سرما ۱۹۹۶

آج

ترتیب: اجمل کمال

کراچی کی کہانی (۲)

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

شمارہ ۲۱ : سرما ۱۹۹۶
جنوری ـ مارچ ۱۹۹۶

مینیجنگ ایڈیٹر
زینت حسام

اہتمام
آج کی کتابیں
بی ۱۲۰، سیکٹر ۱۱ بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی ۷۵۸۵۰

طباعت
ایجوکیشنل پریس
پاکستان چوک، کراچی

رابطے کے لیے پتا:
اے ۱۶، سفاری ہائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰
فون: ۸۱۱۳۳۷۳
ای میل: aaj@biruni.erum.com.pk

بیرونِ ملک خریداری کے لیے پتا:
محمد عمر میمن
۵۳۱۷، ریجنٹ اسٹریٹ، میڈیسن، وسکانسن ۵۳۷۰۵، یو ایس اے

Scanned with CamScanner

کراچی کی کہانی (۲)

فہمیدہ ریاض

۷

کراچی

اختر حمید خان

۹۳

جینے کا ہُنر

آصف فرخی

۱۱۳

اس شہر میں رہنا

محمد حنیف

۱۳۵

ایک اخبار نویس کا کراچی

Scanned with CamScanner

زینت حسام

۱۵۱

گزرے دن، گزرتے دن

بنجمن انتھونی   شریف سوز

لیاقت منوّر   بیکسٹر بھٹی   نسرین اسٹیفن

آصف شہباز   محبوب جان

۱۸۶

عیسیٰ نگری کی زبانی تاریخ

تسنیم صدیقی

۲۲۹

کچی آبادیاں کیوں؟

عارف حسن

۲۳۸

سہراب گوٹھ کا انہدام

Scanned with CamScanner

کینتھ فرنانڈیز

۲۳۶

بے دخلی اور بے گھری

یان فانڈر لینڈن

۲۵۸

دلال آباد

عارف حسن

۲۷۳

شہری بدانتظامی اور تشدد

اکبر زیدی

۲۸۹

سندھی بمقابلہ مہاجر

تضادات، ٹکراؤ اور سمجھوتہ

مارک ٹلی

۳۰۹

چھوٹے ہتھیار

عارف حسن

۳۲۷

کراچی کی صورتِ حال ــــ تناظر اور تجزیہ

***

ضمیمہ ۱

۳۸۰

کراچی ــــ چند اہم حقائق

ضمیمہ ۲

۳۹۸

کتابیات

Scanned with CamScanner

فہمیدہ ریاض

کراچی

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

Scanned with CamScanner

میرا وطن ملیر

وقت کے جادو گھر میں تحلیل ہوتی صدی کے آخری برسوں، اس برس کے آخری مہینے، اس مہینے کے آخری دنوں کی بات ہے۔

بحیرۂ عرب کے ساحل پر آباد، تیسری دنیا کے ایک غریب، بین الاقوامی مالی اداروں سے مستقل لدا لوخواہ ریاست کے ایک عظیم الجثہ شہر کے نو تعمیر اور شان دار ہوائی اڈے سے ایک جہاز علی الصباح، منھ اندھیرے پرواز کرنے والا ہے۔

اس میں بیٹھی ہوئی ایک عورت نے کس کر حفاظتی پیٹی باندھ رکھی ہے۔ اس کے بغیر، اسے یقین ہے کہ وہ اپنی سیٹ ہی سے نہیں بلکہ جہاز سے بھی نیچے گر پڑے گی، اور شاید اس گول کرۂ ارض سے پھسلتی ہوئی، زمین کی کشش پکڑنے میں ناکام، کہیں خلا میں گم ہو جائے گی۔

برطانیہ جانے والی اس پرواز میں، جو آدھے گھنٹے کے لیے دوبئی میں رکے گی، بہت کم مسافر ہیں۔ عورت اپنے دفتر سے پندرہ دن کی چھٹی لے کر مہینا بھر برطانیہ میں رہنے کی غرض سے جا رہی ہے۔ (چھٹی بڑھانے کی درخواست، بہ سبب علالت، وہ برطانیہ سے بھجوا دے گی۔)

وطن چھوڑتے ہوئے وہ کافی خوش ہو رہی ہے۔ شہر میں کئی برس سے بدامنی پھیلی ہے۔ فائرنگ ہوتی ہے اور لوگ مارے جاتے ہیں۔ چوریاں، ڈاکے، اغوا، غرض تمام بد تشدد جرائم یا واقعات اکتا دینے والی یکسانیت سے مسلسل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کبھی ان کی رفتار تیز اور کبھی سست ہو جاتی ہے۔ چند دنوں سے قتل کی وارداتوں میں تیزی آ گئی تھی۔ ہر روز اوسطاً سات آٹھ لوگ مارے جا رہے تھے۔ اس لیے وہ تشدد اور قتل و غارت گری کے شعلوں میں جلتا ہوا شہر چھوڑ کر کچھ دنوں کے لیے تازہ ہوا کھانے کے خیال سے بہت خوش تھی؛ اس بات پر تو اور بھی خوش کہ جہاز کا رخ مغرب کی طرف تھا۔ "گڈ وڈ لندن!" اس نے بخوشی ایک گھسا پٹا جملہ دہرایا (منھ میرا کعبے شریف کی طرف، اللہ اکبر) اور لندن جانے کی نیت باندھ لی۔

زمین پر تیزی سے دوڑتا جہاز اب ہوا میں بلند ہو چکا تھا۔ نیچے شہر تھا، جو اس کی نظروں کے سامنے تیزی سے آ ڑا ترچھا ہو رہا تھا۔ گڑیا گھروں کی طرح چھوٹے پڑتے مکانوں، قطعوں میں بدلتی سڑکوں، کھجوروں کے مور پنکھوں اور ترچھے ساحل سمندر کو کھڑکی کے شیشے سے بغور دیکھتے ہوئے، جن پر دسمبر کے کہرے، سورج کی پہلی کرنیں دمک رہی تھیں، عورت نے آنکھوں میں گرم پانی آتا محسوس کیا۔ اس نے شہر سے محبت اور سینے میں احساسِ محبت کی شدید تکلیف محسوس کی، گویا کوئی تیز دھار چیز سینے میں پیوست ہو اور کوئی ان دیکھا ہاتھ اسے نکالنے کی کوشش کرتا ہو۔ مگر یہ کیفیت ایک دو منٹ سے زیادہ نہیں رہی۔ گرم آنسو اس کی آنکھوں میں خشک ہو گئے۔ اس کا دھیان کہیں اور لگ گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ انگلینڈ پہنچ کر کیا کرے گی، اسے لینے کون آیا ہوگا، اور دیگر یہ کہ اب چائے ملنی چاہیے۔

Scanned with CamScanner

عورت کھڑکی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ کی دو نشستوں پر ایر ہوسٹس نے نہ جانے کیوں (اتنی بہت سی خالی سیٹیں چھوڑ کر صرف اسی کے ساتھ کیوں؟) دو مسافر بٹھا دیے تھے جو کسی اور پرواز سے کراچی آئے تھے۔ ان میں سے ایک بڑے اشتیاق سے جھانک جھانک کر کھڑکی کے نیچے دور کہیں ڈگمگاتے شہر کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"وہ نیچے لانڈھی نظر آ رہا ہے کیا...؟" دبلے پتلے مسافر نے بڑے اشتیاق سے انگلی کا اشارہ کر کے پوچھا۔

عورت چکرا گئی۔ اتنی بلندی سے وہ لانڈھی کو کیسے پہچان سکتی تھی۔

"نہیں تو... پتا نہیں..." اس نے کہا۔ پھر ایک نظر اپنے ہم سفروں پر ڈال کر سوچا کہ کیا وہ لانڈھی سے آئے ہوں گے۔ عورت نے آنکھیں موند لیں۔ اچانک اسے خیال آیا۔ لانڈھی کا کیا مطلب ہے؟ اس نے سوچا کہ وہاں اب رہنے والے یہ بات مشکل سے جانتے ہوں گے کہ سندھی زبان میں لانڈھی کا مطلب کوئی صاف ستھرا، آرام دہ جھونپڑا ہے جو گاؤں کے راستے میں مسافروں کے آرام کرنے کے لیے بنایا گیا ہو۔ شاید، اس نے سوچا، صدی بھی پہلے، اس علاقے میں ایسی کوئی گھاس پھوس کی کٹیا ہو جہاں مسافر پل بھر آرام کرتے ہوں۔ اس نے ایک پرسکون راستے کا تصور کیا جہاں دو رویہ کھجوریں کھڑی ہوں اور جھاڑیوں میں کالے تیتر بولتے ہوں۔

لانڈھی --- اب شہر کا ایک خطرناک علاقہ، گولیوں کی بوچھاڑوں سے دھواں دھار۔

دور ہوتا گیا کراچی، مقتولوں کے خون سے جا بجا شرابور، وارداتوں کی کثرت اور اسرار پر بھونچکا۔

وہ حفاظتی بیلٹ کو تھوڑا سا ڈھیلا کر کے، کرسی کی پشت پیچھے کھسکا کر، آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی دیر کے لیے سو جانے کی کوشش کرنے لگی۔

آنکھیں بند کیے کیے عورت نے تصور کیا ــــ نہ جانے کیوں یہ خیال اس کے ذہن میں آیا، شاید اس لیے کہ شہر کی حالت واقعی بہت خراب تھی ــــ گویا کوئی اس سے سوال کر رہا ہو:

"بھئی کراچی میں دراصل ہو کیا رہا ہے؟"

یہ ایسا سوال تھا جو دراصل اس سے کوئی نہ پوچھتا۔ اس شہر کے بارے میں لوگ سوال نہیں پوچھتے تھے بلکہ صرف تبصرہ کرتے تھے: کراچی کی تو حالت اتنی خراب ہے، وغیرہ۔ مگر عورت کے تصور نے اس سے من چاہا سوال پوچھ لیا۔ (پورا تصور یہ تھا گویا کوئی اس سے انٹرویو لے رہا ہے۔)

عورت تصور میں اپنے تئیں ایک نہایت اہم اور معتبر شخصیت محسوس کرتے ہوئے مفصل جواب دینے کی کوشش کرنے لگی۔ دماغ پر زور ڈالتے ہوئے اس نے سنبھل سنبھل کر کہنا شروع کیا:

"دراصل یہ ایک پیچیدہ صورتِ حال ہے۔ ایک سطح پر تو... کہا جاتا ہے کہ یہ ایجنسیوں کی لڑائی ہے..."

"کیسی ایجنسیاں؟" اس کے چوکنے تصور نے سوال کیا، کیوں کہ حال ہی میں امریکہ سے آئی ایک

پاکستانی لڑکی نے حیرت زدہ ہو کر اسے بتایا تھا کہ وہ ایجنسیوں کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہے، دیگر یہ کہ اس کے بچے باپ کی ایک اسسٹنٹ ایجنسی تھی۔ لہٰذا عورت نے بلاتامل وضاحت کی:

ملکی خفیہ ایجنسیاں۔ جن کے ایجنٹ ہوتے ہیں

جیسے؟ انٹرویو کرنے والے نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

وہ کچھ گڑبڑا سی گئی۔ ایجنسیوں کو حروف تہجی سے یاد کیا جاتا ہے ورنہ وہ ہمیشہ انھیں گڈمڈ کر دیتی تھی۔ پھر بھی اس نے ہمت کر کے، حواس مجتمع رکھتے ہوئے (کیوں کہ وہ انٹرویو لینے والے پر یہی حماقت روا رکھ سکتی تھی اور کم علمی تو کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتی تھی) لکھنا شروع کیا۔

ملکی بہت سی ایجنسیاں ہوتی ہیں — سی آئی اے ہے، آئی بی ہے، آئی ایس آئی ہے... پھر کچھ تصحیح کر کے اس نے صاف کیا، سی آئی ڈی ہے — حالاں کہ یہ سوچ کر اسے شرمندگی ہو رہی تھی کہ اس قدیم ادارے کو کہیں برسوں پہلے ختم ہی نہ کر دیا گیا ہو۔

اس کے علاوہ — اس نے کہا، ایم کیو ایم کے دو متحارب گروہ ہیں۔ پھر شیعہ اور سنی، سیاسی اور غیر سیاسی جماعتیں ہیں۔ اور پھر — وہ کچھ رک گئی، اس احساس کے ساتھ کہ بات پوری نہیں ہوئی۔ پھر اس نے کہا: پھر پولیس ہے، رینجرز ہیں، شہری ہیں اور اور ایجنٹ ہیں، ہندوستانی ایجنٹ ہیں، افغان ایجنٹ ہیں — تو یہ سب یعنی کہ لڑ رہے ہیں۔

انٹرویو لینے والے نے قہقہہ لگایا۔ عورت ہنس رہی تھی۔ خود ہی تو لے رہی تھی وہ یہ انٹرویو۔

لاحول ولا قوۃ" اس نے کہا، "کیا بکواس کر رہی ہوں میں!"

تو پھر کراچی میں ہو کیا رہا ہے؟"

واللہ اعلم! عورت نے سر جھٹکا۔ پھر آنکھوں میں آنسو بھر آئے: خانہ جنگی ہو رہی ہے۔ روز کتنے ہی لوگ مارے جاتے ہیں۔ دس بارہ، دس بارہ ہر روز۔

اسے اپنے پڑوس کی مسجد پر حملہ یاد آیا۔

زندگی سے دو دن پہلے اس کے محلے کی مسجد میں کتنے آٹھ آدمیوں کو مار دیا گیا تھا۔ مرنے والے کہا جاتا تھا سب دوستی کے تھے۔ کیا مارنے والے یقیناً شیعہ رہے ہوں گے؟ اس سے پہلے شیعوں سے بھری بس میں بم پھٹا تھا۔ اخباروں میں روزانہ مرنے والوں کی تصویریں چھپتی تھیں اور حالاں کہ شہر کے لوگ مدت مدید سے ان اموات میں دلچسپی کھو بیٹھے تھے، پھر بھی کوئی نہ کوئی شخص (مثلاً یہ عورت ہی) شہر کے معمے کو سمجھنے کی کوشش میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا کہ مرنے والوں کا تعلق کس فرقے یا سیاسی جماعت یا لسانی گروہ سے ہے۔ بعض اوقات خبریں اس طرح ہوتیں:

مرنے والوں میں دو ایم کیو ایم کے کارکن، ایک ایم کیو ایم حقیقی کا کارکن، تین شیعہ اور دو سنی تھے۔

پڑھنے والے اس طرح شہر کے معمے کو حل کرتے۔ یہ بات ناقابل یقین تھی کہ شہر میں مدت سے بھی

Scanned with CamScanner

سب کچھ ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ ہلاک کرنے والے ڈونز صرف ایم کیو ایم کے حریف ہیں بلکہ حقیقیوں، شیعوں اور سنیوں کے بھی جانی دشمن ہیں۔ پھر وہ نفی کرنے لگتی: ارے نہیں یہ تو آپس میں ایک دوسرے کو مار رہے ہیں لوگ!

کبھی لڑکپن میں وہ شمع معمے حل کیا کرتی تھی۔ یہ سب سے پہلے معمے تھے جن پر ہزاروں روپوں کے انعام ملتے تھے۔ اس زمانے میں ہزاروں روپے بڑی بات ہوتے تھے۔ حروف تہجی کے خانوں میں بھرے ہوتے تھے۔ شمع نامی رسالہ جو دہلی سے نکلتا تھا اور پاکستان میں بکتا تھا۔ اس کے ہر صفحے پر معمہ شائع ہوتا تھا اس کی پشت پر صحیح حل کے لیے کچھ اشارے درج ہوتے تھے! اس کالم کا دلچسپ اور خیال انگیز عنوان ہوتا تھا، "اشارے۔"

کراچی میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ بھی بے معنی تھا۔ یوں ہی دل بستگی کے لیے لوگ اخباروں میں اشارے ڈھونڈتے، جب کہ صحیح حل پر کوئی انعام ملنے والا نہ تھا۔ بلکہ شاید صحیح حل کوئی تھا ہی نہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ یہ بلا حل معمہ ہو جسے صرف بے وقوف بنانے کے لیے پیش کر دیا گیا ہو۔ لوگ برسوں دماغ پچی کرتے رہیں اور پھر پتا چلے... اوہو! ہمیں یوں ہی الو بنایا گیا۔

تھوڑی دیر میں فضائی میزبان چائے لے آتی ہے۔ ایک ٹرالی پر اخبار بھی ہیں۔ لڑکی اسے اخبار پیش کرتی ہے۔ خوشی سے تقریباً کپکپاتے ہوئے عورت نے اخبار لینے سے انکار کر دیا۔ وہ صرف یہی نہیں کہ وہ پہلے سے جانتی تھی اخبار میں کیا لکھا ہوگا (اتنے دو شیعہ، ایک ایم کیو ایم، شاید ڈیڑھ حقیقی، وغیرہ)، بلکہ اس لیے کہ اب وہ جاننا ہی نہیں چاہتی تھی، کم از کم ابھی تو نہیں۔ رستے میں تو وہ بھاگ رہی ہے... کوئی یوں ہی تو نہیں، اس کو دیتے رہنے والے مسلسل تشدد سے بچ کر ہی تو وہ جا رہی ہے بلکہ (اس نے تفاخر اور تحقیر کی لہر میں تاک تاک کر سوچا) وہ جا چکی ہے۔ یہ بات اب ماضی بعید کی ہوتی کہ وہ کراچی میں تھی۔ اخبار کے بدلے وہ فضائی کمپنی کے رسالے میں کم سن مسافروں کے لیے کے عنوان سے چھپے بندروں اور طوطوں پر لکھے با تصویر مضامین پڑھنے لگی۔ مضمون بے حد معلوماتی تھے اور تصویریں بہت دلکش تھیں۔ چند ہی لمحوں میں وہ ان میں کھو کر رہ گئی اور سوچنے لگی کہ دوسری ٹرپ پر محصول معاف دکان سے وہ اپنی نواسی کے لیے مخمل کا بندر خریدے گی، کرسمس کا تحفہ!

وہ کرسمس کا دن تھا۔ اس کی بیٹی، داماد اور نواسی اسی جگمگاتے دن اسے لینے ہوائی اڈے پر آئے ہوں گے۔ فادر کرسمس کے بدلے مدر کرسمس آ رہی ہیں! اس کی بیٹی نے دور دراز ٹیلی فون پر خوشی سے چیختے ہوئے کہا تھا۔ عورت خوشی سے مسکرانے لگی۔ دور کہیں، اجنبی دیس کے ہوائی اڈے پر، خوشی اس کا انتظار کر رہی تھی؛ ایک سجے ہوئے شہر میں، جیسے اس کی آمد کے لیے خاص طور پر سجایا گیا ہو۔ اس وقت وہ ہرگز نہیں جاننا چاہتی کہ کل کراچی میں کون کون مارا گیا، بندھی میں اور ملیر میں...

ملیر تو وہ خود گئی تھی۔ حیرت! حیرت! وہ ملیر کیوں کر پہنچی؟

مقتول کے گھر تعزیت کے واسطے، جب کہ لاش ہسپتال سے لائی جا رہی تھی۔

اُن دنوں دو تین روز سے قتل کی وارداتوں میں تیزی تھی۔ اچانک ایک صبح اسے خبر ملی کہ جس دفتر میں وہ جاتی تھی وہاں کام کرنے والا ایک کلرک مارا گیا ہے۔ کون تھا وہ؟ اسے اس کی صورت بھی یاد آ گئی تھی۔ یہ خبر اس نے ٹیلی فون پر سنی تھی، اور اس کی عجیب تفصیلات۔

سرکاری دفتروں میں کام کرنے والے کم گریڈ کے زیادہ تر ملازم دفتری اوقات کے بعد، مہنگائی کے زمانے میں کسی طرح پورا کرنے کے لیے، کوئی اور بھی کام کرتے ہیں۔ یہ کلرک بھی — جس کو زید، بکر یا عمر کہیے — دفتر کے بعد ٹھکو بیچتا تھا۔ پی ہوئی دھنیں، مرمرے، سیو، پاپڑ، نمک پارے وغیرہ وہ پلاسٹک کی تھیلیوں میں اسٹیپل کے دھیلے تار کے دانت سے بند کر کے (تاکہ وہ ہوا اور نمی سے محفوظ رہیں) اپنی موٹر سائیکل پر لوگوں کے گھروں اور دکانوں میں پہنچایا کرتا تھا۔

واردات والے دن (مگر واردات والا تو ہر دن تھا! یعنی جس روز اس کے ساتھ واردات ہوئی) زید، بکر یا عمر گھر نہیں پہنچا۔ گھر والوں نے بہت دیر تک، یعنی گلی بتی تک، انتظار کیا۔ جب وہ صبح تک گھر نہ پہنچا اور آسمان پر ... سیاہ دھواں سا ... ہو گیا، اور پھر وہ بھی چھٹ گیا اور سورج مشرق سے جیسا ہمیشہ طلوع ہوتا ہے، طلوع ہو گیا، اور چڑیوں نے پچھواڑے میں اگے امرود اور کیلے کے تین پیڑوں میں گانا اور چہچہانا بھی ختم کر دیا اور اس کے بدلے کراچی کے آسمان کی وہی شناسا چیلیں اور کوے چکر کاٹتے قسائی کی دکان کا رخ کرنے لگے جہاں دکان کے باہر پڑے چھیچھڑوں پر تیزی سے اڑتی ہوئی چیلیں اپنے پنجے پر جھپٹے مارتی ہیں، اور روشنی میں سب کچھ صاف نظر آنے لگا تو زید، بکر یا عمر کی بیوی نے پوری طرح دہل کر بستر پر سوتے دیور یا جیٹھ کو جگایا اور کہا:

وہ نہیں آئے۔

گھر والوں نے دفتر کھلنے کا انتظار کیا۔ ان کے گھر میں ٹیلی فون نہیں تھا۔ انھوں نے باہر کسی دکان سے دفتر فون کیا۔ انھوں نے استفسار کیا کہ کیا بات ہے، وہ دفتر سے گزشتہ رات گھر کیوں نہیں پہنچا؟ دفتر والوں نے حیرت اور پریشانی کے عالم میں بتایا کہ وہ تو دفتر کے وقت کے بعد سب لوگوں کے ساتھ گھر چلا گیا تھا۔ پھر کچھ توقف کے بعد انھوں نے مشورہ دیا کہ بھائی، حالات کچھ اچھے تو ہیں نہیں، خدا کرے سب خیریت ہی ہو، مگر آپ لوگ ذرا کسی ہسپتال میں بھی معلوم کر لیجیے۔ گھر والوں اور عزیزوں نے سب ہسپتالوں سے رجوع کیا۔ دس بجتے بجتے ایک ہسپتال میں زید، بکر یا عمر کی لاش کی شناخت ہو گئی، اور یہ خبر دوپہر کے نکلنے والے اخباروں کے دفتروں میں بھی پہنچ گئی۔ وہیں سے کسی نے ٹیلی فون پر اسے بتایا تھا کہ اس کے دفتر کا ایک آدمی بھی کل رات...

بے تابی سے اس نے اپنے دفتر فون کیا تھا۔ وہاں اسے مزید تفصیلات بتائی گئی تھیں۔ یہ سب سن کر عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ وہ اس قدر کیوں رو رہی ہے۔ بہرصورت وہ روتی دھوتی دفتر چل دی تھی۔

دفتر کا نچلا اسٹاف تجہیز و تکفین کے لیے کب کا ملیر جا چکا تھا۔ صرف ڈائرکٹر اور ان کے نائب بیٹھے تھے۔ وہ منتظر تھے کہ ہسپتال سے پوسٹ مارٹم کے بعد لاش گھر آ جائے اور جنازہ اٹھنے والا ہو تو پھر وہ بھی ملیر جائیں۔ ملیر ـــــ جو پہلے شہر کے مضافات میں تھا۔

ملیر جاتے ہوئے وہ سڑک پر رواں ٹریفک کو دیکھتی رہی۔ رکشا والے اور ٹیکسی ڈرائیور، اور اپنی گاڑیوں میں جاتے ہوئے لوگ، یہ سب جیسے کسی جنازے میں جا رہے تھے۔ ان کے چہرے سختی سے الم میں منجمد تھے۔ راستے میں سے اور تفصیلات معلوم ہوئیں۔ لاش علی الصباح ہسپتال لائی گئی تھی۔ واردات شام کو ہوئی تھی جب زید، گویا عملہ تنخواہ تقسیم کر کے گھر واپس جا رہا تھا۔ رات بھر لاش سڑک کے کنارے پڑی رہی تھی۔

راستے میں سے کچھ یاد آیا۔ اس نے ہم سفر ڈائرکٹر سے کہا، فلاں بھائی۔ (جیسا کہ اس کے شہر کا قاعدہ تھا ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کا، جسے اس نے غیر شعوری طور پر اپنا لیا تھا)۔ آپ کو یاد ہے کئی برس پہلے یہاں ملیر میں۔۔ ایک صاحب کے گھر ادبی محفل ہوتی تھی۔ اس نے ٹوٹے ہوئے جملوں میں کہا۔ یاد میں ایک چھوٹے سے گھر کا ایک نیم تاریک کمرہ بجلی کے پیلے، مدھم بلب سے روشن ہو گیا۔ فرش پر بچھی دری، اس پر سمٹ کر بیٹھے ہوئے لوگ۔ نظم یا افسانہ پڑھنے والے۔ جیسے دلوں کے تبصرے۔ اسے یاد آیا، کتنی کتنی دور سے جاتے تھے لوگ وہاں۔ وہ خود کتنی دور سے گئی تھی۔ تب دھوراجی کالونی میں رہتی تھی وہ۔ ڈائرکٹر صاحب ذرا دیر خاموش رہے۔ پھر ان کی ٹوٹی ہوئی سی آواز آئی۔

"ہاں صاحب، خوب یاد ہے۔ میں خود وہاں جاتا تھا۔"

"پھر ان صاحب کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ محفلیں ختم ہو گئی تھیں"، عورت نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ "آخری بار اسی گھر میں وہ سب تعزیت کرنے گئے تھے۔"

"نہیں، ختم تو نہیں ہوئی تھیں۔ ان کی بیوی نے جاری رکھی تھیں"، ڈائرکٹر صاحب نے کہا۔

"کامریڈ تھے وہ صاحب۔" اسے مدھم سا یاد آیا۔ یہ ایک سوشلسٹوں کا حلقہ تھا۔ لینن اور مارکس کے نظریات پر وہاں طویل بحثیں چلتی تھیں۔

ایک موڑ کاٹ کر گاڑی ملیر میں داخل ہو گئی۔

علاقے میں مرگھٹ کا سا سناٹا تھا۔ اکا دکا دکانوں کے سوا تمام دکانیں بند تھیں۔ ڈرائیور فیصلہ نہ کر پا رہا تھا کہ آگے جائے یا نہیں۔ یہ ایک فساد زدہ علاقہ معلوم ہو رہا تھا۔ سڑک پر ایک آدھ جگہ لوگ گچھا سا بنائے کھڑے تھے۔ وہ ان کی آنکھوں کو مشکوک نظر آ رہے تھے اور خود انہیں شک بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

تبھی، نہیں سامنے سے ایک کھٹارا بس آتی نظر آئی جس میں چند مسافر بھی تھے۔ بس اسٹاپ پر نہ جانے کہاں سے ایک عورت آ کھڑی ہوئی۔ سڑک پر عورت! اس کے آثار انہوں نے ہمت کر کے آگے جانے کی ٹھانی۔

لاش سسرال سے یا تو آچکی تھی یا وہاں سے واپس روانہ کی گئی تھی۔ اسے ٹھیک سے پتہ نہ چل سکا۔ [illegible] اسے گھر کے اندر عورتوں کی طرف بھیج دیا گیا۔ چھوٹی سی تنگ گلی پار کرنے کے بعد گھر تھا۔ عورتوں سے کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا۔ پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی عورتیں۔ کسی نے اشارے سے بتایا: یہ ان کی ماں اور وہ بیوی ہیں۔

بیوی تیس کے پیٹے میں رہی ہوگی۔ روتے روتے نڈھال، دیوانی ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کاجل پھیل رہا تھا۔ سوتی ململ کا گلابی دوپٹہ، ہاتھوں میں سفید لٹھے کا جوڑا، چست پاجامے کی کلائی تک شکل سے خوشحال گھرانے کی لگتی ہے۔ [illegible] اس نے دل میں سوچ کر حیرت کی۔ یہ تو بالکل سوتی پت یا ریوڑی کے کسی مسلمان محلے سے نکل کر [illegible] سومیانی ہوگی۔ پچاس برس میں ان کی اندرونی حالت جوں کی توں رہی [illegible] نہیں، یہاں پہلے گھر تھے کہاں! جھگیاں ہی جھگیاں تھیں چھوڑا [illegible] تک۔ اور [illegible] پکے گھر کھڑے ہوئے تھے۔ [illegible] میں وہ یہی [illegible] کرنے آئے تھے، اس بستی آبادی پر جو اب کھوکھراپار تک جا پہنچی تھی۔

کھوکھراپار ــــ ہجرت کی سرحد!

[illegible] کلائی میں کانچ کی چوڑیاں جھنکیں۔ [illegible] ہری بھری [illegible] کی [illegible] سسکیوں سے [illegible] رو رہی تھی۔ [illegible] بیٹی تھی۔ دو چھوٹے بچے وہیں کہیں دوسرے بچوں میں کھیل رہے تھے۔ اب یہاں تک پہنچ کر عورت کو بالکل رونا نہیں آرہا تھا۔ [illegible] سنا، اس نے سوچا۔ کس قدر رقت [illegible] رو رہی تھی کہ گلے میں لوٹ زیادہ [illegible] بات [illegible] قتل کا تعلق کسی سیاسی جماعت یا دھڑے سے نہیں تھا۔ باہر نکلنے پر معلوم ہوا کہ [illegible] یہ بات ہوئی تھی۔ لوگوں کی یہی رائے بن رہی تھی کہ [illegible] دراصل اُن دو [illegible] سے وصولی کرنے آرہا تھا۔ ڈاکوؤں نے اس پر حملہ کیا اور پیسے لے کر فرار ہوگئے۔ اس قتل کے پیچھے کوئی دوسرا مقصد نہیں تھا۔

[illegible] ڈپٹی کمشنر صاحب سے بھی یہی رائے ظاہر کی تھی۔ کچھ نہیں صاحب، محض غنڈہ گردی کی کارروائی ہے، پیسوں کے لیے۔

جب [illegible] یہ بات سب سے پہلے باعث اطمینان کیوں تھی۔ [illegible] بات پر مقتول [illegible] سے [illegible] تھے [illegible] قدر حد ہاری ہے، جب کہ [illegible] جنازہ ٹھنڈا بھی نہیں ہوا تھا، [illegible] کا سے [illegible] کیوں نہیں؟ [illegible] رہے تھے کہ اس قتل کے پیچھے کوئی دوسرا مقصد نہیں تھا۔

[illegible] اس نے سوچا [illegible] والی بات ہے۔ مقتول کے عزیز و اقارب ڈر گئے ہوں گے [illegible] قتل کا [illegible] انتقامی کارروائی میں دوسروں کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ لیکن [illegible] سب گھر کے لوگ اس بات پر کیوں مطمئن نظر آرہے تھے کہ یہ

محض غنڈہ گردی ہے، اور اس قتل کا اس شہر کے تار و پود میں پڑی سیاسی گرہ سے کوئی تعلق نہیں؟

اس بات میں عجیب سا اطمینان تھا۔ نہیں صاحب، محض غنڈہ گردی ہے! سارا زور محض پر تھا۔

کیوں؟

دوسری صورت میں سیاسی لگاؤ اور اس کے ممکنہ حل کو فوکس میں لانا ضروری ہو جاتا۔ اس لیے اس منطق پر قدم بہ قدم چلا جائے کہ:

(۱) اس قتل کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں،

(۲) کسی قتل کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں،

(۳) ہم جو کوئی سیاسی رائے نہیں رکھتے، اور اس کا اظہار کرنے سے بھی اب پرہیز کرنے لگے ہیں تو ہم ذمہ دار نہیں ہو سکتے،

(۴) اس قتل میں، یا کسی بھی قتل میں، ہماری کوئی ذمہ داری نہیں۔

ایک منچلا صحافی ان کی ذہنیت سے مسکراتا ہوا ان کی طرف بڑھا اور رازداری سے گویا ہوا:

خوب صاحب، پیسوں کے لیے قتل کیوں کر ہوا ہو گا؟ جیب میں اس کی تین چار سو روپوں سے زیادہ رقم نہ تھی۔ گولی بہت قریب سے ماری گئی ہے۔ قمیص کی جیب کے پاس خون کا معمولی سا داغ ہے۔ یہ تو۔۔ اس نے سرگوشی میں کہا، کوئی اور ہی معاملہ لگتا ہے۔

کیا یہ بدبخت اس قتل کو سیاسی ثابت کرنا چاہتا ہے؟ آنے والوں نے جھنجھلا کر سوچا تھا۔ خوف زدہ آنکھوں سے انھوں نے متحارب گروہوں کے اس گڑھ میں فاصلوں پر کھڑے لوگوں کے مشکوک گچھوں کو دیکھا تھا اور سرعت سے کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے تھے۔

راستے میں انھوں نے اس بات پر غور کیا تھا کہ زید، بکر یا عمر کیوں کر گولی کھا گیا۔ کئی امکانات تھے: (۱) کہ یہ محض ایک ڈاکے جیسے قتل کی واردات تھی؛ (۲) کہ وہ ایم کیو ایم کا تھا اور حقیقی والوں نے قتل کر دیا؛ (۳) کہ وہ حقیقی والوں کا تھا اور ایم کیو ایم نے مار دیا؛ (۴) شیعہ تھا، سنیوں نے قتل کر دیا؛ (۵) سنی تھا، شیعوں نے مار دیا؛ (۶) حالات خراب کرنے کے لیے بغیر نشانہ لیے چلائی گئی گولیوں کی زد میں یوں ہی آ گیا۔

زید، بکر یا عمر کو کس نے قتل کیا؟

اچانک آسمان پر بادل چھا گئے۔ عورت نے سندھ کے شاعر شاہ لطیف کی ایک نظم یاد کی جو انھوں نے کراچی پر لکھی تھی۔ کیا تب بھی کراچی تھا؟ ہاں، تب بھی تھا۔ ایک چھوٹا سا مچھیروں کا گوٹھ کلاچی۔ وہاں ایک مچھیرا اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ دن بھر سمندر میں مچھلیاں پکڑتے اور شام پڑے گھر لوٹتے۔ کہیں سے سمندر میں ایک مگرمچھ آ نکلا۔ اور پھر ایک دن وہ مچھیرا گیا تو گھر نہ لوٹا۔

یہی نظم تھی۔

Scanned with CamScanner

منّا تو گھر نہیں آیا
شام پڑ گئی اور پھر رات
منّا تو گھر نہیں آیا

کار کے بونٹ پر ٹپ ٹپ بوندیں گرنے لگیں۔

***

مسئلے کا حل

سیاسی مسئلہ حل کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ فلاسفی کے ساتھ چار پانچ میں جیسی عورت سے واقف، تجربات کی مشاہدوں پر مبنی ایک بات، سمجھ نتیجہ اخذ کیا۔ مسئلے کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو کچھ عرصے بعد، آکسیجن کی کمی کے باعث، وہ مر جاتا ہے۔ پھر اس کی لاش گلنے سڑنے لگتی ہے۔ بدبو پھیلتی ہے۔ کیڑے مکوڑے گلا سڑا گوشت کھانے لگتے ہیں۔ غرض جب تک مسئلہ خاک میں ملے، خوب گند پھیلاتا ہے۔

وہ اس عادت کو اپنی فطری تشکیل پر خوش ہونے کی کوشش کرنے لگی، شہر میں ہر روز پابندی سے گرتی لاشیں یاد کر کے، جو اس شہر میں رہنے والوں کے وجودی نظاموں میں گرتی رہی تھیں، اسلئے تمام شواہد کے مطابق معدوم ہو چکی تھی، اور چند دنوں میں محسوس ہونے لگا تھا کہ کراچی کو اس کے اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے، جب کہ قتل و غارت گری کی قوتیں بلا جھجک یا روک ٹوک ہر طرف منڈلا رہی تھیں

اس شہر کی (ایک حد تک پوری ریاست کی) آبادی پر ٹھونسی ہوئی بے عملی (در حقیقت بے بسی) کی پیشگی میں عورت نے اس طرح کی کسی شہری عمرانی نظری تشکیلات پلو میں باندھ لی تھیں جن پر وہ کاربند رہنے کی کوشش کر سکتی ہے۔ مثلاً یہ کہ سیاسی تنظیمیں مارنے سے ختم نہیں ہوتیں۔ اگر طویل عرصے تک کوئی سیاسی جماعت کچلی جاتی رہے (بقول سندھیوں کے، موچڑوں میں رہے) تو وہ مرتی نہیں بلکہ لولی لنگڑی، اندھی کانی یا گونگی بہری ہو جاتی ہے۔ پھر جب طاقت ور عناصر اسے اپنے کام میں لانا چاہیں تو وہ لکڑی کی ٹانگ یا کانچ کی آنکھ لگا کے، چند گنتی ہوئی، میدانِ عمل میں آتی ہے۔ وہ پہلے جیسی باقی نہیں رہی ہوتی۔ دیکھنے والے کچھ ہی عرصے میں سمجھ جاتے ہیں کہ یہ سب بناوٹی بکواس ہے، پیسے والوں کا ایک مسخرہ ہے۔ پھر آپ اگر اسے ختم بھی کر ڈالیں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس کی اصل وقت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، لیکن اس کی تعداد بھی بے ضرر ہو جاتی ہے۔

Scanned with CamScanner

موہنجوڈاروں کی یادوں کے حیاتیاتی خلیوں میں سرایت کر چکی ہوتی ہے۔ مشتاق صاحب نے پہلے سے یہ وہ ہمیشہ کھمبیوں سے مسعود صاحب پر رحمت کرتی ہے۔ متواتر، کھانے کے بعد آپ سے [illegible] نہیں رہ سکتے۔ وہ جنت یا آسمانی طاقت سے بہرہ ور، پسماندوں کا گروہ نہیں تھا، محض [illegible]، اور انسانی کردار رکھنے والے لوگوں کی ایک سیاسی جماعت ہی تو تھی۔

ہوئی میزبان نے کے لیے ناشتہ لائی۔ عورت کا نہیں، انٹرویو ادھورا رہ گیا۔

انٹرویو کا خیال دراصل اس لیے آیا تھا کہ چند دن پہلے اخباروں میں مولانا محمد اسعد مدنی کا انٹرویو چھپا تھا۔ وہ کراچی سے پراسرار طور پر لندن جا چکے تھے۔ اس کی بات غیر ملکی ریڈیو سٹیشنوں سے نشر بھی ہوئی تھی۔ ملک کے [illegible]، مرتبے میں محترم [illegible] شخصیت، وہ اپنے گجراتی لہجے میں کہہ رہے تھے: میرے کو قتل کرنے کا پلان ہے۔ [illegible] کہ ایم کیو ایم سے یا کسی مذہبی جماعت سے [illegible]۔ [illegible] ڈائرکٹ آ جاؤ۔ بات یہ ہے بھائی کہ پاکستان میں سچ لکھا نہیں جا سکتا۔

پاکستان سنتے ہیں [illegible] کیا تھا۔ [illegible] بات کہہ ڈالی۔ [illegible] دم بخود، منہ پھاڑے، دل ہی ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے تھے۔ سب سے زیادہ مشکل [illegible] جو آزادی اظہار کے اس جمہوری دور میں ناقابل اور [illegible] مقالات سے [illegible] سے کچھ [illegible] میں مصروف تھے۔ پھر [illegible] کھانے، گلاس صاف کیا، [illegible]۔ اخباروں [illegible] تبصرہ کیا۔ ایک انگریزی اخبار نے اور [illegible] میں لکھا [illegible] وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔

پھر بڑی سرعت سے اخباروں نے موضوع بدل دیا۔ وہ اس بدقسمت شہر سے [illegible] گریزاں تھے جس کی بدامنی سب سے مستقل بن چکی تھی۔ شہر [illegible] گنجان آبادی اور حیرت انگیز پھیلاؤ کے باعث دنیا کے بڑے شہروں میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ ریاست کی معیشت کی شہ رگ، دنیا کی [illegible] (در حقیقت واحد) جدید شہر، موٹر کاروں سے [illegible] غریب اور مالدار [illegible] شہریوں کا [illegible] سڑکوں پر [illegible] آتی ٹوکس ویگنوں کے ساتھ ساتھ [illegible] کے مہنگے ترین فائیو سٹار ہوٹلوں کے ساتھ ساتھ سستی ترین [illegible] ہے، کسی تیز رفتار کے ساتھ اور کبھی رک رک کر، سڑکوں پر، محلوں پر [illegible] مقتولوں کی لاشیں گرائی جاتی رہی ہیں۔ [illegible] تھے: آج کس علاقے کی باری ہے؟ جس شہر کی خبریں پڑھتے [illegible] ـــــ [illegible]

[illegible] کی بی بی [illegible]
[illegible] ہوتے گئے ہیں [illegible] فہمیدہ شہ [illegible]
[illegible] اپنے شہر سے اس [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] کہاں کہاں [illegible] ہوتی ہیں۔ [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] دہشت پھیلانے [illegible] کھیل رہے ہیں۔

پاکستان میں [illegible] دہشت گردی کی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کے کھیل
میں اصل قوت جنوز روپوش ہاتھوں میں ہے؟

[illegible] اس کے شہری
کن حالات سے گزر رہے ہیں؟

[illegible] کا عمل [illegible]
[illegible] ملک میں
اس طرح اپنے [illegible]
متنوع اور متعدد ہوتے ہیں۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]

وسائل مسخ اور برباد ہو چکے تھے۔ جمہوری انجمنوں سے محروم ہوئے، خوف زدہ، دولت مند مالکان کے یہ اخبارات سچ لکھنے سے معذور تھے۔ قومی زبان کے اخبارات، جنہیں ملک کی خواندہ آبادی کا بڑا حصہ پڑھ سکتا تھا، سنسر شپ کی طویل، ریاست کی تقریباً تمام زندگی پر محیط، روایت سے جاں بر نہ ہو سکے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ اشاعت رکھنے والا اخبار نوازلی و مذہبی طاقت ور عناصر کی خوشنودی کا متلاشی تھا کہ سے مقامی رجحانات کی چھت کا مضبوط ترین ستون قرار دیا جا سکتا تھا۔ انگریزی اخبارات، جو حریت کے تحت کی دور میں، حکومت پر نکتہ چینی کے لیے نسبتاً آزاد تھے، مقامی قارئین کی کم تعداد تک پہنچ سکتے تھے، مگر مغربی دنیا، خصوصاً مدد دینے والے ملکوں کے واسطے، جواب دہ ہونے کے ناتے حقوق انسانی کی پکار سے تھے۔ اس ملک میں آزادی اظہار کے ادنیٰ سماجی ہمدردوں کا کام دے سکتے تھے، اپنے ستھرے شعور اور روشن خیالی کے باوجود بے بس اور حد درجہ محتاط تھے اور ایک مشکل وقت سے گزر رہے تھے۔ ان کے پیچھے بھی یہ حقیقت، مخفی تھی کہ اصل طاقت کن عناصر کے پاس ہے۔ اس میں اور طاقت ور ہاتھ کے لیے نمبروں سے، حیلہ داری کے ساتھ، اسٹیبلشمنٹ کی ترکیب اختراع کر لی گئی تھی تاکہ پہلو بچا کر اس کا ذکر کر سکیں، یا گاہے گاہے اس کو کوئی دردمندانہ مشورہ دے سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ ایک مدت سے پڑھنے والے ان میں شائع شدہ تبصروں کیا رپورٹوں تک پر اعتماد کرنا چھوڑ چکے تھے اور انہیں محض یہ اندازہ لگانے کے لیے پڑھتے تھے کہ ان گنت رخنوں کے ذریعے داخل (پلانٹ) کی گئی یہ تحریریں کس جانب دار نے لکھوائی ہیں اور ان کی بنیاد پر آئندہ حالات کے کون سا رخ اختیار کرنے کی پیش گوئی ہو سکتی ہے۔

ملک کی سیاسی جماعتیں، جن کا مفاد سونے کی چڑیا، اس شہر کراچی، سے وابستہ تھا، کمزور تھیں، مگر ان کی کم شعوری یا نا بینی کو اس پس منظر میں دیکھنا ناگزیر تھا کہ کم از کم تیس برس کے طویل عرصے میں قائم یا پس پردہ سیاسی طاقت ور ہاتھ نے عوامی حمایت رکھنے والی ہر سیاسی تنظیم کو بزور طاقت کچلنے اور پھر بار بار، مذہبی اور نسلی جوڑ توڑ، سازش گیری، دھمکی، بلیک میل اور رشوت پر انحصار رکھنے کے مسلسل عمل سے ذریعے — اس سے قبل کہ وہ سنبھلے اور روپوش ہاتھ کے پس پردہ اشاروں اور امداد کے بغیر کاروبار حکومت چلا سکے — اپاہج بنا دیا تھا اور مسلسل اس بات کا پروپیگنڈہ کیا تھا کہ دراصل یہی پوری قوم کے مفاد میں ہے۔ تیسری دنیا کے نو آزاد، عوام دوست نظام قائم کرنے کے لیے تڑپتی ریاستوں میں وہ دھڑے جنہیں ماضی میں خود مغربی جمہوریتوں نے پالا تھا، پیہم تسلسل اور عام لوگوں کی ان تک نارسائی کے باعث اب ایسے قائم بالذات طبقے بن چکے تھے جن کے دست معیشت کی رگ گلو میں پیوست تھے اور جو نو آزاد ریاستوں میں ایک بالکل نیا مظہر (phenomenon)، ایک جدید مظہری وجود تھے جو اسی سبب کی عمرانی کتب میں شامل نہیں کیے گئے تھے۔

مگر کراچی ہی کیوں؟ یہ شہر ہی مسلسل تشدد کا شکار کیوں ہو رہا ہے؟

کیوں کہ یہ بھی لکھنا اہمیت کی بات ہے کہ کراچی تیسری دنیا کے کسی عام سے ملک کا عام سا شہر نہیں تھا۔ یہ ایک خاص الخاص ملک کا خاص شہر تھا: دنیا کی دو بڑی ریاستوں کی رسّاکشی میں سامنے کا

سے کام رکھنے والے ملک کا ایسا شہر جس پر سرد جنگ کو اختتام پذیر کرنے والی طالبان جنگ اور اس کی بے تحاشا بمباری میں ان کی بھی تصویروں کے ٹوٹ کر دھڑام سے زمین بوس ہونے کا تمام دھماکا خیر مقدم برسوں سے کر رہا ہو! ایسا شہر جسے اس ملک کے جنگ جو حکمرانوں نے جرائم، تشدد اور مذہبی جنون کی تاریک حماقت کا مرید طفلہ جیتنے کے لیے کٹھ پتلیوں کی طرح استعمال کیا ہو، جب کہ وہ خود ایک خواب خرگوش میں عیش و عشرت کے ڈنکے بجا رہے تھے۔ اور اس وقت جب وہ جرائم، تشدد اور تاریک حماقت کو کام میں لاتے ہوئے، دنیا کو یک قطبی (uni-polar) بنانے کی مہم میں جٹے ہوئے تھے ایسوں کو جنت اور موت میں سب کچھ برابر ہے! یہ ہر مرید طفلہ شہر کی نسوں میں رواں تھا

***

دوبئی کا درزی

عورت نے ساتھ والی نشستوں پر بیٹھے ہوئے مسافر لانڈھی سے نہیں آئے تھے۔ جیسا کہ اسے بعد میں معلوم ہوا، اور یہ معلوم کر کے اسے حیرت بھی ہوئی، وہ ہندوستان سے آئے تھے۔

ہندوستان! کیا آپ وہاں پی آئی اے سے سفر کر سکتے ہیں؟ اس نے تعجب سے پوچھا تھا۔

جی نہیں، انہوں نے نرمی سے جواب دیا تھا، ایئر انڈیا سے آدھی قیمت پر سفر ہو جاتے ہیں۔

اس نے برابر والی نشست پر ایک سانولی، سوکھی کانکھ عورت بیٹھی تھی؛ تیز جامنی ساڑی اور کھلے سیاہ بالوں کا زرد جوڑا جس کو گندھوانے والے ہاتھ میں اصلی تیل کی تیز، گیلی ناریل تیل کی چپ اور کانوں میں کھل رہی تھی۔ وہ آدھی پرورش سے آئی تھی اور اب دوبئی میں کسی شیخ کے پاس آیا گیری کے لیے جا رہی تھی۔ اس سے برابر بیٹھا ہوا مرد آگے دوبئی جا رہا تھا۔ دوبئی میں اس کا درزی کا کام تھا، جیسا کہ اس نے بتایا۔

آپ کہاں رہتی ہیں؟ عورت نے اسے بڑے اشتیاق سے ہزاروں میل کی دوری سے مانوس کو پہچاننے کی کوشش کرتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

جی نہیں، دوبئی میں نہ آباد کی بات، اتنا سب کے شستہ صوفی زیر و بم رکھنے والی اردو میں جواب دیا۔ بس ہوائی اڈے پر رکے ہیں، دو ایک گھنٹے کے لیے۔

تو آپ کے رشتہ دار ہوں گے یہاں؟

جی ہاں، دو ہوں گے ہیں۔ ممبئی میں رہتے ہیں۔ پاکستان و ہندوستان کی ہیں۔

ویسے ہندوستان کے حالات اب کیسے ہیں؟ اس نے بے ساختہ پوچھا تھا، یہ سوال جو ہر پاکستانی

ہندوستانی مسلمانوں سے پوچھتا ہے۔

"جی ٹھیک ٹھاک ہیں اب تو" درزی نے کہا۔ "وہ جو پہلے پریشانی سی تھی سو تو اب دب دبا گئی۔

تو اب..." عورت نے کچھ گول مول سا سوال کیا تھا۔ "کچھ گڑبڑ نہیں آپ کی طرف؟"

بالکل نہیں۔ دونوں ہندوستانیوں نے سر ہلا دیا۔ عورت آندھرا کی آیا کا اندرونِ ملک آمد کا کارڈ بھر رہی تھی (کیونکہ آیا کو اردو یا انگریزی نہیں آتی تھی)، اور اس وقت اس کے پاسپورٹ سے نقل کر کے اس کا مشکل سا تیلگو نام لکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ وہ آندھرا کے کسی بالکل گمنام گاؤں میں پیدا ہوئی تھی اور یہ تازہ، نیا نکور پاسپورٹ اسے حیدرآباد (دکن) سے ملا تھا جہاں ہو سکتا ہے وہ خاص اسی مقصد کے لیے گئی ہو۔ اس کے سوال کے جواب میں "نہیں نہیں" میں سر ہلاتے ہوئے وہ مسکرائی تو اس کے سفید دانت سیاہ لبوں میں چمکے۔ عورت کو اس کی نظروں میں امید بھری التجا دکھائی دی گویا کہتی ہو، ہندوستان میں ہندو مسلم جھگڑا بالکل نہیں ہوتا، اے مسلمان عورت، تو میرا کارڈ صحیح صحیح بھر دے۔

دوبئی میں پتے کا خانہ بھروانے کے لیے اس نے سفید پلاسٹک کی جالی کے تھیلے سے بڑے بڑے رنگین پھولوں والے ریشمی رومال میں بہت احتیاط سے لپٹا ہوا ایک کاغذ نکالا۔ شیخ کا نام اور پوسٹ بکس نمبر لکھوانے کے بعد کاغذ تہہ کر کے اس نے دوبارہ اسی طرح احتیاط سے تھیلے میں واپس رکھ دیا۔

کیا اتنا کافی ہوگا؟ عورت نے کچھ تشویش سے پوچھا۔

جی ہاں، جی ہاں، بالکل کافی ہوگا۔ درزی نے فوراً کہا۔ وہ بڑی توجہ سے کارڈ بھروانے میں اپنی ہم وطن، ہم زبان تیلگو عورت کی مدد کر رہا تھا۔ چند گھنٹوں کے سفر میں ان دونوں میں جیسے کوئی بندھن بندھ گیا تھا۔ عورت نے سوچا، دوبئی اترنے پر درزی کمال ذمہ داری سے آیا کو خیریت سے شیخ کے حوالے کرے گا۔

وہ کون تھی؟ کیا شادی شدہ تھی؟ کیا اس کے بچے تھے؟ عورت یہ سب کچھ آندھرا کی آیا کی زبان نہ جاننے کے باعث اس سے نہ پوچھ سکی۔

وہ درزی سے باتیں کرنے لگی۔ توقع کے عین مطابق، درزی خوش حال تھا۔ جی ہاں، دوبئی میں تین رشتہ داروں کو کام پر لگا چکا تھا۔ بیوی بچے وہیں الہ آباد میں رہتے تھے، لیکن وہ خود ہر دو ایک سال بعد چکر لگا آتا تھا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس کا چھوٹا بھائی بی کام میں پڑھتا ہے؛ اب وہ بھی اگلے سال دوبئی آ کر اس کا ہاتھ بٹائے گا۔

لیکن، درزی نے تحمل سے کہا، بی اے، ایم اے کیا ہوتا ہے بیگم صاحبہ! لاکھوں پڑھے لکھے جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں۔ دو چار یہ اسے پاس کو تو — اس نے سکون سے کہا، خدا کے فضل و کرم سے میں خود اپنے پاس نوکری دے سکتا ہوں۔

ہمارا دوبئی کا درزی تعلیم کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا تھا۔

لیکن .. عورت نے چاہا کہ چھما چھپ کے چکر میں پڑتے ہوئے بات آگے بڑھائی تھی، تعلیم

Scanned with CamScanner

[illegible]

ورنہ ہی مسکرانے لگا۔

[illegible]

کیا شعر کہا ہے؟ ارشاد، ارشاد!

بھلا یوپی کا آدمی اور شعر نہ سننا چاہے!

عورت نے پاکستانی مزدور شاعر کا شعر سنایا۔

کاری گروں نے بابوؤں کو زیر کر لیا
محنت کی آگ کاغذی اسناد کھا گئی

[illegible]

لیے۔

[illegible]

پھر وہ عورت کو اپنے گھر کے قصے سنانے لگا۔

دیکھیے صاحب، [illegible]

[illegible] پھرتی ہیں۔

عورت غور سے ورثی کی بات سنتی رہی۔ [illegible]

[illegible]

ہوئی، تماشے طوفان سی ہولی، وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ تو وہ والی عورت نہ تھی، یہ دوسری طرح کی تلنگن والے دنوں میں گھبراہٹ محسوس کیے، کمائی کے لیے کس کے لیے کرتی؟ ماں باپ کے لیے؟ چھوٹے بھائی بہنوں کے لیے؟ بچوں کے لیے؟ دور دیسوں کو جاتی ہوئی، یوں لڑکی جیسی پیچھے کوئی کام رہتا ہو۔

عورت درزی سے یہ نہ پوچھ سکی تھی کہ اس کے پڑوسی ہندو تھے یا مسلمان۔ بعد میں اس نے سوچا کہ پوچھ لیتی تو اچھا ہوتا! اس طرح کچھ نظریاتی گتھیوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ تو ایک مسلمہ اصول تھا کہ مخلوط معاشروں میں ایک طبقے کی معاشی ترقی سے ذات اور مذہب کی کشمکش میں پیچ پڑتے ہیں۔ اگر درزی کے پڑوسی ہندو تھے تب درزی کے مکان کی دوسری منزل میں بڑی مسجد کا شدت سے مخالف بن سکتی تھی۔

ہندوستان، ہندوستان ... تقسیم سے سفر کی واپسی تک، ایک غیر مختتم تسلسل... یادیں... میرٹھ ... جلوس کا طویل سلسلہ ... مسلمان عید گاہ کی مسلی، سوئیں پڑی وردیوں پر خون کے دھبے، دروازے پر عید کے پیسے خریدے گئے نئے جوتوں کا ڈھیر۔ ایک ننھا سا، کلابتو کا جوتا ... کوڑے کے ڈھیر کے پاس پڑی ایک چھوٹی سی سفید کڑھی ہوئی ٹوپی

دو برس پہلے کراچی میں۔ رنچھوڑ لائن کی تنگ، پیچ دار گلیوں میں ملوہ پاڑے کے دائیں جانب، جہاں اس سینتالیس، اڑتالیس کا شاندار سیمنٹ ... بنی شفاف شیشے جڑی جنگلی بالکنی میں ہلکی دھوپ میں کھڑا ... تھا، چھ برس کا جلال ایک سہ منزلہ عمارت میں اپنے چھوٹے سے فلیٹ کے نیچے دروازے پر کچھ خوف زدہ سا کھڑا حیرت سے ٹکٹکی باندھے برابر کی گلی کی طرف دیکھ رہا ہے جہاں ایک متروکہ مکان کا تالا توڑا گیا ہے اور سامان لوٹا جا رہا ہے۔

گلی میں شور ہے۔ چھینا جھپٹی میں لوگوں کے بال بکھر گئے ہیں، دامنوں کے چاک ادھڑ گئے ہیں۔

منے، اندر آ جاؤ! بالکنی سے اس کی اماں پکارتی ہیں۔

یہ... یہ... جلال چھوٹی سی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے تتلا کر پوچھتا ہے: یہ کیا ہو رہا ہے؟

کچھ نہیں، سامان لوٹا جا رہا ہے۔ تم اندر آ جاؤ۔ اماں جلال کی بڑی بہن کو اسے اوپر لانے کے لیے بھیج کر باورچی خانے میں واپس چلی جاتی ہیں۔

لٹتے مکان کے سامان میں سے کسی ہندو بچے کی ایک چھوٹی سی گیند لڑھکتی ہوئی جلال کی گلی میں پہنچ جاتی ہے۔ ننھا جلال ڈرتے ڈرتے اسے اٹھاتا ہے۔ پھر جب اس کا اعتماد بحال ہوتا ہے تو وہ اسے مضبوطی سے تھام لیتا ہے۔ گھر میں آ کر وہ اماں کو گیند دکھاتا ہے۔

اماں، دیکھو! ہم نے بھی لوٹا!

مگر وہ پڑوسی ہندو تھے یا مسلمان، عورت نہ پوچھ پائی تھی۔ وہ مختلف ارادے کی تھی۔ ان دونوں سے درمیان گفتگو نہ ہو سکی تھی، وہ دونوں انگریزی بولتے تھے۔ محض [illegible] ہندو [illegible] سمجھ سکتی تھی۔ [illegible] کرنے سے [illegible] ہو۔ پوچھ سکتی تھی جس میں فرقہ وارانہ کا پہلو نکلتا ہو۔

تو کیا کسی قدر تکلف سے بیٹھے تھے؟ عورت دل میں سوچتی ہے۔ شاید تکلف سے نہیں، [illegible] سے [illegible] روہ میں ہماری قسمتیں، پر شانے سے شانہ جوڑ کر بیٹھے، پہاڑ کو سلامت لیے، ہوا میں اُڑے جاتے تین مسافر...

[illegible] عورت نے دونوں میں دونوں ہندوستانی مسافروں کو وداع کرنے کے بعد تیسوں قسمتوں پر بیٹھ [illegible]، [illegible] سے انگوٹھے اوپر نکالتے ہوئے، پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ سوچا تھا ___ اگر وہ پڑوسی مسلمان ہوتے تب؟ تب کیا بات ہوتی؟

[illegible] بات وہ معلوم [illegible]۔ [illegible] مسلمان [illegible] ہیں ٹھیک نہیں بیٹھ سکتے تھے [illegible] معلومات [illegible] کرنے سے [illegible] ایک طرف سے [illegible] جاسد پڑوسی، [illegible] ہندو تھے کہ مسلمان!

* * *

[illegible] درمیان گفتگو ہو رہی تھی زبان کے تحت [illegible] عجیب طرح کے اشارے کر کر کے کچھ پوچھنے لگا۔ [illegible] نہیں مانی [illegible] چہرہ [illegible] انتخابات کا مسئلہ لیکن معاملہ [illegible] ۱۹۴۳ [illegible] ہونے سے مستعفی کر دیا تھا

[illegible] سے آئے تھے [illegible] چلے۔ [illegible] کے پاس جا لیے تھا [illegible] کھلائے۔

[illegible] کہیں سے آئے ہیں وہ بولی تھی کہیں کا نام لایا [illegible] نہیں ہے

[illegible] اور بچوں پر، ریل گاڑیوں اور سواری [illegible] ہیں اور ایک دوسرے سے مختلف وعدل میں [illegible] روٹی ڈالنے کے لیے، اور [illegible] پیپ ریا [illegible] اور [illegible] بسوں اور ریل گاڑیوں [illegible] ایک دوسرے سے [illegible]

سفر کر رہے ہیں اور ایک دوسرے سے جدل و قتال میں مصروف ہیں۔

چناں چہ کلیم الدین گویا ہوا:

"اوہ! تو پھر... ایسا کیوں نہیں کیا جاتا... کہ... کہ سبھی، یہ ساری اشیا جن دکانوں میں سجی ہیں ان کو... کیا عام کر لوٹ لیا جائے اور یہ سب چیزیں برابر برابر تقسیم کر دی جائیں لوگوں میں۔ بجائے ایک دوسرے کو قتل کرنے کے، میرے خیال میں تو یہ زیادہ بہتر طریقہ ہوگا۔

یعنی کرۂ ارض پر مکمل طوائف الملوکی قائم کر دی جائے؟ علیم الدین نے استفسار کیا۔

نہیں نہیں، اس کا باقاعدہ نظام بنایا جائے۔ ایک تو یہ کہ زندگی سادگی سے گزاری جائے۔ اصل ضروریات کیا ہیں، ان کی برابر تقسیم کی جائے۔ مثلاً ایئر کنڈیشنر کیا یہ جائز انسانی ضرورت ہے؟

نہیں، مگر جب غیر ایئر کنڈیشنر والا ہجوم ایک طبقے کے کتوں کو بھی ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں آرام کرتا دیکھتا ہے تو وہ بھی یہی سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے جو امرا کو اور ان کے کتوں کو حاصل ہے۔

یہ تو صحیح ہے۔ طبقات بڑی گڑبڑ چیز ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں طبقات ہونے کے باعث سب سے زیادہ بدامنی اور خوں ریزی ہوئی ہے۔ تو طبقات ختم کر دیے جائیں!

ایسا ہوا تو تھا پیارے! سوویت یونین اور چین میں ایک اشتراکی معاشرہ قائم کیا گیا تو تھا! مگر یہ بیسویں صدی کا آخر ہے۔ دنیا نے سوشلزم کو مسترد کر دیا ہے۔

وہ تو اس لیے کہ آزادی نہیں تھی اور ضرورت سے زیادہ نوکر شاہی آ گئی تھی اس نظام میں

جی نہیں! اس لیے کہ اشتراکی ملکوں کے عوام اپنے اشتراکی قومی ملکیت کے کارخانوں میں بنے بھدے کیمروں اور ناقص کلائی کی گھڑیوں سے نفرت کرتے تھے۔ اس کے بجائے وہ خوب صورت اور اعلیٰ ترین جاپانی کیمرے اور گھڑیاں خریدنا چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ سوئس چاکلیٹ کھانا چاہتے تھے۔

آہ! صرف ان چیزوں کے لیے! سننے والے نے کہا۔

ہاں! کہنے والے نے بتایا اور چند ردی کاغذ ہوا میں اچھالے۔ وہ گیا اشتراکی نظام صرف ایک سوئس چاکلیٹ کے لیے!"

تو آدمی تو ایسا ہے!

ایسا ہے بھئی ایسا ہے!

علیم الدین رضوی اور کلیم الدین رضوی، ساکنان ناظم آباد نمبر چار، نے قوالی گائی اور دھمال ڈالا۔

***

برسوں پہلے کی بات ہے، کراچی میں ناگن چورنگی کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے قدم اچانک رک گئے۔ چورنگی پر ایک ادھیڑ عمر کا شخص کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں، گیروا لوٹا اور دوسرے میں کچھ

[illegible] پلٹنے والے [illegible] ہے۔ وہ [illegible]

ساہیوال اور [illegible] اور [illegible] پنجابی [illegible] چھوٹے گھروں میں [illegible] سے خواب کہاں کھو گئے؟

[illegible] پاکستان میں؟ جیسے جو ہماری آنکھوں کو [illegible] دھوپ میں [illegible] لوگ [illegible] سے [illegible] انسانی حقوق کی [illegible] کے انسانوں کا جائز حق ہے۔

[illegible] کا [illegible] شادی کی [illegible] شرکت [illegible] ہیں۔ اور [illegible] گھروں میں [illegible]

[illegible] ہماری آنکھوں سے [illegible] اور ثروت کے [illegible] عیاشی کے خواب۔ [illegible] ایک دوسرے [illegible] ایک دوسرے کی کھوپڑیاں پاش پاش کر رہے ہیں۔

[illegible] حقوق [illegible] انسان [illegible] ایک دوسرے کا [illegible] ہیں۔

[illegible] وہ یہ صورت حال برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

ہمیں [illegible] ہماری [illegible] چھوٹی سی دنیا۔ اس میں ایک پیڑ تھا اور ایک [illegible] پانی کی [illegible] اس میں کتابیں تھیں اور [illegible] ہماری [illegible] کی طرح آنکھوں [illegible]

مارتے پھر رہے تھے، وہ ہر دل کی صوتی لہروں سے سمجھتے تھے۔

ہمیں بھی تحریک کی بازیافت کی ضرورت ہے جو ہم سے چھین لی گئی ہے اور ہمارے ہاتھوں میں بندوقیں تھما دی گئی ہیں۔ اور اس قتل و غارت گری کو تقدس بخشنے کے لیے ہمارے شہروں کی شاہراہوں پر یا اللہ مدد اور یا رسول مدد کے سائن بورڈ آویزاں کر دیے گئے ہیں۔"

وہ یہاں تک کہہ پایا تھا کہ ہجوم سے ایک نعرہ اٹھا۔

غدار... غدار! مارو! نکالو اسے!

ہجوم اس پر جھپٹتے ہوئے ٹوٹ پڑا اور کندھے سے کندھے بڑھ کر تتر بتر ہو گیا۔

اب اس شخص نے پینترا بدل کر دوبارہ تقریر شروع کی۔ اس نے نعرہ لگایا

مہاجروں کے حقوق کے لیے ہم خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے!

ہجوم سرعت سے متفق ہو گیا اور تالیوں کا ایسا شور بلند ہوا کہ آس پاس کی عمارتیں لرز رہی تھیں۔

پھر اس نے لہجہ بدل کر کہا:

ہم سندھیوں کے حقوق کے لیے آخری سانس تک جنگ کریں گے۔

حیدر آباد اور سکھر اور نواب شاہ اور پورے سندھ سے نعروں کا ایسا شور اٹھا کہ دھرتی دھمکنے لگی۔

"مرسوں مرسوں سندھ نہ ڈیسوں!

وہ آدمی سندھیوں اور مہاجروں کا رہنما بن گیا۔

***

کراچی کے شہری

پہلے لوگوں نے ایک سنسنی محسوس کی۔

پھر وہ مزید قتلوں کا انتظار کرنے لگے۔

اس کے بعد مزید قتل ہوئے۔ یہ سب قتل متوقع تھے۔

کراچی میں لوگ دو تین برس سے ایک بڑے قتلِ عام کی توقع کر رہے ہیں — حالاں کہ بیچ میں لوگ اپنی توقع بھول جاتے ہیں۔

کبھی انھیں لگتا ہے کہ قتل کی خبروں کا اب ان پر اثر نہیں ہوتا۔ وہ کثیر تعداد قتل کی وارداتوں پر مذاق بنانے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے سے آج کا سکور پوچھتے ہیں۔

ان میں سے چند کہتے ہیں، قتل اور جرائم تو ہر شہر میں ہوتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

بڑے شہروں میں قتل اور جرائم زیادہ ہوتے ہیں
ہمارے ہاں بہت قتل اور جرائم ہوتے ہیں۔
کراچی کی آبادی بہت زیادہ بڑھ رہی ہے۔
اس میں تعجب کی مقام نہیں۔ [illegible] یہ لوگ ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں؟
ان سب باتوں کی [illegible] ہو جائے، اگر ہمیں سسٹم ٹھیک ہو جائے، تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

* * *

پیاز کے چھلکے

[illegible] ایک خبر شائع کی تھی اور یہ بات بڑی زور و شور سے کہی جاتی تھی کہ با اختیار قوتوں نے کراچی کے مسئلے کو حل کرنے کا ایک منصوبہ بنا لیا ہے۔ منصوبہ یہ بتایا جا رہا تھا کہ کراچی کا مسئلہ بہت پیچیدہ اور الجھا ہوا ہے، اور اسے حل کرنا صوبائی حکومت کے بس کی بات نہیں، اس لیے فیصلہ کیا جا رہا ہے کہ تھوڑے عرصے کے لیے کراچی کو وفاقی تحویل میں دے دیا جائے گا۔ اور ایسی صورت میں [illegible] کہا گیا تھا [illegible] بہت [illegible] جرم کا خطرہ تھا۔ اس منصوبے کا کیا ہوا؟ چاروں طرف [illegible] چلی گئی [illegible] کسی کو یاد ہے کہ اس منصوبے کی تکمیل کا مرحلہ کہاں ہے؟ جیسے بات [illegible] منصوبے کی پیاز کے چھلکے اتر رہے ہوں [illegible] منصوبہ [illegible] کچی ہی میں چھوڑ دیا گیا یا یہ محض افواہ تھی! ایسا کوئی منصوبہ بنایا ہی نہیں گیا تھا؟

کراچی جیسے شہر کی [illegible] نہیں جا سکتا [illegible] ہو سکتے ہیں۔ صحیح معلومات حاصل کرنے کا ان کے پاس کوئی [illegible] نہیں۔ مسائل کے حل کی حکمت عملی تجویز ہے۔ ایسے منصوبے صندوقوں میں بند [illegible] کی خصوصیت نہیں [illegible] سکتے ہیں کہ یا حتی [illegible] کی حکمت عملی درست ہوں، تو [illegible] پر بیٹھے گا، اور [illegible] شاید سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اس منصوبے [illegible] جب [illegible] میں جسکی تھی تو سننے والوں نے طوفان تک محسوس کیا تھا۔ وہ ایک [illegible] کھیلے جانے والے [illegible] کی ہو ہیں اور قبول کرنے کے [illegible] ہو گئے تھے۔ [illegible] نیا [illegible] ایک بات ہے، کراچی کی صورت حال سے [illegible] دوسری بات۔ [illegible] کا حصہ تھا [illegible] وہ [illegible] ہمیں محسوس [illegible] کا [illegible] کراچی کا حصہ ہے والوں

کے ذہنوں میں اتنا چاہنے والوں کے جتنا کوئی بھی نہیں چاہتا ہوگا؟ مگر کیا ہوش و حواس بنائے ہوئے کسی ایسے منصوبے کا حصہ شاید نہیں ہو سکتی جس کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔

کیا شہر کے لوگ اپنے حالات خود ٹھیک نہیں کر سکتے؟

لیکن اس کا جواب ایک اور حکمت عملی میں ہے: جو ۱۹۷۷ سے جاری و ساری اور سختی سے نافذ حکمت عملی جس کے ذریعے سے منظم طور پر عام لوگوں کو سیاسی عمل سے اور معاشرے کو کوئی بھی رخ دینے کی قوت سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔ دہشت ناک فوجی حکومت کے طویل، عذاب ناک برسوں نے لوگوں کو، بحیثیت ہوش مند شہری، معطل کر دیا ہے۔ ایک سطح پر، ان جانے میں، کسی مقام پر وہ اپنی صلاحیتوں سے دستبردار بھی ہو گئے ہیں۔ فوجی آمریت میں جلاوطن ہو جانے والے لوگوں نے پاکستان واپس آ کر ماتھا پیٹا، ہمدردی اسی خلوص کو دیکھ نہ سکی آنکھیں برسوں صرف وہی کی آرزو میں تکتی روش دیکھتے دیکھتے جو کھو چکی تھیں اور جو صوفوں پر، کرسیوں پر، چٹائیوں پر دراز بھی کہہ رہی تھی کہ کچھ کرو، کچھ ہو رہا ہے، کچھ کرو، بچے والے ہے، وہ بھی نتائج سے معذوریت کی حالت سے بے خبر تھی۔

***

معیشت

اس شہر میں، میں ابھی یوں ہی آ نکلی تھی میرے سے بعد،
اس کی زمیں، اس کے فلک، اس کی ہوا کو کیا ہوا؟
پہچان میں آتا نہیں پہچان بھی پاتا نہیں مجھ کو کوئی
بدلا ہوا سارا سماں
ہے روشنی اتنی مگر کچھ بھی نظر آتا نہیں
گھر تھے یہاں
رہتے تھے جن میں کچھ مکیں
اک پیڑ تھا اس جا گھنا
جھولا پڑا تھا ڈال پر
اک دوست رہتا تھا یہاں
کیوں مٹ گئے سارے نشاں؟
اب تو فقط ہر موڑ پر، ہر گام پر

بازار ہے، بازار ہے، بازار ہے

بازار میں ہر روز عید
سستی فروخت، فوری خرید
میلے دکاں داروں کے ہیں
کیا شور بیوپاروں کے ہیں
اشیا کا جوبن ہے عیاں
پکوان کے صحن میں، خوشبو لٹاتا ہو کر،
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
بازار کے اوپر تنا ہے آسمان نیلم جڑا
ابھری سمندر سے ہوا، نکلا ہے تارا شام کا
اور چاند ہے پیلا پڑا
بازار کے اندر مگر [illegible]، دیکھے ادھر
اب گرد کے تٹ تک چھا گیا، سانسوں کی حد تک آ گیا
جو ہر طرف بازار ہے
بازار ہے، بازار ہے

(۱۹۸۷ء [illegible] ایک نظم)

[illegible]

[illegible]

شہر (۱)

اب یہ جہاز لندن ہی جا کر رکے گا، عورت سوچتی ہے۔ ہاتھ بڑھا کر بتی بند کرتی ہے اور ہوائی میزبان کا دیا ہوا کمبل اوڑھ کر، دونوں نشستوں کے بیچ کے ہتھے اٹھا کر، ننھا سا تکیہ لگا کر آرام سے سونے کے لیے لیٹ جاتی ہے۔

بہت ہی دور رہ گیا کراچی۔ اس کے دماغ میں شہر کی تصویر گھومتی ہے۔

شہر جو بحیرۂ عرب کے کنارے بیٹھا ہے۔ نقشے میں دیکھیے تو اس کی شکل ایک مچھلی کی دُم کی طرح دکھائی دیتی ہے جس کا باقی حصہ پانی میں ڈوبی ہوئی ہو۔ اس مفروضہ دم کا شمالی حصہ لس بیلہ سے متصل کیرتھر پہاڑی سلسلے کے ساتھ ساتھ باریک ہوتا ہوا ختم ہوتا ہے جبکہ جنوبی حصہ سندھ کے میدانی علاقے میں گولائی میں پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح کراچی میدانی، زرخیز سندھ اور کوہستانی، سنگلاخ بلوچستان کے درمیان دھوپ میں لیٹا ہے؛ جنوب مغرب میں عرب ساگر کی نرم لہروں کی تھپکیوں میں مگن، سفید اجلے بادلوں بھرے ساحلی آسمان کے نیچے؛ نمکین، گیلی ہوا سے سدا ٹھنڈا اور کچھ چپ چپا۔ یہاں آپ کا پسینہ آسانی سے نہیں سوکھے گا، اور اگر آپ کے بال لمبے ہیں تو وہ اس کی گیلی ہوا کے پہلے ہی جھونکے میں گھنگھریالے ہو جائیں گے اور نمکین دھوپ تھوڑے ہی دنوں میں آپ کی جلد کی رنگت سنولا دے گی۔

یہاں کا پانی ہر ایک کو راس نہیں آتا۔ ۱۹۵۸ء میں ملک میں مارشل لا لگانے کے بعد جب فیلڈ مارشل ایوب خان یہاں آئے تو ان کا ہاضمہ مستقل طور پر خراب رہنے لگا۔ ملک کے دارالخلافے کو اس سمندری، گرم مرطوب علاقے سے (اور یہاں آ بسنے والے دبلے پتلے، سانولے، تیزی سے بڑھتے ہوئے بہت زیادہ بولنے والوں کے شور مچاتے جنگل سے) نکال کر دور شمال میں اپنے گاؤں ریحانہ کے پاس لے آنے میں فیلڈ مارشل ایوب خان کی بدہضمی کا بھی خاصا ہاتھ تھا۔

(یہ بات راقم الحروف کو ۱۹۶۲ یا ۶۳ میں ایوب خان کی اس وقت کی بہو صاحبزادی نے ان کے پرسکون گاؤں ریحانہ کی آبائی رہائش گاہ میں بتائی تھی۔ راقم کالج کی لڑکیوں کے ساتھ مری اور ایبٹ آباد کی سیر و سیاحت کو گئی تھی۔ ساتھ پڑھنے والی ایک لڑکی ایوب خان کی صاحبزادی کی دوست تھی۔)

بڑی طاقتوں کی میزوں پر دھرے نقشوں میں یہ عمان کی کھاڑی کے دہانے پر بیٹھا پانیوں کے پار عین سامنے ہرمز شہر مسقط کو تاکتا ہوا، تو ملاحظہ آسکتا ہے؛ گرم پانیوں کے دہانے پر، جہاں سے تیل کی دولت سے مالامال مشرق وسطیٰ کے وسائل تک رسائی سہل اور کم خرچ ہے اور خوشحال، پھلتے پھولتے بازار، زیادہ سے زیادہ چیزوں کی زیادہ سے زیادہ قیمت دینے کے اہل صارفین کی زیادہ سے زیادہ اور روزافزوں تعداد...

اردو میں گٹ پٹ بولنے اور بولتے ہی رہنے والے مہاجرین (جیسا کہ بہت سے دوسری زبان بولنے والوں کو شکایت ہے) ۱۹۴۷ء میں جس شہر میں پہنچے وہ ایک خوب صورت، صاف ستھری اور

مختصر بندرگاہ تھا، گو اس وقت بھی بڑی اہمیت میں وسیع المشرب تھا۔ یہاں ایران سے ہجرت کر کے سورت کی بندرگاہ پر اترنے اور پھر کراچی میں آ کر بس جانے والے پارسیوں اور مہاجنوں کی کالونیاں آباد تھیں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے محلے تھے، پرتگالی اثر سے گوا میں عیسائیت اختیار کرنے والے رومن کیتھولک گوا والوں کی بستیاں تھیں جن کے بنائے ہوئے چرچ جابجا ایستادہ ہیں۔ (پاکستان کا سب سے بڑا رومن کیتھولک چرچ کراچی میں ہے۔ اس کے برعکس، برطانوی راج کے زیر اثر عیسائی ہونے والے پروٹسٹنٹ، عموماً پنجابی خاکروبوں، کا چرچ کی تعمیر میں شامل رہے مگر اس کے ممبروں کی تعداد کراچی کے قدیم رومن کیتھولکوں سے کم ہے۔ سفید پوش روزگار کمانے والے ان کیتھولکوں کا ایک خوبصورت جملہ یہ ہے کہ کراچی کے رنگیلی اور برطانوی سفارت کار تہوار کے موقعے پر سنگی چرچ میں عبادت کرتے ہیں۔)

شہر کی پرانی گلیوں میں گھومتے ہوئے آپ کو پارسی مخیر حضرات کے ناموں کی لاگو کی تختیاں آج بھی کہیں نظر آ سکتی ہیں اور اسی وقت جو محمد علی نامی ایک عظیم سیاست دان کے نام سے منسوب ہو کر مشرف بہ اسلام کیے جانے پر، یا اردو سے جانے پر، جناح حقی سے لکھی گئی اور جناح ہی، مگر جیسے اس کو مسلم اپنی اصل میں گم کی، ذات نے دوسرے سے الگ ہو گئے۔ ایسا ہی اور آپ کہتے جناح گھومتے پھرتے! کیا آپ کو کبھی تعجب نہیں ہوتا کہ برصغیر میں جناح ذات کا کوئی دوسرا بندہ نظر کیوں نہیں؟

بیسویں صدی کے وسط میں برطانوی قبضے میں آنے کے بعد بھی اس شہر کا کثیر قومی اور کثیر تہذیبی مزاج برقرار رہا جس میں یہاں رہنے والی سندھی آبادی اور اس سے تعداد میں بہت کم مسلم آبادی (جو یوں بھی ہندوؤں، سندھ کے علاوہ دوسرے علاقوں، کچھ، گجرات یا سوراشٹر سے آئی ہوئی تھی) شامل تھی۔ اسی لیے یہ شہر صرف سندھ کے دوسرے شہروں ہی سے نہیں بلکہ اس پورے خطے سے قطعی مختلف نظر آتا تھا جسے اب مغربی پاکستان کہا جاتا تھا، اور اپنی اہمیت اور تہذیب میں بحیرۂ عرب کے اس کنارے بسے ساحلی شہروں، جیسے بمبئی، آبادیوں اور بستیوں سے زیادہ مماثل تھا۔

مگر ۱۹۴۳ سے آس پاس مذہبی فرقے کا شعور بڑھنے کے باعث (جیسا کہ پورے برصغیر میں، کہیں کم کہیں زیادہ، کہیں جلد اور کہیں بدیر، رفتہ رفتہ پارہ تھا) سندھ میں بھی مسلمان اپنی مذہبی حیثیت پر اصرار کرنا شروع کر رہے تھے۔ سندھ کے بمبئی سے علیحدہ ہونے کے بعد اس شہر میں ہندو رہائش اختیار کر رہے تھے۔ پارٹیشن کے قریب دنوں میں ایک میگاپولس بن جانے والے اس شہر کی آبادی ۱۹۴۳ کی مردم شماری کے مطابق چار لاکھ سوا تک پہنچ گئی تھی۔ ۱۹۵۱ میں یہ آبادی گیارہ لاکھ ہو چکی تھی۔ قدیم آبادی سے کئی گنا زیادہ تعداد میں یہاں آنے والے مہاجروں نے اس شہر کو پلک جھپکتے میں ایک مہاجر شہر بنا دیا تھا۔ ان میں بھاری تعداد اردو بولنے والوں کی تھی جو مہاجر کیمپوں سے نکل نکل کر شہر بھر میں پھیل رہے تھے: جن سے بن پڑا متروکہ مکانوں کے تالے توڑ کر ان پر قبضے کر رہے تھے، یا جھگیوں جھونپڑیوں میں رہ رہے تھے۔ پچاس کی دہائی تک کراچی میں آپ کو جابجا جھگیوں جھونپڑیوں سے

Scanned with CamScanner

پٹے میدان نظر آ سکتے تھے۔ ساٹھ کی دہائی تک یہ لوگ مکانوں، فلیٹوں میں منتقل ہو چکے تھے۔

دنیا بھر میں ہجرت کرنے والے گروہوں کی طرح، جو پرانے طور طریق، معاشرے اور عادات کی زنجیریں توڑ چکے ہوتے ہیں، یہ جمِ غفیر بھی اس سرزمین پر، یہاں کے قدیم بسنے والوں، پرانے طور طریق، عادات اور اقدار میں منجمد بندھے باسیوں سے کہیں بڑھ کر، بہتر سے بہتر روزگار اور زندگی کے وسائل حاصل کرنے کی جدوجہد میں جتا ہوا تھا۔ یہ لوگ بات بے بات پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے، ایک ایسے ملک کے باسی تھے جو نصف زمین پر اور نصف ان کے اپنے ذہن میں تھا۔

آنے والے برسوں میں اس نئے اپنائے ہوئے وطن کی طبعی حقیقت (مع اپنے باشندوں کے) ان کے تصوراتی وطن سے ٹکرانے والی ہے۔

فی الحال تو وہ مسلم لیگ میں ہیں، اور قائدِ ملت نواب زادہ لیاقت علی خان فضا میں مکا بلند کر رہے ہیں اور مہاجرین کے جمِ غفیر پاکستان زندہ باد کے پُرشور نعرے لگا رہے ہیں۔

آنے والے چند برسوں میں ہجرت کر کے آنے والے ہیولے جیسے انبوہ کے خط و خال نمودار ہونا شروع ہو جائیں گے، جیسے وقت کی ریگ پر تصویر کے نئے نقش اُبھرتے ہیں۔ ان میں یک رنگ کے بدلے افراد، گروہوں اور طبقوں کے نقوش قابلِ شناخت بننے لگیں گے۔ یہاں سے اردو کے دو بڑے اخبار "جنگ" اور "انجام" نکلیں گے۔ انگریزی کا اخبار "ڈان" جم جائے گا اور انگریزی مجلہ [illegible] نکلے گا۔ ہفت وار نمکدان اپنے فقرے اور کارٹونوں سمیت خودغرض سیاست دانوں کے پرخچے اڑائے گا۔ یہاں کا پریس مختلف آرا کا ترجمان ہوگا۔ اس شہر کے کسی کوچے میں ابراہیم جلیس پبلک سیفٹی ایکٹ کی مخالفت میں "پبلک سیفٹی ریزر" لکھیں گے اور حسن ناصر مزدوروں کو منظم کرنے کی تحریک کا آغاز کریں گے۔ اونچے تعلیمی اداروں میں ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن مضبوطی سے جڑیں پکڑے گی۔ یہاں مختلف سیاسی رجحانات ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے اور تصادم کا شور اُٹھے گا، جیسا کہ دنیا بھر کی سیاست میں ہوتا ہے۔ دور، شمالی ہندوستان کے ہرے بھرے میدانی علاقوں سے آئے ہوئے یہ لوگ اپنے چھوٹے چھوٹے صحنوں میں، گھروں میں اور گھروں کے باہر، مرغوب پیڑ اور ہریالی بوئیں گے اور دور دور تک خالی پڑے چٹیل، غیر آباد ریتیلے علاقوں میں کسی آنے والے زمانے کی ہریالی کا انتظام کریں گے۔

یہاں بنیں گے دھڑا دھڑ اسکول اور کالج۔ ہجرت کر کے آنے والی اس شہری آبادی کے سامنے آگے بڑھنے کا صرف ایک راستہ ہے — تعلیم۔ حتیٰ کہ گجرات میں جنما ایک مزدور، اے ایم قریشی، کراچی آ کر دولت کمانے کے لیے اسکول اور کالج ہی بنائے گا، جب کہ اس کا حیرت انگیز طور پر مماثل ہمزاد، حاجی مستان، بمبئی میں نام اور پیسہ کمانے کے لیے اسمگلنگ کرتا رہے گا — ہجرت کا ایک تحیر خیز شاخسانہ!

۱۹۵۸ میں ملک میں مارشل لا نافذ کرنے کے بعد ... مصنف جنرل ایوب خان دارالسلطنت کو کراچی سے ... منتقل ... کراچی کے باشندے کچھ زیادہ پسند نہ تھے۔ گنجان آبادیوں ... شور شرابوں اور مظاہروں ... ان سے ... حکومت پسند نہیں ... باتیں ... سمندر ہے۔ ... مشہور ہو گیا تھا ... مشہور ہے کہ ... سمندروں کے سکے ... آنے والے ... میں ... سمندر کا رخ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اگر ... جب ایوب خان ... ٹھیک ... ہوگی، تو کراچی کے باسی اس میں شامل نہ ہوں گے۔

مگر ... دور میں، جب کراچی ... صنعت کاری کا سلسلہ ... ملک کے شمال مغربی سرحدی علاقوں سے ... کی تلاش میں آنے والوں کا ... سلسلہ شروع ہو چکا ہے، ... انسانوں کے اس سمندر میں گر رہے ہیں۔

شہر ... میں ... کی ... کالی ... بچے ... روشنی ... سمندر ... جیسے ... پانی ... پیچھے ... سمندر ... نکل ... کی پشت پر ... نظر آتے ہوں۔

* * *

سکے کے پیٹ میں

... کراچی میں ... دور میں آئے ... کلرکوں اور ... فلیٹوں اور کوارٹروں میں رہتے تھے۔ ... گھنگھریالے بالوں والے ... شنیاق سے چھپتے تھے۔ وہ جوش و خروش سے ... مشرقی پاکستان کی ... ملک میں ... تمام حلقوں کی ... حیثیت ... تحریک کے دوران ... کا شعور ... تھا۔ ... ایک ...

حقیقت بھی تھی؛ سندھ کے باقی زرخیز میدانی علاقے سے منسلک، یہ جغرافیائی لحاظ سے سندھ ہی کا حصہ تھا۔ برطانوی راج میں سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے اسے سندھ کا دارالحکومت بنانے کے لیے سندھیوں نے منظم اور کامیاب تحریک چلائی تھی، مگر پاکستان بننے کے بعد سندھی آبادی کراچی میں گزر۔ کر پائی تھی۔ ون یونٹ کے نظام میں سرکاری ملازمتوں پر پاکستان بھر کے ملازم کھینچے جاتے رہے تھے۔

۱۹۷۲ میں، جب ایک نیا دور شروع ہوا تو سندھیوں کے داخلے کا بھی آغاز ہو رہا تھا، مگر یہاں آ کر وہ خود کو غیر سندھیوں کے سمندر میں پا رہے تھے۔ (ان کا سندھ کا تصور کراچی کی طبیعی حقیقت سے ٹکرا رہا تھا، وقت کے ہاتھ نے جس کو ماضی سے قطعی مختلف بنا دیا تھا۔) اسی لیے ان کو گھر نہیں، مگر ایک اٹل سا یقین تھا کہ کراچی سندھ کا حصہ ہے، کہ کراچی پر ان کا بھی حق ہے، اور اسی طرح کے چند ایک اور یقین...

اتفاق سے راقم الحروف کا انھیں دنوں اس طبقے میں کافی اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ان میں سے ایک ضلع کنڈیارو سے آیا تھا۔ اسے ایک پرائمری اسکول میں سندھی ٹیچر کی ملازمت ملی تھی، لیکن اس نے اپنے تئیں ہمیشہ ایک ادیب ہی تصور کیا تھا۔ وہ ہر وقت بغل میں پروگریسو پبلشرز کے ہاں سے سستی ملنے والی ٹالسٹائی، دستوئیفسکی یا گورکی کی کوئی کتاب دبائے گھومتا تھا اور، گو کہ وہ سندھی قوم پرست تھا جیسا کہ اس کی نسل کے فیشن کا تقاضا تھا، درحقیقت وہ خود کو روسی محسوس کرتا تھا اور روس جا کر رہنا چاہتا تھا۔ اپنے جیسے دوسرے کئی چھڑوں کے ساتھ وہ لیاقت آباد اور ناظم آباد کے درمیان سندھی کلرکوں سے آباد کسی سہ منزلہ گمنام سی عمارت میں رہتا تھا۔

ایک دفعہ میں نے ان لوگوں سے پوچھا تھا، بھئی، آپ لوگ گھر والوں کو کیوں نہیں بلا لیتے؟ باقاعدہ گھر بسا کر کیوں نہیں رہتے؟

اس پر انھوں نے معصوم اور بشاش قہقہہ لگایا تھا (جیسا کہ دیہات سے نئے نئے آنے والے سندھی کلرک لگاتے ہیں)، پھر ایک دوسرے کو چور نظروں سے تکتے ہوئے کہا تھا:

سائیں، ادھر کا بھروسا ہی کیا۔ کسی کل کو بھٹو کی حکومت چلی جائے تو ہم سب کان لپیٹے واپس گوٹھ جا رہے ہوں گے۔

(اور ہوا بھی یہی۔ بھٹو حکومت کے خلاف ۱۹۷۷ کی پی این اے کی تحریک کے دوران سندھی کلرکوں کے فلیٹ کے نیچے رات رات بھر ڈھول بجائے جانے لگے۔ وہ تین راتوں تک نعروں سے شہر کے خالی کر دینے کے اس صوتی مطالبے کی تاب سہی، پھر کان لپیٹ کر واپس گوٹھ چلے گئے۔)

یا پھر کراچی میں وڈیرے آتے تھے، ایک گورے یا سانولے اور چھدرے، ڈبل گھوڑا بوسکی کی لسلساتی شلواروں اور قمیصوں میں ملبوس، گلوں میں سونے کی زنجیریں ڈالے اور سونے کی انگوٹھیاں پہنے، وہ اپنے باورچیوں اور نوکروں اور مصاحبوں کی پلٹنوں سمیت کراچی میں وارد ہوتے تھے اور قیمتی کاروں میں دندناتے پھرتے تھے۔ وہ دھڑا دھڑ اشتیاق سے مہاجر عورتوں سے شادیاں کرتے اور معاشقے لڑاتے، دیکھ

Scanned with CamScanner

آوازوں میں شوخ مذاق اور قہقہے لگاتے، گفتگو کرتے ہوئے بڑی موٹی موٹی مرچیں پکوڑوں پر ڈال دیتے اور اپنا بدن سہلاتے رہتے۔ ان کے مصاحب اور نوکر بھی اپنے شاہ سائیں کی شاہی کے نشے میں مست تھے۔

پی پی پی کی تحریک کے دوران، جس کا رخ حیرت انگیز طور پر تیزی سے سندھی مخالف بن گیا تھا، میں نے چند مہاجر نوجوانوں سے سندھیوں کی مخالفت کا سبب پوچھا تھا۔ مختلف بینکوں، اداروں، اخباروں اور چھوٹی موٹی دکانوں میں کام کرنے والے، موٹر سائیکلوں پر پورے خاندان کو لے کر سیر کرنے والے ان محنتی، ہوشیار، متوسط طبقے کے نوجوانوں نے سندھیوں کا وہی حلیہ بتایا تھا جو اوپر وڈیروں کا کیا ہے۔ مہاجر متوسط طبقے کو وہ صرف سندھی نظر آتے تھے۔ سندھی وڈیرے نظر نہیں آتے تھے۔ یہ نوجوان کراچی میں پیدا ہوئے اور یہیں بڑے ہوئے تھے۔ انہیں بالکل علم نہ تھا کہ ان کے اپنے آبائی وطن کے جاگیردار اور زمیندار بھی بالکل ایسے ہی تھے اور انہیں عادت سے لگے تھے اور ان میں کس قدر رعونت ہوتی تھی۔

ان نوجوانوں نے سندھی کلرکوں اور ہیڈ کلرکوں اور خود کو روزی کے سبب گھسے ہوئے سرکاری اسکول کے ٹیچر کو بھی دیکھا تک نہ تھا، جو اگر چند برس ملازمت پاتے تو پیسے جمع کر کے اور دفتر یا بینک سے قرضہ لے کر موٹر سائیکل خرید سکتے تھے اور گوٹھ سے بچوں کو لا کر، پورے خاندان کو ایک موٹر سائیکل پر سوار کر کے، چھٹی کی شام کو کلفٹن پر ساحل سمندر کی سیر کرا سکتے تھے۔ وہ شہر کے تنگ و تاریک اور بے وسیلہ تھے۔ شہر کی بے گانگی اور خود اپنے زمیندار وڈیروں کی رعونت سے اس قدر دہشت زدہ ہوتے تھے — کہ ان کا خوش باش ہونا ممکن نہیں تھا، بالکل اسی طرح جیسے شوخ مذاق پر قہقہے لگاتے وڈیروں کا دور ہی سے دکھائی دینے والا لازمی حصہ جو سلطنت سندھ کے اس شہر کے اونچے طبقے اور مستحکم متوسط طبقے میں پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔

مگر حقیقت یہی ہے کہ اگر پہلے منتخب وزیر اعلیٰ اپنے علاقوں میں بس لاتے، رعونت مآب وڈیروں کی کچھ تبدیلی کرتے تو اپنی منتخب حکومت کے دور میں بظاہر سندھی قوم پرست مگر باطنی طور پر وہی وڈیرے، سندھی سرکاری ٹیچر کی موٹر سائیکل اور اس کے خاندان کی ساحل سمندر پر سیر کے امکانات موجود تھے۔ یہ شاید وڈیروں کا راستہ روکنے کا ارادہ بھی ترک کر دیتا۔

***

مگر ہوگا نہیں ایسا

تیرے وسیع دامنوں میں ہم کیوں رہیں — مہاجر قومی موومنٹ — اور تمام مہاجر، جیسا کہ تحریری اصطلاح ہے، خود وہ اس تحریک میں شامل ہو گئے، اتنی بھاری عددی قوت کے ساتھ کہ ایسا کبھی

نے آنکھوں دیکھا اور نہ کانوں سنا۔

لوگ کہتے، "ارے خالہ، ارے چچی جان، ارے دولہا بھائی، ایک جوش، ایسی وفاداری، ایسا جذبہ تو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا!

مارٹن کوارٹرز میں اور حیدری میں اور محمود آباد میں بڑے بوڑھے سفید کرتوں میں لپ لپاتے، جھکی کمریں سیدھی کرتے ہوئے کہتے، "بھئی واہ، کیا بات ہے! یہ اتحاد دیکھ کر تو قیامِ پاکستان سے پہلے کا منظر آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ ارے اپنے آگرہ میں، کانپور میں، بنارس میں مسلم لیگ کے جلسوں میں نظر آتا تھا یہ جوش اور ولولہ! یہ عزم یا تو تب دیکھا تھا یا اب دیکھ رہے ہیں۔"

***

"دیکھیے کہ مسلم لیگ نے اپنے مُردہ بطن سے بچہ جنا ہے!" چھکن بھائی نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اور چہل قدمی کرتے ہوئے کہا۔ چھکن بھائی امریکا سے چند ہفتوں کے لیے آئے ہوئے ہیں اور حیدری میں اپنی بڑی بہن کے گھر ٹھہرے۔ اس وقت رات کے کھانے کے بعد ہواخوری کر رہے ہیں۔ پیٹ پر ہاتھ کیوں پھیر رہے ہیں؟ بھئی یوں ہی، طمانیت کے اظہار کے لیے!

"دیکھو میاں، معاملہ تب بھی مائناریٹی کا تھا اور اب بھی وہی مسئلہ درپیش ہے۔" چھکن بھائی اپنے بھانجے اور بھانجی کو سمجھا رہے ہیں۔ "مائناریٹی پراونسز کے مسلمان پریشان تھے کہ ہندوستان میں ان کی حیثیت کیا ہوگی؛ سو وہ یک جان ہو کر پاکستان کے حصول کے لیے کوشاں ہو گئے۔ پاکستان بن گیا۔ اب یہاں آ کر وہ دوبارہ مائناریٹی ہو گئے۔ اس طرح تحریکِ پاکستان چلانے والوں، اس ریل گاڑی کو اصل ایندھن مہیا کرنے والوں کی اولاد ہے ایم کیو ایم بھائی۔ یہ لوگ اسی جوش و خروش سے اب ایم کیو ایم کے حامی بن چکے ہیں۔ دراصل یہ مسلم لیگ کا دوسرا جنم ہے۔

"اور نظریۂ پاکستان؟"

"تو پیارے بیٹے، نورِ نظر، لختِ جگر! گویا مفادات نظریے کی چھتر چھایا خود بنا لیتے ہیں۔ یعنی آپ یہ کایا کلپ دیکھیے، اور اس پر غور کیجیے، کہ روٹی کپڑے اور آسائشوں کی ضرورت اجتماعی بننے کے عمل میں کسی قلبِ ماہیت سے گزر کر ہر مادی نجاست سے پاک ہو کر مقدس، بلکہ الوہی بن جاتی ہے۔ آدمی اپنے روٹی کپڑے کے حصول کی لڑائی کو بہ آسانی اللہ کے نام اور حکم پر جہاد سمجھنے لگتا ہے۔

چھکن بھائی امریکا میں رہتے ہیں اور مفادات کہتے ہوئے ذرا بھی نہیں گھبراتے۔

"تو فرض کیجیے کہ مہاجر اپنی نعرے بازی کے برعکس، اسلام اور پاکستان کے الوہی تصور کی خاطر نہیں آئے تھے، روٹی پانی کے لیے آئے تھے، تب کیا فرق پڑتا ہے؟ کیونکہ، میگریشن تو ایک بڑی حقیقت ہے۔ اب دنیا بھر میں حقیقت پسند سماجی ماہرین اسے ایک ویلڈ (valid)، یک معقول وجہ

[illegible] ہیں [illegible]؟

چمن ساگر پہلے [illegible] آباد [illegible] میں [illegible] پڑھاتے تھے۔ [illegible] میں [illegible] چمن ساگر [illegible] کی [illegible] میں پڑھاتے ہیں۔ [illegible] کے پاس [illegible] ہیں۔ [illegible] سے لکھنوی [illegible] کے [illegible] ہیں۔

[illegible] چمن ساگر [illegible] ہیں، [illegible] ہیں کہ چمن [illegible]۔

[illegible] چمن ساگر [illegible] چمن ساگر [illegible] ہیں۔

[illegible] ۱۹۹۲ میں [illegible] ایک رپورٹ چھپی تھی — آپ [illegible] ہوں گا — [illegible] کوئی [illegible] صورت میں [illegible] کی طرف اور [illegible] کی طرف [illegible] صورت [illegible] نہیں جا سکتا۔ چمن ساگر [illegible] ہوں۔

چمن ساگر [illegible] ہیں کہ [illegible] گئے، چھا گئے، سب کچھ!

[illegible] چمن ساگر [illegible] ہیں۔ [illegible] بڑی تعداد میں، ایک ہی محلے میں [illegible]، مقامی لوگوں میں [illegible] تھا۔ اس میں حیرت کی یہ بات ہے؟ [illegible] تقسیم [illegible] ہندوستان کی [illegible] آبادی کا [illegible] میں نہیں ملتی۔ [illegible] نہیں تھا، اور [illegible] کی [illegible] نہیں ہوئی تھی، اور۔

[illegible]؟

[illegible] ہندوستان کی تقسیم [illegible] کیا

گئے ہیں، یہی تجسی کر دی۔ اور ماشاءاللہ پروفیسر کا مسئلہ جسے کہتے ہیں، وہ حل ہی نہیں ہوا۔ یعنی وہ وہیں ہیں جہاں تھے، بلکہ اور بھی پیچھے چلے گئے۔

اب یہ ہے کہ کو ایگزسٹنس، یعنی ساتھ ساتھ مل جل کر رہنا، نہایت اہم، حولیاتی ضرورت ہے، ملٹی ایتھنیسٹی، سیل ڈویلپمنٹ کے لیے لازمی۔ علاوہ ازیں، دنیا بھر کے چھوٹے سے چھوٹے کلچر کی وضاحت کی طرح پریزرویشن کی جا رہی ہے، یعنی ملٹی کلچرزم۔

جیسا کہ کہا ہے، مل جل کے رہو اور پیار کرو، یہ چیز بہت ضروری ہے،' شکیلہ نے کہا۔ چکن سائی کی یہ نوعمر ساتھی وی سی آر پر خوب انڈین فلمیں دیکھتی تھی اور اس وقت حیدری کی ایک دکان پر جگمگ کرتی چوڑیوں پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔

تو چکن ماموں آپ تو یہاں رہتے نہیں۔ آپ کے خیال میں ہونا کیا چاہیے؟

چکن بھائی مشورہ دیتے جانے پر خوش ہوئے۔ ان سے پوچھا جاتا تو وہ حیدرآباد سندھ میں سے کالج کی انتظامیہ کو کالج میں ایک بڑا نفسیاتی علوم کا مرکز قائم کرنے کا مشورہ دیتے۔ شہری نفسیات، دیہی نفسیات، کاروباری اور زرعی نفسیات — الغرض پندرہ سیمینار کرواتے سال میں۔ پھر وہ ... جاتے اور ان کا مزدوری ڈالر یابانہ کا نقصان ہوتا۔ خیر، پھر بھی انھوں نے کچھ سوچ کر مشورہ دیا۔

ہونا یہ چاہیے کہ سندھیوں کو یہ احساس دماغ سے نکال دینا چاہیے کہ مہاجر عام در اصل یہاں مہمان یا دوسرے درجے کے شہری بن کر رہیں گے۔ سندھ اب عملاً دو زبانی صوبہ ہے۔ سو اس بات کو مان کر چلا جائے، دشمنی کا ماحول ختم کر کے کوشش کی جائے کہ سندھ کی ترقی میں مہاجروں کو شامل کیا جائے۔ اور مہاجروں کو بھی یہ خناس دماغ سے نکال دینا چاہیے کہ کراچی کوئی ان کی ایسی جاگیر ہے جس میں دو سندھی داخل ہوں تو وہ واویلا مچانا شروع کر دیں۔ کراچی کو سندھیوں کے لیے ممنوعہ علاقہ بنانے کی خواہش کو الوداع کہنا چاہیے۔'

چکن سائی کا سانولا چہرہ ان کی عالمانہ باتیں سنتا رہا۔ پھر اس نے کہا:

مگر ہوگا نہیں ایسا!

پھر کیا ہوگا؟' چکن بھائی نے منہ بنا کر سوال کیا۔

میرے خیال میں... ان نے صرف ایک ہی سے پاس پاکستانی تجربہ کار جانے سے کہا، کہ پہلے ایک پر مار پڑی، اور دوسری کو حکومت دے دی گئی — برائے نام سہی، مگر مار سے محفوظ حیثیت۔ پہلی انتظار کرتی رہی کہ کب میری باری آئے۔ پھر پہلی کی باری آئی، اور دوسری پر مار پڑی، خاصی تگڑی مار۔ پہلی کو حکومت دے دی گئی — برائے نام سہی، مگر مار سے محفوظ حیثیت۔ تو آپ کے خیال میں اب دوسری کیا کر رہی ہے؟' اس نے چکن بھائی سے پوچھا۔

کیا کر رہی ہے! واویلا مچا رہی ہے، اور کیا؟"

وہ تو ہے مگر... بچے نے سوچتے ہوئے کہا، ساتھ ہی انتظار بھی کر رہی ہے۔ انتظار، کہ اب

میری باری دوبارہ کب آئے گی۔

چنگس سائی نے کہا۔ اس پر مجھے اس بلی کی کہانی یاد آرہی ہے جو دو چوہوں میں پنیر تقسیم کر رہی تھی۔

***

شہر (۲)

پیچھے رہ گیا رہی۔ دس منزلہ فلیٹ کی بلندی پر رہتے ہوئے آپ سوچتے ہیں، پیار کریں، اچھا کریں۔ آپ دل ہی دل میں شہر کے خلاف اپنے جذبات کھال سہلاتے ہیں۔ شہر محنت کشاں، جو اپنے مزاج میں سامنے پیار سے کہ سخت ترین مشکل میں بھی کسی موجی رن کے قصور بھنگ کا شہر نہیں معلوم ہوتا؛ جہاں مسئلہ ان بلا آتے ہوئے ہر بات کے لیے تیار رہتے ہیں کہ کہیں بھی گھر۔ اس شہر میں ان کے گریڈوں سے افسر شاہی کی سیڑھی پر ان کے خاص الخاص مقام سے کوئی مرعوب نہیں ہوگا؛ جہاں لوگوں نے اپنی دنیا میں آپ بسائی اور آباد کی ہیں۔ اور آپ یاد کرتے ہیں سینے میں فخر کا ہاں جب آپ کبھی رات کے دو بجے اپنے سر سے، گیدڑوں اور بیوروکریٹوں میں غرق ہو بیدو دارالسلطنت سے اداس، پہنچے ہوں اور اسے بیدار اور روشن پایا ہو۔

جب فرقہ وارانہ رنگ سے شہر میں کثیر تعداد میں قتل و غارت شروع ہوئے تو دو ایک روز ہی میں شہر میں ایک غیر مرئی حد فاصل کھنچ گئی۔ شہر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا — غریب اور امیر حصوں میں۔ یہ غریب حصے تھے جہاں فائرنگ ہو رہی تھی، سڑکوں پر چھراتی لاشیں گر رہی تھیں، گلیوں سے جنازے اٹھ رہے تھے۔
یہ خوش حال علاقے تھے — ڈیفنس سوسائٹی، گلشن — جہاں رونق میں کمی نہیں آئی تھی؛ اسی ویڈیو ریستورانوں میں بیٹھنے کی جگہ نہ تھی، موٹرگاڑیوں کو پارک کرنے کی جگہ نہ تھی؛ جہاں کلاشنکوفوں کا دھواں نہیں، چرغوں اور تکوں اور سکے ہوئے جھینگوں کی بھاپ کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔

جس رات ہم سٹی کے ایک گھر میں گیارہ سات قتل ہوئے (پولیس چوکی سے چند گز کے فاصلے پر، جب کہ پاس طارق روڈ کا بازار رمضان کی ان آخری راتوں میں پوری طرح بیدار تھا) اس کی خبر ہمیں گردونواح سے ملی پڑوس میں کسی — کسی پڑوسن، جب میں باجی، اس وقت گھر میں اکیلی تھیں؛ ان کے شوہر دو دن کے لیے دفتر کے کسی کام سے فیصل آباد گئے ہوئے تھے۔ وہ ٹیلی فون پر کسی سے باتیں کر

رہی تھیں۔ للی کے کان میں باتوں کے جو ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے پڑے ان سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ اسی واردات کے بارے میں بات کر رہی ہیں جو ان کے گھر سے صرف تین گلی پیچھے ہوئی تھی۔

فون رکھ کر صائمہ پلٹیں۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں عورتیں دہشت سے ٹھٹک گئیں۔

دروازے کی گھنٹی دوبارہ بجی، اس بار ذرا زور سے۔

"کون... کون ہے؟" گھروالی نے بلند آواز سے پوچھا۔

"میں ہوں جی پلمبر۔" ایک جانی پہچانی آواز آئی۔ محلے کا نلکے ٹھیک کرنے والا آیا تھا۔ صائمہ باجی کے باورچی خانے کا نل کئی دن سے رس رہا تھا۔ کل ہی تو انھوں نے رُکا بھیج کر کہلوایا تھا کہ وہ کسی وقت آ کر دیکھ لے۔ اور اب لالہ رخ کے ساتھ کھڑی وہ دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں، اس سوچ میں گم کہ دروازہ کھولیں یا نہ کھولیں۔ آخر انھوں نے پلمبر کو بلایا۔ وہ اسے نل دکھانے باورچی خانے میں لے گئیں۔

لالہ رخ گول کمرے کے وسط میں گم سم کھڑی رہی۔ جب صائمہ باورچی خانے سے نکلیں تو انھوں نے سوالیہ نظروں سے لالہ رخ کی طرف دیکھا۔

اس نے کہا، "باجی... آج آپ نے سنا؟ ہماری گلی کے پیچھے... کل رات یہ سب ہوا۔ یا اللہ! پورا روڈ چل رہا تھا۔ یہ کس وقت ہوا ہوگا؟ کسی کو خبر کیوں نہیں ہوئی؟"

صائمہ ساری کے پلو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی گول کمرے میں داخل ہوئیں۔

"کہتے ہیں گیارہ بجے وہ لوگ آئے تھے۔"

"تو یہ... یہ... کیا قصہ تھا؟" لالہ رخ نے انتہائی منتشر دماغ سے سوال کیا۔ "شیعہ سنی؟ یا... یا کچھ اور؟"

صائمہ باجی کا زرد پڑا ہوا چہرہ سرخ ہو گیا۔ انھوں نے چیخ کر کہا:

"کہاں ہو رہی ہے شیعہ سنی کی لڑائی؟ آپ جانتی ہیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے، کون لوگ یہ قتل کر رہے ہیں۔ جیسے جانتی نہیں..."

لالہ رخ ہونق بنی رہ گئی۔ یہ حملہ اس قدر غیر متوقع تھا کہ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ "آپ کا... میرا مطلب تھا باجی..." وہ ہکلائی۔ خاموشی سے صائمہ بیگم کے گھر سے نکل کر اپنے گھر آ گئی۔ گھر آ کر وہ گم سم اپنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی نند نے اسے اس حالت میں دیکھ کر پوچھا:

"کیا بات ہے بھابی؟ کہاں گئی تھیں؟"

"کہیں؟" اس نے چونک کر کہا۔ "کہیں، پڑوس میں، صائمہ باجی کے یہاں۔"

"تو کیا بات ہو گئی؟" نند نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" لالہ رخ بالکل گم سم تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ وہاں موجود نہیں ہے۔ ے

Scanned with CamScanner

اپنے چاروں طرف سناٹا پھیلتا محسوس ہو رہا تھا جس میں دور کسی جھینگر کی آواز، دور کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی غراہٹ اور پنکھے کی گھر گھر اچانک سن سی گئی تھی۔ بہت دیر تک وہ دم بخود بیٹھی رہی۔ پھر اس نے تاثر سے خالی آواز میں کہا:

صاحب جی... صاحب... کمپنی میں کوئی قتل... شاید میں سے ڈر گئے ہیں۔

پھر سے ... کے بعد ... وہ ... ہو گیا۔ صبح سے ان کے گھٹنے میں ہلکا ہلکا درد تھا جو اچانک شدت پکڑ گیا تھا۔ کچھ لنگڑاتی ہوئی وہ ... سونے کے کمرے میں آ کر پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ انھوں نے چاروں طرف نظر ڈالی: خالی دیواریں، ہوا کے جھونکے سے سرسراتا پردہ، فرش پر بچھا پرانے قالین کا ٹکڑا۔ کمرہ خالی تھا۔ جیسے ... کوئی نہیں ... دونوں ہاتھوں میں منہ دے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ وہ بہت دیر بیٹھی کہیں ... روتی رہیں۔ پھر انھوں نے ... کو فون کیا:

مجھ سے تنہا رہا نہیں جاتا۔ مجھے آ کر لے جاؤ۔

پھر بعد میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ دراصل قاتلوں کو ایک شیعہ کی تلاش تھی جو کہ مارا گیا۔ اس سے دو دن پہلے ایک شیعہ ... دوسرا خیال یہ تھا کہ قتل کا مقصد شہر میں وحشت پھیلانا تھا۔ تیسرا خیال یہ تھا کہ یہ دراصل ڈاکے کی واردات تھی۔

پھر ایک دھند ہر طرف چھا گئی

جوں جوں قتل کی وارداتوں میں اضافہ ہوتا ... وہ بے حس ہوتے جا رہے تھے — ایک اصطبل میں ... ان کے درمیان ایک ... اور وہ ... پھیر پھیر کر ... قتل کی وضاحت کر رہے تھے، اور انھیں ... کے پیروں تلے وہ سب کچلے جا رہے تھے ... بے موقع کی ... تھی۔

بات صرف ... تھی کہ وہ لوگ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے — شہر کے ... ایک ... کے دوران وہ حقیقت جاننے کی خواہش سے محروم ہو چکے تھے۔ وہ ... کا مطلب ... تھے اور ... نہیں جانتے تھے کہ کراچی میں دراصل ہو کیا رہا ہے۔

شہر ان ... میں تقسیم تھا جو ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ جتنی ہی ناگہانی ... خوف سے ... ہوئے ... — کسی سے ... کی اصطلاح ... کے ... بد ترین ... تھی، جو ... کی بنیاد پر ... دوسروں سے جوڑ سکتی تھی۔

سندھی سندھی سے، اردو بولنے والا اردو بولنے والے سے، پٹھان پٹھان سے اور پنجابی پنجابی سے جڑا ہوا...

نفرت اور انتقام کی آگ میں جلتا ہوا شہر...

ریاستی مشینری سچ بتانے سے قاصر رہا کرتی ہے: پی پی کی توڑ پھوڑ مہم میں علماء
جب مساجد کے اندر حوالداری شروع ہوئی تو سرکاری درباروں نے کہا: مسلمان ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ ہندو ہیں، بھارتی ایجنٹ!

کراچی کے گلی کوچوں میں لوگوں نے کہنا شروع کیا: مسلمان ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ ہندو ہیں۔ وہ سندھی پولیس جو اندرون سندھ سے درآمد کی گئی ہے، سب ہندو ہے! کیوں کہ تمام سندھی ہندو ہیں، بظاہر مسلمان بن گئے ہیں، راجہ داہر کی اولاد! ان کی نظر میں ہندو اس وقت تک ٹھیک طرح سے قابلِ نفرت نہیں ہو سکتا تھا جب تک وہ سندھی بھی نہ ہو۔

اس طرح پاکستان بنانے سے پاکستان میں بسنے تک کا ایک دائرہ مکمل ہوتا ہے۔

ریاست کی داغ بیل پڑنے کے ساتھ ہی جس سرکاری پالیسی کا زور شور سے اعلان اور پرچار کیا گیا، یوں تھی: مسلمان کے لیے مسلمان کو قتل کرنا بری بات ہے۔ دوسرے لفظوں میں: قتل کرنا بری بات نہیں، مسلمان کو قتل کرنا بری بات ہے۔

لوگوں نے ایک دوسرے کو کافر کہہ کر قتل کرنا شروع کر دیا۔

اور سندھی! مبادا آپ انہیں فرشتہ سمجھیں۔

کراچی سے متعدد سندھی اخبار نکلتے ہیں۔ ایک آدھ مستثنیٰ کو چھوڑ کر ان کا لہجہ اس مصیبت زدہ شہر کے لیے نفرت اور حقارت ہی کا ہوتا ہے۔ صوبائی خودمختاری کے لیے تحریک چلانے کے باعث سرکاری اداروں کے مطابق برسوں تک غیر محب وطن اور بھارتی ایجنٹ وغیرہ کہلائے جانے والے سندھی — ان کا پڑھا لکھا طبقہ، ان کے دانش ور — اقتدار اور سرکاری قبولیت کی پہلی جھلک دیکھتے ہی ایک قلبِ ماہیت سے گزرتے ہیں اور سرکاری زبان میں بات کرنے لگتے ہیں۔ وہ مہاجر صوبہ بنانے کا — ملک سے علیحدگی کا نہیں، صرف صوبہ بنانے کا — مطالبہ کرنے والوں کو حکومت کا، بلکہ ریاست کا باغی قرار دیتے ہیں، اور انہیں (کم از کم کئی ہزار نفوس کو) سرعام پھانسی پر لٹکانے کے جواز میں آئین سے شقیں نکال سکتے ہیں۔ وہ تمام مہاجروں کو صرف دہشت گرد کے نام سے یاد کر سکتے ہیں، اور گو انہوں نے ابھی تک مہاجروں کو ہندوؤں کی اولاد نہیں کہا ہے (انہیں اس کا موقع نہیں ملا ہے) لیکن طویل مدت سے دیے جانے والے سرکاری بیانات کو — کہ مہاجروں کی منتخب شدہ جماعت دراصل ہندوستانی خفیہ ادارے را کی ایجنٹ ہے — وہ بتدریج سنجیدگی سے زیادہ قدر و منزلت دینے لگے ہیں۔ سندھی اتنے طویل عرصے تک معتوب رہے ہیں، اپنے خلاف زہر آلود بیانات سنتے رہے ہیں، کہ شاید وہ اپنے اوپر تھوپی گئی

اس جہالت اور تاریکی کا جواب جہالت اور تاریکی ہی سے دینا چاہتے ہوں۔ اپنے وطن میں ستر الدر کی جیت انھوں نے کبھی دیکھی ہی نہیں ہے۔

* * *

کراچی اور جرمن

برٹولٹ بریشٹ جرمن تھے، اور اڈولف ہٹلر بھی۔ نازی پارٹی کے لاکھوں ارکان اور حامی بھی جرمن تھے، پاکستانی، حتیٰ کہ ہندوستانی تک نہیں تھے۔

برٹولٹ بریشٹ اگر پاکستانی، اور کراچی میں رہنے والے مہاجر ہوتے، تو یہی نظم یوں لکھتے:

پہلے، بہت پہلے، سب سے پہلے
وہ پٹھانوں کے لیے آئے
(یہ غدار ہیں، علیحدگی پسند ہیں،
پختونستان بنانا چاہتے ہیں، ہندوستانی ایجنٹ ہیں)
میں پٹھان نہیں تھا
میں چپ نہیں رہا، میں اس کورس میں شامل ہوا
اور میں نے گایا
مارو... پکڑو... جانے نہ پائے...

پھر وہ بنگالیوں کے لیے آئے
غدار، علیحدگی پسند، ہندوستانی ایجنٹ!
میں بنگالی نہیں تھا
میں چپ نہیں رہا، میں نے گایا
مارو، پکڑو، جانے نہ پائے،
نامنظور، نامنظور، بنگلہ دیش نامنظور

پھر وہ بلوچوں کے لیے آئے

Scanned with CamScanner

غدار... علیحدگی پسند... ہندوستانی ایجنٹ...
میں بلوچ نہیں تھا
میں چپ نہیں رہا، میں نے گایا
مارو... پکڑو... جانے نہ پائے...

پھر وہ سندھیوں کے لیے آئے
غدار... علیحدگی پسند... سندھودیشی... ہندوستانی ایجنٹ
میں سندھی تو خیر ہرگز نہیں تھا
میں چپ نہیں رہا میں نے زیادہ جوش و خروش سے سُر ملایا
مارو... پکڑو... جانے نہ دینا...

اب وہ میرے لیے آئے ہیں
غدار... علیحدگی پسند... ہندوستانی ایجنٹ۔
میں حالت حیران پریشان کھڑا ہوں
اور سن رہا ہوں ایک کورس
سندھیوں، بلوچوں، پٹھانوں، پنجابیوں کی آوازوں کا
کورس میں شامل ہونے والی تازہ تازہ، نو آموز، کمزور سی آوازیں
جنھیں ابھی ٹھیک سے غدار، ہندوستانی ایجنٹ کہنا بھی نہیں آیا
مگر پھر بھی وہ لوگ مشق کر رہے ہیں
دھڑکتے دلوں سے، امید بھری اُمنگ سے،
کہ ایک دن ان کی ادائیگی بے نقص ہو جائے گی

۱۹۹۶ تک، جب کہ مملکت خداداد اپنے استقرار کے انچاس برس پورے کر رہی ہے، ہر قوم کو باری باری غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دیا جا چکا ہے ـــــ ماسوا پنجابیوں کے۔
اب رہے پنجابی، تو اس قوم (قومیت؟) میں انفرادی طور پر تو ہندوستانی ایجنٹوں کی کمی نہیں؛ شاعر فیض احمد فیض، شاعر حبیب جالب، صحافی مظہر علی خاں، سیاست داں میاں افتخار الدین۔ یہ فہرست اتنی طویل تو یقیناً ہے کہ ان کی تعداد پاکستان میں بسنے والی کسی بھی قومیت کے انفرادی طور پر اعلان شدہ غداروں اور ہندوستانی ایجنٹوں سے بڑھ کر ہو گی، مگر ابھی تک پنجابیوں کو من حیث القوم غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار نہیں دیا گیا ہے۔ اب آگے چل کر دو ممکنہ صورتِ حالات ہو سکتی ہیں:

(۱) یقیناً تمام پاکستانی قومیتیں یک دل، سندھیوں کو کسی سیاسی تحریک کی بنیاد پر، یا کوئی دوسری خانہ ساز گڑبڑ کی بنا پر بیک قلم غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دے دیں گی۔

(۲) دوسری قومیتیں اسٹیبلشمنٹ پر اس حد تک قبضہ کر پائیں گی کہ سندھیوں کو غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دے سکیں، جیسا اسٹیبلشمنٹ نے پنجابی اور دیگر باری باری دوسروں کو (اور پھر دوسرے دوسروں کی مدد سے) غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دیتے رہیں گے۔

واضح رہے کہ مندرجہ بالا دو امکانی صورتوں کے علاوہ یہاں تیسری صورت حال پیدا نہیں ہو سکتی۔ یا اگر آپ ایک باقاعدہ شکست خوردہ حقیقت پرست ہوں تو اس بات کو یوں کہہ سکتے ہیں: کیا یہاں کوئی تیسری صورت حال پیدا نہیں ہو سکتی؟

اب رہا ہندوستان، تو ہندوستان تو بہت عرصہ سے راجو کا دیوانہ ہے، کہیں میں منہ چھپا چھپا کر، پیچھے پیچھے ہنستے ہوئے یونین کیبنٹ کی طرف رخ کیے پر ہوٹ راجو کا ورمی کے مارے آنکھوں سے بہتے پانی کو پونچھتے ہوئے کہہ رہا ہوگا:

ہے رے ہرے ہو چوہو! ٹک تو ہم سے ہو گئے ہو تم، میاں سالی اب دیکھو کیسی جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے ... بھی باری باری ہر قومیت ہماری ایجنٹ!! ہا ہا ہا! ق ق ق!

سالا بنیا... مکار ہندو! ہم پر ہنستا ہے سالا دال خور...

مگر ہندوستان ۱۹۹۵ میں ہنس نہیں رہا۔ شاید وہ کچھ خاص غور سے پاکستان کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا۔ وہ خود تیزی سے ہندو توا کا نعرہ لگاتے ہوئے مذہبی جنونی سیاست کی طرف رواں دواں ہے۔ یعنی یوں کہ وہ پاکستان سے مختلف ہے ہی نہیں۔ بالکل ہی جیسا تو ہے ہندوستان!

* * *

لہو کا سُراغ

سمندر کے ساحل کلفٹن پر وسٹ کی سوری پرانے شہر کے وسط میں پتلی چکنتی پٹڑیوں پر گھومتی جاتی چلتی گھسٹتی ٹرام، دوڑتی بھاگتی، دو گھوڑوں والی، اکّا رتھ کی شان سے پکی سڑک پر ٹپ ٹپ کرتی جاتی وکٹوریہ گاڑیوں کے علاوہ ہمیشہ کی رنگینی کی ولیمہ یادوں میں ایک ہلچل مچی رہتی تھی۔ اس رات کوئی نہیں سویا تھا۔

نعیمہ کراچی سے چند گھنٹوں کے فاصلے پر حیدرآباد سندھ میں رہتی تھی اور ان دنوں کراچی اپنی پھوپھی کے پیر الٰہی بخش کالونی کے تین تنگ کمروں، ایک دالان اور چھوٹے سے آنگن والے کوارٹر میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اس آنگن میں سلمانہ پھوپھی نے رات کی رانی اور چنبیلی کے جھاڑ لگائے تھے۔

پیر الٰہی بخش کالونی — جسے بعد میں سب صرف پی آئی بی کالونی کے نام سے جاننے لگے تھے — مہاجرین کی بستی کمیٹیوں کے لیے عجلت میں تعمیر کی جانے والی مختصر قاسی کالونیوں میں سے ایک تھی۔ دو رویہ کوارٹر، بیچ میں سڑک اور دکانیں جہاں دہی بڑوں کے پھیرے اور آگرہ کے سیو اور میرٹھ کی گزک ملتی تھی۔ اور دہی بڑے بھی۔

دہی بڑے، ایسے نہیں جیسے اب ملنے لگے ہیں۔ سلمانہ پھوپھی ۱۹۹۵ میں کہتی ہیں، یہ تو دہی پھلکیاں ہیں، بیسن کی، وہ بھی نگوڑی میٹھی۔ یہ ڈسکو والے انہیں کیا جانتے ہیں! سلمانہ پھوپھی جانتی ہیں کہ اصلی دہی بڑے کیسے بنتے ہیں۔ اُڑد کی دال کو رات بھر بھگوتے ہیں۔ دوسری صبح نرم پڑی دال کو سِل پر ہلکے ہاتھ سے پیستے ہیں کہ وہ بس ذرا دردری ہو جائے۔ پھر ملاتے ہیں اس میں توے پر سینک کر پسا مسالا وغیرہ، نمک اور سونٹھ، پسی ہوئی کالی مرچ۔ چاہو تو دو ایک ہری مرچ بھی ملا دو۔ پھر بڑے بنا کر بھی ان کو بھاپ دیتے ہیں تاکہ نیم پخت ہو جائے۔ شامی کباب کی طرح دہی بڑے بناتے ہیں۔ پھلکیاں نہیں، تمہارے ڈسکو جیسی۔ بڑے تو چپٹے ہوتے ہیں، چپٹے اور گول۔

اور تم بڑوں کو تل کر بغیر دہی کے یوں بھی کھلا سکتی ہو۔ وہ اپنی بیٹی نشاط بانو سے کہتی ہیں جو لب صحن باریک دوپٹے گوٹے کی چٹکی بنا رہی تھیں۔ ان کی پتلی پتلی انگلیوں میں گوٹے کا فیتہ آن کی آن میں ایک خوب صورت، آرائشی، نفیس اور گراں قدر تر (value added) شے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ چٹکی، کلی اور کرن پیر الٰہی بخش کالونی کی دکانوں میں فروخت ہوں گی۔

سلمانہ پھوپھی بیوہ ہیں۔ وہ آگرے سے پی آئی بی کالونی کیوں کر پہنچیں، یہ ایک دوسری داستان ہے۔ مگر عبدالقادر ہمدانی کے موجودہ تصور کے برعکس — کہ ہندوستان سے پناہ گیر، جو اب اپنے آپ کو مہاجر کہنے پر مصر ہیں، لیں یوں ہی، سندھ پر قبضہ کرنے کے لیے آگئے تھے — حقیقت یہ ہے کہ اقلیتی صوبوں میں مسلمان بھاری تعداد میں مارے بھی گئے تھے۔ سلمانہ پھوپھی اسی لیے پی آئی بی کالونی میں بیوہ پہنچی تھیں: اپنی اور اپنے بچوں کی خیر مناتی، ایک کٹی ہوئی ٹرین سے مہاجر کیمپ تک۔ جس نے کراچی پہنچ کر دھاڑوں روتے ہوئے باقاعدہ زمین کو بوسہ دیا تھا اور کہا تھا: پ... ا... ک... س... ت... ا... ن۔

سن سینتالیس میں، شادی شدہ زندگی کے دس برس گزرنے کے بعد، یہاں پہنچیں سلمانہ پھوپھی شادی سے پہلے آگرہ سے ایف اے پاس کر چکی تھیں۔ جب وہ پی آئی بی کے اسکول میں پڑھانے لگیں اور اپنے بچوں نشاط، مسرت اور محسن کی پرورش کرنے لگیں۔ (اور بڑے ہو کر یہ سب ہم کیوں ... — صاحب

Scanned with CamScanner

فوجی ہوسٹنٹ ـــــ میں بھرتی ہو جائیں گے!!

ان چہل پہل بھری رات تھا۔ پھوپھی کے گھر میں ان کے مہمان آئے چھوٹے بھائی، نعیم کے باپ، کے سوا کوئی مرد نہیں ہے۔

یہ ۱۹۶۵ ہے۔ جنرل ایوب خان اور قائد اعظم کی بہن فاطمہ جناح انتخابی حریف ہیں۔ اس کانٹے کے مقابلے میں کراچی کے باسیوں نے مہاجروں کی اس پہلی نسل نے جو کراچی کی زمین پر چھا گئی ہے فوجی جنرل پر جناح کی بہن کو ترجیح دی ہے۔ کراچی شہر نے جنرل ایوب خان کی ایجاد کردہ بنیادی جمہوریت کے اعانت دو ظالم تمک میں عداوت کی راہ نکالتے ہوئے فاطمہ جناح کو ووٹ دیا ہے۔

ایوب خان بہرحال جیت گئے ہیں (فوجی جنرل ہار نہیں سکتے!) اور اب ان کے صاحبزادے گوہر ایوب کراچی والوں سے اس گستاخی کا انتقام لینے آئے ہیں۔ ایک جلوس نکلنے والا ہے جس میں ان جھنڈے جیپ کی سے ہونے والے، پستول، دستے پہنے ہوئے، اور ... کے نہایت گرم جملوں سے ہار ہونے والے سرکشوں کو سبق سکھایا جائے گا۔

پی آئی بی کالونی میں رات کو حملے کا اندیشہ تھا۔ سب لوگ جاگ رہے تھے۔ محلے کے نوجوان گلیوں میں پہرہ دے رہے تھے۔ وہ بجلی کے کھمبوں کے ساتھ کھڑے تھے اور راہ میں آ جانے والی کسی بھی چیز (لکڑی کے ٹکڑے، پتھر، چمچے، کفگیر) سے کھمبے کو بجا کر ایک دوسرے کو بیدار رہنے کا پیغام دے رہے تھے۔

آوازوں سے نعیم کی آنکھ کھل گئی۔ وہ آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس چھ سات سال کا لڑکا۔ وہ دوڑتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ سامنے پھوپھی کے گھر کے سامنے والے کھمبے کے ساتھ سراج کھڑا تھا۔

او ہو منے، تم اندر جاؤ! سراج نے کہا۔

سراج بھائی، میں بھی کھمبا بجاؤں گا۔

سراج ان کے چچا کے بیٹے کا لڑکا تھا۔ وہ کوئٹہ چھوڑ کر ان کا گھر تھا۔ سامنے پھوپھی اور ان خاندان کا ایک دوسرے کے گھر روز روز کا آنا جانا تھا۔ سراج نے نعیم کو ایک چھوٹا سا بی پی کا چاکلیٹ دے کر گھر میں واپس بھیج دیا تھا۔

لوٹتے ہوئے نعیم نے کھڑکی میں شادی کی چھوٹی بہن مسرت کے دھانی دوپٹے کی جھلک دیکھی تو مسرت آپا کھڑکی میں کھڑی تھیں۔ کیوں؟ اس نے سوچا تھا۔ شاید وہ بھی کھمبا بجانا چاہتی ہوں۔

اس رات پی آئی بی کالونی پر حملہ نہیں ہوا۔ مگر شہر کی زیادہ غریب آبادیوں، جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والے مہاجروں پر حملہ ہوتا رہا تھا۔ مارنے والے مقامی نہ تھے؛ وہ ملک کے شمال مغربی سرحدی علاقوں سے خاص طور پر لائے گئے جنگجو نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان وارداتوں نے شہر کے غریب اردو بولنے والے علاقوں میں شدید خوف پھیلا دیا تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں ان کا ذکر شاید نہ ملے، مگر اس ملک کی اصل تاریخ ایسی لاوارث نظموں میں رقم ہے۔ رقم کرنے والے شاعر فیض احمد فیض نے ان ہی کے بارے میں لکھا تھا:

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ

قاتلوں کو کبھی پکڑا نہیں گیا تھا، نہ کسی پر فردِ جرم عائد کی گئی تھی۔

نہ مدعی نہ شہادت، حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

سلمہ پھوپھی کا خاندان، شاہدہ باجی، مسرت باجو اور حسن، عصمت چغتائی کی کسی کہانی (مثلاً چوتھی کا جوڑا) سے سیدھا نکل کر آیا ہوا معلوم ہو سکتا ہے۔ شاہدہ باجی اسی طرح سر جھکائے بیٹھی سیتی ہیں۔ مسرت دریچے میں کھڑی، تاکتی رہتی ہے، گلی میں چوڑی کھنکتی ہے (جو حسن نے اسے ہم آغوش کرتے ہوئے چٹکی دے گا) وہ مسرت سے شادی نہیں کرے گا بلکہ اور میلادی ... کی نگاہیں سے ملک میں سماجی حیثیت بنانے کی خاطر اونچے خاندانوں پر لگی ہیں (جو ... راہِ ترقی کے پر!) جلد ہی یہ پی آئی بی کالونی سے کہیں اور منتقل ہو جائیں گے۔ (ہاؤسنگ سوسائٹی یا کسی محلے کی تعمیر کے رہو کے لیے دیکھیے ہاؤسنگ سوسائٹی ... نہیں ...) چند برسوں میں سی ایس پی کا امتحان دے کر ڈپٹی کمشنر تعینات ہو جائے گا، اور ایک بلندی کی جانب حرکت کرتی ہوئی (upwardly mobile) تازہ و توانا کلاس کا حصہ بن جائے گا۔

مگر چونکہ کراچی کی پی آئی بی کالونی یوپی کا کوئی قدیم ادبی روایتوں کی جگہوں میں بسا ہوا شہر نہیں ہے (اور یہ عصمت چغتائی کی کہانی نہیں ہے)، اس لیے شاہدہ باجو اور مسرت باجو کی شادیاں جلد یا بدیر ہو جاتی ہیں۔ شاہدہ کی شادی لڑکان سے ہوئی جو کسی چھوٹی سی فرم میں کلرک ہے (اس ... کے پاس بی اے کی تین ڈگریاں تھیں: اردو، اسلامیات اور تاریخ)۔ مسرت نے بی اے کر کے اسکول میں ملازمت کر لی اور گھر کا خرچ چلانے میں ماں کی مدد کرنے لگی۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے زمانے میں سفید پوشی کا بھرم رکھنا اور بچوں کی تعلیم کا خرچ برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔ سلمہ پھوپھی صبح کے وقت مقامی اسکول میں پڑھاتی تھیں اور دوپہر کے بعد جہانگیر روڈ پر ٹیوشن سنٹر میں پڑھانے جاتی ہیں۔ حسن اسکول

[illegible] دیکھا تھا۔

[illegible] ایک ذرہ بھی نہ رکھا گیا ہوگا۔

[illegible] میں چوٹ آئی تھی۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] تین گول مٹول بچوں کی خوش و خرم ماں۔

[illegible] قومی موومنٹ ___ کو دے دی [illegible]۔

* * *

۱۹۶۵ میں سرمد — جو ایک رات پی آئی بی کالونی میں کھڑا بجلی کا کھمبا ہو کر شمال مغربی سرحدی صوبے سے لائے گئے جشنِ فتح منانے والوں کے حملے سے اس مہاجر بستی کے بچاؤ کے لیے پہرہ دے رہا ہے اور دور بیٹھے ہیں گہری مسرت سے معانقہ کر رہا ہے، اور جو مسرت سے شادی نہیں کرے گا اور سی ایس پی افسر بن کر آنے والے برسوں میں ڈپٹی کمشنر تعینات ہوگا — اس وقت یہ بالکل نہیں جانتا کہ جنرل ایوب کی مخالفت کرنے والوں میں صرف کراچی کے اردو بولنے والے ہی نہیں؛ اس سے بہت دور، اندرونِ سندھ میں، شہدادکوٹ کے پاس ایک گمنام گاؤں میں، رہنے والا اللہ ورایو بھی ان میں شامل ہے۔

اللہ ورایو ایک اسکول ٹیچر کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا باپ صاحب ڈنو حیدرآباد کے نور محمد ہائی اسکول میں سندھی پڑھاتا تھا۔ وہ عمر بھر حیدرآباد میں رہا اور صرف کبھی کبھی اسکول کی سالانہ تعطیلات میں گاؤں آتا تھا۔ یہ خبریں گاؤں تک اڑتی اڑتی پہنچی تھیں کہ حیدرآباد میں صاحب ڈنو نے ایک ہندوستانی [illegible] کر لی ہے، لیکن اس سے صاحب ڈنو کی کوئی اولاد بہرحال نہ تھی۔

اللہ ورایو کی ماں کبھی حیدرآباد نہ گئی؛ کچے مکان میں چھالیہ کترتی، چکی پیستی، دودھ بلوتی شاہ بی بی سر پر کپڑے کی ایک دھجی کس کر باندھے سر اور نظریں جھکائے زندگی گزارتی رہی اور مٹی کے چولھے پر چاول کی سرخ روٹیاں سینک کر اللہ ورایو کو کھلاتی رہی۔

لیکن ۱۹۶۵ میں صاحب ڈنو ریٹائر ہو کر گاؤں آ پڑا ہے۔ سرطان اس کی آنتیں کھا رہا ہے۔ وہ چارپائی سے لگا پڑا شور مچاتا، پوتے سے کھیلتا ہے اور اللہ ورایو کو گالیاں دیتا ہے۔ (سترہ برس کی عمر میں اللہ ورایو کی شادی کر دی گئی تھی۔ آنے والے برسوں میں وہ چار بچے اور پیدا کرے گا۔ اللہ ورایو کو کبھی ملازمت نہیں ملے گی۔)

صاحب ڈنو جنرل ایوب خان کے حق میں ہے۔ وہ کہتا ہے، "اٹھے بیٹی یا توان ہاریوں [محروموں] کی کسی نے خبر لی ہے۔ بڑے صد کی مار، یہ تو ایک ڈنڈی دی ہے، آیا اور سب کچھ کھا گیا۔"

لیکن باپ کی ڈانٹ سے بے پروا، اللہ ورایو جنرل ایوب کی مخالف فاطمہ جناح کے انتخابی نشان لالٹین کے پوسٹر گاؤں بھر میں لگاتا پھر رہا ہے۔ کیوں بھلا؟ یہی اس کی پارٹی کی مرضی ہے، جی ہاں، آپ کی جانی پہچانی، ہمیشہ معتوب (ہمیشہ زیرِ زمین) کمیونسٹ پارٹی کی۔

چار کتابیں سندھی، دس بارہ اردو اور ایک دو انگریزی کی پڑھ کر اللہ ورایو انقلابی ہو گئے ہیں۔ گاؤں کے اجتماعات میں وہ سندھی مشعل اور انقلابی حیدر بخش جتوئی کے اشعار اور سندھ کے حق میں تقریریں کرتا ہے اور گاؤں جلسوں میں وہ پکی گونج دار، سریلی آواز میں سندھ کا مقبول گیت "سندھی بولی قومی بولی" گاتا ہے مگر قومی سوال کو لینن کے اس موضوع پر مضمون، جمہوریت، آمریت، قومی زبان اردو اور سامراج وغیرہ کے تانے بانے میں کہیں گندھا ہوا دیکھتا ہے۔

آنے والے برسوں میں بغاوت بھڑکانے کے معمولی سے جرم پر گرفتار ہو کر اور کمیونسٹ کا ٹھپہ

ملک چھوڑنے کے بعد شہناز یونس کی قسمت پر مہر لگ جائے گی؛ اسے کہیں نوکری نہیں مل سکے گی۔

برسوں بچوں کو فاقوں سے بلکتے دیکھتے رہے پر، دھیرے دھیرے انقلابی سے صرف ایک بے روزگار شخص میں تبدیل ہوتے گئے اور اس کی خودکشی کی خبر سننے پر شہناز یونس نے شہداد کوٹ کے ایک کچے مکان میں گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرلی تھی۔

یہ شخص حیدرآباد اور کراچی کی تو پارٹی کے لوگ گنتی میں آ گئے۔ اکیلے؟ کیا وہ اس کی بے روزگاری اور بدحالی کی انتہا سے بے خبر تھے؟ — مگر وہ خود بھی مشکل گزار رہے تھے۔ بس وہ بھی گنتی میں آ گئے، جیسے کہ اور کچھ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ بعد میں لوگوں نے کچھ رقم جمع کر کے شہناز یونس کی بیوہ اور بچوں کو بھجوائی جو ان تک نہیں پہنچی۔ شہناز یونس کی بیوہ اپنے بچوں سمیت کسی گاؤں میں کہیں جا چکی تھی۔ اس کے گھر والوں نے بعد میں اسے کوئی تلاش نہ کر سکا۔

شہداد کوٹ میں کہیں دفن ہے شہناز یونس — سندھی مٹی سے گندھا ہوا سندھ کی مٹی کے حوالے۔

شہناز یونس جو کسی گنتی میں نہیں آیا: ایک سندھی نوجوان، پتلے لب، ایک گیت اور آنکھوں میں ایک خواب لیے! ایک بے روزگار سندھی جو زمانے کے دھکے کھاتے راستے میں ختم ہو گیا — اس کا ذکر اس داستان میں کیوں کیا جا رہا ہے؟

یہ ذکر تو بس یوں ہی کیا جا رہا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی تھا۔ وقت کے ان برسوں پر محیط دور ہے جس میں سندھیوں کے صدیوں میں نظر آتا ہے، کہانیوں کی لہریں اٹھتی ہیں، شہناز یونس زمین کا وہ مٹی اور پانی سے بنا ہوا، آس پاس کی فضا سے رنگ و بو حاصل کرنے والے پودے کی مانند تھا اور کسی ڈھیٹ گمشدہ بے پروائی سے جاری ہے۔ ختم ہونے کی حیثیت میں آ کر بے روزگار ہمیشہ کے لیے محروم ہو کر دنیا اور خاک میں مل گیا۔ سندھ کی مٹی، اپنے گیت اور اپنے خواب سمیت، سپرد خاک!

[illegible] شہادت [illegible]

[illegible] شجیاں [illegible]

٭٭٭

شاعر اور تاریخ

کراچی میں ابو کھیت اور گولی مار کی بستیوں میں لسانی فسادات (اُن دنوں اس وقت صرف قومیت ہی یا کہلاتے تھے) کے قتلِ عام پر جب فیض صاحب نے جو نظم لکھی تھی اس میں اس کے بارے میں یہ مصرعے بھی تھے:

نہ رزم گاہ میں برسا کہ معتبر ہوتا
کسی علم پہ رقم ہو کے مشتہر ہوتا

اس وقت ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ آنے والے برسوں میں یہ لہو ایک پرچم ـــ ایک کمیونٹی کے پرچم ـــ پر رقم ہو گا۔

شاعر تاریخ کو مستقبل میں غیر متوقع موڑ کھاتے سفر میں نہیں دیکھتا۔ وہ تو دل کے ایک لمحے میں آنسو بہاتے ہوئے، کرب کے عالم میں شعر جوڑتا ہے۔

مؤرخ وہ گھیرے پر پولیس کی طرح ٹنگ پر نظر رکھ دیتا ہے۔

شاعر تاریخ کے متوازی ایک لکیر کھینچتا ہے، متبادل مقامات کی تعمیر۔

وقت کے بے شعور، اندھے، ریلے میں شاعر اکیلا ہے۔ شاعر تاریخ نہیں، وہ بے شعور ہے وہ مستبد ار نہیں ہو سکتا۔ شاید اسی لیے وہ تاریخ کے پیچھے بے مصرف نہیں ہو سکتا۔

* * *

آؤ بھاگ چلیں

جہانگیر روڈ پر نیو ٹاؤن سنٹر کے پاس یوسف کی پان شاپ پر کھڑی، رنگین آنچل لہراتی اور خوشبو میں نہائی سندھی لڑکیوں کو چھیڑتے دیکھ کر سلمان چوہدری سے ڈانٹتی ہیں۔

ارے یہ خوش بخت! کیوں خاندان کے نام میں بٹا لگا رہے!

کان دبائے ہنس کر بھاگتے یوسف کے بیٹے کو سلمان چوہدری آگے سے جا لیتی ہیں۔ کسی ماں کا اکیلا، اس لیے لاڈلا، سادہ یوسف جھونپڑیوں کی دنیا میں آوارہ ہو گیا ہے۔ یوسف کی ماں کہا کرتی تھیں: نگوڑے کو فلم اور ان میں جانے کا شوق چرایا ہے آگے سے ایک پشاور جانے کا جلوہ نوجوں جو تماشو برو، پر کشش، تیر طرار اور مسجد سے لے کر جہانگیر روڈ کی کوئی گلی عشق ان سے چھوٹی

[illegible]

[illegible] بڑی بڑی بھوری آنکھیں۔ کبھی کبھی [illegible]

[illegible] کاپی میں رکھ دیا [illegible]

اے مردود! لڑکی بھگا رہا ہے!

یوسف کے [illegible] کے پیٹ میں منہ گھسیڑ کر ہنستا رہا۔

[illegible]

[illegible] بتایا۔

[illegible] کو بھاگ کہتی اور لکھتی ہے۔

یوسف [illegible] مسکراہٹ ضبط کرنے کی کوشش [illegible] کے بعد انھوں نے کہا:

ارے بیٹے! اردو نہیں آتی انصاری کو!

[illegible] چھوٹی سی [illegible] یوسف کی زندگی میں سیاست کا [illegible] نہ تھا۔

Scanned with CamScanner

اس کی ماں کی آرزو تھی کہ وہ ڈاکٹر بنے، مگر یوسف نے پڑھنا ترک کر دیا۔ … تک میاں … نے کی کوشش کرتے یوسف آخرکار … ہو گئے تھے۔ وہاں ان کی مہر وشہ کی خواہش تو پوری نہ ہو پائی تھی مگر اس نے … کی علمی دنیا میں گھسنے کا راستہ ضرور تلاش کر لیا تھا … کا شوکت حسین رضوی کی ٹیم میں شامل ہو گیا تھا۔ … اس نے اپنا نام یوسف حسین زیدی رکھ لیا تھا۔ ہوشیاری کے کسی پیچیدہ چکر میں اس نے اپنے آپ کو شیعہ ظاہر کیا تھا؛ یا ہو سکتا ہے کہ اس بات نے بالواسطہ اس خاص گروپ میں شامل ہونے میں اس کی مدد کی ہو کیوں کہ شوکت حسین رضوی شیعہ ہے۔

لاہور میں یوسف کی شادی ہو گئی تھی۔ دراصل شادی نہیں … ان نے اپنے خاندان کے قدیمی ملازم کا پتا لگایا تھا جو وہاں ریلوے میں ملازمت … چھوٹے سے … میں رہتا تھا۔ یوسف نے اس کے گھر … دیا تھا، اس نے خوشی قبول کر لیا۔ مگر کچھ عرصے بعد یوسف کی سرمستیوں نے اس لڑکی کا پاؤں بھاری کر دیا اور … یوسف کی کنپٹی پر … اور … تقسیم کئے۔ شادی کی خبر جب کراچی … میں کہرام مچ گیا۔ رجب علی خاں کے اکلوتے وارث کی شادی نوکرانی سے!

نوکرانی نے اچھو بعد میں شمو بیگم کہلائیں، یوسف کا ساتھ دیا۔ چند برس بعد یوسف … اس وقت کے مشرقی پاکستان میں ڈھاکا چلا گیا تھا۔ ملک کے اس حصے کی علیحدگی کے بعد یوسف … اس حالت میں پہنچا کہ کسی حادثے میں اس کا چہرہ، جو کسی … پرکشش اور وجیہ تھا، جھلس گیا تھا۔ اس کے ساتھ متعدد بنگالی نژاد اولادیں تھیں، ان میں سے دو کی ماں، ایک … بنگالن، ان کے ساتھ آئی تھی مگر کچھ مہینے بعد اُسے کوئی اور لے اڑا۔

بنگالن کی رخصتی کے بعد شمو بیگم نے آنسو بہاتے اور پونچھتے ہوئے سب بچوں کو سمیٹ کر … کی ایک نئی بستی میں گھر بسا لیا۔

اس دوران یوسف کے تمام رشتے دار جہانگیر روڈ کے کوارٹروں سے نکل کر ناظم آباد اور … سوسائٹی منتقل ہو چکے تھے۔ ان کی ایک بھابی کے ڈاکٹر شوہر نے … کو اپنے دواخانے میں بٹھا دیا۔ چند مہینوں میں دواؤں کی شُد بُد حاصل کرنے اور انجکشن لگانا سیکھنے کے بعد یوسف نے … اپنے مکان میں کلینک کھول کر ڈاکٹر یوسف علی خاں کی تختی آویزاں کر دی اور محلے والوں کو موت کے گھاٹ اتارنے میں مصروف ہو گئے۔

زندگی میں پہلی بار انھیں سیاسی جماعتوں میں شمولیت کے اقتصادی اور سماجی فوائد کا احساس ہوا تھا۔ مگر یوسف — اب ڈاکٹر یوسف علی خاں — کی ایم کیو ایم میں شمولیت پر کسی نے غور تک نہ کیا تھا، کیوں کہ پورا محلہ، پورا ضلع، پورا شہر ایم کیو ایم میں یوں ہی شامل ہو چکا تھا۔

قوم یا قومیت کا تصور بھی یوسف میاں کے ذہن میں کچھ الجھا الجھا سا تھا۔ … زندگی گزارنے کے

مد آیا بڑھاپا انھیں بار بار بیمار کر ڈالتا۔ وہ بڑبڑاتے، پلنگ پر پڑے پڑے پکارتے۔

لوگوں میں عوام پریشان تھی [یعنی ... رہے کے پٹھان]، ... یہ محل ... یہ محل تو ہو رہے تھے۔ راجاؤں کے پاس خود تو کھٹکتے بھی نہ تھے۔ رہے کہتے ہیں ان کی عورتیں تو ... سے فاصلوں کے ساتھ ہوتی تھیں ... ساتھی، بہنیوں کے ساتھ ہوتی تھیں۔ ... سی سو شوہر ... ہوتے تھے۔

دور کھڑی چارپائی پر بڑے سے کپڑے پھیلائے، چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ کر بڑوں کو چھوٹا بنانے کی صد میں ... شوخی سے جیوں میں قینچی چلاتے ہوئے کہتیں: "... اعلیٰ ... صاحب ... یا مولا مشکل کشا!" اور کتر بیونت میں مصروف رہتیں۔

حویلی کے اندر حالات یوسف میاں پر تیزی سے حیثیت اور بڑھاپے سے قوی کو مستقل کر رہا تھا۔ وہ موسلوں اور تھیلوں کا تصور کرتے اور ... سخت محل عورتوں کی مشورہ ... وقت بیٹھ بیٹھ کر چکچاتے یوسف میاں شوخی کی ہے جیوں پر اور بھی ... کھلاتے۔ کچھ سنتی تو ہے نہیں، کم عقل! وہ بڑبڑاتے اور سخت روئی کے تکیے پر دو تین بار ہیں مر پٹکتے۔ پھر لوٹ پوٹ کر آپ ہی آپ ٹھیک بھی ہو جاتے اور اپنا مطلب جلانے لگتے۔

۱۹۸۸ میں یوسف جواد جہیر گڑھی کے ریشان ... ت کے دوران جیل بھی گول گئے سے ملاقات ہو گئے۔ انھیں ... شیعہ ... ہسپتال دیا گیا تھا ... سے پہلے یوسف سے آنکھیں کھول کر پاس کو دیکھ ... کسی ... کو دیکھتے تھے، جوان بیٹے کو غور سے دیکھا تو ایک لشیب، کچھ آلودہ رستے سے گزرتے ہوئے، بنس کر بدلی ہوئی آواز میں کہا تھا:

آؤ بھاگ چلیں!

***

... اسپتال میں ... سے ... اس سے کام ... میں کر ... گیا تھا اور اسے ایک بینک میں نوکری ... کی ... ۔ ... کے قریب سے جانے کے ... ہی پر ... سے اور کھوبات کیے گئے ... سے ... ہونے ... نے خاموشی سے کھوپوری ... کا ... کیا۔ (کسی بھی قسم کی ... لوگوں کی ... کھتا تھا) اور تین ساتھیوں کے ساتھ مل کر گلشن قتبال میں ایک چھوٹا سا ... رہا۔ ... سے ساتھ ... شام کو کمپیوٹر پروگرامنگ کی کلاسیں لیتے ہیں۔ ... ان سے ... جنوں ساتھی ... سے بچے ہوگی ہیں اور لوگوں سے ... عہدے دار ... کسی ... تک ہیں ہیں ... ہوا کرتی ... پر ... ووٹ ... جماعت ... ایک شخص، ایک ... کا ... دیا ہے، ... کی دوسری جماعت سے ... جا۔

Scanned with CamScanner

اور نعیمہ، ہماری داستان کا وہ سات آٹھ سالہ بچہ کہاں گیا جو برسوں پہلے ایک چہل بھری رات میں پی آئی بی کالونی کا کھمبا بجانا چاہتا تھا؟

نعیمہ ہمیشہ حیدرآباد میں نہیں رہا۔ ۱۹۶۹ میں شہر سے دور جام شورو منتقل کی جانے والی سندھ یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات میں داخلے کا فارم بھرنے کی کوشش میں پتلون تار تار ہو جانے کے بعد — جب کہ اس کی مقعد میں دو تین قد آور صحت مند عضو ہائے تناسل طاقت ور دھکوں سے اسے دھکیلنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کے سر پر جیئے سندھ کے نعرے گونج رہے تھے روتے ہوئے اور سر پٹختے ہوئے اس نے کراچی چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور حیدرآباد کے ان گنت خاندانوں کی طرح اس کا خاندان بھی کراچی آ کر بس گیا تھا۔

کراچی یونیورسٹی سے ایم ایس سی کر کے نعیمہ ٹورنٹو، اوٹاوا یا واشنگٹن چلا گیا، جہاں وہ خوش حال ہے اور اچھا کماتا کھاتا ہے۔ آپ اس بات پر متعجب نہ ہوں کہ وہ ٹورانٹو یا اوٹاوا یا واشنگٹن ڈی سی میں ایم کیو ایم کا یونٹ صدر ہے۔

برسوں بعد آپ کا وہاں سے گزر ہو گا۔ ہر کیوبک کے ٹورنٹو، اوٹاوا یا واشنگٹن ڈی سی میں اس جواں سال، ہنس مکھ بزنس ایگزیکٹو اور ایم کیو ایم کے یونٹ صدر کے گھر کے گول کمرے میں ہالہ کی منقش سندھی پیڑھیاں اور دیوار پر آرائش کے لیے لٹکائی سندھی اجرک آویزاں دیکھ کر آپ خاموشی سے آنکھیں پھیر لیں گے اور ہلکے سے آنسو ضبط کرنا چاہیں گے۔ آپ ان آنسوؤں کو واپس اپنے دل میں دھکیل دینا چاہیں گے۔ آپ اس پہیلی کا بھی کوئی حل معلوم نہ کرنا چاہیں گے کہ جب کہ ہماری سطح پر میرا کلچر اور تیرا کلچر کی گالم گلوچ اور نفرت بھری بحث جاری ہے، نیچے کہیں پاتال میں، ان جانے میں، مہاجروں کے وجود کا تہذیبی پہلو سندھ کے رنگ میں رنگ چکا ہے، اور یہ کہ پردیس میں وطن کی تہذیب کے نام پر ایم کیو ایم کے یونٹ صدر کو صرف ہالا کی منقش پیڑھی اور سندھی اجرک ہی کا خیال آتا ہے۔

***

مہاجر قومی موومنٹ

نچلے اور درمیانہ مہاجر طبقوں سے آئی ہم تعلیم نے آخر کار ایک مانند دو، مستقل نام رکھنے والی، سیاسی تنظیم بنائی۔ اور اسے کراچی سے لمبی دیکھا رہے تھے۔ شاہراہوں پر رواں انسانوں کا سمندر، گلی کوچوں سے ابلتا ہوا...

یہ کس قسم کی تحریک تھی؟

[illegible] پڑھے لکھے اور [illegible] جماعت کی [illegible] ہیں۔ [illegible] اختلاف [illegible] نہیں سکتا تھا۔

[illegible] جماعت کی مقبولیت میں کمی نظر آتی ہو۔

[illegible] صوبائی حکومت کا دور [illegible] امید جام صادق علی [illegible] کراچی [illegible] میں شامل ہو گئے تھے۔ [illegible] قبیلے [illegible] کا اعلان کیا ہے۔ کراچی میں [illegible]

[illegible] کے بعد فوج [illegible] سندھ کے [illegible] دوست اور خیر خواہ سمجھا۔

لیکن کراچی میں صورت حال کیوں مختلف رہی؟ آج بھی کیوں یہ شہر میں سکون اور اطمینان کی [illegible] ناکام رہا؟ کس لیے یہ شہر [illegible] جنازوں کا، [illegible] کا، [illegible] قوتوں کا شہر بنا رہا؟

شہر کی ایک بڑی سیاسی تنظیم معتوب ہے۔ اس کی بنائی ہوئی [illegible] ٹیلی ویژن پر دکھائی [illegible] انہیں ختم کر دیا گیا۔

شہر [illegible] خوشیاں [illegible] رہے۔

ہزاروں لوگوں پر مشتمل ایک پوری "تنظیم" زمین میں چلی گئی۔ شہر کی نچلے اور درمیانے طبقے کی آبادیوں نے انھیں اپنے اندر سمو لیا۔

ہزاروں گرفتاریاں ہوئی ہیں۔ شہر میں ہولناک تشدد کی داستانیں گشت کر رہی ہیں۔ پوچھ گچھ میں ملزموں کے ہاتھ پیر توڑ دیے گئے ہیں اور کئی ملزموں کو جیل میں ہلاک کر دیا گیا ہے۔

مسافروں اور راہگیروں کو، سڑک پر چلتی موٹر گاڑیوں کو روک روک کر تلاشیاں لی جاتی رہیں، گویا دہشت گرد کار کی سیٹ کے نیچے یا بونیٹ میں بند ہیں۔

کراچی ایک ذلیل کیا ہوا شہر بن گیا۔

جلد ہی یہ خبریں عام ہو گئیں کہ کس طرح وہاں قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکار بے گناہ افراد کو گرفتار کر کے لے گئے ہیں اور ہزاروں روپے لے کر رہا کرتے ہیں۔ شہر میں جرائم کی وارداتوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ شہر کے کونوں کھدروں میں لاشیں ملتی رہیں، اذیت دے کر قتل کیے ہوئے لوگوں کی لاشیں۔

آپریشن کلین اپ کے پچھلے برس میں شہر سے لڑکے غائب ہونے شروع ہوئے۔ ان کی عمریں سترہ سے ستائیس برس تک کی بتائی جاتی ہیں۔ کہتے ہیں کراچی سے اٹھارہ ہزار لڑکے غائب ہو گئے۔

شاید اٹھارہ ہزار نہ ہوں، شاید یہ مبالغہ ہو۔

شاید نو ہزار ہوں، یا اس سے بھی کم۔

شاید پانچ ہزار ہوں۔

پانچ ہزار جوان لڑکے اپنے گھروں میں نہیں۔ کیا ان کے ماں باپ کو ان کے بارے میں علم ہو گا؟ کیا وہ جانتے ہیں کہ ان کا بیٹا کہاں ہے؟ کب لوٹ سکے گا؟

جس رات نہیں آتا ہوں میں
اس آنگن میں ہوتا ہے کوئی
اس بستر پر سوتا ہے کوئی
اس کمرے کی دہلیز پہ اپنا سر رکھ کر روتا ہے کوئی

(ساقی فاروقی)

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

(حبیب جالب)

Scanned with CamScanner

ہو سکتے ہیں۔ کا[illegible] ہتھیاروں سے [illegible] کم [illegible] جا سکتی۔

[illegible] کی مدت میں [illegible] نے ہیں سامنے پھیلائے ہوئے ہتھیار [illegible] کی [illegible] نے [illegible] ہتھیار دیا [illegible] کئی [illegible] ہیں ہو سکتے ہیں۔ [illegible] عوامی حمایت [illegible] ہتھیاروں سے [illegible] کا استعمال [illegible] مشکل [illegible] ہے۔ ہتھیاروں کا استعمال اسی طرح ختم ہو سکتا ہے۔

[illegible] ہیں [illegible] ہتھیار [illegible] ایک مدت [illegible] کرتے رہے بھی ہیں۔

[illegible] دنیا کا ایک شہر [illegible] جنگ کے [illegible] سرد جنگ کا [illegible]۔ [illegible] میں استعمال [illegible] کا شکار شخصوں نے اپنے معاشرے [illegible] ایک [illegible] شہریوں کی [illegible] گروہ [illegible] ہے، [illegible] شہریوں نے ایک [illegible] دوسرے گروہ پر [illegible] شکار [illegible] مسئلے کا حل [illegible] جاتا ہو۔

[illegible] بات کے ثبوت موجود ہیں کہ [illegible] میں شہریوں کو [illegible] کی جانب سے وحشت [illegible] سے ہتھیاروں کی [illegible] سوچے سمجھے [illegible] کا دیا ہوا ہر ہتھیار ایک نیا قاتل پیدا کرے گا۔

اس شہر میں [illegible] قتل کیے گئے ہیں۔ شہر کے [illegible] میں [illegible] شیعہ سنی مساجد میں قتل کی [illegible] ہیں، [illegible] شہر میں کوئی شیعہ سنی تضاد موجود نہیں ہے۔ [illegible] مساجد میں قتل کی ان [illegible] وارداتوں کو [illegible] کلیش کا نام دیتے رہے ہیں۔

[illegible] تنظیم [illegible] وقت، اور [illegible] (سیاسی، معاشرتی) پس [illegible] میں [illegible] اور [illegible] سرگوشی میں کہیں:

کس کے مشورے پر [illegible] تھی؟ [illegible] کے مشورے پر؟

([illegible] کا گروہ [illegible] سے ملے ہو؟ [illegible] کے [illegible] ہو؟ [illegible] تنظیم [illegible] دیا۔)

[illegible] ہے۔ وہ پوچھ سکتا ہے: جنرل [illegible] کانگریس کس نے [illegible] تھی؟ [illegible] ہوئے یہ بھی پوچھ بیٹھے، پی پی پی [illegible] تمہیں خوش کرنے کے لیے آپ کے [illegible]... بھٹو صاحب

Scanned with CamScanner

نے معاہدۂ تاشقند کی مخالفت کی تھی؟ اور پارٹی مرضی تھی کہ سب ایوب خان کو ہٹایا جائے۔ مگر ان سب سیاسی جماعتوں کی اس وقت صورت بھی تھی عوامی صورت اسی لیے یہ اس قدر کامیاب رہیں۔

اس تنظیم کو دیکھوں عام شہریوں کی نسبت تنظیم کو ان قوتوں نے اذیت کاموں کے قیام سے، قتل سے، جلوس سے، ہتھیاروں سے داغ دار کیا؟ اور لوگ اب بھی اسے کیوں نہیں چھوڑتے؟

کراچی میں اس جماعت کے قائم کیے ہوئے اذیت خانوں کے دوش بدوش سرکاری، قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اذیت خانے بھی تھے جہاں اس وقت کی معتوب پیپلز پارٹی کی نوجوان لڑکیوں کو ننگا کر کے ان کے نازک عضو میں بجلی کے تاروں سے جھٹکے دیے جا رہے تھے۔ اس شہر میں، ایک وقت تھا کہ معتوب پیپلز پارٹی کے لوگ در بدر سر چھپانے کی جگہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔

پھر جب یہ کیو یہ کرسیوں پر متمکن ہوئی۔ کو اسے فیتے کاٹنے اور لوگوں سے ہاتھ ملانے کے علاوہ شہر یا صوبے یا ملک کے اہم معاملات کو اپنی سمجھ بوجھ سے حل کرنے کا اختیار نہ تھا۔

انہیں جلوس نکالنے کا اختیار تھا سو انہوں نے فقیدالمثال جلوس نکالے۔ انہیں بھتہ خوروں کا اختیار تھا یہ اختیار یہاں سب کو دے دیا جاتا ہے۔ اسلحہ کے ہتھیار نہ، شوقین لڑکے جنہیں سرکاری نگرانی میں برسوں سے ہتھیار بند سپاہ بنا یا تھا بھتہ وصول کرنے لگے۔

انہیں قابو میں کرنے کے لیے قانون نافذ کرنے والے ہتھیار بند داروں کو تعینات کیا گیا۔ نہایت قلیل عرصے میں وہ بھی بھتہ وصول کرنے لگے۔

کراچی میں دراصل ہو کیا رہا ہے؟ اور وہ کیا چیز ہے جو لکھی نہیں جا سکتی؟ عورت سوچتی ہے۔

یہ لکھا جاتا رہا ہے اور لکھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ظلم، دھونس اور سیاسی مخالفوں کو کچلنے کے لیے استعمال کیے جانے والے ریاستی ادارے کس قدر کھوکھلے ہو چکے ہیں کہ ان کی صورت حال میں ان کا اوری حول تک نظر نہیں آ سکتا۔ مزید برآں، ان بڑی فوج ناکارہ، ریاست کے دیمک چاٹے ہوئے عناصر کار کے ذریعے ظلم، جبر، زبردستی اور دھونس کا خاتمہ، ظلم، جبر، زبردستی اور دھونس کے ذریعے نہیں کیا جا سکتا، خصوصاً شہر کی اکثریتی آبادی کے نعروں سے مبرا ہو کر نہیں۔ یہ حکمت عملی صرف گزشتہ دہشت گردی کو تازہ دہشت گردی سے خلط ملط کرنے اور مجرم اور خون ریزی کی گنتی کو اور بھی مضبوط کمپوزیشن نئے ولی گروہ میں تبدیل کرنے پر قادر ہے اور یہی ہو رہا ہے۔

کراچی میں آپریشن کلین اپ اسی لیے کامیاب نہیں ہوا۔

***

خون کی بوچھاڑ میں

چلچلاتی دھوپ میں [illegible]

[illegible]

[illegible] چلچلاتی دھوپ میں تالاب کے کنارے جا بیٹھا ہے۔

[illegible] اُسے کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا۔

[illegible] ناچنے اور گانے لگے:

بڑھیا ری بڑھیا تو کیا ڈھونڈے، خون کی بوچھاڑ میں؟

بڑھیا نے کہا:

[illegible]

بچے: [illegible]

بڑھیا: [illegible]

بچے: تھیلی میں کیا رکھے گی، خون کی بوچھاڑ میں؟

بڑھیا: تھیلی میں روپیہ رکھوں گی، خون کی بوچھاڑ میں، خون کی بوچھاڑ میں....

[illegible]

نہیں! شاید یک رنگ آنسو سولی مل تو گئی تھی جسے اس نے اپنے لباس میں جذب کر لیا تھا۔ بڑھیا پیر و نوت کے پاس آئی جو اب ایک گلاس سے کوئی مشروب پی رہا تھا۔ بڑھیا نے اپنا ہاتھ اسے دکھا کر پوچھا:

"کیوں بڑے میاں، میری تقدیر میں کیا لکھا ہے؟"

بڑے میاں نے کھنکار کر کہا: "کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ؟"

"پیسہ آئے گا، روزگار؟" بڑھیا نے معصومیت سے پوچھا۔

بڑے میاں شرمندگی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کچھ جھجک کر بولے:

"یہ کیا پوچھ رہی ہیں آپ؟ آپ تو ماشاءاللہ ... ہیں۔ ... حاصل۔"

یہ سن کر بڑھیا پہلے ہنسی اور پھر روئی ــــ یا شاید وہ پہلے روئی تھی اور پھر ہنسی تھی۔ پھر وہ پیر و نوت کے پاس اپنی کرسی بچھا کر بیٹھ گئی اور اس نے بڑے میاں سے کہا:

"بیٹھے چپ سے دیکھیے ــــ یہ میرا ذاتی اور قومی معاملہ ہے۔ آپ یہ بتایئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے کراچی میں؟"

بوڑھا دیر تک عورت کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے یوں اظہار کیا:

"محترمہ، میں یہ باتیں آپ تک پہنچا دینا چاہتا ہوں۔ خدا معلوم اب میری زندگی اور کتنے دن کی رہ گئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ حقیقت کسی ایسے شخص تک پہنچ جائے جو اسے سمجھ سکے اور محفوظ کر سکے۔ میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں کہ مجھے شک ... تحریک کی دراڑ بیل میں سے ڈالی ... اور ... حالات کہ مدت ہوئی میں اس سے جدا ہو چکا ہوں، اور تحریک تباہی کی طرف رواں ہے۔ پھر بھی میں چند باتیں ... کیوں رہا ہوں۔"

"بتایئے، بتایئے،" عورت نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ اس کے دیدوں کے پیچھے پانی جمع کرنے والے غدود کا سماعت کی حسوں کا ایک غیر معمولی ربط اس طرح ہو گیا ہے کہ دو تین برس سے ... سنتے ہی یہ غدود متحرک ہو جاتے ہیں اور آنکھوں سے پانی جاری ہو جاتا ہے۔

بوڑھے نے بتانا شروع کیا:

"محترمہ، میں نے اس ملک کی سیاست کے گارڈن کے چپے چپے کی دشت نوردی کی ہے۔ برسوں، بلکہ عمر ... کی تگ و دو کی ہے۔ سب میں شامل ہیں ..، جی ایم سید کے ساتھیوں میں بھی رہا ... میں دیکھتا رہا کہ مہاجر ... حیثیت قوم ... رجعت پرست سیاسی جماعتوں کے آلہ کار رہے۔ ترقی پسند ان سے حتمی طور پر نہیں کسی بھی ... طرف کھینچ سکے۔ ۱۹۷۷ء سے ... یہ ... متحدہ محاذ کے ساتھ ہو گئے جسے قومی اتحاد کہا جاتا تھا۔"

عورت کے ذہن میں ایک تصویر تازہ ہو جاتی ہے۔

یہ کراچی ہے۔ شہر کے ... علاقے میں ... سائٹ کے صنعتی علاقے کی ایک مزدور، کنیز ... دو سال فیکٹری کے دفتر میں ... کی طرف جا رہی ہے۔ اس دفتر ... کا ...

یک تو جماعت اسلامی کا حامی ہے۔ یونیورسٹی کی طرف جاتی ہوئی دو نوجوان لڑکیاں سامنے آ رہی ہیں۔ ایک دوسرے سے باتیں کر رہی ہیں۔ وہ خوش ہیں اور ہنس رہی ہیں۔ ان میں سے ایک کہہ رہی ہے: ہم نے انہیں ہرا دیا۔ جماعتی جن کو ہرا رہے تھے ان مہاجروں کے دماغ اور پٹھانوں کی جسمانی قوت نے مل کر کام کیا ہے۔

"چلو، مگر آپ مہاجروں کے خلاف کیوں ہیں؟" عورت نے ایک نوجوان خوش پوش اور مستعد سیلز ایگزیکٹو سے پوچھا۔

وہ بلندی [illegible] سے مسکرانے لگا: "جی [illegible] آدمی نے شک میں [illegible] یہ جو پہلے آتے ہیں بڑے بڑے شہروں میں [illegible] دیکھیے میڈم، [illegible] کی دکان پر جا کر دیکھیے [illegible] کپڑے کا ایک کوٹ سلوانے کی استطاعت حاصل کرنے کے لیے ہمارے [illegible] محنت کی ہے، [illegible] نوٹ [illegible] کس طرح خریدتے ہیں۔"

ہوں، تو معاملہ طبقاتی ہے، عورت دل میں سوچتی ہے۔

مگر شہر کے گلی کوچوں میں یہ طبقاتی نفرت لسانی اور نسلی رنگ اختیار کر چکی ہے۔ [illegible] کی قیادت میں کراچی کے پٹھان پیپلز پارٹی کے شدید مخالف بن چکے ہیں۔ [illegible] کے لیے کوئی [illegible] نہیں، لیکن [illegible] کوئی [illegible] ہو

"تو پھر آپ نے کیا کیا؟" عورت پیرزادہ قاسم سے پوچھتی ہے۔

"تو انتخابات کے بعد میں نے سوچا [illegible] میں، [illegible] میں [illegible] تضادات کو [illegible] ہے۔ [illegible] سے مہاجروں [illegible] ایک ہی طریقہ ہے [illegible] قومی عصبیت کا [illegible] متحمل [illegible] تقریریں کرنے کے باعث ملکوں کے ہیرو بن چکے تھے۔"

عورت کو یاد آتا ہے۔

۱۹۷۷ کے انتخابات کے بعد [illegible] میں [illegible] ہوئی [illegible] کی [illegible] زمین دوز [illegible] کی کوشش [illegible] کی یہ نظم:

پتھروں کی کمی نہیں خون کی
گر گئی ہیں [illegible] قیامت کے [illegible]
[illegible] سنہری [illegible]

[illegible] جماعت اسلامی کی قیادت [illegible] تحریک کا [illegible] میرے ہی محلے کے ایک لڑکے نے کی...

میں نے ترقی پسند نوجوانوں کو اس طرف لانے کی بہت کوشش کی۔ مگر وہ انکار کر دیتے تھے۔ کیا مہاجر مہاجر کر رہے ہیں؟ وہ کہتے۔ ہم تو بین الاقوامی، طبقاتی تحریک پر یقین رکھتے ہیں۔ میں ان کو سمجھاتا — میاں، تحریکیں ایک حد تک ہی کامیاب نہیں ہوتیں۔ عوام کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑنا ہوتا ہے، کسی زخم کو کریدنا ہوتا ہے۔ بظاہر چاہے وہ گھٹیا سی بات لگے، مگر اس کی آڑ میں، ملک کی کے سہارے، بڑے بڑے کام کیے جا سکتے ہیں۔

بوڑھے کی بات کی سفاک سچائی عورت کے دماغ میں پگھلے سیسے کی طرح اترتی ہے۔

مگر کیا! بوڑھا کہتا ہے۔ پھر آتی ہے تنظیم۔ جیسی ہم بنا رہے تھے پارٹیوں کی نقل ہے۔ ہم نے سوچا کہ تنظیم اتنی مضبوط ہونی چاہیے کہ کوئی کارکن اپنی جگہ سے ہل نہ سکے۔ ایسا ہی تصور — منتخب ممبرانِ اسمبلی اپنے گھر نہیں جا سکتے، اب وہ صرف تحریک کے لیے وقف ہو چکے ہیں۔ ان کے گھر والوں پر بھی نظر رکھی جائے گی۔ اگر منتخب نمائندہ گم ہو جائے تو اس کے خاندان والوں کی خیر نہیں۔ تم کو تو پتا ہے۔

طبقاتی نفرت کا ایک مظہر — جو کسی کی سمجھ میں آنے سے پہلے، زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ مہذب، مہاجر دستے کی نفرت میں تبدیل ہو گیا۔ ایک چھوٹے سے گھر میں مرغا بنے ہوئے، الٹے لٹکے ہوئے لوگ...

"ان کو توڑ دو؟"

کیوں؟ کیا چین میں ماؤزے تنگ نے نہیں کہا تھا کہ ان بڈھے رجعتی پروفیسروں کے سر پر جوتے مار مار کر ان کے فلسفے کی ہوا نکالو؟ بوڑھا ہنستا ہے۔ اب وہ دوسرا گلاس بھر رہا ہے۔ بھول گئیں چین کا ثقافتی انقلاب؟

مہاجروں کو سب سے زیادہ ناز اس بات پر ہے کہ وہ پاکستان بھر میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان میں پڑھے لکھوں کی شرح فی الحقیقت دوسری تہذیبی اکائیوں سے بڑھ کر تھی۔

اور تحریک نے ان کی ایک پوری نوجوان نسل کو تعلیم سے بیگانہ کر دیا — وہ جاہل ہو گئے۔ صرف نعرہ بازی، جلسے جلوس میں مشغول، جیسے مہاجر!

بوڑھا گلاس سے چسکی بھرتا ہے۔ کلچرل ریوولیوشن کے دوران چائنا میں بھی یہی ہوا تھا۔ برسوں کروڑوں کی قوم پڑھنے لکھنے یا کوئی بھی پیداواری کام کرنے کی بجائے ڈنڈے بجاتی گھومتی رہی تھی — اسی لیے بعد میں ملک میں اتنا بڑا قحط پڑا تھا۔

مہاجروں کو دوسری سیاسی جماعتوں پر اعتراض تھا کہ ان کی قیادت وڈیروں اور پیروں کے ہاتھ میں ہے۔

تحریک کے اپنے قائد وڈیرے تو خیر نہ بن سکے، مگر اس شہری، تعلیم یافتہ، روشن خیال جماعت کے سربراہ سرعت سے پیر بن گئے۔ پاکستان کے اس جدید ترین شہر کے اندرونی گلی کوچوں میں بستیوں،

پھولوں اور پتوں میں ان کی مبارک شبیہ نمودار ہونے لگی۔

[illegible]

[illegible] تمھیں نوکری دلا دوں گا۔

۱۹۵۳ [illegible]

[illegible] صاحب کرتا ہے اور بے پروائی سے کہتا ہے:

[illegible]

[illegible] ان کے گھر سے متعلق رازداری میں، اُسے مرغا بنانا ناممکن تھا

[illegible]

[illegible] عوام کے کسی خاص احساس محرومی پر تو کہیں۔۔

[illegible]

Scanned with CamScanner

بوڑھا ہنستا ہے۔

"اب... ایسا ہوتا ہے کہ..." وہ اب اپنا دوسرا گلاس ختم کر رہا ہے۔ "سندھی کالجوں اپنی ہی محرومیوں کے ازالے سے کر چکی ہیں — دوسروں کی نہیں۔ اب سندھی قوم پرستوں کو لیجیے۔ جن حقوق کو یہ اپنے قومی بلکہ لسانی حقوق کہتے ہیں، ان کے حصول نے کسی دور دراز گوشے میں بھی، کیا یہ حقوق سندھ میں ہر روز رس رہے ہیں۔ جیسے ولی خیل اور اوڈھ قوموں کے بھی ہیں؟ سندھ کے دیہات کی محرومیوں کا پتہ تمام روشن طالب علمی میں رہ رہے والے سندھی، اچھے گریڈ کی نوکریاں حاصل کرنے کے بعد، ڈاکٹر یا انجینئر بن جانے کے بعد، ان دیہات میں بھٹکتے بھی نہیں — وہ تو کراچی یا اسلام آباد میں رہنا چاہتے ہیں۔ یہ انسانی کمزوریاں ہیں، اور معاشرے کی کمزوریاں بھی ہیں۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر عورت نے پوچھا:

"اتنا اسلحہ ان کے پاس کہاں سے آیا؟"

"اسلحہ کراچی میں عام فروخت ہوا ہے — عدم اعتماد کا منطقی نتیجہ!"

اب عورت کی آنکھوں والے پانی کے قطرے پلکوں سے متحرک ہو چکے ہیں۔

"مگر یہ سفاکیت! یہ درندگی! معصوموں کے جسموں میں ڈرل سے سوراخ کرنا!" وہ رک رک کر بول رہی ہے۔ لڑکی بھی اچھی خاصی اردو سپیکنگ معلوم ہوتی ہے۔ اس کے منہ سے یہ الفاظ بڑی مشکل سے نکل رہے ہیں۔ وہ یقین کرنا چاہتی ہے کہ یہ سب سچ نہیں ہے، مگر دل کی شمالی تاریک کھڑکیوں سے آواز آتی ہے کہ یہ سچ ہے۔

"ایسا تو کوئی نہیں کرتا تھا!" وہ روتے ہوئے کہتی ہے۔ "آخر دوسری بھی سیاسی جماعتیں ہیں۔ یہ درندگی... ان مہاجر لڑکوں کو کس نے سکھائی؟"

"ایسٹ پاکستان میں!" وہ اچانک چیخ اٹھی۔ "ایسٹ پاکستان میں سب سے پہلے ایسا ہوا تھا۔ پہلے بنگالیوں نے اردو سپیکنگ لوگوں کے ساتھ یہ کیا تھا... آنکھیں نکال دی جاتیں... بدن کا سارا خون نچوڑ لیا جاتا..."

بوڑھا ہنسنے لگا۔ "کمال کر دیا... دہشت اور درندگی سیکھنے کے لیے کسی استاد کی ضرورت نہیں پڑتی!"

"آپ اپنی لکھی ہوئی کتاب دوبارہ خود پڑھیے، کبھی کبھی،" دفتر میں ان کے ایک دوست نے ان سے کہا تھا۔

کسی نے فلسطین کی سماجی بنیادوں پر ایک جرمن نژاد سیاست داں کی کتاب سے ایک مختصر جائزہ لکھا تھا۔ متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی اخلاقیات میں جس طرح لطف لینے کو گناہ سمجھا جاتا ہے، حصولِ مسرت کے خلاف جو جذبہ ہے، وہ ہے ایک بے حسی روحانی، روکھی پھیکی زندگی گزارنے پر مصر رہا ہے جو ان میں سادیت پیدا کرتا ہے۔ سادیت کا دوسرا رخ خود اذیتی ہے۔ یہ دونوں مل کر جنم لیتے ہو

فلسطین سے آئے ہیں اور جبر ہمیں کی طرف اشارہ دیتے ہیں۔ یہ نظم ایک حاکم سے جنگ پر سختی سے کاربند رہنے میں خود کو معصوم محسوس کرتا ہے۔ اس کتاب کا حاصل یہی کچھ تھا۔ وہاں سے خود لکھی تھی ــــ مگر۔ مگر ان نظموں کو کسی معیار کی سیاسی رائے سے پہلے میں لکھا ایک بات تھی۔ اور ان سے پہلے پڑوسیوں پر اور دیگر لوگوں پر ستم کا تعلق رکھنا بالکل دوسری بات تھی۔ جو اب خود بار کی رہے تھے ان کی سمجھ کی سوئی۔ شہر کے گلی کوچوں سے بارود کی بو ہی نہیں ان کے بیچ ان کا پناہ دل خون ہو رہا تھا۔ جو لوگ نہیں، بیٹھے ہوئے رنگے تھے۔ کسی کے بیٹے، کسی کے ساتھی، مسلح ہوئے، گاتے ہوئے، سڑک پر ٹھٹھے چلتے ہوئے...

اسے وہ دن یاد آیا جب اچانک شہر میں جیسے رنگ سے سے تھے، پھر لگا دیے گئے تھے جن پر تحریر تھا نہیں کہا جاتا۔ جو قائد کا ہے وہ موت کا حقدار ہے۔ سارا گلی کوچے ان خون بہا دینے والے ہوئے ہے اس طرح ڈھک گئے تھے کہ کسی اور عبارت پر دیکھنے پر شہر کسی زخمی کے مانند نظر آ رہا تھا جس نے تمام جسم پر خون سے بھی سولی پٹیاں باندھ دی گئی ہوں۔

اس دن شہر میں بہت وحشت تھی۔ یہ کیونکہ ایک بائیں گروپ کے لوگ، جو بعد میں یہ کیوں کہ حقیقی ہے نام سے معروف ہوئے، چند دن پہلے ہی شہر سے غائب ہو گئے تھے۔ لوگ روپوش تھے۔ شہر کی ہر سڑک سے دیواروں پر ایک ہی بات: موت کا، موت کا حقدار ہے!

اس دن موت کے سائے پر پھیلی ہوئی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا بیان میں ڈال دی گئی تھی۔

یہ نظم ہے! شاید اس دن کچھ لوگوں کے دل چھپے ہوں۔ مگر ایسا کیوں ہے کہ فقید المثال قائد کی محبت کے سامنے سب شکی ہیں۔ مشکل سے تو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ محبت جو کراچی کے غریب بچوں سے بچ رہی ہے یہ شتشمل ہی ہو گئی ہے۔ ایسا اس کے حساب میں عیاشی کی ــــ مستقبل نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ لطیفے، اور یہ سب شاید وہ جو ڈوپٹے اور شعر میں تمیز نہیں کر سکتے تھے۔

کاریگروں نے بابوؤں کو زیر کر لیا
محنت کی تیغ کاغذی استاد کھا گئی

وہ ان لفظوں کے ایک شاعر ہیں جب جوش اور جذبے میں یہ شعر لکھا تھا، تو کیا وہ سوچ بھی سکتا تھا کہ اس کا عملی مطلب یہ بھی نکل سکتا ہے، یہ کہ ”جو قائد کا ہے وہ موت کا حقدار ہے؟“

اب سب بے معنی تھی اور شام ہو چلی جا رہی تھی۔ اس نے جلد، آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے سورج کو سے تک حصہ دینا چاہیے ہو، کہ کسی فلسفے کے باعث یہ نہیں ہو رہا تھا اور سورج مستقل سست انتظار پر ہے۔

تک اتنے دن وہ کا شکوہ ہو رہا تھا: نہیں ہاتھوں سے گزرے ہوئے بیں بیٹے، وہ پولیس کے ہاتھوں ولی کھانا۔ وہ بھی ہوئے، ایک ماسے میں یہ آدمی لاشیں ان کی نہیں کاٹ دی گئی تھیں، باقی کے

Scanned with CamScanner

پولیس مقابلے میں مارے گئے۔

یہ کون کر رہا ہے؟ میں نے ہواؤں سے، خلاؤں سے، ستاروں سے پوچھا۔

ان سب نے مستعدی سے جواب دیا: اس تنظیم کے دو متحارب گروہ کر رہے ہیں۔

ان میں سے ایک گروہ کو سرکاری پشت پناہی حاصل ہے؟

جی ہاں، کیوں کہ یہی ان کی مسلح قوت کو گلی کوچوں میں چیلنج کر سکتا ہے۔

پھر اس قوت کا کیا کیا جائے گا؟

یہ تو ابھی پتا نہیں کچھ۔ کچھ حل سوچ لیں گے!

اگر اس تنظیم سے سیاسی صلح ہو جائے تو پھر اس کی مسلح قوت حرکت میں نہیں آئے گی — یہ بھی تو ہو سکتا ہے؟

بہرحال جیسا کہ آپ دیکھ رہی ہیں۔ یہ مناسب نہیں سمجھا گیا۔

اس تمام عمل سے ایک خاص کمیونٹی کے لیے پورے ملک میں جو نفرت پھیل رہی ہے، اور خود اس کے اندر جو احساسِ بیگانگی پیدا ہو رہا ہے، اس کے بارے میں کیا کہنا ہے؟

بُرے کام کا بُرا نتیجہ!

پورے پورے محلوں کے مردوں کو قمیصیں اتروا کر، آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر تھانوں میں لے جانے سے کیا حاصل ہے؟

تو وہ بتاتے کیوں نہیں کہ اس تنظیم کے مسلح لڑکے کہاں چھپے ہوئے ہیں؟ خوف کے مارے چپ رہتے ہیں۔

صرف خوف کے مارے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کی عوامی حمایت اب بھی موجود ہو؟

ہو سکتا ہے۔ مگر اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

عدالتی تحقیقات کروا کر کیوں نہیں دیکھ لیتے؟ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔

اور اگر یہ جیت گئے تب؟ نا بابا نا! ایسی غلطی دوبارہ نہیں کی جا سکتی۔

اگر — بالفرضِ محال — یہ عوام میں اب بھی مقبول ہیں، تب لاکھوں شہریوں کی رضا کو جبر سے کچلنا... جمہوری اقدام تو نہیں ہو سکتا۔

اگر لاکھوں شہری ایک فسطائی جماعت کے ہمنوا بن جائیں تو ہم کیا کریں؟

اسے سیاسی عمل کا راستہ فراہم کر کے، اس کے فسطائیت کے رجحان کو ختم کر کے، بحیثیت ایک سیاسی تنظیم کے رہنے دیا جائے — کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟

خاموشی

خاموشی

خاموشی

Scanned with CamScanner

یہ ہندوستانی ارمنت ہی بچے ہیں

[illegible]

سکتا؟

خاموشی

خاموشی

خاموشی

[illegible]

خاموشی

خاموشی

خاموشی

[illegible]

[illegible]

اور آپ کا کارنامہ کیا ہے؟

[illegible] دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہیں۔

[illegible] سوئی؟

اب تو بولی سے جن باہر آ گیا ہے...

[illegible] ان دونوں کی ایک دوسرے سے خاصی وسیع دشمنی ہے۔

خیر... دس برس تک تو کنٹرول میں رکھا اس جذبے کو...

ان دس برسوں کے لیے یہ گلدستہ قبول کیجیے!

Scanned with CamScanner

عورت نے بڑے میاں کو تازہ سرخ گلابوں کا ایک گلدستہ پیش کیا۔
پھر دونوں تالاب میں واپس چھلانگ لگا کر غائب ہو گئے۔ رات کی ظلمت ختم ہو گئی۔ سورج کی تاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ ایک طرف سے کالی تھوتھنی والا بگلا ... میں ... ہو گئی۔

***

زنا بالجبر ــــ ہوا کہ نہیں؟

شہر میں سناٹا ہے اور ہڑتال ــــ کوئی گھر سے باہر نہیں نکل سکتا، تمام دکانیں بند ہیں اگر دکانیں کھولی جاتی ہیں، یا ایک محلے سے دوسرے محلے تک جانے کے لیے کسی سواری پر سفر کیا جاتا ہے، تو پتھراؤ ہو سکتا ہے، گولیاں بھی چلائی جا سکتی ہیں۔
ہو سکتا ہے یہ پتھراؤ اور فائرنگ وہ تنظیم کرے جس نے ہڑتال کی کال دی ہے۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پتھراؤ اور فائرنگ اس تنظیم کی رقیب تنظیم یا حکومت کی خفیہ ایجنسیاں کروائیں تاکہ ان کا الزام ہڑتال کروانے والی تنظیم پر رکھا جا سکے۔
ایسا ہو سکتا ہے ــــ کیوں کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔
ممکن ہے کئی دنوں، ہفتوں، مہینوں سے ایسا ہو رہا ہو۔ کیوں کہ یہ شہر ایسا ہے جہاں عرصے سے ہو سکتا ہے کچھ بھی ہوتا رہا ہو۔

ایک شخص ہڑتال یعنی شہر بند کی وجہ سے گھر میں بند ہے، وہ اپنے روزمرہ وی سی آر پر فلم دیکھ رہا ہے۔ ہندوستانی فلم ہے، ایک ڈاکو کی کہانی جس کا ایک بیٹا ڈاکو بنتا ہے اور دوسرا پولیس والا۔ جب کہ دوسرے بیٹے کو علم نہیں ہوتا کہ وہ ڈاکو کا بیٹا ہے اور ڈاکو بیٹے کو علم نہیں ہوتا کہ پولیس والا اس کا بھائی ہے۔ شخص مذکور کو یہ فلم ہزار بار دیکھی ہوئی لگتی ہے۔ پولیس کی وردی میں ایک حسین پولیس والی بھی ہوتی ہے جو کسی نہ کسی بہانے بار بار پولیس یونیفارم اتار کر تنگ اور مختصر لباس پہن کر ناچتی اور گاتی ہے۔ پولیس والی ڈاکو کے اس بیٹے سے محبت کرتی ہے جو پولیس والا ہے۔ وہ یونیفارم میں بھی پرکشش لگتی ہے۔ ہاتھ بندوقوں کی گولیوں اور آنکھوں پر عینکیں رکھتی ہے۔ شخص مذکور کو گانوں اور ... سے دلچسپی ہے۔ فلم میں سب ڈاکو باپ، پولیس والا بیٹا، پولیس والی اور ڈاکو بیٹا ایک دوسرے پر گولیاں چلا رہے ہوتے ہیں اور گاڑیوں پر بیٹھ کر چھلانگیں لگا رہے ہوتے ہیں، تو ہمیں چنداں حیرت نہیں ہوتی کہ ان سب نے آپس میں کیا رشتے ہیں۔ مگر فلم کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے ... ہوا اور ہو جاتا ہے،

سب کو معلوم ہو جاتا ہے کہ کون کس کا باپ، کس کا بیٹا اور کس کا بھائی ہے۔ باپ دونوں بیٹوں کو گلے سے لگا کر رو جاتا ہے۔

[illegible] ایک لڑکی [illegible] نے [illegible] ایک [illegible] تھے — یہ [illegible] کے طور پر کی گئی ہے۔ لڑکی کا تعلق ایک [illegible] تنظیم سے [illegible] ہے اور روپوش ہے۔ چند دن پہلے اخباروں میں ایک پندرہ [illegible] برس کی روتی ہوئی لڑکی کی تصویر شائع ہوئی تھی اور ساتھ ہی یہ خبر [illegible] روپوش تنظیمی کارکن کی بہن کے ساتھ اہل خانہ کی موجودگی میں کئی افراد نے زنا بالجبر کیا۔

دوسرے دن سے مخالف تنظیموں کی جانب سے [illegible] کی تردید شائع کی جانے لگی۔ چند ڈاکٹروں سے سرٹیفکیٹ [illegible] لڑکی کا معائنہ [illegible] اور [illegible] رپورٹ میں لکھا کہ اندام نہانی یا پستانوں پر [illegible] کے نشانات دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ پھر لڑکی کا معائنہ ایک غیر سرکاری اسپتال میں کروایا گیا۔ [illegible] رپورٹ میں [illegible] اندام نہانی کے پیچھے [illegible] مقامات پر خراش اور سوجن ہے۔ [illegible] تنظیم سے [illegible] یہ نتیجہ اخذ کر رہا ہے، جب کہ مخالف تنظیموں اور سرکاری [illegible] نتیجہ [illegible] نہیں ہوا ہے۔

شخص مذکور کا دل [illegible] سے دھڑکنے لگا۔ اس نے سوچا کہ صحافی یا [illegible] جیسے کام میں [illegible] زیادہ عضلات، ہڈیاں، اعصاب، گوشت کے [illegible] کام کرتے ہیں — ایسا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا [illegible] وثوق سے نہیں کہا جا سکتا [illegible] یا نہیں۔ ایک بات جس کا ذکر (غیر سرکاری اسپتال کی رپورٹ میں تھا) یہ تھی کہ اندام نہانی [illegible] ہے، لیکن [illegible] عرصہ گزر چکا ہے کہ [illegible] ایک صحت مند، پندرہ سولہ سال کی [illegible] میں [illegible] کتنا عرصہ لگتا ہے — ایک دن؟ اس سے زیادہ؟ — جب [illegible] گوشت اور خون [illegible] اپنے فطری کام میں لگی ہوں…

چند دن پہلے اخباروں میں شخص مذکور نے یہ خبر بھی پڑھی تھی کہ زیر حراست تنظیم کا ایک گرفتار کارکن [illegible] پوچھ گچھ کے سلسلے میں ایک کثیر منزلہ عمارت سے بالائی منزل پر لے جایا گیا تھا جہاں سے اس نے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔

یہ خبر پڑھ کر شخص مذکور کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ [illegible] نوجوان نے [illegible] کے باعث پولیس کا [illegible] پر خودکشی کو ترجیح دی۔ مگر بعد میں آنے والی خبروں سے معلوم ہوا کہ اس نوجوان کو [illegible] منزل سے نیچے پھینکا گیا تھا۔ اس انکشاف سے معلوم ہوا کہ [illegible] نوجوان نے [illegible] کے باعث خودکشی نہیں کی تھی۔ [illegible] نہیں، یہ کیا بات ہوئی؟ شخص مذکور نے سوچا [illegible] گرفتار نوجوان کو کسی [illegible] سے نیچے پھینک دیا گیا۔ اب کی بار شخص مذکور پھوٹ پھوٹ [illegible] عمارت کے نیچے [illegible]

اور گرنے والے نوجوان کو اس نے بانہوں میں جھیل لیا۔ نوجوان اس سے لپٹ گیا۔ مگر اس نے کہا کہ شہر میں رہنے میں وقت نہ گنواؤ اور فوراً گھر جاؤ۔ نوجوان آنسو پونچھتا ہوا گھر کی گلیوں گلیوں دوڑ گیا۔ جب وہ ہانپتا ہوا گھر پہنچا تو اس کی ماں نے روتے روتے اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کے بعد شخص مذکور کا تصور ختم ہو گیا۔ وہ مزید تصور نہ کر سکا کہ گھر والوں نے اسے پانی پلایا ہو گا یا دودھ پلایا ہو گا۔

تصور کے ختم ہو جانے پر اس نے حقیقت کا سامنا کرنے کی ٹھانی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ نوجوان بالائی منزل سے گرنے سے ہلاک ہو گیا تھا۔ جہاں میں زندہ سلامت نوجوان کی بجائے اس کے سامنے ایک ہڈیاں ٹوٹی، کھوپڑی پھوٹی لاش پڑی تھی۔ اب تو وہ اور بھی رویا اور ماتم کرنے لگا اور سینے پر دو ہتڑ مار مار کر چیخوں میں کہنے لگا: ہائے، نوجوان لڑکے! کیسے تجھے پالا تھا ماں نے سینے سے لگا کر۔ پل پل تیری بلائیں لے کر دروازے پر منتظر رہتے تھے گھر والے، گر تو دیر سے آتا تھا۔ میرے بیٹے کہا، ڈھانپ کر رکھتے تھے۔ منتیں کر کر کے تجھے کھلاتے تھے، گر تو کسی کھانے سے انکار کرتا تھا۔ تیرا سر ذرا بھی دکھنے لگتا تو پیار سے سر میں تیل لگاتی تھی تیری بہن، یا تیری ماں۔ یہی سر جو آج زمین پر ٹوٹا پڑا ہے ــــ کھوپڑی کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی، خون میں تر مغز زمین پر بکھرا ہوا اور اس پر مکھیاں بھنکتی ہوئی۔

ہائیں، شخص مذکور نے سینہ کوبی بند کر کے، گردن سیدھی کر کے، غور سے کھوپڑی کے اندر دیکھا۔ تو یہ ہوتا ہے کھوپڑی کے اندر؟ اس نے نہایت تحیر اور بے بسی کے عالم میں خود سے کہا۔ مگر وہ جیسی سائنس داں تو نہ تھا کہ مزید تحقیق کرتا کہ آدمی کی کھوپڑی کے اندر کیا ہوتا ہے۔ وہ تو محض چھٹی یا ہڑتال کے دن وی سی آر پر ہندوستانی فلمیں دیکھنے والا ایک معمولی، عام شہری تھا۔ بعد ازاں کا تجسس زیادہ دور تک نہ گیا چند لمحے بعد اس نے دوبارہ مرنے والے کے عزیز کی طرح رونا اور سینہ کوبی کرنے لگا۔

لیکن اسی اخبار میں یہ خبر بھی تھی کہ ایک سر کٹے آدمی کی لاش ملی ہے جس کا عضو تناسل بھی کٹا ہوا ہے۔ لاش کی جیب سے یہ پرچی ملی ہے: 'ایک ماں جیسی بہن کی بے حرمتی کرنے والے کا انجام۔' پہلے بھی چند لاشوں کی جیبوں سے ان مضمونوں کی پرچیاں برآمد ہوئی ہیں: 'مخبری کرنے والے کا انجام۔'

یہ خبریں پڑھ کر شخص مذکور مزید حیران اور پریشان ہو گیا۔ وہ کٹے ہوئے سر کو دھڑ سے اور عضو تناسل کو رانوں کے بیچ میں جوڑ کر پورا آدمی بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر وہ غور کرنے لگا کہ خوف کے باعث، یا تکلیف کے باعث، یہ عضو تناسل پورا تنا ہوا ہے یا کملایا ہوا اور ایک جانب ڈھلکا ہوا ہے جیسے ہونٹوں پر آرام کر رہا ہو۔ اس نے لاش کو پلٹا اور دیکھا کہ سر کٹنے کی پشت پر کوئی زخم نہیں ہے۔ دونوں سر شانوں کے درمیان جہاں گوشت کی ہڈیوں کا جوڑ ہوتا ہے، وہیں سر کٹنے کی ریڑھ کی ہڈی کا آخری نچلا سرا تھا۔ اس نے سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا ریڑھ کی ہڈی پر پھیر کر ستونوالی زنجیر کی آخری کڑی کو بھی طرح محسوس کیا۔ کہتے ہیں (شخص مذکور کو خیال آیا) کہ یہاں آدمی کی تمام قوت پوشیدہ اور جمع ہوتی ہے۔ پرانے زمانوں میں ہندوستانی مردوں کا ایسا ہی خیال تھا۔ کہتے تھے کہ تپسیا یا مراقبے کے ذریعے

Scanned with CamScanner

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] چلی پاپا - وہ اسی طرح سر پر خاک ڈالتے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پوری صورت، شخص مذکور نے کاندھے پر رکھی بندوق بڑی پھرتی سے اتار دی۔

"مگر اس کے کپڑے؟" انھوں نے اعتراض کیا۔

"آپ یہ کہتے ہیں ... ان سے عجلت سے کہا۔ وہ اس قدر مستعدی اور وقت سے ... کو ... پر ... مستعمل ہو یا ... پولیس ... بدن ... گئے ... وردی پہنا ... اور جوتوں سے لے کر چھوٹے بڑے میں ... سے ... وہاں ... وردی ... بالکل پولیس والے کی ... لگنے لگی۔ دوسرے ... پولیس والے ... بڑی ... سے ... کر لے گئے۔

شخص مذکور تھوڑی دیر خاموش کھڑا رہا ... رہا ... اس قدر ... ہنستے ہنستے دوہرا ہو ... جانے وہ ... پوری کوشش کر رہا تھا ... سے ... اور ... کے ... سے کمرے ... میں کھیلا ... سے ... بیٹھ ... اچانک سے ... آ ... کسی مسرت ... عمارت سے چھینکا جانے والا ... تو ... ہوگا ... وہ اسپیکنگ! ... دوسری ... نے ... لی تھی ... کہیں ... مل جاتے ... خیال آتے ہی ... چونک ... اور کچھ ... لیکن فوراً ہی وہ اپنے تردد کی حماقت پر ہنسا ... نے خدا کا شکر ادا کیا ... نہیں ... سے ... آدمی کے بارے میں ... اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ یہ پنجابی تھا، سندھی تھا یا ... اردو سپیکنگ۔

شخص مذکور اپنے کامیاب کھیل پر خوش ہو کر ہندوستانی فلمی ... گانے لگا۔ ... سے ... اصل ... بالکل ہندوستانی فلم جیسی ہی ہے، ... کی طرح کی ... وجھی ... معلوم ہوتی ہے۔

اتنے میں بجلی چلی گئی۔ وی سی آر کھٹاک سے رک گیا اور پنکھا بھی بند ہو گیا۔ شخص مذکور ... اخبار سے پنکھا جھلنے لگا۔ اخبار میں ... کی طرح کی خبریں تھیں۔ اور یہ بھی اسی موضوع پر تھا کہ کراچی ... میں ... رہا ہے۔ اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "ساڑھیں جائے کراچی ... کیا دنیا میں اور کچھ بھی نہیں ہوتا؟"

وہ دوسرے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پھر اس نے پوری ... کے ساتھ آہستہ آہستہ یہ الفاظ اپنے منہ سے ادا کیے:

"کھڑکی ... کی ... جالی ... پھٹ ... گئی ... ہے۔

اسٹول ... پر ... ایک ... بلی ... چڑھ ... رہی ... ہے۔"

"پھول ... جوا ... سے ... ہل ... رہا ... ہے"

میری ... قسمت ... نے ... دو ... دن ... سے ... باہر ... نہیں ... کھایا۔

لیکن وہ زیادہ دیر تک یہ کھیل جاری نہیں رکھ سکا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر کمرے میں آ گیا اور کتابوں کے شیلف پر نظر دوڑانے لگا۔ اس نے اپنے لیے ہندوستانی تاریخ کی ایک کتاب چن لی۔ ... وہ کوئی ایسی کتاب پڑھنا چاہتا تھا جس کا کراچی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ ... یقین تھا کہ کراچی میں جو کچھ ہو رہا ہے، ... کا ...

ن سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

بستر پر نیم دراز، تکیے کا سہارا لیے، رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے وہ کتاب پڑھنے لگا۔ کسی انگریز مورخ کی تحریر تھی۔ اس نے کتاب درمیان سے کھولی تھی، اتفاق سے وہ کتاب کا ساتواں باب "بنگال میں انگریز" تھا۔

مغلوں کے دور میں — کتاب میں لکھا تھا — ہندوستانی کسان اُس زمانے کے یوروپی کسانوں سے معاشی اعتبار سے بہتر حالت میں تھے۔ "اچھا؟!" شخص مذکور نے آنکھیں مل کر تعجب سے یہ سطریں دوبارہ پڑھیں۔ آگے لکھا تھا: "ان کے پاس کھانے کے لیے خوراک اُس زمانے کے یوروپی کسانوں سے زیادہ مقدار میں ہوا کرتی تھی۔"

اٹھارھویں صدی کے آغاز میں بنگال کے صوبیدار نواب سراج الدولہ نے کمپنی بہادر کو کلکتے سے نکال دیا۔ کلائیو مدراس سے بھاری فوج لے کر آیا اور ۱۷۵۷ء میں اس نے کلکتہ دوبارہ فتح کر کے میر جعفر کو تخت پر بٹھا دیا۔

اور یہاں — کتاب میں درج تھا — ہم کلائیو کی شخصیت کا دوسرا روپ دیکھتے ہیں۔ کریلا جنگ کا قابل رہنما، باصلاحیت سفارت کار، موقع ملتے پر لٹیرا بھی ثابت ہوا۔ کلائیو نے اور کمپنی بہادر کے اہلکاروں نے میدان صاف پا کر خوش حال بنگال کا خون نچوڑنا شروع کر دیا۔ وہ صرف خزانے ہی نہیں خالی کر رہے تھے، وہ دیہات کو بھی لوٹ رہے تھے۔ چند ہی برسوں میں بنگال برباد ہو چکا تھا اور کمپنی بہادر، اہلکاروں کی بے راہ روی کے باعث، دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچ چکی تھی

تو پھر آئے وارن ہیسٹنگز۔ اب دیکھیے کہ ہیسٹنگز میں بھی سیاست اعلیٰ صلاحیتیں تھیں، مگر کیا ہوا کہ رفتہ رفتہ ان کے ذہن میں تلخی آ گئی۔ وہ سنگدل رہے، قانونی قتل میں برابر کے شریک رہے، بنارس کے راجا کو بہت تنگ کیا اور اودھ کی بیگمات کو ہراساں کرتے رہے۔ ان شکایتوں پر ان کے حریفوں کی بن آئی اور انھیں برطرف کر دیا گیا

پسینا پونچھتے پونچھتے شخص مذکور نے شدید غم و غصہ محسوس کیا۔ اس نے دل ہی دل میں کلائیو اور ہیسٹنگز کو گالیاں دیں — "حرام زادے، کتے کے بچے! تمھیں کیا حق پہنچتا تھا، کیا حق..." لیکن وہ اس کر کے بیٹھے، رکھی سر کٹی لاش کا کیا کرے، یہ ابھی تک اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔

پسینا بہہ کر اس کی گردن سے قمیص کے اندر ٹپک رہا تھا۔ اچانک ایک خیال نے اسے چونکا دیا۔ اور پھر وہ سے کچھ سوچنے لگا۔ سر کٹے کا عضو تناسل بھی کٹا ہوا تھا۔ اس نے بے ساختہ ران پر ہاتھ مارا۔ "واہ استاد! یہ تو تم نے عجوبے کا کام کر دیا — سر کٹی اور عضو تناسل کٹی لاش! یہ تو بچے کا کھیل تھا۔" آخر شخص مذکور نے لاش کو کاندھے پر ڈالا اور سرحد کی جانب چل پڑا۔

سرحد پر کیمپ کے افسران نے اس سے پوچھا: "آپ اس سر کٹی لاش کو کہاں لے جا رہے ہیں؟"
شخص مذکور مسکرا کر سوچنے لگا۔ پھر اس نے کہا: "سرحد پار ... لوگوں کو لو سامنے۔ ذرا دیکھیے

وہاں ہندو مسلمان کی پہچان یہی (ہاتھ سے کٹی ہوئی جگہ پر اشارہ کر کے) تو ہوتی ہے۔ پاجامے کھول کھول کر دیکھتے ہیں بھئی پاجامے کھول کھول کر ـــــ تو اب آپ دیکھیے گا۔ ہندو مسلمان سکھ، تینوں کو الّو بناؤں گا۔ ذرا اس لاش کو دیکھیے ـــــ اس کا وہ ہی نہیں ہے! تو اب یہ ہے کیا؟ بس یاروں بھرا ایک سوالا سابق ہندوستانی ـــــ یعنی اب تو ہندوستان پاکستان بنگلہ دیش ہے نا ـــــ تو ہم اسے نند کمار کی لاش بھی ثابت کر سکتے ہیں۔ آپ ذرا دیکھتے تو جائیے۔ خدا قسم وہ مزہ آئے گا کہ جھنے جھنے ہم پاگل۔ ہو جائیں تو میں موچھ منڈا دوں گا۔ شخصِ مذکور نے بڑی موچھوں پر ہاتھ پھیرا جو پسینے سے چپک کر اس کے ہونٹوں پر چپکی جا رہی تھیں۔

نند کمار؟ افسران نے حیرت سے پوچھا۔ وہ کون ہے؟

شخصِ مذکور نہیں جانتا تھا کہ نند کمار کون تھا اور وارن ہیسٹنگز اس کے قانونی قتل میں کیوں شریکِ کار رہا۔ انگریز مورخ نے یہ تفصیل نہیں لکھی تھی۔

اس نے لجاجت سے کہا: ہوگا کوئی ـــــ آپ کو اس سے کیا؟

سرحد پر تعینات افسران نے متانت سے کہا:

آپ سرحد پار کے معاملات میں دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟ یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا۔ آپ کے نیک جذبات بہرحال اپنے وطن، اپنی قومیت، اپنی قوم پرستی کے حق میں تھے۔ لیکن اس طرف قدم رکھتے ہی آپ کی قوم پرستی، حب الوطنی اور قومی وفاداری پر بھی حرف آنچ آ جائے گی۔

اب کی بار شخصِ مذکور ہنسا نہیں۔ وہ رونے لگا۔ سر کٹے کے کٹے ہوئے، گمشدہ عضو کی جگہ پر ہاتھ پھیر کر اس نے کہا: "یہ کہاں گم ہو گیا؟"

ایک کھمبے کے سہارے نہ جانے کب سے ایستادہ، قوم، قومیت، قوم پرستی، قوام یا قسمت اہی، روئی کی وہ قدِ آدم گڑیا جس کے منہ پر دھاگے سے ٹنکے ہوئے جیسی سیاہ آنکھیں اور سرخ شوخ بھرے ہونٹ بنے تھے، جس کی روئی شخصی سے تماشا دیکھی ہوئی بہت حیز چاندنیوں کی سرخ جھنڈیوں سے ڈھکی کی آڑوں، فرقوں اور دیشتوں اور یخ پیپ و گاڑیوں کے دودھیا دھاگے بھرے تھے اور جو کثرتِ استعمال سے سرحدوں کے پاس سے طرح پھٹ گئی تھی اور ان چاکوں سے روئی نکل نکل کر زمین پر گر رہی تھی، اچانک شخصِ مذکور پر آ گری۔

شخصِ مذکور نے چونک کر قہقہہ لگا کر اس نے گڑیا کے سیاہ دھاگوں سے بنے الجھے بالوں کا گچھا جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا:

"تو بتا سالی ـــــ زنا بالجبر ہوا تھا کہ نہیں؟"

* * *

Scanned with CamScanner

کراچی میں کیا ہو رہا ہے (۱)

پاکستان میں کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہم ایک [illegible] عوام کے غیر مسلح، عوامی گروہوں کے مابین [illegible] جمہوری نظام میں تبدیل کیے جانے کی کوشش کے [illegible] تکلیف دہ، پیچیدہ اور ناہموار راستے کا نظارہ کر رہے ہیں؟ جب کہ پرانے نظام کے ستون ڈگمگا کر [illegible] گر رہے ہیں [illegible] ہو رہے ہیں۔ جب کہ ماضی [illegible] مستقبل کے طاقت ور [illegible] کو [illegible] طرف کھینچ رہے ہیں، [illegible] کمزور رہے ہیں، جیسے [illegible] ہوتی ہیں [illegible] اور [illegible] جوڑنے کی کوشش کرتی ہوں۔

[illegible] کشمکش میں [illegible] کیا ان جمہوری رجحانات کی [illegible] ہیں، جو ایک وقت [illegible] طاقت ور [illegible] کی طرف [illegible] ہیں؟ یا [illegible] کا [illegible] ہوگا؟

[illegible] میں ایک خاموش، [illegible] طویل رات میں [illegible] عورت سے پوچھا تھا۔ [illegible] بالکل [illegible] ایک آدمی [illegible] پوری عمر کا آدمی [illegible] رہا تھا۔

ارے! وہ حیران رہ گئی تھی۔ "تم کیوں رو رہے ہو؟"

"کچھ نہیں" اس نے سرخ آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

"[illegible] کی بے روزگاری ہے"

"کیا؟" اس نے بھونچکا ہو کر کہا تھا۔

[illegible] ایک [illegible] میں ڈوب گئی تھی، [illegible] ایک سے ایک [illegible] ذلیل، [illegible] میں [illegible] عورت [illegible] آہستہ آہستہ [illegible] کی طرف [illegible] اور [illegible] کے پیچھے [illegible] ٹھوکریں [illegible] تھے، [illegible] کانپ [illegible] میں [illegible] نہیں، [illegible] پھسل رہے تھے۔

[illegible] سے [illegible] اور [illegible] کے [illegible] میں ماضی، حال اور مستقبل [illegible] ایک [illegible] مقامات سے کسی طلسم کے طور پر نمودار ہو رہا ہے۔

* * *

[illegible] نسواراں [illegible] پھڑ لے، چودھری اکرم نے دردمندی نال کہیا۔ [illegible] دا اپنا دھندا وی
چلدا سی۔ [illegible] دے [illegible] نال [illegible] کھاں [illegible]۔ ایہہ سب کم ایہہ کردے سن۔
[illegible] دی [illegible] ڈوردے رہے سن، ہور کجھ نہیں کردے ہوندے سن؟

[illegible] چودھری صاحب [illegible] نے باقاعدہ سیاسی تنظیم [illegible] وی [illegible] دے نال
مذاکرات

دوجی [illegible] گل، حوصلہ رکھو، [illegible] نال گل [illegible] سی دی۔

مذاکرات؟

ہور کیوں نہیں [illegible] دے؟ اوہی کوشش تے رکھو!

تے ایہہ لوک۔

[illegible] وی [illegible] سیاست وچ [illegible]۔ [illegible] بڑی کوشش کردا کیہ [illegible]۔ تے [illegible] دنیا دے [illegible] وچ آئے نیں۔ [illegible] دے مذاکرات [illegible] دے نال۔ [illegible] ساڈی پوزیشن سٹرانگ ہونی چاہیدی اے ناں۔ [illegible] دی ٹیسٹ وکٹ ختم ہو جاوے تے فیر مذاکرات وی ہون گے۔

[illegible] اوہناں نے [illegible] نظراں چودھری صاحب دے چہرے تے لا دتیاں۔ [illegible] کجھ خیال آئے، [illegible] داڑھی [illegible] کرن لگے۔

[illegible] ایہہ گلاں تے تسیں شاید سیشن وچ کر دے آئے او۔ [illegible] بسٹ پاکستان [illegible]، [illegible] قتل [illegible] سن [illegible] وی تے ساڈے اپنے ای بندے سن۔ [illegible] وچ [illegible] فیر [illegible] دنیا دے [illegible] وچ آئے سن۔ فیر بلوچستان وچ [illegible] گیتی [illegible]۔ [illegible] پہلے کئی ہوتی لیڈراں [illegible] دتی [illegible] فیر [illegible] سب [illegible] خوخرا سے۔

بسٹ پاکستان دی [illegible] نال [illegible] گیتی سی تے [illegible] دی [illegible]۔ [illegible] پسند ہوئے سن سب۔ تے [illegible] دی [illegible] سی۔

[illegible] سب پھوٹ پھوٹ کر رو رہے سن۔ [illegible] آخر دیا ساڈی دشمن کیوں ہو گئی سی؟ [illegible] ساڈا دشمن [illegible] دنیا [illegible] دشمن۔ چین تے امریکہ دوست نیں، [illegible] تاریخ دے زیادہ تر [illegible] وچ [illegible] دشمن۔ [illegible] ساڈا ساتھ نہیں دیندے۔ وقت پوے تے [illegible] مدد نہیں کردے۔ [illegible] آئے [illegible] دی [illegible] دا شکار ہو جاندے نیں۔ ساڈے دشمن [illegible] دی [illegible] مدد کردے نیں۔ آخر کیوں؟ اساں دنیا دا کیہ وگاڑیا اے؟

[illegible] چودھری صاحب دیاں اکھاں وچ وی اتھرو آ گئے۔ [illegible] رکھیا: سچ کہندے او۔ [illegible] ویلے کجھ نہیں لبھدا۔ [illegible] کوئی۔ [illegible] بساں وی نہیں تاہوئی کیوں نہ کردیاں...

***

کراچی میں کیا ہو رہا ہے (۲)

لیاقت آباد کی ایک مسجد … کئی منزلہ عمارت کی آڑ سے … صاحب نکلے۔ (وہ اس محل کی آڑ سے … صاحب! … کرتے ہیں۔ اسی دوران، بچے … کا سارا بادلوں کے نیچے … سے آنکھ مچولی کھیلتے، معصوم نگاہوں سے سامنے شہر کو دیکھ رہے ہیں۔

… عمارت میں پاکی … سات؟ … دو بڑے گھس کر … قتل کیے تھے۔ یہ قتل کراچی ڈائجسٹ … کے شعبے کے دفتر میں ہوئے تھے جو … کی فروخت اور … کی سمگلنگ وغیرہ کا … کرتا ہے اور … سے بھتہ وصول کرتا ہے۔ شعبہ ہذا میں دس افراد … مکمل تعاون ہوتا ہے۔

کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا (قوالی)۔

… معاملات … دکانیں … گلی … کاروائیاں … کے شانے … کے باپ، معشوق، … سے بچا، نتیجے میں … کے مالک … صاحب …

اب کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ … سیاسی تنظیم کی کارستانی ہے۔ … کے … میں چشم دید گواہوں کی … فائلوں میں سے چند … شائع ہوئے جنہیں اخباروں میں شائع شدہ … جس سے متعلق علاقے سے … سے پہچان لیا تھا۔

… کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا (قوالی)۔

یہ قتل کس نے کیے؟

کیا کوئی بھی وثوق کی … تنظیم … سے بھتہ وصول نہ ہونے کے باعث یہ قتل کیے؟

… ممکن ہے۔ … تنظیم … کے لڑکے زیادہ تر … ایک کا کلپ … علاقوں … مقامی … قتل در قتل کے باعث … قتل … ہوں۔

… ممکن … کچھ ہے۔ … کہا

دماغ ہوش کی دوا کرو! اگر وہ قاتل ہے تو کیا روز آدھی رات میں تو دہشت نہیں ہوئی ان کی؟ اسی علاقے کے دکانداروں سے ملو گے، ہر کسی نے بتا دیا ہے؟ اور وہ کیا کہتے ہیں کہ اخباروں میں بھی آ گئے؟ شام کی شہرت میں؟ میاں یہ کوئیں کسی اور کو دیکھا ہے کبھی کہ دیکھ سکتے ہیں

تو پھر یہ قتل کس نے کیے ہو سکتے ہیں؟

اس دن کراچی میں کل نو قتل ہوئے ہے۔

***

آسمان صاف نہیں ہے، اور چاند کس قدر خوب صورت! ہمدو فٹ پاتھ پر ایک پاگل، یا نیم پاگل، یا پاگل ہوتے ہوئے آدمی نے چاند کو بڑی دیر تک بہت غور سے دیکھا۔ نظر اٹھا کر ہر طرف دیکھیں تو بھی آپ کو ایک پاگل، ہونی صورت سا نظر آئے گا جس کے بال سر پر اکھڑے ہوئے ہیں اور جس کے منہ پر جھاڑ ہیں اور جو چاند کی طرف مسکراتے ہوئے کسی لاوارث بچے کی طرح جھنجھلا رہا ہے۔ مگر اس پاگل، یا نیم پاگل، یا پاگل ہوتے ہوئے بوڑھے نے اٹھا کر چاروں طرف دیکھا بلکہ اس کی شاید معمولی سے چاند پر جما رکھیں۔ سہمی ماہتاب آسمان کی کھڑکی تک، دولت میں ہر کسی روشنی کے رنگ کی، مشکوں تک میں ... جب رات جاتی ہیں بھی، چاند کے مدھم ہوتے ہے، جب رات ٹھیک بھی ہو، فٹ پاتھ پر کیوں؟ اصل میں اس کے پاس جانے کی کوئی حد نہیں ہے۔ ابھی یہ رات کی یہاں تک آپ نہیں جانتے، مگر میں جانتی ہوں۔ ان کا نام رحیم میاں ہے۔ عادی روڈ کے پاگل ہیں تو پہلی بار ... سے ملنے سے ملے اگر سے ایک وقت ہوئے ہیں، وہیں ایک بڑھیا پر نکلے ہوئے ہیں وہ کھانے چکھتے ہیں۔ صبح سے وقت نہیں کھاتے تو وہاں پر بیٹھ کر لیتے ہیں۔ یہ کے لیے دکان ہے، کچھ دیر ان کی دکان سے بچوں کے لیے حلوہ پوری لے جاتے ہوئے میری ان سے بات چیت ہوئی تھی۔

بتا چلا کہ رحیم میاں سابق مشرقی پاکستان سے آئے ہیں اصل وہ گورکھپور، مشرقی یوپی سے ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ان کے تمام رشتہ دار، بیوی، بیٹے، بہو، پوتے پوتیاں، وہیں مارے گئے تھے۔ کیوں؟ یہ سب پوچھنے کا موقع نہ ملا۔ سر پر ململی دوپلی ٹوپی منڈھے اور کھلے پائینچوں کا پاجامہ پہنے، ایک لمبی داڑھی اور سب کی پرانی عادی بڑے رہتے ہیں۔

... رات بھی سنسان گلی ہیں، جب تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں اور کتے بلیوں کی مشکل سے دو وقت گزر رہے تھے ... اور ... کہ ... تو ... اس علاقے کی ... سب گلیوں میں باقی بچے ... سے ملاقاتوں کی ... سب ختم ہو چکی تھیں، ... پر ... کے ساتھ

[illegible] تحلیل ہو گئی اور وہ گہری نیند سو گیا۔

[illegible] تحلیل ہو گیا [illegible] روشنی پھیلی ہے۔ وہ ایک سمت [illegible] میں پھیلی ہے۔

[illegible] میں [illegible]

[illegible] کل کا کراچی بنے گا۔

[illegible] میدان دوسرے [illegible] میں فاصلوں [illegible] میدان [illegible] جبیں میاں کے [illegible] ہوتی ہیں۔

جبیں میاں کے [illegible] ہے۔

[illegible] آنکھوں [illegible]

[illegible]

[illegible] خلیفہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

خلیفہ [illegible] دوروں علاقوں میں جا چکی [illegible] وہ کی [illegible] گاہ ہوتی [illegible] ہیں [illegible]

[illegible] تھے ہیں

[illegible] دروازے [illegible]

جھونپڑیاں بسو دی جاتی ہیں۔ قبضہ کرنے والے مالدار اور طاقتور افراد ہیں جو تنخواہ دار مسلح افراد تعینات کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

"کون لوگ زمینوں پر قبضہ کر رہے ہیں؟" عورت نے اُنہی دلاسوں کے ساتھ آہستہ سے پوچھا۔

اُس رات پہلے ماہتاب کو تکتے ہوئے وہ پھر سوالی حصار میں جا بیٹھی تھی جہاں اُس نے ایک ٹی وی انٹرویو دیا تھا اور اس سوال کو صدیوں کی طرح دہرایا تھا کہ کراچی میں کیا ہو رہا ہے؟ لیکن اب یہ حصار سمندر جانے کے بجائے چاند کی طرف اُڑ رہا تھا، اور چاند پر پہنچ چکا تھا۔

اُسے سینے سے لگا کر جواب دینے والے بوڑھے نے، جو شاید مدہوش تھا، اس نے کہا:

"قبضہ کرنے کے لیے قوتِ بازو استعمال کرنے والے ہتھیار بند معمولی حیثیت کے لوگ ہیں۔ یہ قتل کرنے اور قتل ہو جانے پر آمادہ ہیں۔ یہ کروڑوں روپے نہیں کماتے، مگر روٹی ان کو بھی ملتی ہے۔"

"کیا یہ کراچی کے لوگ ہیں؟" عورت نے پوچھا۔

"سب تو کراچی کے ہیں،" بوڑھے نے آنکھیں مچکاتے ہوئے کہا۔ "الگ الگ علاقوں میں الگ الگ قبضہ گروپ کام کر رہے ہیں ... کس سے میں ملتی ہیں، کورنگی اور مہاجر کیمپ میں ... سومالی بنگالی یہ کام کر رہے ہیں۔ جہاں جہاں ان کا تسلط ہے وہاں ایم کیو ایم حقیقی یا الطاف بھائی کا نام لینے والے مصروفِ کار ہیں۔"

"ہوں۔" عورت نے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولی: "سندھی نہیں ہیں قبضہ گروپ میں؟"

بوڑھا ہنسا۔ "کیا وہ سندھی نہیں؟ ہیں تو سہی ..." اس نے کہا۔ "گلشن اقبال سے گلستان جوہر تک قبضہ گروپوں میں مخلوط لوگ ہیں: پنجابی ہیں، پٹھان ہیں، ان میں سندھی بھی ہیں۔ وہ اس دھندے میں آہستہ آہستہ شامل ہو رہے ہیں۔" وہ پھر ہولے سے ہنسا۔

"تو کراچی میں یہی ہو رہا ہے؟" عورت نے چادر پر مستقل سے نظریں جما کر کہا۔

"ہاں، یہ بھی،" کسی نے جواب دیا۔ "کہیں زیادہ سفاکی کے ساتھ۔ کیونکہ فرقہ واری اور سیاسی بدامنی کے زمانے میں ہر واردات سیاسی مخالف گروہ کے سر آسانی سے تھوپی جا سکتی ہے۔"

"پھر ڈرگ مافیا ہے، جو غیر قانونی ہتھیاروں کی فروخت کا کام بھی کر رہا ہے،" ... نے کہا۔

"ہوں۔" عورت اب پھر ایک دوسرے زمانے میں جا پہنچی۔

خواجہ اجمیر نگری اور قصبہ کالونی میں پٹھان مہاجر فسادات سے کراچی جوں جوں جل رہا ہے۔ یہ ... لسانی صرف دکھائی دے رہا ہے۔ اس میں کوئی دوسرا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈرگ مافیا

سے پورے شہر کو یرغمال بنا لیا ہو، کیوں کہ بعض واقعات اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

اس طرح کی تین رپورٹیں وہ اس انگریزی اخبار کو بھیج چکی ہے جس میں ان دنوں وہ کام کر رہی ہے۔ چوتھے دن ٹیلی فون پر دور، بہت دور سے اخبار کے ایڈیٹر کی آواز:

"بی بی، آپ یہ لفظ ڈرگ مافیا اب نہ لکھیے۔"

"کیوں کیوں ایڈیٹر صاحب؟" اس کی حیرت۔

"ابھی یہ پشاور سے... ڈرگ مافیا سے لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ پٹھانوں کو قصوروار ٹھہرا رہی ہیں۔"

خاموشی۔ اس کے ہاتھ میں ٹیلی فون کا پلاسٹک کا ٹھنڈا ریسیور

"سمجھ گئیں نا بی بی؟"

ہتھیار اور منشیات... شہر کی شہ رگ میں دوڑتا پیسہ، بہت زیادہ پیسہ۔ کروڑ؟ دس کروڑ؟ یہ تو معمولی رقمیں ہیں۔ اس سے بہت زیادہ۔ رستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو کچلنے کے لیے ہتھیار جو فروخت بھی ہوتے ہیں۔

کیسی رکاوٹ؟ جب کہ یہ دور منتشر ہے اور عالم تنہا ہے۔ اور جب کہ کل سورج کے طلوع ہونے کا کسی کو یقین نہیں اور آج جتنا پیسہ بنایا جا سکتا ہے وہ بنانا لازمی ہے۔ ہتھیاروں سے لدے ہوئے ٹرک علاقہ غیر سے سندھ کی حد تک آتے ہیں، راہداری کی چیک پوسٹیں پورے صوبہ سرحد، پورے صوبہ پنجاب اور پورے صوبہ سندھ سے گزر کر کراچی میں ہتھیار مطلوبہ مقام تک پہنچتے رہتے ہیں۔ ان کو کہیں نہیں روکا گیا ہے۔ گھنٹے میں ساڑھے تین ٹرک میں ہتھیاروں سے لدا ٹرک مطلوبہ جگہ تک پہنچ جاتا ہے۔ توڑے دار بندوقیں نہیں جدید ترین ہتھیار۔ ٹی ٹی، کلاشنکوف، راکٹ کی دو دو ہزار میں مل گئی۔

آپ کو یقین نہیں آتا؟

کراچی میں اڑتی ہوئی سیدھی گولیوں سے شانوں پر لوگ مر رہے ہیں۔ شاید ابھی انھیں نہیں آئے۔ پھینکنے نہیں ہوئے، وہ کہیں جا رہے تھے۔ زیادہ تر ان کا شمار نہ کرو، ورنہ پولیس تھانے تھے، مگر لوگوں نے نہیں ہوا بنا سکے۔

یوں نہ کراچی میں یہ سب ہو رہا ہے۔ اوڑھنے سے کلام جاری رکھا۔ مہیب طور پر مہیب ہے۔ دہشت گردی کے ڈھکے یہ لیویز نے لڑکوں کو قتل کر رہے ہیں۔ باقی سب بھی مہیب ہے۔

اس صورت میں وہ ایسی دشمنیاں یاد ہے کبھی کچھ ہوئی ہوں ان کو بھی قتل کر رہے ہیں۔ لیوں نہ سب سمجھ گئے ہیں۔ ان کے لڑکے لے جاتے ہیں تو وہ بادشاہ سے ورثہ لڑکی سے بھی تو بھی قتل کیا ہے۔ وہ عقیدوں کو لے رہے ہیں اور عقیدہ دینے پر بھی قتل کر رہے ہیں۔

بہ کراچی اور پنجاب میں ادھر بھی مہیب ہے ایک کیو یہ کے لڑکوں کو دہشت پسند کر کے قتل کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی ہیں جو پوچھے جاتے ہوں گے؟ مہیب طور پر یہ بھی عقیدوں کو کر رہے ہیں۔ کچھ وں

Scanned with CamScanner

میں گھس کر لوٹ مار کر رہے ہیں۔ بڑے پیمانے پر گرفتاریاں کر رہے ہیں۔ نے چھوٹے لڑکوں کو بھی گرفتار کیا گیا ہے جو چودہ پندرہ برس کے تھے۔ یہ نامعلوم مقامات پر رکھے گئے ہیں۔ (مبینہ طور پر) رہا کرنے کی رقم پچیس ہزار روپے سے شروع ہوتی ہے۔

"ذرا صبر سے سنو... یہ اکتا دینے والی طویل فہرست ہے" بوڑھے نے کہا۔ "ایم کیو ایم الطاف گروپ کے لڑکے (مبینہ طور پر) حقیقی کے لڑکوں اور پولیس اور رینجرز کو قتل کر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بھی بھتا وصول کر رہے ہیں اور بھتا نہ دینے پر قتل بھی کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ذاتی دشمنوں یا جن سے کوئی کوفت ہوئی ہو انہیں بھی قتل کیا جا سکتا ہے۔

اور یہ سب، یعنی پولیس، رینجرز، ایم کیو ایم حقیقی اور مجاری، اپنے ان ایجنٹوں اور کارکنوں کو بھی قتل کر رہے ہیں جو اب ان کے کام کے نہ رہے ہوں یا خطرناک بن چکے ہوں۔ ان کے نام پتے یہ ایک دوسرے کو فراہم بھی کر دیتے ہیں۔ قتل کرنے والے مفرور ہوں تو رفتہ رفتہ ایک طرح کا ادارہ جاتی تعاون پیدا ہو گیا ہے۔ کیوں کہ بھتے ... موٹی موٹی رقمیں ... گھومتے پھرتے کارکن ہیں۔ لہذا کچھ نہ کچھ ہمارا کی بنیاد پر، جو کہ گروہی مفادات کے تعاون کی بنیاد سے ... علاقیات ہوتی ہیں

اس پر ایک آدمی میدان میں چلایا: "کیا بک رہے ہو... کیا بکواس کر رہے ہو؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے ... جھوٹ ہے... جھوٹ... جھوٹ... جھوٹ..." منہ سے جھاگ نکل رہا... وہ ہانپ رہا تھا۔

"کیا جھوٹ ہے؟" بوڑھے نے تحمل سے پوچھا۔ "یہ کہ اس شہر کے ساتھ اس کے باسیوں کے ساتھ اس قدر گھناؤنا، پرت در پرت خون سے تر، سازش اور سفاکی سے غلیظ، مکروہ جرم مہینوں، برسوں سے کیا جا رہا ہے؟"

"ہاں!"

"اور کوئی کچھ نہیں کرتا؟"

"ہاں!"

اس پر انگریزی کے ایک صحافی نے انگریزی میں نہایت تیز رفتاری سے کہا: "اور یہ سب کچھ اس لیے آسانی سے ہو رہا ہے کہ ایم کیو ایم، پی پی پی اور اسٹیبلشمنٹ میں سمجھوتا نہیں ہو رہا۔"

اس پر اس کے ... پر تین چار چانٹے رسید ہوئے۔ ... سمجھوتے کا ... کرنے لگا۔ پیچھے آنے میں پیچھے ... کھیڈ ماں، کھیڈ دے ماں کے مصداق

جیسے ایک دریا ہے جو بہہ رہا ہے ... اس سے فیض یاب کیوں نہ ہو جائے؟ اور یہ دریا ہمیشہ یا کم از کم چند برس اور، کیوں نہ بہتا رہے؟

... دریا سندھ کنارے کوٹھے میں سندھی ... نئے جوان یہ ... ہوئے ہیں۔ لٹھے کی کاٹ قمیصیں پہنے، کاندھوں پر اجرک ڈالے، ہری دھرتی کی مٹی اور نمک کی مہک سے ... حیرت سے

ہوں سے لیے ان سے دریا ہو وہیں رہے ہیں۔ مہاجر؟ ان میں ان کا حصہ کہاں سے؟ استحصال تو وہ بھی چاہتے ہیں وہ کسی سے کم تو نہیں مردے بچے ہیں!

کراچی میں وہ پیسے ہتھیا رہے ہیں؟ بھتے کا ایک نظام ہے جو وصول کیا جاتا ہے۔ اسے پروٹیکشن منی کہا جاتا ہے۔ تو یہاں وہ کس کو پروٹیکٹ کرنے کا ڈھونگ رچا رہے ہیں؟ لیکن حیدرآباد میں جہاں سندھی کل ۵۰ فیصد ہیں، وہاں سے بے تحاشا سندھیوں کو پروٹیکشن کا شروع کر دیا ہے اور وافر مقدار میں سندھیوں سے بھتہ وصول کر رہے ہیں۔

رات سے ایک گلی، سنسان گلی میں ایک بجلی کے کھمبے کے نیچے روشنی میں ایک چہرہ ابھرا، جس کی جلتی ہوئی چمکتی آنکھیں ہیں، گلے میں لٹکی ڈبیا سے سگریٹ سلگاتے ہوئے آہستہ آہستہ گنگناتے ہوئے ماچس پھونک کر کہتا ہے:

کہ ہوا میں دو ... کہ ... ہیں وہ ... کل ... کہ

***

خون آلود چہرے والی عورت چاند کی طرف دیکھتے ہوئے مادہ بھیڑیے کی مانند زور سے چیخی اور سنسان گلی گونجی۔

کراچی میں ہو کیا رہا ہے؟"

کراچی میں کل کے طبقات کی صف بندی کی جا رہی ہے، جو موجودہ شکل میں ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ ان دنوں میں، اس کشمکش میں جو درندگی اور ایک لاوارث شہر کو جھنجھوڑ رہا ہے، کل کا طبقہ اشرافیہ جنم لے رہا ہے۔ وہ لوگ جو آج دولت اور زمینیں لے کے قابض ہیں کل صاحبِ حیثیت ہوں گے۔ اشرافیہ میں سے جو دوڑ میں شامل ہوں گی ایک نیا بالائی طبقہ پیدا ہوگا۔

کراچی میں کوئی نئی بات نہیں ہو رہی۔ انسانی معاشرے کے طبقات کی کہانی دہرائی جا رہی ہے۔ پرانے اشرافیہ نے جاگیریں اور اعلیٰ خلاقیت پر مضامین لکھ کر حاصل نہیں کی تھیں۔ یہ کھیل خوں ریزی کے کل بھی تھے اور آج بھی ہیں۔

کراچی کا ہر گلی کوچہ خون میں نہایا ہوا۔ شام کے اخباروں میں مقتولوں کی تصویریں۔ کراچی سے اٹھتا ہوا کوئی آدمی جیسے مر رہا ہو، اداکاری کرتا ہوا مرنے کی، قتل ہونے کی

بوڑھے نے اسے چپ بیٹھے دیکھ کر کرسی سے جنبش کی اور کہا، سنو

وہ اس کی بیٹی رہی، چاند کو گھورتی۔ پھر بوڑھے نے کہا:

Scanned with CamScanner

انسان میں اور دوسرے جانوروں میں فرق یہ ہے کہ ایک دوسرے کا گوشت بھنبھوڑنے سے پہلے اور بعد میں آدمی واویلا بہت کرتا ہے، ندامت سے آنسو بہاتا ہے۔ "ہائے ہائے! یہ کیا ہو گیا!" (اکثر کہتا ہے: "یہ تم نے کیا کیا!") انسانیت کا خون کر دیا! اس معصوم بچے کو آگ کے شعلوں میں پھینک دیا! (بے دھیانی سے ہونٹ پونچھتے ہوئے) عورتوں کے اندام نہانی میں سنگینیں مار دیں۔ ہوں ہوں رونا... سسکیاں۔ جب کہ اس کا آدھا دماغ ران و رسان کے کسی حسی منطقے میں ٹھہرا ہے کے حریف لونڈیا دکھانے کا تازہ ترین پروگرام سوچ رہا ہوتا ہے: سالے تیری لونڈیا۔ جب تک ہر گردوں تلے میں

یہ متعدد قتل کرنے کے بعد جیسی ہوتی اپنے جنے کی روٹی یا ہی روٹی تس بدن کے بیان میں دراصل اس کا حق تھا... کہ ماں کے اپنا ہی نہیں لگتا۔ ابھی تک خون میں تر ہوتی ہے۔ وہ اسے انگلی انگلی کر کے لے گا، زمین پر لوٹیں لگائے گا۔ درختوں پر جھولا ڈال کر جھولے گا۔ بارش میں نہائے گا۔ پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہے گا: آہ! دھنک کس قدر حسین ہوتی ہے! اس پر کچھ شعر لکھے گا۔

"ہم..." عورت نے کہا اور ایک لمبی، ٹھنڈی سانس لی۔ اسے سلطنت میں کی گئی اپنے دوست سے گفتگو یاد آئی۔

وہ کرسی میں منجمد بیٹھا تھا۔ اس نے کہا: "صرف کراچی ہی کیوں؟ پوری دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ بوسنیا کو دیکھیے۔ یہ نام نہاد اکیسویں صدی نسلی تنازعات، خوں ریزی اور تعصب سے عبارت ہوگی۔" پھر اس نے کچھ سوچ کر اضافہ کیا:

"کراچی کے لیے روتی کیوں ہیں بزدلوں کی طرح؟ اس کے بدلے... ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں؟ کیا وہ بالکل برباد نہیں ہو جائیں گے؟"

"کیا وہ بالکل برباد ہو جائیں گے؟" عورت نے مسحور ہو کر دہرایا۔

"یقیناً!" اس کے دوست نے کہا۔ پھر وہ خاموش ہو گیا۔

عورت سوچ میں پڑ گئی۔ کیا اسے بزدلوں کی طرح کراچی پر رونے کے بدلے (بہادروں کی طرح) ہندوستان کے مسلمانوں پر رونا چاہیے؟ مضبوطی سے نظریں اس طرف جمائے رکھنی چاہییں؟ یقیناً یہ زیادہ محفوظ بات تو ہے۔ اس نے کرسی پر دیر سے خاموش بیٹھے، بہت تنہا لگتے ہوئے عزیز دار کسی دوست پر نظر ڈال کر سوچا۔ ملکی متحارب لوگوں کے عتاب سے اسی طرح بچا جا سکتا ہے۔ اسٹیبلشمنٹ کی بھی یہی رٹ ہے کہ لکھنے لکھانے والے کراچی کی گندی بحث میں الجھنے کے بجائے ملک اور مسلمانوں کے خلاف بیرونِ ملک کی جانے والی ستم ناک سازشوں پر خامہ فرسائی کریں۔

مگر عورت کو تو کراچی واپس آنا تھا اور ایک مادہ بھیڑیے کی چنگھاڑ دھنسی تھی۔

ہنس کر اس نے اپنی نظریں اس رات کے پہلے ماہتاب پر گھما دیں جہاں رئیس میاں چرخا کاتا کرتے تھے۔

پنجابی... سندھی... مہاجر..."

وہ پھر سانسوں میں بڑبڑائی۔ اور چونک کر وہ کسی دوسرے زمانے میں جا پہنچی۔ غالباً ۱۹۶۸ یا ۱۹۶۹ کی ایک کالی گھپ، بادلوں کی رات۔ ایک ریل گاڑی بھاری آواز سے رات کی بھیانک تاریکی میں داخل ہوتی اور دندناتی ہوئی اندھیرے میں سے گزرنے لگی۔ اس کے ایک ڈبے میں دو نوعمر لڑکیاں خوف سے لرز رہی ہیں۔ یہ حیدرآباد سندھ کے قریب، سندھ ندی کے کنارے کی بستی جامشورو ہے۔ یہ لڑکیاں کس قوم یا قومیت کی ہیں؟ آپ نہیں کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان کی ماں مہاجر اور باپ پنجابی۔ یہ یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں۔ سندھ یونیورسٹی میں سندھی قوم پرست طلبہ تحریک کا زور ہے۔ چند دن پہلے یہاں سے کچھ دور ایک گاؤں میں سندھی قوم پرستوں نے اشتعال میں آکر ایک پنجابی آبادکار کے گھر پر حملہ کر دیا تھا۔ جس میں ان کے گھر کی جوان لڑکی کے ساتھ زیادتی کر کے اس کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش لٹکا دی گئی تھی۔ اس طرح کہ اس کے پوشیدہ عضو میں ایک کھردری لکڑی ٹھنسی ہوئی تھی۔

لڑکیوں کے ساتھ اس ڈبے میں اتفاقاً ایک موٹی جون بھی تھے۔ اس نے لڑکیوں کو حفاظت سے ان کے گھر تک پہنچانے کا وعدہ کیا ہے۔ اندھیرے سے جو چیرتی ہوئی، دندناتی اس ریل گاڑی کی مدھم روشنی کی تعبیر میں وہ مصنف سندھی مسلمان تھا جو ان لڑکیوں کے لیے ایک فرشتے سے کم نہ تھا پتہ نہیں کون کا خون، کس سے نہیں معلوم کہ کب تک جاری۔

پھر وہ ریل چلی گئی۔ کئی دہائیوں بعد کراچی میں ایک دن طلوع ہوا۔ بھٹو حکومت کے خلاف پی این اے کی تحریک نے زمانے کا ایک دن۔ اس دن کی روشنی میں کراچی کے ایک علاقے بہادر آباد میں بھٹو مخالف مظاہرین نے ایک بوڑھے سندھی کو قتل کر کے اس کی لاش چوراہے پر لٹکا دی تھی۔ بہت دیر تک وہ لاش جھولتی رہی۔

پھر اس نے ساتھی کو دیکھنے کی بڑی سی کوشش سے نیچے جھانکا جو سندھ لگی تھا۔

اسے کراچی سے سندھی مخالف ساتھی فسادات یاد آئے۔ سندھ کی بستی میں ساتھی جل چکی ہو تھی اور وہ اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس نے دیکھی پکی آبادی کے ایک چھوٹے سے مکان کی بالائی منزل پر ایک کمرے میں وہ بند ہو کے بیٹھے رہتے تھے کمرے کی ٹینکی میں پانی بھر رکھے تھے۔

"ارے اتنے پانی کا کیا کیجیے گا؟" اس نے پیار سے پوچھا۔

"... سے صحت ... کہ وہ ... ایک ایک بار ... سعید خان کرتا ہے۔"

"... پانی ... جینٹس کے کھولتا ہوا پانی ... کیا ... پولیس ..."

... انھوں نے پاس رکھی پسی مرچوں کا بڑا سا ڈبہ دکھایا۔

عورت ہنسنے لگی۔ چاندنی میں اُسے بڑی بی کی کھکھلاہٹ سنائی دی۔ اس کے گھر کی نچلی منزل سے چمپا اور چنبیلی کی مہک تیرتی ہوئی اوپر آنے لگی۔

***

کراچی میں کیا ہو رہا ہے (۳)

جب معروف سیاسی تنظیم کے رکن، سابق صدیقی کاؤنسلر کو کراچی کے ایک بھرے پرے محلے سے گرفتار کیا گیا تو یہ متوقع نہ تھا کہ اس کی لاش دوسرے ہی دن اسپتال پہنچا دی جائے گی۔ (کسی وجوہ سے اس عمل میں دو تین دن کا وقفہ پڑنے کا معمول تھا) پولیس رپورٹ میں درج تھا کہ متوفی پر حراست میں دل کا دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ دل کا دورہ ایک وبا کی طرح گرفتار شدگان میں پھیل چکا تھا اور نوجوان لڑکے حراست میں دل کے دوروں کا شکار ہو رہے تھے۔

پوسٹ مارٹم کے بعد فوراً لاش واپس مل گئی۔ مگر اسپتال میں موجود عینی شاہدوں اور چند ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ متوفی کے پورے جسم پر تشدد کے نشان تھے۔ اخباروں میں آنے والی دیگر رپورٹوں میں درج تھا کہ اس کی ایک آنکھ بھی غائب تھی۔

یہ پڑھ کر کراچی میں رہنے والا ایک دردمند شخص سر تھام کر بیٹھ گیا کیوں کہ متلی ہونے لگی تھی اور اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ آنکھ نکال لی! آنکھ نکال لی! یہ الفاظ اس کے دماغ میں گردش کرنے لگے۔ اس کے ذہن میں یہ عجیب سا خیال بھی آیا کہ اس رات جب لوگ چپ گھروں میں آرام سے سو رہے تھے، ایک شخص کی آنکھ نکالی جا رہی تھی۔ اس خیال سے وہ پوری رات سو نہ سکا۔

دوسرے دن کے اخبار میں پولیس کی جانب سے متوفی پر اذیت کرنے کی تردید شائع ہوئی۔ پولیس نے بیان دیا کہ لاش پر اذیت کے نشان پہلے سے موجود تھے۔ وہ معروف سیاسی تنظیم کے عقوبت خانے میں خود تنظیم کے ہاتھوں اذیت کا شکار ہوا تھا۔ اپنے اوپر تشدد کروا کے وہ گرتا پڑتا لنگڑاتا سڑک پر جا رہا تھا کہ گرفتار ہو گیا اور تب حراست میں اس پر دل کا دورہ پڑا اور وہ مر گیا۔

یہ تردید پڑھ کر دردمند شخص کی جان تسلی نہ ہو سکی۔ بار بار ایک ہی خیال اس کے ذہن کو کچوکے دیتا کہ جب اس پر اتنا تشدد ہو چکا تھا تو وہ کم بخت عقوبت خانے سے نکلا ہی کیوں، اور اس حالت میں بیدی آنکھوں کے بے چین ہونے، درد کی شدت جیسی کیا کیفیت رہی ہوگی۔ بعد پھر وہ یہ بھی سوچتا رہا، اور رات بھر اس کے ذہن میں ایک شخص بہت سے سوچ میں رہا، گھٹی گھٹی آوازیں اور جسموں کے ٹکڑے حلق سے

کاٹتا رہا۔ ایک شتر بے مہار سا ... کا ڈھیلا ڈھالا ... وہ گھر نکلنے سے ... کرسی سے ٹیڑھا ہو کر وہیں [illegible] چلا گیا۔

اس طرح، تیسرے دن سے ... دوں تک ... ایک رات ... دوست سے حوالے کی گئی [illegible] کا کام [illegible]۔ [illegible] تشدد کے نشان تھے اور آنکھ میں کوئی [illegible] کھوپڑی کی پشت سے پار ہو گئی تھی۔

[illegible] دو ... سوچا [illegible] تو سمجھا [illegible] آنکھ نکالی گئی ہے۔ اسے پتا چلا [illegible] نے اطمینان کا سانس لیا، اور اس رات وہ آرام سے سویا۔

***

تب [illegible] بیگم [illegible] سے گھر ٹیلی فون آیا [illegible] فیڈرل بی ایریا کے کسی اسپتال میں داخل ہو گیا ہے۔ [illegible] کا دل ڈوبنے لگا۔ فون پر [illegible] مشکل اسپتال کا پتا [illegible] سے [illegible] اور کمر کی موٹی [illegible] سے گھر [illegible] گئیں۔ دستک دی تو [illegible] نے دروازہ کھولا۔ وہ [illegible] اسپتال لے جانے کو تیار ہو گیا۔ ذرا سی [illegible] آمنہ بیگم کے ساتھ ہو لیں۔

آمنہ بیگم کا ڈرائیور، چوبیس پچیس سالہ جوان انھیں [illegible] کار میں اسپتال لے چلا۔ ابھی [illegible] سو گز [illegible] ہو گا کہ سپاہیوں کا ایک ٹرک سامنے آ [illegible] نے بے ساختہ [illegible] سے پیر ہٹا کر وہیل کو تیزی سے بائیں جانب گھمایا۔ پہیوں کی چیخ کے ساتھ گاڑی [illegible] اور سڑک کے وسط میں [illegible] گئی۔ [illegible] زیادہ دور [illegible] سپاہیوں نے ٹرک سے تیزی سے [illegible] کر اس کا راستہ روک دیا۔

پھر [illegible] نے [illegible] کو گاڑی سے کھینچ کر باہر نکالا اور غلیظ گالیوں کی بوچھاڑ کے ساتھ اسے بری طرح مارنا شروع کر دیا۔ [illegible] کے گھر [illegible] گھر جاتی ہو؟

پچھلی سیٹ پر بیٹھی دونوں عورتوں کی [illegible] اور چیخ پکار چند لمحوں کے بعد ختم ہو گئی۔ وہ خاموش بیٹھی تماشا دیکھتی رہیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو موتی سے بہتے، ان کی ناک اور ٹھوڑی اور تھرتھراتے ہونٹوں سے نیچے ٹپکتے رہے۔

[illegible] بیٹے والا جیسی [illegible] اس کو بری طرح مار کھاتا دیکھ کر اس نے [illegible] پھیر لیا اور [illegible] بچے کو مضبوطی سے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ [illegible] اور ٹھوکر کی ہر آواز کے ساتھ اس کی گرفت سخت سے سخت ہوتی [illegible] ہاتھوں کی [illegible] بوڑھی رگیں ابھرتی گئیں۔

[illegible] سے وہاں [illegible] کار [illegible] لمحہ [illegible] دھیمی کی، پھر تیزی سے گلی سے چلی گئی۔

مار کھانے کے بعد عمران گاڑی میں بیٹھا۔ ہوش حواس مجتمع کر کے وہ گلی سے باہر نکلا۔ بڑی سڑک پر آ کر اس نے محلے کی کریانے کی دکان کے سامنے گاڑی روکی۔ دکاندار نے پہچان کر اس کی طرف دیکھا۔ "ارے، تمھاری یہ حالت!" واقعے کی نوعیت اسے سمجھ آ گئی۔ دکاندار کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ خاموشی سے اندر جا کر پانی کا گلاس لایا۔ عمران نے تھوڑا سا پیا۔ پھر دانتوں سے نکلنے والے خون کی کلی کی اور ٹشو پیپر سے منہ صاف کیا۔ سانس ٹھیک کر کے تھوڑی دیر بعد وہ ماں اور پڑوس کی سعدیہ خالہ کو لے کر اسپتال روانہ ہو گیا۔

پھر عمران بھی کہیں چلا گیا ـــ کہاں؟ کون جانے!

**

اختر حمید خاں

انگریزی سے ترجمہ اور تدوین: اجمل کمال

جینے کا ہنر

مجھے اپنے گناہوں کی یہ سزا ملی ہے کہ لمبی عمر پاؤں اور صدمات و واقعات ہوتے ہوئے دیکھوں۔ ایک نوجوان آئی سی ایس مجسٹریٹ کی حیثیت سے میں نے بنگال کے خوفناک قحط اور انگریز سرکار کی انتظامیہ کے زوال کا مشاہدہ کیا۔ ۱۹۴۷ء میں جامعہ ملیہ دہلی میں ایک استاد کی حیثیت سے مجھے مغل ثقافت کے وارث مسلمانوں کو شکست و ریخت سے دوچار ہوتے دیکھنا پڑا۔ تقسیم کے نتیجے میں دہلی سے پانچ لاکھ مسلمانوں نے ہجرت کی اور دس لاکھ ہندو اور سکھ شہر میں آ گئے؛ چند ہفتوں میں شہر بالکل بدل کر رہ گیا۔ ۱۹۵۰ میں میں ہجرت کر کے کومیلا، مشرقی پاکستان، گیا اور وہاں بیس برس کے عرصے میں پاکستان کے شیدائیوں اور حامیوں کی اکثریت کو، بنگالی مسلمانوں کو، دشمنوں میں تبدیل ہوتے دیکھا۔ میں نے ان تمام وحشت ناک واقعات کا، مشرقی پاکستان کے ختم ہونے کا اور بہاریوں کے قتل عام کا مشاہدہ کیا۔ اور میری سزا اب بھی جاری ہے۔ کبھی کبھی میں شیخ سعدی کا ایک شعر دہراتا ہوں، جنھوں نے سو برس کی عمر پائی اور بہت سے المناک واقعات دیکھے جن میں ہلاکو خاں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی بھی شامل تھی:

بسے نادیدنی ہا دیدہ ام من
مرا اے کاشکے مادر نہ زادے

لیکن یہ تمام المناک واقعات شیخ سعدی کو قنوطیت یا کلبیت کا شکار نہیں بنا سکے۔ بلکہ ان کی توجہ اور انسیت کا رخ زندوں کی طرف رہا جو تمام مصیبتوں کے باوجود بھی زندگی کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ مجھے امید ہے کہ میں نے بھی یہی سبق سیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ایک بہت بڑی تبدیلی کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ بہت سی پرانی چیزیں مر رہی ہیں؛ چاروں طرف تنزل اور موت کے آثار ہیں۔ لیکن مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ بہت سی نئی چیزیں پیدا بھی ہو رہی ہیں؛ زندگی اور ترقی کے نشانات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

۳

تقریباً ساٹھ سال پہلے، ۱۹۳۶ میں، میں انڈین سول سروس میں شامل ہوا اور نو سال تک ایک ڈسٹرکٹ افسر کے طور پر کام کرتا رہا۔ پھر میں نے اپنے فقر پسند مزاج کو دیکھتے ہوئے افسر کے بجائے استاد بننے کا فیصلہ کیا۔ چودہ سال تک میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کے جامعہ ملیہ میں، جو ایک گاندھیائی ادارہ تھا، کام کیا۔ ۱۹۵۰ میں کومیلا جانے کے بعد میں آٹھ سال کومیلا کالج کا پرنسپل رہا۔ ۱۹۶۰ اور ۱۹۷۰ کے عشروں میں مجھے امریکی استادوں سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ مجھے اپنے انگریز، گاندھیائی اور امریکی استادوں کے احسان کا ہمیشہ پاس رہا ہے۔ اس کے بعد میں خوش قسمتی سے کچھ تجرباتی (پائلٹ) پروجیکٹوں میں شریک رہا جہاں ایک محقق کے طور پر میں نے اپنے استادوں کے سکھائے ہوئے سبق سے کچھ آگے جانے کی کوشش کی۔

حکومت پاکستان نے فورڈ فاؤنڈیشن کی مدد سے دیہی ترقی کی دو اکیڈمیاں قائم کی تھیں، ایک پشاور میں اور دوسری کومیلا میں۔ ۱۹۵۸ میں مجھے کومیلا اکیڈمی کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ اکیڈمی نے ۱۹۵۹ میں کام شروع کیا۔ اکیڈمی کو کومیلا تھانے کے ۱۰۰ مربع میل کے علاقے اور اس کی حدود میں آنے والے ۳۰۰ گاؤں کو تحقیق اور تجربے کے لیے ایک طرح کی لیبارٹری بنانے کی اجازت دی گئی تھی۔ تحقیق سے پتہ چلا کہ آبپاشی، دریائی بندوں اور سڑکوں کے نظام کی سرے سے تعمیر بہت ضروری ہے۔ کھال (آبپاشی کے نالے) ریت سے اٹ گئے تھے اور بند ٹوٹ رہے تھے، جس کی وجہ سے سیلاب میں زبردست تباہی ہوتی تھی۔ ۔۔ڈاکٹر مونس کا متعارف کرایا ہوا زمینداری نظام، جو کسی حد تک ان کھالوں اور بندوں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا، پاکستان بننے کے بعد ختم ہو گیا تھا۔ سرکاری محکمے یہ کام کرنے کے اہل نہ تھے۔ اس لیے نئے ادارے قائم کرنے اور تعمیر ہونے کے نئے طریقے وضع کرنے کی ضرورت تھی۔

کومیلا تھانے میں سال بھر کی تحقیق کے بعد دیہی تعمیر کا پروگرام وضع کیا گیا:

(۱) تھانہ کاؤنسل اور یونین کاؤنسلوں کو کھال، بند اور سڑکیں تعمیر کرنے کے لیے پانچ سالہ منصوبے تیار کرنے کی تربیت دی گئی۔

(۲) کاؤنسلوں کو ہر سال ان منصوبوں اور اسکیموں پر عمل کرنے کے لیے مالی گرانٹ دی جاتی۔

(۳) انجینیئروں اور کاؤنسلوں کو مقرر کیا گیا کہ مقامی پروجیکٹ کمیٹیوں کو تربیت دیں، اور یہ کمیٹیاں کسی ٹھیکیدار کے بغیر تمام کام کفایت سے چھوٹی چھوٹی مرمتوں پر اور بہت تیز رفتاری سے تعمیر کا کام مکمل کریں۔

(۴) دیہی تعمیر کے اس کام سے نہ صرف تھانے کا ڈھانچہ بہت تیزی سے بحال ہو گیا بلکہ بہت سے بے زمین مزدوروں کو روزگار بھی ملا۔

۱۵۔ بستی کی سطح پر [illegible] پانی کی نکاسی [illegible] استعمال کرنے کے لئے [illegible] آبپاشی کے [illegible] کا [illegible] کاشتکاروں کے [illegible] کا پانی استعمال کرنے والوں سے [illegible] دیکھ بھال کریں [illegible] کے اخراجات برداشت کریں۔

بستی کے نقشے میں [illegible] چھوٹے [illegible] کی مثال کا تھا۔ [illegible] میں [illegible] فیصد [illegible] بڑے [illegible] زمین [illegible] کی پیداوار کم تھی [illegible] سیلاب اور فصل [illegible] نقصان [illegible] زیادہ [illegible] استعمال [illegible] چھوٹے [illegible] کی حالت [illegible] کا [illegible] تیار کیا گیا۔ گاؤں [illegible] چھوٹے [illegible] کی سطح پر [illegible] اور بینک [illegible] میں [illegible] کے حصص [illegible] پانی کا [illegible] کی تربیت کی [illegible] کی کوشش کرتی۔

[illegible] تعمیر [illegible] مقامی کاؤنسلوں [illegible] کی تعمیر [illegible] چھوٹے کسانوں کی حالت [illegible] کا مسئلہ [illegible] ڈویلپمنٹ سنٹر [illegible] کی عمارت میں [illegible] کا [illegible] مسجدوں کے [illegible]

[illegible] گئے۔

[illegible] کا حصول [illegible]

[illegible] نقصان [illegible] کیا گیا [illegible] دریاں [illegible] اور تعاون [illegible] کیا گیا۔

۳۔ [illegible] کو [illegible]

[illegible]

[illegible] کامیابی [illegible] عملی طور [illegible] میں قائم [illegible]۔

۱۹۷۰ تک ان میں سے ۲۵۰ میں قائم کیے ہوئے مرکز مضبوط بنیادوں پر مستحکم ہو چکے تھے۔ ہارورڈ کے مشیروں اور ورلڈ بینک کے شرکت کے باعث ہمہ گیر دیہی ترقی کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ ورلڈ بینک کے مشیروں نے یہ پروگرام انڈونیشیا میں متعارف کرایا جہاں ۱۹۶۳ سے اس پر مسلسل عمل ہونے کی بدولت دیہی منظر بالکل بدل چکا ہے۔

۳

اپریل ۱۹۷۱ میں مجھے کومیلا سے اکھڑ کر موجودہ پاکستان میں آنا پڑا۔ پہلے دو سال میں نے فیصل آباد اور کراچی یونیورسٹی میں پڑھایا اور اس کے بعد دو سال پشاور کی دیہی اکیڈمی میں کام کیا جہاں میرے دوست شعیب سلطان خان نے کومیلا کے خطوط پر داؤدزئی پروجیکٹ شروع کیا تھا۔ مگر مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ نئے پاکستان میں دیہی ترقی کا یہ طریقہ بے مصرف قرار دے کر مسترد کر دیا جاتا ہے۔ اب، ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ جانے پر، مجھے خود کو بے کار شے کے طور پر کونے میں پھینک دیے جانے کا کوئی ملال نہ ہوا۔ مجھے اس کونے میں سے امریکا کی مشی گن سٹیٹ یونیورسٹی نے اٹھایا اور ڈویلپمنٹ کا استاد بنا دیا۔

چند سال بعد میں تدریس سے تھک کر کراچی لوٹ آیا تاکہ اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن مطالعے اور غور و فکر میں بسر کروں۔ لیکن جب بی سی سی آئی فاؤنڈیشن کے آغا حسن عابدی نے مجھے اورنگی میں ایک اور پائلٹ پروجیکٹ شروع کرنے کی ترغیب دی تو میں مزاحمت نہ کر سکا۔ اورنگی پائلٹ پروجیکٹ (OPP) ایک اعتبار سے کومیلا اکیڈمی سے بالکل مختلف تھا۔ یہ ایک غیر سرکاری ادارہ تھا جس کا انحصار ایک اور غیر سرکاری تنظیم کی جانب سے ملنے والی قلیل مالی امداد پر تھا، جبکہ کومیلا اکیڈمی کو حکومت، ہارورڈ کے مشیروں، مشی گن یونیورسٹی اور فورڈ فاؤنڈیشن کا تعاون اور مالی اعانت حاصل رہی تھی۔ شروع شروع میں اورنگی پروجیکٹ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے مجھے دفتر، رابطوں اور ذریعوں کے بغیر، اور محض ایک ٹوٹی پھوٹی جیپ کے ساتھ تھی، کومیلا اکیڈمی کے سربراہ کی نسبت، جس کو سو سے زیادہ میسر تھا۔ لیکن ایک اور اعتبار سے اورنگی پروجیکٹ اور کومیلا اکیڈمی میں گہری مماثلت بھی تھی: دونوں ایک ہی اصول پر عمل کرتے تھے: پہلے سیکھنا اور پھر سکھانا۔

سب سے پہلے میں نے پروجیکٹ کی غیر سرکاری حیثیت کی محدودات کو اپنے دل میں بٹھانے کی کوشش کی۔ او پی پی (OPP) کے پاس کسی قسم کا اختیار نہیں تھا۔ یہ ادارہ مشاہدہ اور تحقیق کر سکتا تھا لیکن اسے مشورہ دینے یا کوئی چیز نافذ کرنے کا اختیار حاصل نہیں تھا۔ یہ صرف رضاکارانہ بنیاد پر لوگوں کو منظم کر سکتا تھا۔ یہ نہ تو سرکاری محکموں کی جانب سے دی جانے والی سہولتوں کا متبادل پیش کر سکتا تھا اور عوامی نمائندگی کا اختیار کاؤنسلروں سے اپنے ہاتھ میں منتقل کر سکتا تھا۔

Scanned with CamScanner

پھر میں نے بڑی مکمل ناواقفیت [illegible] میں اورنگی میں [illegible] رہا تھا میں یہاں ایک طالب علم تھا۔ یہ معاشرہ کومیلا کے چھوٹے سے شہر سے بہت مختلف تھا۔ جہاں پر سب سے پہلے میں نے خود کو تعلیم دینے کا فیصلہ کیا۔ کئی مہینوں تک میں ایک ٹوٹی پھوٹی جیپ میں اورنگی بھر میں گھومتا پھرتا، گلیوں کو دیکھا اور لوگوں، سرکاری افسروں، کاؤنسلروں، [illegible] کے نمائندوں، بستیوں کے سربراہوں سے باتیں کیں۔ خوش قسمتی سے میں پہلے کام میں [illegible] تھا مجھے پہلے کسی اعلیٰ افسر کو جواب دہی نہیں کرنی تھی۔ رفتہ رفتہ میں نے جانا کہ اورنگی میں کس قسم کے لوگ رہتے ہیں، ان کے مسائل کیا ہیں، وہ خود ان مسائل کے بارے میں کیا سوچتے ہیں، ان کے نزدیک کیا چیز ضروری ہے اور وہ خود اپنے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں۔

اورنگی کراچی کی سب سے بڑی کچی آبادی ہے۔ یہ شہر کے وسط میں واقع [illegible] کچی آبادی (slum) نہیں ہے بلکہ شہر کے مضافات میں ۲۵ سال پہلے قائم ہونے والی بستی ہے۔ اس کی آبادی کا مجموعہ [illegible] ہندوستان سے آنے والے مہاجر، بنگلہ دیش سے آنے والے بہاری، شمالی علاقوں سے آنے والے پٹھان، پنجابی، سندھی اور بلوچ شامل ہیں۔ ان کی اکثریت [illegible] طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ ۱۹۸۹ میں [illegible] ایک سروے کے مطابق یہاں ۱۱۰ محلے [illegible] ۶۳۴۳ گلیاں اور ۹۴۱۲۲ مکانات ہیں۔ [illegible] یہاں کے لوگ [illegible] ووٹ کی طاقت اور [illegible] کی طاقت کا پورا احساس رکھتے ہیں۔ [illegible] سہولتیں حاصل کرنے کا طریقہ [illegible] مطالبات [illegible] شکایت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

سرکاری محکموں کے پاس [illegible] حیثیت نہیں [illegible] مطالبوں کو پورا کر سکیں۔ ان کی [illegible] سہولتیں [illegible] ہیں۔ ایک غیر سرکاری تنظیم، او پی پی، سرکاری اہلکاروں کی [illegible] کا کام [illegible] سرکاری محکموں [illegible] کے لیے ایک [illegible] تنظیم کی کوئی ضرورت [illegible] اور تنظیمیں پہلے سے اس کام میں مشغول نہیں۔ چنانچہ او پی پی نے [illegible] ایک [illegible] کیا۔

[illegible] لوگ [illegible] زیادہ تر کام خود ہی کر رہے ہیں [illegible] تقریباً ۹۵ [illegible] سیوریج [illegible] ۵۰۹ پرائیویٹ سکول اور سینکڑوں [illegible] ۵۰ [illegible] ہسپتال [illegible] ہیں۔ [illegible] پرائیویٹ [illegible] تقریباً تمام [illegible] ہزاروں کارخانے اور چھوٹے کاروبار لوگوں کو روزگار فراہم کر رہے ہیں۔

او پی پی نے لوگوں کی ان کوششوں کو [illegible] اور وسعت دینے کی غرض سے ایک معاون

ادارے کا کردار اپنانے کا فیصلہ کیا۔ تکنیکی ماہروں اور سماجی تنظیم کے کارکنوں پر مشتمل ایک مختصر سا عملہ بھرتی کیا گیا جس کا کام لوگوں کو سماجی اور تکنیکی رہنمائی فراہم کرنا تھا۔ بعد میں چھوٹے کاروبار کے لیے قرضے فراہم کرنے کے لیے ایک ٹرسٹ بھی قائم کیا گیا۔

اورنگی کے لوگوں کا ردعمل تناہی بھرپور تھا جتنا کومیلا کے لوگوں کا۔ تین پروگرام شروع کیے گئے: گندے پانی کے نکاس کا کم لاگت کا نظام تعمیر کرنا، صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کی تعلیم دینا اور گھریلو کاروبار کو فروغ دینا۔ پہلے دو پروگراموں میں او پی پی کی طرف سے صرف تکنیکی اور سماجی رہنمائی کی گئی، جبکہ تیسرے پروگرام میں چھوٹے کاروبار کے لیے قرضے بھی فراہم کیے گئے۔

۱۹۸۰ میں، جب او پی پی نے اپنی تحقیق شروع کی، دوسری کچی آبادیوں کی طرح اورنگی بھی گندے پانی کا نکاس نہ ہونے کے باعث نہایت بری حالت میں تھا۔ اس صورت حال سے لوگوں کی صحت اور مکانوں کی مضبوطی کو سخت خطرہ لاحق تھا۔ او پی پی کے انجینیروں نے سب سے پہلے کام کی لاگت کم کرنے کے طریقے دریافت کیے۔ اگلے مرحلے میں سماجی کارکنوں نے لوگوں کو آمادہ کیا کہ جس طرح انھوں نے اپنے مکان خود بنائے ہیں، اسی طرح نکاس کا نظام بھی خود ہی تعمیر کریں اور گلیوں میں نکاس کی راستوں کو اپنے مکان ہی کی توسیع سمجھیں۔ اس سماجی اور تکنیکی رہنمائی کے ذریعے اورنگی کے باشندوں نے، کسی مالی امداد یا قرضے کی سہولت کے بغیر، ۱۹۸۱ سے ۱۹۹۳ تک نکاس کا پورا نظام اپنے خرچ پر اور اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا اور خود ہی اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی جیب سے ۵ کروڑ ۵۴ لاکھ ۱۳ ہزار ۱۷۱ روپے خرچ کر کے ۳۸۵۰ گلیوں میں نکاس کی زیرزمین لائنیں، ۳۸۳ سیکنڈری ڈرین اور ۴۳۷ ہزار ۸۸ فلش لیٹرین تعمیر کیے۔ اس کام کے نتیجے میں گندے پانی سے پیدا ہونے والی بیماریاں بہت کم ہو گئیں اور مکانوں کو ہونے والا نقصان رک گیا۔

اس کامیاب پروگرام کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر لوگوں کو تکنیکی اور سماجی رہنمائی فراہم کی جائے تو وہ نکاس کے پورے نظام کا ۸۰ فیصد حصہ خود بنانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ سرکاری محکمے کے ذمے باقی ۲۰ فیصد کام یعنی مین ڈرین اور واٹر ٹریٹمنٹ پلانٹ ــــ تعمیر کرنے کا کام رہ جاتا ہے۔ عوام اور حکومت کے درمیان اس شراکت سے نکاس کا جدید نظام قائم کرنے کی لاگت بہت کم ہو جاتی ہے۔ اس طرح کچی آبادیوں کا ایک نہایت سنگین مسئلہ آسانی سے اور کم وقت میں حل کیا جا سکتا ہے۔

او پی پی کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ اورنگی میں بیماریوں کی کثرت کی دو بڑی وجہیں ہیں: نکاس کے نظام کا نہ ہونا اور لوگوں میں حفظانِ صحت کے جدید اصولوں سے ناواقفیت۔ چنانچہ ۱۹۸۵ میں صحت کا پروگرام شروع کیا گیا جس میں ناخواندہ اور نیم خواندہ گھریلو عورتوں کو صحت کے اصولوں اور بیماریوں کی روک تھام کی تربیت دی جاتی تھی۔ ایک لیڈی ڈاکٹر کی نگرانی میں چار لیڈی ہیلتھ وزیٹروں نے اورنگی کی عام بیماریوں کی روک تھام کے لیے چھ مہینے کے ایک کورس کا بندوبست کیا، بچوں کو حفاظتی ٹیکے

والے، خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے [illegible] بچوں کی دیکھ بھال اور گھروں میں سبزیاں کاشت کی تربیت [illegible] کورس کے سلسلے میں ہر چھ مہینے بعد محلوں سے ۸۰ کارکن عورتیں منتخب کی جاتی ہیں۔ [illegible] ہر ایک [illegible] والے [illegible] پڑوسی کے گھروں [illegible] سے [illegible] شریک ہوتی ہیں۔ [illegible] کارکن [illegible] سے [illegible] کے نتائج [illegible] کی صورت حال [illegible] ہوئی ہے۔

[illegible] تعلیم [illegible] ثابت ہوتی ہے [illegible] تعلیم [illegible] کا ترقی کی سمت کم ہے۔ [illegible] خاندانوں کو بیماریوں کی روک تھام، خاندانی منصوبہ بندی، بچوں کی دیکھ بھال اور گھر میں سبزیوں کی کاشت کی تربیت دے سکتی ہیں۔ [illegible] صرف ۱۲۵ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ یہ پروگرام نہایت معقول ہے۔ [illegible] کی باتیں سکتی ہیں۔ [illegible] کے اثرات بہت دیرپا ہوتے ہیں۔

[illegible] روزگار کا [illegible] لوگوں کی [illegible] صلاحیت کا [illegible] گلی گلی [illegible] گھریلو کارخانے [illegible] عورتوں کی عملی شرکت۔ [illegible] او پی پی کی [illegible] گھریلو کاروبار کی توسیع روزگار [illegible] چھوٹے چھوٹے [illegible] کاروباری اداروں کی [illegible] موجود تھی۔ صرف [illegible] کی قلت تھی۔ [illegible] باقاعدہ بینک [illegible] قرضے کی سہولت دینے کو تیار نہ تھے۔

[illegible] ۱۹۸۷ میں ایک ٹرسٹ قائم کیا گیا۔ ٹرسٹ نے [illegible] بینکوں [illegible] شرح سود پر قرض حاصل کیا۔ لیکن [illegible] کاروباری [illegible] قرض دیے [illegible] کی شرط [illegible] ٹرسٹ [illegible] کا حساب کر رکھا جا سکے گا اور یوں رفتہ رفتہ قابل [illegible] کا ایک حلقہ وجود میں آ جائے گا۔ [illegible] ٹرسٹ [illegible] سے زیادہ خطرہ مول لے سکتا تھا۔

[illegible] شروع [illegible] غلطیوں سے بچنے [illegible] قرض [illegible]

روپے، دوسرے سال ۱۱ لاکھ دس ہزار روپے، تیسرے سال ۱۹ لاکھ ۷۰ ہزار روپے، چوتھے سال ۳۴ لاکھ ۸۰ ہزار روپے، پانچویں سال ۶۱ لاکھ ۷۰ ہزار روپے اور چھٹے سال ۹۳ لاکھ ۸۰ ہزار روپے کے قرضے جاری کیے۔ ان چھ سال کی مدت میں ۱۷۶۳ گھریلو یونٹوں کو ۲ کروڑ ۴۳ لاکھ ۱۰ ہزار روپے کے قرضے دیے گئے جن کا تعلق ۳۹ مختلف پیشوں سے تھا اور جن میں تقریباً سولہ ہزار لوگ کام کرتے تھے۔ ڈوبنے والے قرضوں کی مالیت ۵ لاکھ ۴۲ ہزار روپے (یعنی کل قرضوں کا تقریباً دو فی فیصد) رہی۔ ایک کروڑ ۴۰ لاکھ ۲۰ ہزار روپے کی قسطیں وصول ہوئیں، جس میں سود کی رقم ۱۵ لاکھ ۶۰ ہزار روپے تھی۔ ٹرسٹ نیشنل بینک، حبیب بینک اور [illegible] بینک سے لیے ہوئے قرضے مکمل طور پر ادا کر چکا ہے اور اب اس کے ذمے کسی بینک کی رقم واجب الادا نہیں ہے۔ عطیات کے طور پر وصول ہونے والے ایک کروڑ ۴۳ لاکھ ۵۰ ہزار روپے ٹرسٹ کے فنڈ میں شامل کر دیے گئے ہیں۔

چھوٹے قرضوں کے اس پائلٹ پروجیکٹ کا مقصد چھوٹے گھریلو یونٹوں کے لیے قرض کا ایک خود کفیل نظام دریافت کرنا تھا۔ اس لیے ٹرسٹ ڈوبے ہوئے قرضوں کی کیفیت اور مالیت کی بہت غور سے نگرانی کرتا ہے اور اس کی روشنی میں قرض داروں کے انتخاب اور قرضوں کے استعمال کی نگرانی کے طریق کار کو بہتر بناتا رہتا ہے۔ چھ سال پہلے جب یہ سلسلہ شروع کیا گیا، جہاں تک وفاداری اور دیانت داری کی روایات معدوم ہو چکی ہیں۔ پہلے سال بہت سی غلطیاں بھی سرزد ہوئیں۔ اب ڈوبنے والے قرضوں کی ممکنہ مالیت کی پیش گوئی کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ تقریباً ۳۰۰ وفادار قرض داروں کا ایک حلقہ بھی بن چکا ہے جو قرض کی واپسی میں سستی دکھانے والوں پر دباؤ ڈالتے ہیں۔ تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ قرضوں کے ڈوبنے کی تین وجوہ ہوتی ہیں: بے ایمانی، نااہلی اور بدقسمتی۔ واپس نہ آنے والے قرضوں کا تین مہینے بعد جائزہ لیا جاتا ہے اور انھیں حساب سے خارج (write off) کرنے میں غیر ضروری تاخیر نہیں کی جاتی۔ قرض واپس نہ کرنے والے ۱۱۰ یونٹوں میں ۳۰ بے ایمان اور ۳۲ نااہل نکلے جبکہ ۴۹ کسی بدقسمتی (موت، شدید بیماری وغیرہ) کے باعث قرض ادا نہیں کر سکے۔

میں نے مختلف حلقوں سے اورنگی میں آکر بسنے والوں کو محنت اور جوش سے اسی طرح معمور پایا جیسے معاشی بہتری کی تلاش میں نئے علاقوں میں جانے والے تمام لوگ ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے چار بنیادی مسائل — مکان اور نکاسِ آب، صحت، تعلیم اور روزگار — بہادرانہ جدوجہد سے اپنے بل بوتے پر اور کسی سرکاری مدد کے بغیر حل کیے ہیں۔ شہروں کے یہ آبادکار صرف پرجوش اور محنتی ہی نہیں، باوسیلہ بھی ہیں۔ ان کی کفایت شعاری انھیں بچت کرنے اور سرمایہ بخش کاروبار میں لگانے کی ایک حیرت انگیز صلاحیت بخشتی ہے۔ وہ اپنی استعمال کی ہر چیز — بجلی، مکان اور سہولتوں — کی قیمت ادا کرتے ہیں! یہ الگ بات ہے کہ ان کی ادا کی ہوئی رقم سرکاری خزانے میں نہیں پہنچتی بلکہ رشوت لینے والے سرکاری ملازموں کے دلالوں کے ہاتھ میں جاتی ہے۔ اورنگی کی مختلف بستیوں میں ہمنے دو

سے سرکاری افسروں، سیاسی مجرموں، وڈیروں اور علاقے کے غنڈوں کی زبردستی وصول کی ہوئی رشوت اور بھتے کی رقم کا صرف دس فیصد بھی عوامی خزانے میں جائے تو ہماری حکومت کو آئی ایم ایف سے اتنے قرضے نہ لینے پڑیں۔ او پی پی کے پروگراموں کی کامیابی سے ظاہر ہے کہ اورنگی والوں میں انتظامی صلاحیت کی بھی کمی نہیں ہے۔ معاشی ترقی اور سماجی استحکام دونوں کی بنیاد مفید روزگار پر ہوتی ہے۔ کیا مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ غنڈہ گردی اور لوٹ مار میں اضافہ بڑی حد تک بے روزگاری کا نتیجہ ہے؟ جن توانائیوں کا رخ تعمیری سرگرمی کی طرف نہ موڑا جا سکے وہ کینسر کے خلیوں کی طرح سماج میں تباہی پیدا کرنے لگتی ہیں۔

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ بستی کے رہنے والے، دیہات سے شہروں میں آنے والے، اکیسویں صدی کے پرامید شہری، خود کو تباہ نہیں کرنا چاہتے۔ اس کے برعکس وہ زندہ رہنا اور پھلنا پھولنا چاہتے ہیں۔ وہ کفایت شعار، محنتی، ہوشیار اور باہمت ہیں۔ وہ محنت کش اور پیداوار کرنے والے لوگ ہیں، طفیلی اور بیٹھ کر کھانے والے نہیں۔ وہ بھیک اور رعایتوں، مخلوط ملازمتوں اور مفت کے مکانوں کے طلب گار نہیں۔ وہ بھکاری اور سماج کا بوجھ نہیں۔ انھیں صرف تکنیکی اور سماجی رہنمائی درکار ہے۔ انھیں صرف رشوتوں اور بھتوں کی وصول سے تحفظ اور تھوڑا سا امن چاہیے۔

۳

۱۹۸۷ میں اورنگی میں زبردست لسانی فسادات پھوٹ پڑے اور مہاجروں اور پٹھانوں نے ایک دوسرے کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ پولیس کا کردار اس معاملے میں کہیں غیر جانبدار تماشائی کا اور کہیں خوف زدہ تماشائی کا رہا۔ میں صاف کہتا ہوں کہ میں دونوں فریقوں کے خوفناک نعرے سن کر دہشت زدہ رہ گیا: یہ (علیگڑھ کالونی کا قتل عام) تو صرف ٹریلر تھا! —— ہم مر کر ساتھ نہیں رہ سکتے! —— ڈی سی آر بیچو، کلاشنکوف خریدو! گلیوں اور محلوں میں مورچے بننے لگے اور مسلح گشت کیے جانے لگے۔ میں لوگوں کی جنگی صلاحیت دیکھ کر حیران ہو گیا۔ لیکن جب میں نے لڑنے والوں سے بات چیت کی تو مجھے پتا چلا کہ یہ لوگ اپنے منی پاکستان کو بیروت بنانے کی درحقیقت کوئی خواہش نہیں رکھتے۔ انھوں نے ہمارے امن کے نعرے پر فوراً لبیک کہا، جو شیراز کے خواجہ حافظ کے شعر پر مبنی تھا۔ جسموں نے خود کشی کی ہولناکی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا:

درختِ دوستی بنشان کہ کامِ دل بہ بار آرد
نہالِ دشمنی بر کن کہ رنجِ بے شمار آرد

ایک فرض شناس اور ہمدرد اسپیشل ریلیف کمشنر منظور الحسن نے جلے ہوئے مکانوں کو تیزی سے دوبارہ تعمیر کرا کے اور لٹی ہوئی دکانوں کا فوری معاوضہ ادا کر کے دونوں طرف کے زخموں پر مرہم رکھا۔ بہت جلد لوگوں کی توجہ کا رخ انتقام سے تعمیرِ نو کی طرف مڑ گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں لڑنے والی دونوں برادریاں دوبارہ شیر و شکر ہو چکی تھیں۔

۵

اورنگی میں اپنا کام مستحکم کرنے کے بعد او پی پی اپنی سرگرمیوں کا دائرہ آس پاس کے گوٹھوں تک پھیلانا چاہتی تھی، لیکن ہمارے محدود وسائل مانع تھے۔ پھر اچانک فسادات اور تشدد کے واقعات نے ہمیں دھکیل کر دلدار گوٹھ میں پہنچا دیا۔ ۱۹۹۰ میں حیدر آباد میں پیش آنے والے کسی واقعے کے جنونی ردعمل میں اورنگی میں واقع ایک بلوچ کالونی پر حملہ کیا گیا اور ۶۸ مکان جلا دیے گئے۔ بلوچوں نے جان بچا کر دلدار گوٹھ میں اپنے عزیزوں کے پاس پناہ لی۔ او پی پی نے پناہ دہی کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا جو ۱۹۸۷ کے مہاجر پٹھان فسادات کے دوران اختیار کیا تھا۔ کمشنر کراچی کے تعاون سے او پی پی نے تباہ شدہ مکانوں کی مرمت کی اور بلوچوں کو واپس لا کر ان کے مکانوں میں آباد کیا۔ ریلیف کے اس کام کے سلسلے میں ہمارا دلدار گوٹھ جانا ہوا جہاں وڈیرا اللہ بخش اور اس کے عم زاد محمد حسین سے میری دوستی ہو گئی۔

وڈیرا اللہ بخش نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ اخبار نویسوں کی تحریروں نے مجھے بتایا تھا کہ وڈیرے بے تحاشا دولت اور جبر و ظلم کی بھیانک علامت ہوتے ہیں۔ مجھے اللہ بخش میں ایسی کوئی خصوصیت دکھائی نہ دی۔ وہ اپنی دولت یا طور طریقوں کے اعتبار سے گوٹھ کے دوسرے معمر لوگوں سے کسی بھی طرح مختلف نہ تھا۔ اسے قبائلی رواج کے مطابق گوٹھ کا سربراہ چنا گیا تھا۔ اس میں اپنے گوٹھ والوں کی حالت کے بارے میں حقیقی فکرمندی محسوس ہوتی تھی، اور وہ سب اس کا مشورہ مانتے تھے۔ بعد کے معاملات میں ہم نے اسے مکمل طور پر قابلِ اعتماد پایا۔

میری تمام زندگی دیہی ترقی کے کام میں گزری ہے۔ میں کومیلا، داؤدزئی اور گلگت کے دیہات میں کام کر چکا ہوں۔ چناں چہ جب میں دلدار گوٹھ پہنچا تو قدرتی طور پر میں نے ماہرانہ تجسس کے ساتھ ارد گرد نظر دوڑائی۔ مجھے بتایا گیا کہ دو سو سال پہلے رند بلوچ قبیلے کے لوگ پانی کے چشموں کے پاس آٹھ گوٹھوں میں آباد ہوئے تھے۔ دلدار گوٹھ انھیں آٹھ میں سے ایک ہے اور اورنگی سے مغرب کی سمت دس کلومیٹر دور واقع ہے۔ علاقے کی زمین بنجر ہے، بارش بہت کم ہوتی ہے، دھنیا اور باجرے کی غیر یقینی کاشت ہوتی ہے۔ مویشی پالنا لوگوں کا بنیادی ذریعۂ معاش ہے۔ لیکن درخت کم ہیں اور چرائی زیادہ ہونے کی وجہ

Scanned with CamScanner

سے سفر [illegible] کا [illegible] ہے۔ [illegible] بہت سے [illegible] اور [illegible] کماتے ہیں اور دودھ یا چارہ بیچتے یا گدھا گاڑی چلاتے ہیں یا مزدوری کرتے ہیں۔ [illegible] کاموں سے وہ [illegible] جاتے ہیں لیکن [illegible] نہیں بچا پاتے۔

جب میں نے [illegible] سے پوچھا [illegible] حالت کیوں [illegible] ہو سکتی ہے تو انھوں نے فوراً [illegible] پانی کی [illegible] ہے۔ [illegible] بالکل [illegible] کوشش کرتے رہے [illegible]۔ [illegible] کافی [illegible] نہیں [illegible] پانی [illegible] نہیں [illegible]۔ [illegible] عظیم [illegible] نہیں [illegible] وہ [illegible] نہیں [illegible] سکتے۔ [illegible] تک [illegible] کی کوشش کی۔

[illegible] ہمارے [illegible] پانی [illegible] نہیں ہے۔ [illegible] کی عظیم [illegible] ہمارے پاس [illegible] وقت [illegible] سبزی [illegible] دودھ [illegible] کی [illegible] مقدار رکھتی ہے۔ [illegible] سب کچھ [illegible] رکھتے ہیں، [illegible] کما سکتے ہیں اور دولت مند ہو سکتے ہیں۔ کیوں نہیں ہو سکتے؟

انھوں نے کہا، کچھ کمانے کے لیے پانی کہاں ہے؟

[illegible] ہم [illegible] یہاں [illegible] نہیں [illegible] سکتے۔ لیکن چشموں کا پانی تو موجود ہے [illegible] کفایت شعاری سے استعمال [illegible] اور [illegible] لایا جا سکتا ہے۔

کفایت شعاری سے استعمال کرنے کا کیا مطلب ہوا؟

اس کا مطلب ہے پانی کے چشمے سے [illegible] کاشت [illegible] پانی [illegible] پودے کو پیالی بھر پانی [illegible]، جیسے چھوٹے بچوں کو دودھ دیا جاتا ہے۔ چھوٹے پودوں کو بس [illegible] رکھنے کے لیے ذرا سا پانی درکار ہوتا ہے۔ [illegible] ہو جاتے ہیں، وہ [illegible] بیچتے ہیں، تمھاری [illegible] ہیں [illegible] اور تمھیں دولت مند بنا دیتے ہیں۔

[illegible] اور [illegible] انھیں پہلے تو حیرت [illegible]۔ لیکن بہت دیر کی گرما گرم بحث کے بعد [illegible] انھیں گدھا گاڑی [illegible] پانی [illegible] پودوں میں ڈالنے کا طریقہ [illegible] کو تیار ہو گیا۔

ٹھیک ہے، پانی تو ہم چشمے سے [illegible] سکتے ہیں لیکن جب تک [illegible] کی جائے اور [illegible] کے گرد باڑ [illegible] کو روکا جائے، یہاں کوئی پودا [illegible] بیچ کھائی جا سکتی ہے۔ اور ان کاموں کے لیے ہمارے پاس پیسہ نہیں ہے۔ اور نہ [illegible] کا بیج خریدنے کے لیے پیسہ ہے۔

[illegible] ٹرسٹ اس مسئلے کو کسی طرح حل کر سکتا تھا جیسے اس نے اورنگی کے [illegible] کاروبار کرنے والوں کو قرض دے کر ان کا مسئلہ حل کیا تھا۔ میں نے کہا، ٹرسٹ تمھیں باڑ لگانے اور کانٹے خریدنے کے لیے قرض دے دے گا۔ شرط یہ ہے کہ تم [illegible] قسطیں [illegible] کرنے کا وعدہ کرو۔

لیکن، [illegible] نے [illegible] ہم [illegible] نہیں [illegible] رکھیں گے۔

ٹرسٹ ایسی کوئی شرط نہیں لگاتا۔ اگر خدا بخش اور ایک اور معتبر آدمی تمہاری ضمانت دینے کو تیار ہوں تو تمہیں قرضہ مل سکتا ہے۔

میں نے محمد حسین کو وی پی کی نرسری میں آ کر ۱۲ قسم کے جنگلی درختوں، ۱۳ قسم کے پھل دار درختوں، آج کل کی نرسریوں میں کیے دی جانے والی بیماریوں اور کھادوں کو دیکھنے کی دعوت دی جس سے اس کی بنجر زمین سونے کی کان میں تبدیل ہو سکتی تھی۔ اس نے نرسری آ کر پیڑ پودے دیکھے ہمارے سماجی کارکنوں حفیظ آرائیں اور اکرم چوہان سے بھی اس کی طمانیت بخش بات چیت ہوئی۔ فروری ۱۹۹۱ میں اس نے ۲۵ ہزار روپے قرضہ لیا۔ پھر تو بس، جیسا کہ وہ خود کہتا ہے، دھن سوار ہو گئی۔ اس نے مجھے بتایا، "آپ نے تو مجھے جیسے ہیروئن پلا دی ہے۔ دن رات میرے دماغ پر بس باغ ہی کا خیال سوار رہتا ہے۔" اس کی بیوی نے حفیظ آرائیں سے شکایت کی، "تم لوگوں نے میرے آدمی پر کیا جادو کر دیا ہے؟ وہ گھر پر رہتا ہی نہیں۔ اس نے بستر پلنگ بھی اپنے پودوں کے پاس پہنچا لیا ہے۔"

قرض کی رقم اور اپنی بچت کو ملا کر اس نے چار ایکڑ زمین کے گرد باڑ لگائی اور درخت اور چارا کاشت کیا۔ اس نے گائیں بھی اور خریدیں۔ پہلے پہل چھوٹے چھوٹے پودوں پر اس کی بیمار دیکھ بھال کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ ان میں سے کئی ڈھیر ہو کر ختم ہو گئے۔ پھر ایک خاندانی جھگڑے نے تقریباً تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس کے ایک بھتیجے نے دوسرے بھتیجے کو قتل کر دیا اور معاملے کو دبانے کے لیے محمد حسین کو کافی پیسہ خرچ کرنا پڑا۔ لیکن وہ اپنے کام پر ڈٹا رہا۔ اب اس کا باغ پھل رہا ہے۔ اب اس کے پاس ۸۰ ناریل، ۵۰ چیکو، ۳۰ کھجور، ۱۵ انار اور بہت سے جنگلی درخت ہیں۔ اس نے چارا بھی لگایا ہے اور ڈھائی من دودھ روزانہ بیچ رہا ہے۔ اس نے، اپنے خاندانی مسائل کے باوجود، قرض میں سے پندرہ ہزار روپے واپس کر دیے ہیں۔ وہ ایک چھوٹا پمپ بھی لگانا چاہتا ہے، لیکن ٹرسٹ اس وقت تک نیا قرضہ نہیں دیتا جب تک پچھلا قرضہ ادا نہ ہو جائے۔

بہت جلد دوسرے لوگوں نے بھی محمد حسین کی مثال پر عمل شروع کر دیا۔ ان میں پہلا دودا خان تھا۔ اس کے پاس مویشیوں کا سب سے بڑا گلہ پہلے سے موجود تھا۔ اب اس نے درخت، چارا اور سبزیاں اگانے کا فیصلہ کیا۔ دودا خان بہت عمدہ تنظیمی صلاحیت کا مالک ہے۔ اس نے زیر زمین چشمے تک پائپ اتار اور پمپ لگا کر اپنی ضرورت کا پانی حاصل کر لیا۔ اس نے چار ایکڑ کے گرد اپنے بیٹے اور چار ایکڑ کے گرد اپنے بھائی کے لیے حد بندی کی۔ لیکن وہ اپنے منفرد طریقے سے کام کرنے کا قائل ہے۔ اس نے باڑ لگانے کے بجائے پتھروں کی چہار دیواری تعمیر کی اور مویشیوں کے لیے صاف ستھری ناندیں بنائیں۔ دودا خان نے مارچ ۱۹۹۲ میں ۵۰ ہزار روپے قرض لیے اور انہیں اپنی بچت میں ملا کر اپنا باغ اور باڑہ تیار کرنے پر صرف کیا۔ اپنی دیہاتی ہوشیاری اور محنت کے بل پر اب وہ خوش حال ہے۔ مئی ۱۹۹۳ تک، صرف ۱۴ مہینے گزرے ہیں، وہ ۱۵ ہزار روپے کی قسطیں ادا کر چکا ہے۔ ایک اور قسط کے ساتھ اس کا سود بھی ادا ہو جائے گا۔ اس کے باغ میں ۱۱۷ ناریل، ۱۰۰ کھجور، ۵۰ چیکو اور ۲۱ انار کے

Scanned with CamScanner

پیڑوں کے علاوہ بہت سے کیکر، سفیدے، بیر اور املی کے درخت ہیں۔ وہ ہر روز پانچ من دودھ شہر بھیجتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ پچھلے موسم میں اس نے اپنی مرچیں بیچ کر گیارہ ہزار روپے کمائے۔

ٹرسٹ سے جوکھیو گوٹھ کے رسول بخش اور عبد الغنی، رئیس گوٹھ کے رحیم بخش اور بہت سے دوسرے لوگوں نے قرضہ حاصل کیا اور اسے اپنی زرعی اور تجارتی سرگرمیوں میں اٹھانے کے لیے استعمال کیا۔ قرض نے کسانوں کو اپنی پیداوار اور تجارت بڑھانے کا حوصلہ دیا۔ بقرعید کے موقعے پر گوٹھوں کے کسان اندرون سندھ سے جانور لا کر انہیں کچھ ہفتے کھلاتے پلاتے اور پھر شہر میں بیچتے ہیں۔ ان سب تاجروں کو سود خوروں سے قرض لینا پڑتا تھا اور اس کے عوض بھاری سود کے علاوہ آدھا منافع بھی ان کے حوالے کرنا پڑتا تھا۔ مئی ۱۹۹۳ میں ۲۲ بلوچوں نے اس کام کے لیے ٹرسٹ سے کل ۵۶ لاکھ پانچ ہزار روپے کا قرضہ لیا اور جون ۱۹۹۳ کے پہلے ہفتے میں پوری رقم، مع ۹۲۸۵ روپے (۱۰٫۷ فیصد) سود کے، ادا کر دی۔ وہ اپنے منافعے کی پوری رقم بتانے میں آنا کانی کر رہے تھے، لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ ان کا خالص منافع ۲۰ فیصد سے کم نہیں رہا ہوگا۔ کسی بینک کو ان بلوچوں سے بہتر قرض دار نہیں مل سکتے۔

او پی پی نے اپنے تجربے کا دائرہ اورنگی کے آس پاس واقع گوٹھوں تک ۱۹۹۰ میں وسیع کیا۔ پہلے دو برس یہ تجربہ صرف دو گوٹھوں — بلوچوں کے ولدار گوٹھ اور سندھیوں کے سہراب جوکھیو گوٹھ — تک محدود رہا، مگر ۱۹۹۳ میں نیشنل رورل سپورٹ پروگرام کے تعاون سے اسے ۲۲ گوٹھوں تک پھیلا دیا گیا ہے۔ اس تین سالہ تجربے سے گوٹھوں کی یہ صورت حال ظاہر ہوئی:

کراچی میں ایک بے حد وسیع صارفوں کی مارکیٹ موجود ہے، اور گوٹھ اب سڑکوں، ٹرانسپورٹ اور مواصلات کے ذریعے شہر سے منسلک ہیں۔ گوٹھوں کے ارد گرد کی زمین میں جنگل اور پھلوں کے درخت اور گائے بھینسوں کے لیے چارہ اگانے کی صلاحیت موجود ہے۔ ہر گوٹھ میں ہوشیار اور جسمانی لحاظ سے مضبوط کسان موجود ہیں جو ان امکانات کو عمل میں لا سکتے ہیں۔ انہیں تھوڑی سی مالی اور تکنیکی مدد درکار ہے، اور مربوط مارکیٹ اور گوٹھوں کی زمین کی پیداواری صلاحیت کے درست علم کی ضرورت ہے۔ سب سے زیادہ ضرورت ان کسان تاجروں کو قرضے کی ہے جو یہ بینکوں سے مروجہ شرح سود پر، مگر سرخ فیتے اور رشوت کی مصیبتوں کے بغیر حاصل کر سکیں۔ انہیں رہنمائی یا قرض فراہم کرنے کے لیے نہ تو بیرونی مدد کی ضرورت ہے نہ ماہروں کی، نہ مختص کی موٹی رقموں کی اور نہ افسروں کی فوج کی۔ رہنمائی دراصل دو طرفہ تعلیم کا ایک ذریعہ ہو سکتی ہے اور قرض فراہم کرنے کا سلسلہ خود کفیل ہو سکتا ہے۔ کراچی کے ارد گرد کے ہر علاقے کے لیے جنگلی درخت لگانے اور مویشی پالنے کا ایک منصوبہ، جس کا بندوبست کسان تاجروں کے ہاتھ میں ہو، اس علاقے کی ترقی کا سب سے تیز رفتار اور کم خرچ [illegible] سکتا ہے۔

اس سلسلے میں پروجیکٹ کی پہلی ترجیح کسانوں سے گروپ قائم کرانا نہیں بلکہ باصلاحیت کسانوں کو

Scanned with CamScanner

منتخب کر کے انھیں رہنمائی فراہم کرتا ہے تاکہ وہ خود کو باوسیلہ تاجروں میں اور اپنی زمین کو کراچی کی مارکیٹ کے لیے عمارتی لکڑی، پھلوں اور دودھ کے فراہم کنندہ علاقے میں تبدیل کرسکیں۔ پروجیکٹ مالی امداد یا رعایتیں نہیں بلکہ تکنیکی رہنمائی اور قرض فراہم کرتا ہے۔ پروجیکٹ کا انتظامی بوجھ بہت کم ہے؛ صرف تین کارکن، اپنے دیگر فرائض کے ساتھ ساتھ دیہی ترقی کے اس پروگرام پر بھی کام کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ایک برس کی مدت میں یہ کام ۳ گوٹھوں سے ۲۲ گوٹھوں تک پھیل گیا ہے اور اس سلسلے میں کسانوں کے اجتماع منعقد کرانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ آس پاس کے گوٹھوں کے باشندوں نے اس نئے کام کو ہوتے ہوئے غور سے دیکھا اور اپنے طور پر یہی کام خود بھی شروع کر دیا۔ انھیں قائل اور آمادہ کرنے کی کوشش نہیں کرنی پڑی۔ آج قرضے کی بہت سی درخواستیں غور کے لیے موجود ہیں۔ پروجیکٹ کی پالیسی احتیاط سے آگے بڑھنے اور نئے قرضے جاری کرنے سے پہلے پچھلے قرضوں کی واپسی کی صورتِ حال کو غور سے جانچنے کی ہے تاکہ وفادار قرض داروں کا حلقہ قائم ہو جائے اور وہ نئے قرض داروں کے لیے ضمانت فراہم کرسکیں۔

۳۱ مئی ۱۹۹۳ تک کل ۱۴۱ دیہی قرضے جاری کیے گئے: ۱۹ زمین اور پانی کے وسائل کی ترقی کے لیے، ۸۷ دودھ دینے والے جانوروں کی پرورش کے لیے، اور ۳۵ تجارت کے لیے۔ قرضوں کی تیز رفتار واپسی ہوشیار، محنتی اور کفایت شعار کسانوں کی حالت میں بہتری کا واضح ثبوت ہے۔ ۲۷ لاکھ ۲۷ ہزار پانچ سو روپے کے قرضوں میں سے ۱۴ لاکھ ۲۳ ہزار نو سو روپے لوٹائے جا چکے ہیں جس میں ایک لاکھ ۷۹ ہزار دو سو ۳۷ روپے کا سود شامل ہے۔ اب تک ڈوبنے والے قرض کی کوئی مثال سامنے نہیں آئی ہے۔ قرض کی قسط وصول کرنے کے لیے پروجیکٹ کے کسی کارکن کو گوٹھ میں جانا نہیں پڑتا، بلکہ قرض دار خود دفتر میں آکر قسط جمع کرا جاتے ہیں۔ نگرانی سے معلوم ہوا ہے کہ زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے، تجارتی سرگرمیاں پھیلی ہیں اور کسانوں نے منافع کمایا ہے۔ پانچ گوٹھوں میں، جہاں درخت لگانے کے لیے قرضے جاری کیے گئے تھے، عمارتی لکڑی کے ۱۱۳۲۸ اور پھلوں کے ۱۰۰۶۲ درخت لگائے گئے۔

اپنے گوٹھوں کی زرخیز زمین کو دیکھتے ہوئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کراچی کے لوگ دودھ اور مکھن بیرونی ملکوں سے منگوائیں، جبکہ یہ زرخیز زمین پیڑوں اور گھاس کی، اور گایوں بھینسوں کی پرورش کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے اور ہوشیار اور محنتی کسان تمام ہماری ضروریات پوری کرنے کو تیار ہیں؛ انھیں صرف تھوڑی سی رہنمائی اور تھوڑا سا قرض چاہیے۔ جانور پالنے کے سلسلے میں ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ سات ہزار سال پہلے دنیا میں پہلی بار بکری، بیل اور بھینس کو وادیِ سندھ ہی میں سدھایا گیا تھا۔ اور جنگل اگانے کے سلسلے میں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بابر نے اپنی تزک میں اٹک کے قریب گینڈوں کے شکار کا حال بیان کیا ہے۔

۶

مت ... پچھلے چند برسوں سے یہ سب مسلسل ہی تھی، رنجشیں سے رو بہ پسپائی ہی ہوئی جگہ سے مل جاتے
ہیں۔ معاشیات کے میدان میں یہ رنجشیں کوئی کام شروع کرتے، خطرہ مول لیتے، دولت پیدا کرتے، نقصان
برداشت کرنے اور مسابقت کی ان صلاحیت سے وہ پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ عام لوگوں کے درمیان کام
کے عمل میں بھی یہ بڑی آنکھوں سے دیکھی جا رہی صلاحیت جیسے رخصت ہو چکی ہے۔ اس کی
ایک مثال لیجیے ... پاکستان سے جو محنتی ذہنیت کے باہر جاتے ہیں، سوال ہے کس طرح خود کو اور
بے شک وہ خوشحال بنا سکے؟ ان کی ... کمی ہوئی۔ قسمیں ... نہیں تو ہم ... دیہاتیوں کا تو ... جو ہمارا
... ہے، ... آباد ہو چکا ہے ... اور ... کے اشیر ... ہمارے ... ہیں ہمارے شہر ... کی ... رہا ہے۔
ان صلاحیت ان ... ان کی ... جو بچے دیہات میں پڑھے ہوتے ہیں ... کے ہاتھ
... بستیوں ... شہروں کا رخ ... رہے ہیں، مصنوعی بستیاں تعمیر کرتے ہیں، تعمیر کی
... اور ... بیٹھ ... دوست ... کی ... کی امید رکھتے ہیں۔ ملک سے
... ہجرت ... شہروں کی طرف آنے والوں کی ... ان کوششوں کی کامیابیوں کا ... ہمارے قومی
... کی ... سے تھیں۔ ان ... کا سبب ... ہے؟ کیا ان کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے
... ہمارے عام لوگوں کی نسبت کمزور تھیں سے ... ہیں؟

ہمارے ... آج ... کہ غریبوں کے لیے مکانات تعمیر کرنے کے وعدے کرتے ہیں۔
... سے ... مصنوعی ... ان سے عداوت کرتے ہیں۔ یہ تین باتیں ... پیش
آتی ہیں: اول، مکانوں کی تعمیر ... تیس سال تک چلتی رہتی ہے؛ دوم، ... ان مکانوں
کی قیمت ... نہیں ... اور سوم، یہ مکان خوشحال لوگوں اور سیٹھوں ... کے قبضے میں چلے جاتے
ہیں۔ ... دوسری طرف کچی آبادیوں میں ... محنت کش لوگ ... اور ... سرکاری محکمے کی مدد
کے ... خود مکان تعمیر کر لیتے ہیں؛ ان ... والوں کی ... یا ... کوئی امداد اور
... کی ... حاصل ہوتی ہے۔ صرف ... پچھلے پچیس برسوں میں ایک لاکھ
... مکان اسی طرح ... ہیں ... ان مکانوں میں ... کاریگر، چھوٹے تاجر، کلرک، دکاندار
... رہتے ہیں ... ہمارے ... روزگاروں کو روزگار دینے کے وعدے
... میں ... عظیم منصوبوں کا اعلان کرتے ہیں۔ ... یہ ... ایک ایسا وعدہ ہے جس کے
... کوئی ... ایک طرف ... بد عنوانی اور بد انتظامی کے باعث ہماری معیشت تباہ ہوتی
چلی جاتی ہے ... اور ... کچھ ... سکتے ... رہی ہے ... دوسری جانب
بے تحاشا بڑھتی ہوئی آبادی کے ... روزگار ... کی تعداد ... مسلسل ... ہے۔ ... شیوں کو

ملازمتیں دینے کے باعث عجیب و غریب مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ سرکاری محکموں، کارپوریشنوں، خود مختار اداروں، بینکوں اور فیکٹریوں میں ملازموں کی تعداد کا وہ عالم ہے کہ [illegible] کے لیے مناسب جگہ کا [illegible] کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ [illegible] ہے۔ تنخواہ [illegible] کا خرچ [illegible] ہیں۔ [illegible] پڑھے لکھے بے روزگاروں پر [illegible] ہے۔ [illegible] بہت چھوٹی سی اقلیت [illegible] رہتا ہے۔ سرکاری سیاست اور اخباروں کے شور و غل سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ [illegible] ڈگریاں رکھنے والوں کو روزگار [illegible] نہیں [illegible] ہے، چاہے کسی بھی طریقے سے کیوں نہ ہو۔

محنت کش طبقے کے لوگوں نے جس طرح سرکاری ملازموں کی تعلیم کا [illegible] اپنا لیے ہیں، اسی طرح وہ سرکاری روزگار کا بھی انتظار نہیں کرتے بلکہ اپنا روزگار خود پیدا کرتے ہیں۔ اورنگی میں ہم نے مشاہدہ کیا کہ [illegible] روزگاری کا مقابلہ کرنے کے لیے محنت کشوں نے [illegible] چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتیں اور کاروبار قائم کر رکھے ہیں، اپنے گھروں [illegible] عورتیں مردوں کے ساتھ مل کر کاروبار [illegible] کرتے ہیں [illegible] وسیع مارکیٹ سے پوری طرح [illegible] ہیں۔ [illegible] وہ کاروبار میں کامیابی سے مسابقت کرتے ہیں۔ [illegible] اورنگی ٹرسٹ کی طرف سے [illegible] قرضے دے کر [illegible] رہا۔ اگرچہ ہم نے اورنگی میں [illegible] گھریلو یونٹوں کی تعداد کا سروے نہیں کیا ہے، ہمارا اندازہ ہے کہ [illegible] کے دس ہزار یونٹ کام کر رہے ہیں۔ ٹرسٹ [illegible] ہے۔ ٹرسٹ کے قرض دار یونٹوں میں سے ۳۵۵ یونٹ مکمل طور پر عورتوں کے زیرِ انتظام ہیں۔

اس میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں کہ محنت کش طبقے کے لوگ محنت کی عادت اور کاروبار کی صلاحیت کی تربیت زندگی کے سخت گیر مدرسے میں حاصل کرتے ہیں۔ دوسری طرف ہم گریجویٹوں (جن میں میں بھی شامل ہوں) کو کالج کی تعلیم نازک مزاج بنا دیتی ہے۔ ہم محفوظ، مراعات یافتہ اور آرام دہ ملازمتوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ہم سختیاں اٹھانے اور خطرہ مول لینے سے ڈرتے ہیں۔ ہم محنت کی روٹی کمانے کے عادی نہیں ہیں۔ محنت کی روٹی کی [illegible] ہماری بے عملی اور بد انتظامی کی بنیادی وجہ ہے۔

ہمارے تجربے اور تحقیق کی بنیاد پر اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے محنت کش طبقوں میں کاروباری صلاحیت اور سکت وافر مقدار میں موجود ہے۔ لیکن ہمیں بڑی خوشگوار حیرت اس بات پر ہوئی کہ ہمارے قرض داروں میں کالج کے گریجویٹ بھی تھے جو وقت ضائع کیے، محنت کرنے اور خطرہ مول لے کر گھریلو کاروبار قائم کرنے کو تیار تھے۔ میں ان میں سے چند کے مختصر حالات پیش کرتا ہوں۔

محمد جمیل گلشنِ بہار، سیکٹر ۱۲، اورنگی میں رہتا ہے۔ وہ بہاری یعنی بنگلہ دیش سے آیا ہوا اردو

بولنے والا مہاجر ہے۔ اس نے ۱۹۷۶ میں بی اے پاس کیا اور ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر اسے ملازمت نہ ملی۔ اسے اپنے گھر کے آٹھ افراد کا پیٹ پالنا تھا۔ اس نے چند سو روپے حاصل کیے اور سبزیاں بیچنے لگا۔ وہ ہر صبح چار بجے سبزی منڈی جا کر مال لاتا ہے۔ اس کے گھر کی عورتیں سبزیوں کو دھوتی اور چھانٹ کر الگ الگ کرتی ہیں۔ ۱۹۹۱ میں جمیل نے اورنگی ٹرسٹ سے چھ ہزار روپے قرض لیے تاکہ اپنا کاروبار بڑھا سکے۔ اب اس کی روزانہ آمدنی دو سو روپے ہے۔ جولائی ۱۹۹۳ تک جمیل اپنے قرض کی اصل رقم میں سے چار ہزار روپے اور سود کے سات سو روپے ادا کر چکا تھا۔

محمد طفیل سیکٹر ۱۴ ای اورنگی میں رہتا ہے۔ اس نے ۱۹۸۹ میں بی اے اور اس کے بعد ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ اسے کوئی ملازمت نہ ملی۔ اس نے پہلے تین مشینوں پر پلاسٹک کی مصنوعات بنانے کا کام شروع کیا لیکن یہ کام چل نہ سکا۔ فروری ۱۹۹۱ میں اس نے ٹرسٹ سے ۱۰ ہزار روپے قرض لے کر کپڑے کے سوٹ بیچنے کا کام شروع کیا جو خاصا منافع بخش ثابت ہوا۔ دوپہر تک وہ وکیل کے طور پر کام کرتا ہے اور دوپہر کے بعد اپنی دکان چلاتا ہے۔ اس نے اصل رقم کے پانچ ہزار روپے اور سود کے ۱۶۰۰ روپے ادا کر دیے ہیں۔

محمد عالم سہراب جو کھیو گوٹھ گڈاپ میں رہتا ہے۔ اس نے ۱۹۹۰ میں بی اے کیا اور تنخواہ دار ملازمت تلاش کرنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ اس کے باپ نے، جس کے پاس ایک ہوٹل اور دو ٹرک ہیں، اسے اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی مگر محمد عالم کو یہ کام گھٹیا معلوم ہوتا تھا۔ تاہم بعد میں اس کے خیالات بدل گئے۔ اس نے ہوٹل کے گاہکوں کو چائے اور کھانا دینا اور ٹرک چلانا سیکھ لیا۔ ۱۹۹۳ میں محمد عالم نے اپنے ایک ٹرک کی ری کنڈیشننگ کے لیے ۵۰ ہزار روپے کا قرضہ لیا۔ اب وہ ٹرانسپورٹر اور ہوٹل مینیجر کا کام خوشی سے کر رہا ہے۔ اس کی آمدنی بڑھ چکی ہے۔ چھ مہینے میں اس نے ۱۷ ہزار روپے اصل رقم اور ۳ ہزار روپے سود ادا کر دیا تھا۔

رئیس سلیمان بہاری مارکیٹ میں رہتی ہے۔ وہ ہندوستان سے آنے والے مہاجروں میں سے ہے۔ اس نے ۱۹۷۶ میں ایم اے کیا اور شادی کر کے پاکستان آ گئی۔ اس کا شوہر بے روزگار تھا۔ رئیس نے بیوٹیشین اور ٹیلرنگ کی تربیت حاصل کی اور اپنے گھر میں بہت چھوٹے پیمانے پر کام شروع کر دیا۔ نومبر ۱۹۹۳ میں اس نے اورنگی ٹرسٹ سے زگ زیگ سلائی مشین اور بیوٹی پارلر کے لیے قرضہ لیا۔ اب اس کے پاس آرڈروں اور گاہکوں کی بڑی تعداد ہے۔ وہ ایک اسکول کی صبح کی شفٹ میں استانی کے طور پر بھی کام کرتی ہے۔ اس کے شوہر نے فوٹو گرافی کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس نے اپنے قرض کے تین ہزار چار سو روپے اور سود کے پانچ سو روپے ادا کر دیے ہیں۔

مہ جمال نے ۱۹۸۹ میں بی اے کیا۔ اس کے کچھ ہی دن بعد اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی اس لیے بیوہ ماں اور پانچ بہن بھائیوں کا خیال رکھنے کی ذمہ داری اسی پر آ گئی۔ اسے ملازمت نہ ملی، چنانچہ اس نے بیوٹیشن کی ٹریننگ لی اور جون ۱۹۹۱ میں ٹرسٹ سے

۱۵ ہزار پانچ سو روپے قرض لے کر گھر ہی میں بیوٹی پارلر کھول لیا۔ اس کی دو چھوٹی بہنیں بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگیں۔ اب اس کا بیوٹی پارلر خوب چل نکلا ہے۔ اس کی آمدنی سے اس نے اپنی دو بہنوں کی شادی کر دی ہے۔ وہ اپنے قرض میں سے ۱۳ ہزار ۳ سو روپے اور سود کے دو ہزار آٹھ سو روپے ادا کر چکی ہے۔

رضوان میر سیکٹر ۷ ای اورنگی میں رہتا ہے۔ ۱۹۸۳ میں اس کے باپ کے انتقال کے بعد اس کا خاندان غریب ہو گیا۔ اس کی حوصلہ مند ماں سلائی کر کے کسی طرح گھر کا خرچ چلاتی رہی۔ بعد میں اس کی سب سے بڑی بہن سعدیہ ایم اے کر کے لیڈی ہیلتھ وزیٹر بن گئی۔ رضوان نے ۱۹۸۹ میں بی ایس سی کیا اور کوئی بھی ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ چنانچہ اس نے اپنے ایک اور گریجویٹ دوست کے ساتھ مل کر اپنے گھر میں چمڑے کے بے کار ٹکڑے جوڑ کر شیٹیں بنانے کا چھوٹا سا کارخانہ کھول لیا۔ جولائی ۱۹۹۱ میں رضوان نے ٹرسٹ سے ۳۵ ہزار روپے قرض لے کر ایک کمرہ بنوایا اور کچھ اور مشینیں خریدیں۔ اس کا کاروبار خوب پھیل گیا اور اب دس کل وقتی مزدوروں اور محلے کی آٹھ جز وقتی کارکن عورتوں کو روزگار فراہم کر رہا ہے۔ اس کے کارخانے میں ہینڈ بیگ اور پرس تیار ہوتے ہیں۔ رضوان کے دو چھوٹے بھائی کالج میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ سلائی کا بھی کام کرتے ہیں۔ رضوان قرض کے ۱۱ ہزار ۸ سو ۵۰ روپے اور سود کے ۳ ہزار پانچ سو بیس روپے ادا کر چکا ہے۔

محمد امجد اورنگی کے سیکٹر ۵ ای میں رہتا ہے۔ اس کی ماں ایک ہوشیار عورت ہے جس نے او پی پی کی درخواست پر ۱۹۸۳ میں عورتوں کا پہلا ورک سنٹر قائم کیا۔ پہلے پہل اسے اپنے قدامت پرست ہمسایوں کی طرف سے طعن اور طنز و استہزا کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس کے عزم کی بدولت یہ سنٹر نہ صرف تجارتی طور پر کامیاب رہا بلکہ اس نے دوسری سفید پوش گھریلو عورتوں کے لیے مثال بھی قائم کی۔ نو برس کے عرصے میں اورنگی بھر میں سلائی کے سیکڑوں مرکز کھل گئے۔ زاہدہ بیگم کا سنٹر ایک دو منزلہ مکان میں قائم ہے اور تقریباً سو عورتیں وہاں کام کرتی ہیں۔ اس کا منجھلا بیٹا امجد اسکول اور کالج کی تعلیم کے دوران بھی اس کاروبار میں سرگرمی سے شریک رہا۔ بی اے کرنے کے بعد اس نے کل وقتی طور پر سنٹر کا انتظام سنبھالنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایک ہوشیار ماں کا ہوشیار بیٹا ہے۔ زاہدہ بیگم کو سنٹر کی سلائی مشینیں خریدنے کے لیے ۷۵ ہزار روپے کا قرضہ دیا گیا تھا۔ وہ ۲۳ ہزار روپے لوٹا چکی ہے۔ پھر اس نے مکان کی دوسری منزل بنوانے کے لیے ۶۵ ہزار روپے کا قرضہ لیا جس میں سے ۳۳ ہزار روپے کی اصل رقم اور ۵ ہزار روپے سود ادا کر چکی ہے۔

جوں جوں ہمارا کام آس پاس کے گوٹھوں میں پھیل رہا ہے، وہاں بھی ہمیں باہمت گریجویٹ نوجوان ملتے جا رہے ہیں۔ سہراب جوکھیو گوٹھ کے محمد عالم کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں عبدالغنی جوکھیو بھی ملا۔ وہ گریجویٹ ہے اور کراچی کے ایک دفتر میں پی آر او کے طور پر ملازم ہے، لیکن اب بھی گوٹھ ہی میں رہتا ہے۔ ستمبر ۱۹۹۱ میں اس نے اورنگی ٹرسٹ سے ۲۰ ہزار روپے قرض لیے اور اپنی بچت کے ۲۵ ہزار روپے ملا کر اپنے کنویں کو گہرا کیا اور اس پر ایک پمپ لگا لیا۔ پہلے سے اور

ان کے گوٹھ والوں کو پینے کا پانی خریدنا پڑتا تھا، اب وہ پانی سوئی سے حاصل کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس نے
عمارتی لکڑی کے درخت، پھل دار پیڑ اور سبزیاں کاشت کر لی ہیں۔ ان سے اسے خاصی آمدنی ہوتی
ہے جو پیڑوں کے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائے گی۔ اس نے پیسہ پورا قسطیں، مع ۳۴۰ روپے سوا ۱۲۳
روپے سود کے، چکا دیا ہے۔

آخر میں ایک زبردست ساجی کارکن، نصیر جو کھیوا گوٹھ کے چودھری تھے، کے دو بیٹوں کا ذکر ہوں
گا۔ یوسف کو ایم بی بی ایس کرنے کی آرزو تھی، جو پوری نہ ہو سکی۔ وہ صرف بی اے کی ڈگری حاصل کر
سکا۔ چنانچہ اس نے ہومیوپیتھی سیکھی اور ایک میڈیکل سٹور کھول لیا۔ مئی ۱۹۹۱ میں اس نے
ٹرسٹ سے دس ہزار روپے قرض لے کر اپنی دکان کو وسیع کیا۔ وہ پورا قرض، ۶۲۵ روپے سود
سمیت ادا کر چکا ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی ہوں گش بھی گریجویٹ ہے۔ وہ بھی گوٹھ ہی میں رہتا ہے۔ اس
نے عمارتی لکڑی اور پھلوں کے درخت لگائے ہیں اور سبزیاں اگا رہا ہے۔

زندگی کا سبق یہ ہے: ہمارے محنت کش طبقے کے لوگوں کی محنت، ہوشیاری اور کفایت شعاری
سکتی ہے۔ دوسری طرف ہماری کلاس کی تعلیم صنعتی ... پسند اور محنت کی روزی کا شوق ہماری ہے۔
افسوس کہ یہ بات کارساز نہیں ہے۔ ہمیں اپنے محنت کشوں کی پیروی کرنی چاہیے، جنہوں کا اختیار
کیا ہو محنت، ہوشیاری اور کفایت شعاری کا راستہ ہی نجات کا راستہ ہے۔ یہ اچھا شگون ہے کہ کچھ
گریجویٹوں نے بھی ان کی پیروی کی ہے۔ ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ اور لوگ بھی یہی راستہ اختیار کریں گے۔

۷

اخبار پڑھنے کی لت کے شکار دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی روز بروز اور جدیدیت کی روز مرہ
خبروں سے ہوتا ہوں جس سے مسلط خبریں مجھے بھی وقتی طور پر ... بھی شامت کا ذکر ان سے حاصل
ہوتا ہے تب مجھے خیال ہوتا ہے کہ میں یا تو خبطی ہوں یا بد ... ہوں۔ تاہم ایسی ہوش مندی کو
برقرار رکھنے کے لیے میں ہر روز اورنگی کے محنت کشوں کے پاس جاتا ہوں۔ ہمارے ورکنگ طبقے کی طرح،
ہمارے چہرے روشن نظر ... چہروں کی طرح، اور وہ بھی ایک عظیم سماجی عمل سے گزر رہے ہیں،
جس کی تعمیر کی بات ... کے ذہنوں میں کسی انتشار کا گزر نہیں ہے۔

میں چودہ برس سے ان لوگوں کا مشاہدہ کر رہا ہوں اور ان کے لیے میری تحسین بڑھتی جا رہی
ہے۔ وہ بد ... کے ہیں اور ... مہارت رکھتے ہیں۔ وہ خوب ... آنکھوں والے نظریہ بازوں
سے کہیں بلند ... انسانی حقیقتوں سے ... حاصل کرتے ہیں اور ان کا ایک ... استعداد پیدا کر
سکتے ہیں۔ ہمیں کسی بیرونی فکر ... سے ... کا کوئی خطرہ محسوس

نہیں ہوا۔ کسی مضبوط پیڑ کی طرح ان کی جڑیں مٹی سے پیوست ہیں اور ان کی شاخیں نئی ہواؤں کو خوش آمدید کہتی ہیں۔

اورنگی کے لوگوں نے ورثے میں تین بنیادی روایتیں پائی ہیں: مذہبی، علاقائی اور معاشرتی۔ دراصل یہ ایک ہی کلچر کے تین مختلف رخ ہیں۔ اس وقت یہ پورا کلچر ایک جدید شہر کے اندر رہتے ہوئے زندہ رہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لوگوں کا اصل مسئلہ اپنی اقدار کو بیک وقت باقی رکھنے اور ان کی شکل تبدیل کرنے کا ہے۔ ماضی اور حال دونوں سے ان کا رشتہ برقرار رہے، تاکہ وہ دونوں انتہاؤں میں قدامت پرست یا جدیدیت پرست بننے سے محفوظ رہ سکیں، تاکہ وہ محض ماضی یا حال میں سے کسی ایک میں تبدیل ہو جانے سے بچ سکیں۔

مذہبی روایت لوگوں کا رشتہ کائنات کے خالق سے، مابعدالطبیعیاتی قوتوں سے اور اپنے ساتھی انسانوں سے جوڑتی ہے۔ ان لوگوں کے لیے مسجد روحانی اور سماجی قوت کے مرکز کے طور پر اتنی ہی اہم اور زندہ ہے جتنی ماضی میں تھی۔ ہر نئے قائم ہونے والے سیکٹر میں ایک مسجد بنائی جاتی ہے اور اس میں ایک امام کو مقرر کیا جاتا ہے۔ ۱۹۸۲ کے ایک سروے سے معلوم ہوا تھا کہ گزشتہ تیرہ سال کے عرصے میں مقامی کمیٹیوں نے ۱۶۸ مسجدیں تعمیر کیں۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ان سب کے امام علاقے کے باہر سے بلوائے گئے تھے۔ بظاہر اورنگی کے لوگوں کو یہ مقدس پیشہ اختیار کرنے میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی۔ اماموں کا روحانی رہنماؤں کی حیثیت سے احترام کیا جاتا ہے لیکن سیاسی رہنماؤں کے طور پر انھیں ووٹ نہیں ملتے۔ مدرسوں کو ثواب کی خاطر خوب چندے دیے جاتے ہیں، لیکن خود اپنے بچوں کو لوگ اسکول ہی بھیجنا پسند کرتے ہیں۔

اپنے آباواجداد کی طرح اورنگی کے لوگوں نے روحانی قوتوں سے اپنا رشتہ برقرار رکھا ہے۔ وہ کسی مشکل کا سامنا ہونے پر مسجد سے رجوع کرتے ہیں۔ جب کسی بچے کو کوئی بیماری ہو تو اس کی ماں اس کی صحت یابی کے لیے دعا مانگتی ہے۔ لیکن ایک نازک سا فرق محسوس کیا جا سکتا ہے: ماں دعا بھی مانگتی ہے اور بچے کو ڈاکٹر کے پاس بھی لے جاتی ہے۔ ہماری لیڈی ہیلتھ ورکرز بتاتی ہیں کہ مائیں، دادیاں، نانیاں اور یہاں تک کہ بوڑھی عورتیں تک ہماری ہیلتھ ٹیموں سے بیماریوں کی روک تھام اور بچوں کی پیدائش کے درمیان وقفہ رکھنے کے طریقے بہت شوق سے سیکھتی ہیں۔ روحانی قوتوں اور دعاؤں سے ان کا رشتہ جدید حفظانِ صحت اور ضبطِ تولید سیکھنے میں قطعی مانع نہیں ہوتا۔ اورنگی میں روحانی رشتہ لوگوں کو ان مشکلات کا سامنا کرنے کی قوت بہم پہنچاتا ہے جو انسانی زندگی کا حصہ ہیں۔ سماجی رشتے، جو انسان اور سماجی دائرے کے مذہبی تصورات کی پیداوار ہیں، سب ہی خاندانوں، گلیوں اور محلوں کو جوڑے رکھتے ہیں۔ لیکن یہ روحانی یا سماجی رشتے بنیادی طور پر مذہبی نوعیت کے ہونے کے باوجود اورنگی کے لوگوں کے جدید زندگی کے طور طریقے اپنانے کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالتے۔ اس کے برعکس، ان رشتوں کی بدولت ان کی زندگیوں میں نئے حالات کا سامنا کرنے کے لیے زیادہ لچک آ جاتی ہے۔

Scanned with CamScanner

خاندان کے رشتے اورنگی میں ہمیشہ کی طرح مضبوط ہیں۔ دوسرے طبقوں اور برادریوں کے برعکس، ابھی ان میں شکست و ریخت کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ متحد خاندان کسی بھی برادری کے لیے ایک بڑا اثاثہ ہوتے ہیں۔ اورنگی میں خاندانوں کے اندرونی اتحاد نے نئی بستیاں آباد کرنے اور انھیں رفتہ رفتہ بہتر بنانے کے عمل میں بہت اہم حصہ لیا ہے۔ اورنگی کی گلیوں میں گاؤں کی اجتماعی روح نئے سرے سے زندہ ہو گئی ہے۔ اسی اجتماعی روح کے بل بوتے پر اورنگی کی ہزاروں گلیوں کے رہنے والوں نے نکاس کا ایک پورا نظام اپنے خرچ پر اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا ہے اور اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جب تعمیر کے اس عظیم کام کے دوران لوگوں نے اپنے کم مایہ ہمسایوں کی مالی امداد کی۔ اس طرح مذہبی روایت کے پیدا کیے ہوئے خاندانی اور سماجی رشتوں نے نکاس کا جدید نظام اپنانے میں اورنگی کے لوگوں کی مدد کی۔

کوئی بھی مشاہدہ کرنے والا ذرا سی توجہ سے دیکھ سکتا ہے کہ مذہبی روایت سے برآمد ہونے والے چار اخلاقی اصولوں — محنت، کفایت شعاری، احسان اور انکسار — کی اورنگی میں (ظاہر ہے کہ عمومی طور پر) اب بھی پابندی کی جاتی ہے۔ ہماری روایت کاہلی پر جفاکشی کو، شان و شوکت پر سادگی کو، خودغرضی پر احسان کو اور تکبر پر انکسار کو ترجیح دیتی ہے۔ اور اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ اورنگی کے لوگ سخت محنت کرتے ہیں، سادہ زندگی گزارتے ہیں، اپنے ساتھی انسانوں سے حسنِ سلوک کرتے ہیں اور عیاشی اور بدمعاشی سے دور رہتے ہیں۔ ان خوبیوں نے انھیں اس قابل کیا ہے کہ انھوں نے کفایت شعاری سے کام لے کر اپنے مکان، اپنا نکاس کا نظام، اپنے اسکول، اپنے ہسپتال خود بنائے ہیں اور اپنی ٹرانسپورٹ کا خود بندوبست کیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ، میکس ویبر کی پروٹسٹنٹ اخلاقیات کے اصولوں کی طرح، اورنگی کے لوگوں کے مذہبی اخلاقی اصولوں نے ان کے مضبوط خاندانی رشتوں سے تقویت حاصل کر کے ان ہزاروں گھریلو صنعتوں اور تجارتوں کو جنم دیا ہے جن کے ذریعے سے وہ مہنگائی اور بےروزگاری کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

بڑے شہر کی صنعتی تہذیب کے دباؤ نے، جسے اورنگی کے باشندوں نے بخوشی اپنایا ہے، اور ہماری بدانتظامی کی شکار معیشت کی پیدا کردہ بےپناہ مہنگائی نے اورنگی کے معاشرے میں عورت کے کردار کو ڈرامائی طور پر بدل دیا ہے۔ پرانے پدرسری طریقے سے زندگی گزارنا اب ناممکن ہو گیا ہے۔ ان لوگوں نے پردہ نشینی سے چمٹے رہنے کے بجائے آزاد معاشی کارکن بننے کے عمل میں اپنے گھر کی عورتوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اورنگی کی گھریلو صنعتوں میں عورتیں اکثریت نہیں تو ایک بہت بڑی اقلیت کے طور پر حصہ لے رہی ہیں۔ یہ عورتیں صرف کارکن یا مزدور ہی نہیں، اپنے کاروبار کی خود مالک بھی ہیں۔ اس کے علاوہ لڑکیاں پہلے سے کہیں زیادہ بڑی تعداد میں اسکول میں پڑھ رہی ہیں۔ ۱۹۸۹ میں کیے گئے ایک سروے سے معلوم ہوا کہ اسکول کے ۸۰ ہزار طلبا میں ۳۶ ہزار (یعنی ۴۵ فیصد) لڑکیاں ہیں۔ اسکول کے ۲۳۸۹ استادوں میں سے ۱۶۳۶ (یعنی ۶۸ فیصد) استانیاں ہیں۔ مزید یہ کہ اورنگی کے

۸۷ فیصد اسکولوں میں مخلوط تعلیم رائج ہے۔

میں نے ان باروزگار عورتوں، ان استانیوں اور ان طالبات کا بڑی احتیاط سے مشاہدہ کیا ہے۔ بلاشبہ یہ عورتیں ہمارے معاشرے کا ایک بالکل نیا مظہر ہیں۔ وہ میری ماں کی طرح پردہ نشین نہیں ہیں۔ عملی زندگی میں بھرپور حصہ لینے کے باوجود انھوں نے پرانی تہذیب کے نسوانی وقار کو قائم رکھا ہے۔ وہ میری ماں کے برعکس نہ چادر اوڑھتی ہیں نہ چاردیواری میں قید رہتی ہیں۔ اس کے باوجود بنیادی طور پر ان کے طور طریقوں میں اتنی ہی حیاداری موجود ہے جتنی میری ماں کے طور طریقوں میں تھی۔

میں ان باروزگار عورتوں، ان استانیوں اور ان طالبات کے وجود کو اورنگی کے لوگوں کی سب سے نفیس کامیابی سمجھتا ہوں۔ یہ عورتیں ماضی اور حال کے درمیان ایک زندہ رشتے کی سب سے نمایاں مثال ہیں، اور اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی ہماری تیاری کی بہترین علامت ہیں۔

**

اختر حمید خان کراچی شہر کی محترم ترین شخصیات میں سے ہیں۔ کراچی کے شہری انھیں اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے روحِ رواں کے طور پر جانتے ہیں۔ یہ سماجی تنظیم اپنے بنیادی فلسفے کے اعتبار سے دوسری غیر سرکاری سماجی تنظیموں سے مختلف ہے، اور اس کی پشت پر اختر حمید خان کی وہ دانش کارفرما ہے جو ان کی زندگی کے قیمتی تجربات کا حاصل ہے۔

اس کتاب میں شامل مضامین کا متن ان کی کئی انگریزی تحریروں کا ترجمہ اور تدوین کرکے تیار کیا گیا ہے۔ ان تحریروں کی تفصیل یہ ہے:

1. "What I learnt in Comilla and Orangi",
2. "Personal Reminiscences of Change",
3. "The Good Earth of Dildar Goth",
4. "Learning lessons from Orangi",
5. "Graduate Entrepreneurs"

ان پانچوں مضامین کو یونیسیف کے زیرِ اہتمام مارچ ۱۹۹۳ میں اسلام آباد سے ایک مجموعے کی صورت میں Personal Reminiscences of Change کے نام سے شائع کیا گیا۔ ان مضامین کے علاوہ اردو متن کی تیاری میں اختر حمید خان کی اس تقریر سے بھی مدد لی گئی ہے جو انھوں نے ۱۲ نومبر ۱۹۹۵ کو Megacities: Crisis and Challenges کے موضوع پر آغا خان یونیورسٹی کے میں ہونے والے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کی تھی۔ ان کے مضامین کا ایک انگریزی مجموعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والا ہے۔

Scanned with CamScanner

آصف فرخی

اس شہر میں رہنا

لوگ اپنے شہروں کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہی آئے ہیں۔ ایسے شہروں کو، انگریزی محاورے کے مطابق، میں چٹکی بھر نمک کے ساتھ لیتا ہوں۔

مجھے کب سے یہی سنتا آیا تھا: آسماں کی کیا مجال کہ ہم سے چھڑائے لکھنؤ۔ میں نے اس لکھنؤ کے بارے میں پڑھا تھا جہاں میرے ابا پیدا ہوئے تھے۔

وہی جو اک شہر تھا عالم میں انتخاب، اور دلی کے کوچے جو اوراق مصور تھے وغیرہ۔ اس شہر کے بارے میں جہاں میری نانی پیدا ہوئی تھیں اور جس کی نسبت سے میرے ننھیال والے اپنے نام کے آگے اس شہر کا نام لگایا کرتے تھے۔

یہ اور ایسی اور بھی باتیں میرے ذہن کی اس منطق کا حصہ ہیں۔ جس شہر میں میں نے آنکھیں کھولیں، اس شہر کے لیے میں ایسی باتیں نہیں کر سکتا۔

جن دنوں میں بڑا ہو رہا تھا، ان دنوں کا کوئی احساس مجھے یاد نہیں کہ ہم کراچی میں رہ رہے ہیں، رہے، ہو سو۔ ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا! پانی پینے اور سانس لینے کی طرح ایک بے رنگ و بو اور ہمہ وقت جاری لازمی کیفیت تھی کراچی میں رہنے کی۔ اب کہیں نہ کہیں اور سب ہے، کراچی ہی سہی۔ یہ کہ اس شہر میں رہنا کوئی ممیز یا معنی خیز بات ہے۔ اگر یہ کوئی خاص کیفیت تھی تو اس کا کوئی نام بھی نہیں تھا۔ ہم جیسے لوگوں کا بھی کوئی نام نہیں تھا۔ کراچی والے میں اصطلاحی عصبیت کا ٹھپا تو کافی دنوں بعد لگا تھا۔ مختار مسعود نے ایک وقت کہا، اگرچہ، جسے سن کر مجھے کئی پہیلیاں یاد آ جاتی ہیں۔ میری نانی نہیں سکتا اگر کہ لیتی تھیں اور جانے ان میں کی موت کے بعد تو سے وقت کام آتی نہیں یہ پہیلیاں۔ جو اگر ہم پردہ نہیں پڑھ سکتے تھے ان پر کلمہ پڑھ کر پھونکا کرتے تھے کراچی کے باسیوں کا تب شاید یہی مقصد رہ گیا ہے رہنے والوں کی گنتی۔

مگر میں ان دنوں کی بات کر رہا ہوں جب ہمیں کوئی بھی کراچی والے نہیں کہتا تھا۔ دلی والے ہیں، میری نانی کہتیں، محل میں ہوتی تھیں تو لوگ ان کے پیچھے پیچھے کہتے تھے۔ وہ سن لیتی تھیں تو برا ماں جاتا، برا نہیں۔ ہم لوگ سمجھتے ہو دلی والے اس وقت ہوتے ہیں نیز ہر چیز کی سنے والے اور آبادوں، جا

ریاؤں والے؟ ہم وہ نہیں ہیں!)

اس کے علاوہ کبھی کبھی یہ سننے کو ملتا کہ ہندوستانی ہیں۔ اب جو سننے کو ملتا ہے اس میں ذرا جرم کی سی ظلمیت ہے۔ "ابو، آپ جھوٹ بولتے ہیں، ہم سندھی نہیں ہیں،" میری چھ سالہ بیٹی نے پچھلے اسکول کے ساتھیوں سے سن کر طے کر لیا ہے۔ "سارے مہاجر دہشت گرد نہیں ہوتے،" روزانہ اخبار میں کوئی نہ کوئی صاحب تھوڑا تسلی دیتا ہے۔ ہم اپنی شناخت کسی نہ کسی منفی تعریف سے حاصل کرتے ہیں۔ ہم یہ ہیں جو وہ نہیں ہے۔ ہم اردو بولنے والے ہیں ــــ جو سارے کے سارے دہشت گرد نہیں ہوتے۔ ہم کراچی والے ہیں ــــ اس لیے کہ ہم اور کہیں کے نہیں ہیں۔ ہم کہیں کے بھی نہیں رہے ــــ ہم یہاں کے بھی نہیں رہے!)

اور نام کے نہ ہونے پر مجھے اس وقت بھی حیرت ہوتی تھی۔ میں چھوٹا سا ہی تھا جب میرے ابا مجھے پہلی بار مشاعرے میں لے گئے۔ تخلص کیا ہوتا ہے اور نام کی نسبت کے ساتھ جڑی ہوتی ہے، یہ سب مجھے انھوں نے ہی بتایا تھا۔ ملیح آبادی، لکھنوی، دہلوی، امروہوی، بدایونی۔ ہم شاعروں کی طرف منھ پھاڑے میں سب کو سنتا رہا۔

اسٹیج پر گنگناتی ہوئی، مائیکروفون پر ترنم گھماتی ہوئی، وہ ایک مختلف، علیحدہ اور واضح دنیا تھی، جب کہ میں کچا کچا ادھ بنا سا تھا۔

یہ سارے اچھے لوگ دور کیوں تھے، پاس کیوں نہیں آتے تھے؟

ان میں کوئی کراچوی کیوں نہیں ہوتا؟ میں نے ابا سے پوچھا تھا۔

کیوں نہیں لگ جاتا ہے؟ میں نے پھر پوچھا تھا، جب انھوں نے کہا تھا کہ اس طرح کراچی کا نام تخلص کے ساتھ نہیں لگ جاتا۔ "تو پھر کراچوی لکھ دینا،" انھوں نے ہنس کر کہا ہوگا۔

بس میں یہی لکھ لوں گا، میں نے فیصلہ کیا تھا۔ تخلص بھی رکھنا تھا، کیوں کہ شاعری تو کرنی ہی تھی ــــ یہ طے سوچا تھا۔ بس تخلص کے مسئلے پر گڑبڑ ہو گئی اور شاعری کی بات وہیں رہ گئی۔ میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ جس تخلص پر دو رائے شہر تا ساتھ ہی یہ خیال بھی آتا کہ یہ تو صرف ایک کیفیت ہے، اس سے الگ کیفیت ہوئی تو کیا ہوگا۔ اور تخلص کے بغیر کسی نے کراچوی مان کر نہیں دیا! جو تک نے نہیں، جو چھپا بلا صدیقی چھوڑ کر دہی لکھنے لگے تھے۔ میری سالگرہ پر ساحرہ حیاتی کی تتلیاں اور پرچھائیاں تحفے میں دیں تو بہت اصرار کے باوجود میرے نام کے ساتھ کراچوی لکھ کر نہیں دیا۔ "تم خود ہی لکھ لو، ہم نہیں لکھتے ایسے ویسے تباہی نام،" انھوں نے حسب عادت ٹکڑا توڑ کر کہہ دیا۔ تخلص طے نہ ہو سکا، اس لیے شہر بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ میرے محلے کی چھ غزلیں بیاض میں بے منھ دیکھتی رہ گئیں ــــ ہیں، undecided کراچوی، جس کے نام پر ڈوئی نہیں لگائی جا سکتی۔

اس سے کون سا ایسا بھاری نقصان ہو گیا، کہ نام کی نسبت ظاہر نہیں ہوئی؟ ضبط و افتخار کی قسم کا جذبہ نہیں محسوس ہوتا اس شہر کے ہو سکے، جس طرح جنگ اخبار میں احمد ندیم قاسمی صاحب کا

[illegible] چھوٹی سی تصویر [illegible] دوسری [illegible] آگے نہیں بڑھا [illegible] نہیں [illegible] خوشنود محمد دہلوی [illegible] کی کتابوں میں [illegible] [illegible] آباد [illegible] پہاڑوں پر [illegible] ایک شہر کے [illegible] [illegible] مستقل کیا [illegible] نہیں [illegible] شہر [illegible] تعلق [illegible] شہروں [illegible] شہر [illegible] [illegible] شہر چھوٹے [illegible] کراچی کے [illegible] ۱۹۵۰ [illegible] شہر [illegible] سال [illegible] شہروں [illegible] ریل [illegible] ایک [illegible] تصویر [illegible] نقوش [illegible] شہروں کی [illegible] آگے نہیں بڑھی تھی۔

[illegible] کے احساس کی [illegible] وقت کا [illegible] وقت [illegible] دریافت [illegible] پس منظر کا حصہ [illegible] آگے بڑھ رہا ہے [illegible] (pl) [illegible] شاید [illegible] وقت [illegible] چھوٹی [illegible] شہر [illegible] [illegible] شہر [illegible] وقت [illegible]

اور جن گلیوں میں گھوما ہوں، وہ جگہیں بعض دفعہ یوں ہی بیٹھے بٹھائے یاد آتی ہیں اور آ کے چلی جاتی ہیں۔ اگر میں اپنے وقت کو کاغذ پر اتارنا شروع کروں تو کراچی کا نقشہ بنتے لگتا ہے۔ میری کل کہانی کا پلاٹ یہی ہے۔

وہ پہلی جگہ جس کا میں نے ہونا چاہا اور جو مجھ سے کترا کر نکل گئی، وہ لالوکھیت تھی۔ بس دو چار ہاتھ لب بام رہ گیا، چند ایک گلیوں کا فاصلہ۔ میں لالوکھیتا ہو جاؤں، میری شدید خواہش تھی۔ ناظم آباد نمبر ۳ اور لالوکھیت کے کسی درمیانی حصے میں، جس کی حد بندی بہت واضح نہیں تھی، پیدا ہوا تھا میں۔ (اذیت ہوئی کہ وہ لیڈی ڈاکٹر فوت ہو گئی، اور اس کا میٹرنٹی ہوم منہدم کر دیا گیا۔ بلدیہ عظمیٰ کراچی کے جاری کردہ سرٹیفکیٹ پر مقام پیدائش کراچی درج ہے۔) روشن سرائے کی چھت پر چڑھ کر میں صاف تک دیکھ سکتا تھا وہ میرے بچپن کی مانوس دنیا تھی۔ اس سے آگے کہیں لالوکھیت تھا ...... مجھے پتا تھا۔ امی اور چھوٹی خالہ وہاں سے سامان خرید لے جاتی تھیں، خاص طور پر کپڑے۔ ایک دفعہ بڑے بڑے پھولوں والا کپڑا خرید کر لائی تھیں جس کو دیکھ کر چھوٹی خالہ نے ناک بھوں چڑھالی تھی۔ بالکل لالوکھیتا لگتا ہے، انھوں نے کہا تھا۔ میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔ یہ کیسی جگہ ہے کہ [illegible] اس کھیت میں کپڑا ہوتا ہے پھر دیکھتے ہی سے پتا چل جاتا ہے! یہی ان بالوں کو دیکھ کر کہا گیا تھا جو مجھ سے بڑے لڑکے سائیکلوں پر آتے جاتے، ماتھے پر پیچھے بنا کر خوب بھی ہوئی، [illegible] سے لو مجھے بہت قابل رشک معلوم ہوتے۔ چھوٹی خالہ کا اعتراض سن کر میرا رشک اور بڑھ گیا [illegible] بہت واضح [illegible] ادھر سے چھپ کے جانے والے لوگ ہوتے ہوں گے شناخت کے باقی سارے مسائل سے مبرا؟ کسی علاقے سے اس طرح کا بھی تعلق ہو سکتا ہے کہ آدمی وہیں کا معلوم ہو؟ میں اور کسی [illegible] کا [illegible] تھا [illegible] شاید یہی سبب ہے کہ تعلق کے مسئلوں میں الجھا رہتا ہوں [illegible] لالوکھیت سے تعلق نہیں [illegible] آگ لگی تھی اُس دن سارے وقت گھر میں عجیب طرح کی باتیں ہوتی رہیں [illegible] مجھ سے چھپائی گئی لیکن پھر بھی اتنا سمجھ میں آیا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے [illegible] لالوکھیت ہے۔ جب ایسا ہوتا تو میں سمجھ جاتا کہ مجھ سے کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے لیکن [illegible] چھت پر [illegible] دیکھنے لگے۔ جس طرف مجھے بتایا گیا تھا کہ ادھر لالوکھیت ہے وہاں [illegible] آگ لگی ہوئی تھی۔ آسمان دھواں دھواں تھا۔ ادھر کی خاموشی میں دور کا شور گھلا ہوا تھا۔ لالوکھیت پر حملہ ہو گیا ہے۔ چھوٹی خالہ نے مجھے چپکے سے بتایا۔ [illegible] کے آدمی، یہاں کے لوگوں سے مس فاطمہ جناح کو ووٹ دینے کا بدلہ لے رہے ہیں۔ لاشیں اور گلاب کا پھول۔ میں کچھ سمجھ نہیں۔ دعا مانگو! مجھ سے کہا گیا۔ دعا مانگو کہ وہ لوگ لوٹ مار کرتے ہوئے، آگ لگاتے ہوئے لالوکھیت سے نکل کر یہاں نہ آ جائیں۔ لالوکھیت کی سرحد بہت واضح ہو چکی تھی میں سرحد کے اس پار پیدا ہوا تھا۔

ایک محلہ ناظم آباد چار نمبر سے کچھ دور تھا: پاپوش نگر۔ ہمیں اس بات پر بہت ہنسی آتی تھی۔ کمرے کی میز پر کوئی اگر ایک سرے پر بیٹھا ہوتا کہ سالن اور روٹی کا وہاں تک پہنچنا مشکل ہوتا ہو تو کوئی ہانک لگاتا: بھئی ادھر بھی کچھ دے دو، ہم پاپوش نگر میں بیٹھے ہیں۔ وہ علاقہ تو اب کا شہر کے گنجان حصوں میں آگیا، ہمارے یہاں یہ مذاق اب بھی چلتا ہے۔ شہر کا نقشہ ایک گھر کے مذاق سے زیادہ تیزی سے بدلتا ہے۔

اس طرف گھر تھا جہاں وہی دیکھی بھالی روز کی مانوس چیزیں تھیں، اور دوسری طرف لالوکھیت جہاں بازار کا سماں تھا، جہاں واقعات پیش آتے تھے۔ مجھے شروع ہی میں اندازہ ہو گیا تھا۔ ایک آدمی نے دو بچوں کو چڑیا بنا کر لالوکھیت کے چڑیا بازار میں بیچ دیا، روزنامہ جنگ میں خبر چھپی تھی۔ (صبح کے وقت برآمدے میں بیٹھ کر میرے نانا چاہتے میں پاپا ڈبو کر کھانے اور میں ایک فرماں بردار طوطے کی طرح انھیں خبریں پڑھ کر سنایا کرتا۔ میں اخبار پڑھنا سیکھ رہا تھا۔) انھی دنوں میں نے اس خبر سے مجھے اتنا ڈرا کر میں کئی دن گھر سے باہر نہیں نکلا، مجھے بخار چڑھ گیا۔ بخار کی حالت میں کھڑکی کی سلاخوں میں سے املی کے پیڑ میں اٹکے ہوئے بجلی کے تار اور حالت گدلو آسمان کی اجنبیت مجھے یاد ہے ــــ ڈر کا رنگ یہ ہوتا ہے۔ ایسے عجیب و غریب لوگ شہر میں ہوتے ہیں، میں نے سوچا ہوگا؛ لیکن کیا ان دنوں اخبار کی سرخی سے زیادہ اعتبار کس کا ہو سکتا تھا؟ شہر گردوں توڑ بخار کی رو میں۔ ان دنوں کی ایک اور سرخی مجھے یاد ہے۔ اب کی بار کوئی بلا ایسی آئی ہوئی جو بچوں کی گردن بھی ککڑیوں کی طرح چٹاچٹ توڑ ڈالتی ہو گی۔ وبا کے حملے سے مختلف علاقوں میں کئی بچے ہلاک۔ ایسی خبریں ایک ادھ خوف کو جسم دیتی ہیں اور بہت دنوں تک باتوں کا موضوع بنی رہتیں۔ ان دنوں شہر میں ایسے ہی موضوع تھے۔ پھر کسی اخبار رسالے میں (لیکن اس کے بہت دن بعد) اس لڑکی کا حال بھی پڑھا جو لکھوں کی کیمپ میں پڑھاتی ہو رات گئے بارش میں اکیلے گاڑی چلانے والے کو رکنے اور مدد کرنے کا اشارہ کرتی ہے؛ جو سرخ جوڑے اور سنگھار کے بارے میں بتاتی ہے کہ شادی کے فوراً بعد ٹریفک کے حادثے میں دولہا بھی ہو گیا۔ وہ مدد کی التجا کرتی ہے۔ وہ حو سر پا ترغیب ہے، ہوش و حواس پر بجلی گراتی ہے۔ ڈرگ روڈ پر پی ای سی ایچ ایس کے قبرستان کے پاس گاڑی رکواتی ہے جہاں سرکش کراچی کی مخصوص بجلی بارش میں ویران پڑی ہے، اور گاڑی سے اتر کر اندھیرے میں غائب ہو جاتی ہے، اپنے پیچھے ایک خلش چھوڑ جاتی ہے۔ چند برس پہلے انھی تاریخوں میں یہ حادثہ ہوا تھا اور دولہا ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کے بعد دلہن بھی۔ اخباروں نے قیاس آرائی کی تھی۔ اب تو کوئی اس کا ذکر بھی نہیں کرتا، لیکن کئی برس تک اس کے دیکھے جانے کے واقعات اخباروں میں اس طرح چھپتے رہے جیسے امریکا میں اڑن طشتریوں کی دیکھی شہادت (sightings) کے واقعات چھپا کرتے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ برسوں پرانے ان اخبار رسالوں کی گرد جھاڑوں، ان واقعات کو ڈھونڈوں جو کراچی کی شہری لوک روایات (urban folk-lore) ہیں۔ اس روٹی کا احوال بھی مجھے

[illegible] Book of [illegible] Grotesques [illegible]

[illegible] Baedeker [illegible] Burbank with a Baedeker [illegible]

[illegible] اس کو لوگ اب کس پہچان سے پکارتے ہوں گے؟

[illegible]

ہی کشش کالونی کو چھوڑ کر [illegible] ہیں جہاں [illegible] ہو یا تو میر [illegible] پر [illegible] رہتا تھا: انھوں نے [illegible] سب [illegible] کے لیے [illegible] سامان بھی رکھ [illegible] لیکن [illegible] کا [illegible] بھی آبادی [illegible] کوئی [illegible] نہیں [illegible] واقعی [illegible] کس [illegible] پاس کی [illegible] کہاں [illegible] جائے؟

[illegible] کے ساتھ [illegible] رہتا تھا، [illegible] رہتے تھے۔ [illegible] نہیں۔ [illegible] کا [illegible] وقت [illegible] زیادہ [illegible] جب ان رشتہ داروں سے ملاقات ہو جاتی جن کا ملنا شادی غمی کی خصوصی تقریبات تک محدود رہ گیا تھا۔ یہ سارے رشتہ دار شہر [illegible] نہیں، دلی کے مضافات میں آباد تھے۔ [illegible] سے [illegible] یاد [illegible] کو [illegible] دیتی۔ کوئی [illegible] اجتماع ہوتا تو [illegible] بے [illegible] سول سکریٹ [illegible] سے [illegible] نکلتے: [illegible] تو دوسروں کے گھر میں [illegible] بھی [illegible] کر جاتی ہیں۔ [illegible] تک سے ہیں [illegible] وقت [illegible] جب برسات کے دنوں میں [illegible] پڑتا تھا — [illegible] سے [illegible] مسلسل [illegible] ہیں، ان کے دل کا [illegible] سے کہ [illegible] میں [illegible] جائیے [illegible] نہیں [illegible] یہاں آ کر [illegible] لیا، [illegible] میں [illegible] تھیں [illegible] آباد میں کوئی [illegible] نہیں تھے، وہ تو [illegible] فلاں صاحب کو کہتے تھے [illegible] ایک [illegible] کھیاں [illegible] سے چھوٹی [illegible] نکلی — ارے [illegible] کالونی کے [illegible] جہاں [illegible] کا [illegible] دھنیاں، کھاتے ہیں کباب اور [illegible] ہیں۔ [illegible] کے ہو [illegible] نہیں، مسعود آباد میں رہتے ہیں۔ [illegible] محلوں کی [illegible] میں ڈوری لالا دی [illegible] سے، [illegible] جاتا تھا: [illegible] نہیں سے چل دیں [illegible] مسعود آباد میں، [illegible] دیکھا [illegible] مسعود آباد میں [illegible] رنگوں [illegible] ہیں۔ [illegible] مسعود آباد [illegible] مسعود آباد ہیں۔

مسعود آبادی میں کیوں؟

[illegible] ہو گیا تھا کہ [illegible] سے [illegible] شہر سے [illegible] یادی [illegible] سے [illegible] منتقل ہوئے تھے۔

[illegible] شہر سے [illegible] سے [illegible] کے [illegible] ہیں۔ [illegible] سے [illegible] بچپن میں [illegible] تھے۔ [illegible] سے [illegible] جلیبیاں، عید [illegible] میں [illegible] شادی کی تقریبات [illegible] ہمارے [illegible] شادی کے بعد [illegible] کا [illegible] اور [illegible] سے [illegible] تھے [illegible]

[illegible] تھیں ہو لوگ [illegible] منتقل [illegible] کا [illegible] نہیں یاد کی [illegible] کا سبب [illegible] ٹوٹ [illegible] کانیاں [illegible] چلے [illegible] سے [illegible] چھپ [illegible] ہیں۔ [illegible] شادی میں [illegible] کچھ اور یاد نہ آئے تو دمادم مست قلندر بھی۔

[illegible] شادی [illegible] شادی [illegible] معلوم ہوتا [illegible] کھیلتے ہوئے [illegible] معلوم ہوتے تھے۔ [illegible] جن لوگوں نے [illegible] وقت [illegible] حساب کہاں گیا؟

شہر کا جو علاقہ [illegible] طویل مدت تک [illegible] کیمپس [illegible] میں وہاں گیا تو [illegible] شہر سے بارہ میل پرے [illegible] کیمپس سے [illegible] تھے: [illegible] شاید [illegible] شہر [illegible] ہے۔

[illegible] تھی، رات [illegible] جیل روڈ [illegible] ۱۹۲۸ [illegible] وہاں منتقل ہوئے [illegible] کلب [illegible] کتراتے تھے۔ [illegible] وقت موٹر گاڑی [illegible] جیل روڈ [illegible] بات پر [illegible]

سمت میں اور کتنی دور ہے۔ ہمارا شہر آدھا ی کے حساب سے تھا۔ شہر سے میری، اس وقت میری ملاقات اس الگ تھلگ بستی کے گھیرے سے درختوں، چڑیوں، پرندوں، سناٹے اور مہذب تنہائی سے تھی۔ آج وہاں داخل ہونے کے لیے رہ گزر کی جرأت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ میں اب وہ بستی چھوڑ چکا ہوں۔ نہ ان مرے ہوئے سناٹوں کی جستجو ہے نہ ہی جاتا ہوں میں ایسی دور رسائی پڑتی ہے۔ درختوں کے سامنے میں چہل قدمی اور خوش کلامی کے دوران شہر میں مجھے اب دکھائی دیتے ہیں۔

صبح ٹھیک پونے سات بجے یک بس یونیورسٹی کیمپس کے مختلف ٹاؤن سے چلتی اور ہمیں سکول لے جاتی۔ جو عام سے کد شہر میں واقع تھا۔ پہلے پہل شہر کا مطلب ہی تھا سکول اور اس کے گردونواح۔ یہاں سے شہر کی دید اور دریافت کا مرحلہ شروع ہوا ورنہ اس سے پہلے تو یہ بعد پس منظر تھا، بد سے رنگ در پیچے ہوئے پردے کی طرح، جس کے سامنے کھڑا کر کے فٹ پاتھ پہ فوٹوگرافر تصویر کھینچ لیتے تھے جس کو واپس اپنے گاؤں جا کر آپ فخریہ دکھا سکتے ہیں کہ ہاں دیکھ لیا کراچی۔ پھر اس تصویر کی سطح ٹوٹی اور اس نے اپنے اندر شمولیت کی دعوت دی۔ میں نے شہر گردی اختیار کی۔

سینٹ پیٹرز اسکول صدر میں ہے اور ڈی جے سائنس کالج برنس روڈ پہ آ گئے۔ گھر سے اسکول کالج تک، میں شہر کے نقشے میں ان ہی نقطوں کے درمیان حرکت کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس نقشے میں وسعت آئی اور نئے مقام بھی آ گئے۔ اس یک سڑک کی سیدھ اور پھر اس کے آس پاس تک محدود تھا کراچی کا جو ذہنی نقشہ (mental map) میں نے بنا رکھا تھا۔ آگے بڑھے تو اس میں مختلف اور نئی مقامات (perceptual spaces) شامل ہوتے گئے، یک دوسرے سے منسلک ہوتے رہے۔ ذہنی نقشے میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ میں خود بھی اس سے ملتے جلتے عمل سے گزرتا رہا، اسی لیے میں اپنی زندگی کے دور یا تجربات کو شہر کے بعض علاقوں کے حوالے سے جانتا ہوں۔ اس بات کو جغرافیائی اصطلاح میں دہراؤں تو یہ آپ کو یوں سمجھا سکتا ہوں کہ زندگی کی بھی locations ہوتی ہیں جس کی مناسبت (relativity) سے ہمارے واسطے اور وسیلے، رہائش کا طور طریقہ، رہن سہن کا اسلوب، وقت گزاری کے مشاغل، دیگر دلچسپیاں اور ہو گئے، ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے، حلقہ عمل اور دائرہ کار کا انتخاب اور تعین ہوتا ہے۔ یہ بات میرے دھیان میں پیٹر گولڈ اور روڈنی وائٹ کے جغرافیہ دان کے تجزیاتی مطالعے سے، کہ ہم مختلف جگہوں کی ذہنی امیج کیوں کر بنا لیتے ہیں (جہاں پہ نیویارک والوں کے لیے ریاست ہائے متحدہ امریکا کا ذہنی نقشہ ان لوگوں کے ذہنی نقشے سے مختلف ہوگا جو کیلی فورنیا میں رہتے ہیں، اور امریکا کو نیویارک کے بجائے کیلی فورنیا کی طرف سے شروع کرنے اور کھولنے کے عادی ہیں۔ لندن والوں کے لیے انگلستان کا محور ان کا اپنا شہر ہے، جس سے جتنا دور ہٹتے جائیے، ان کی واقفیت کا نقشہ محدود ہوتا چلا جائے گا۔) یہ امیجز دراصل معلومات جمع کی selective channeling کا نتیجہ ہوتی ہیں اور اسی کے زیر اثر ہم شہر کے مختلف حصوں کے بارے میں تاثراتی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ کون کس علاقے کو

Scanned with CamScanner

کس طرح دیکھا ہے۔ اس کے اس دل چسپ مطالعے کا مقصد فقط حسن کی تشکیل نہیں ہے، بلکہ مجھے اس کا یہ جملہ کلیدی معلوم ہوتا ہے:

"We are slowly realizing that people's perception of places is one of the things we must consider as we try to understand the pattern of man's work on the face of the earth."

میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ کراچی کا جو ذہنی نقشہ میں نے قائم کر رکھا ہے، اس میں میرے وقت کے ساتھ ساتھ بڑی معنی خیز تبدیلیاں آئی ہیں اور وہ محض عمارتوں، راستوں، گلی کوچوں کی واقفیت پر مبنی نہیں ـــــ ان میں میرے تجربے کا لہو دوڑ رہا ہے۔ یہاں لہو سنسناتا ہے، رگوں میں چلتا ہے، یہاں شعور کو جلا ملتی ہے، وہاں حسیت محض کی تسکین ہوتی ہے، اس راہ سے پیغام کی ترسیل ہوتی ہے اور نظر حیرت ہوتی ہے، قلب و ذہن میں ارتقا ہے۔ کراچی کا نقشہ میرے لیے کچھ اس طرح کا ہو گیا:

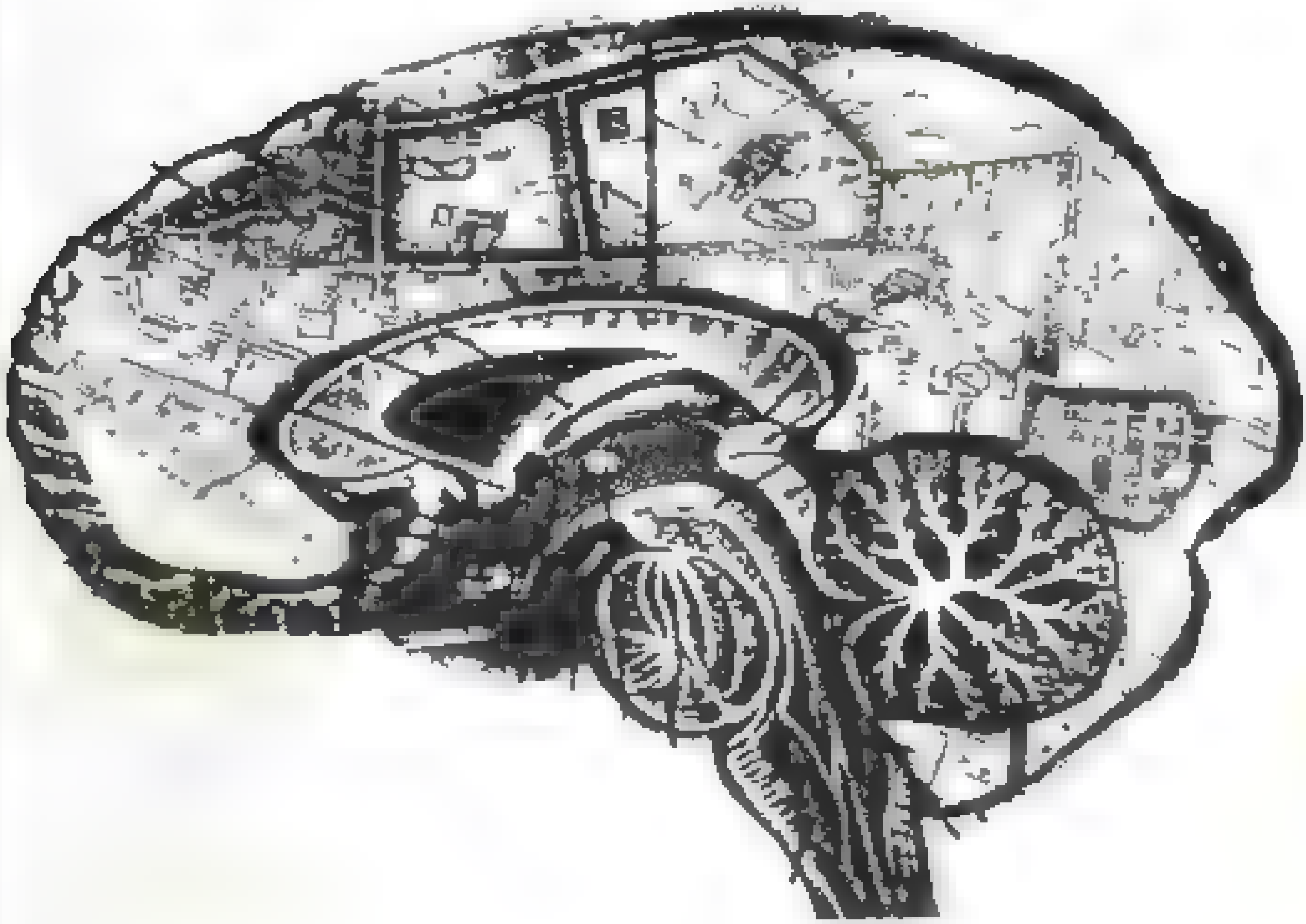

دادی رحمان بیگم نے اپنی عمر کا خاصا بڑا حصہ کراچی میں گزارا، لیکن میری دادی کو اس شہر کی گلیوں محلوں کا کوئی خاص اندازہ نہیں تھا۔ انہیں پاکستان چوک بھی معلوم تھا اور پیر الٰہی بخش کالونی بھی، لیکن ایک سے دوسری جگہ کیسے جاتے ہیں، اس سفر کا طے کرنا ان کے لیے کسی مدد کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ آخر عمر میں جب نسیان مرض کی سی شدت اختیار کر گیا تو وہ گھر جانے کی ضد کرنے لگیں ___ لکھنؤ والا جا بسے بیہ ش، اس کا سیدھا سہارا ان کے میاں ہیں، گاڑی میں بیٹھ کر بس تھوڑی سی دور لے جانے کی بات تھی۔ انہیں دکھ تھا کہ کوئی تماشا بھی نہیں کر سکتے۔ کم و بیش یہی حال حمیدہ خاتون کا بھی تھا جو گئت بھی آپا نہیں۔ قیام پاکستان کے بعد سے تو عمر کا بڑا حصہ انھوں نے کراچی میں مختلف گھروں میں بسر کیا، تقریباً پاور ہاؤس، گزارا۔ انہیں محلوں کا بہت دھندلا سا اندازہ تھا۔ ایک مرتبہ کسی جگہ سے جاتے ہوئے وہ غلط بس سٹاپ پر اتر گئیں۔ برقعہ اور بغل میں گٹھریاں، پوٹلیاں سنبھالتی خدا معلوم کہاں کی کہاں چل دیں۔ وہ تو بس کے دروازے میں سے بڑے میاں نے دیکھ لیا اور شور مچا کر بس رکوا لی ورنہ وہ تو کھوئی گئی تھیں ___ کراچی میں گم شدہ، جو شاید ہم سب ہیں۔ بچپن میں گھر کا پتا اور ٹیلی فون نمبر ہمیں رٹوا دیا گیا تھا کہ اگر کھو جائیں تو کوئی ہمیں ہمارے گھر پہنچا دے، اور پھر بڑے ہونے سے بہت ڈر بھی گیا تھا۔ پھر بھی میں شہر کے بہت سے حصوں میں گم ہو سکتا ہوں۔ دراصل مجھے وہی علاقے یاد رہتے ہیں جن سے میرا کوئی نہ کوئی تعلق بن گیا ہے۔ اس شہر کے نقشے میں ہم سب اپنے اپنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں گھومتے رہتے ہیں ___ اس دماغ کی طرح جس کا بیشتر حصہ عالم اسباب ہی میں رہتا ہے۔ میرے لیے وہی علاقے مخصوص ہیں۔ میں گلشن اقبال سے نارتھ ناظم آباد جاتے ہوئے کئی بار راستہ بھول چکا ہوں۔ ابا کو ڈیفنس سوسائٹی میں خیابان اور اسٹریٹ نمبر میں دھوکا ہو جاتا ہے اور اکثر غلط گلی میں گاڑی موڑ لیا کرتے ہیں۔ مریم غلط بس میں بیٹھ کر ناظم آباد کے بجائے میر پہنچ گئی اور خاصی دیر بعد چونکا۔ شہر کے نقشے میں اپنے اپنے مقام پر رہتے ہوئے ہم اپنے نقشے خود بنا لیا کرتے ہیں۔ ایک خاتون سے جو ہوئی ملی تھیں، گھر کی پابند نہیں تھیں، کسی حوالے سے پوچھا کہ وہاں کیا حال ہے، ارے بھئی وہیں ورنگی کورنگی صاحب گھر جایا کرتے ہو۔ پھر میری ہنسی کا سبب ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دونوں میں فرق کیا ہے۔ اور کسی کی تو کیا ہوا؟ ایک معروف انگریزی رسالے سے وابستہ صحافی خاتون سے، جن کے بے باک تجزیے پر ارباب اختیار کو پسینے چھوٹ جاتے ہیں، کراچی کی آبادی کے حوالے سے بات ہو رہی تھی کہ کس قدر ہے۔ مجھے کہنا سمجھانے کا، تو آبادی کا تخمینہ سن کر انہیں خاصی حیرت ہوئی۔ یہ سارا کراچی ہے؟ اور اس میں وہ سب بھی شامل ہیں، ناظم آباد، نارتھ ناظم آباد، نیو کراچی؟ اور اس سے آگے سپر ہائی وے پر جو پولٹری فارمز ہیں؟ ان پولٹری فارموں سے آگے جہاں اور بھی ہیں! میرے دادا کہیں جانے کا سبب یہ بتایا کرتے تھے کہ ہم گھر سے نکلے تو فلاں نمبر کی بس کھڑی تھی، ہم نے سوچا فلاں کے ہاں ہوتے آئیں۔ وہ راستہ تو نہیں بھولتے تھے لیکن پتہ ڈھونڈنے میں دشواری ہوتی تھی۔ وہ بیسٹ دار کے نے ہمارے پیچھے سے عادی ہے۔ ایک مرتبہ کسی کا گھر ڈھونڈنا تھا، باقی لوگ ٹیکسی میں ساتھ تھے اور وہ بار

اور چھجّی، کوا، کرانچیروں سے ایک ہی سوال پوچھتے ہو رہے ہے جس کا جواب لاعلمی میں ملتا تھا۔ لیکن صاحب، یہ ہول سویٹ میٹ مارٹ کس طرف ہے؟ یہ سوال کچھ مابعد الطبیعیاتی نوعیت کا معلوم ہوتا ہے۔ وہ گلی کہاں ہے، کس طرف کو ہے، کدھر ہے؟ یہ کس کا شہر ہے؟

وہ جس طرف بھی ہو، اس شہر کے واقعے مختلف ہیں ــ مختلف واقعے، مختلف بیانیے۔ کسی بڑے شہر میں رہنے کے تجربے کو کسی بڑی عمر کی عورت کے ساتھ وابستہ ہونے سے مشابہ قرار دیا ہے۔ عروج اور بعد کا [illegible] حساب اس طرح [illegible] حاصل ہو جاتے ہیں [illegible] اسی شہر سے روزمرہ آشنائی۔ کراچی میرے لیے بھی وہ رہا ہے جسے قیس کی زبان میں کوچہ [illegible] کہیں سے [illegible] سالوں کو جہاں در دیکھا اور [illegible] میر کے مطابق دلی جسے آفاق [illegible] کہلاتا تھا۔ [illegible] جہاں میں ہلچل [illegible] شہر میں چہروں کا ہجوم [illegible] [illegible] کا وہ پہلا سبق [illegible] نظر سے آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ میری آنکھوں [illegible] کا شہر میری آنکھوں سے تیز بتیوں کی ایک قطار نکلی ہے اور شہر کی گلیوں [illegible] پھیلتی ہے [illegible] کھڑکی میں کی دو آنکھیں [illegible] ہوئے [illegible] کل [illegible] کے دن [illegible] عمارت کی چھت پر سے [illegible] سامنے ہوئے وہ [illegible] جلسے کی کارروائی کے دوران [illegible] ایک دوسرے مختلف ہے [illegible] [illegible] ایک نقش ہے [illegible] جہاں پہلے کی [illegible] آتی؟ شہر کی [illegible] میرے لیے [illegible] نصب کرنا ممکن نہیں، [illegible] حساب رکھنا مشکل ہے کہ یہاں پہلے [illegible] کیا ہو گیا۔ اب میں بھی [illegible] کے ساتھ اس شہر کے بارے میں کہہ سکتا ہوں [illegible] ہمارے اپنے آبائی قبرستان کے بارے میں کہتے ہیں: عجب سہل ہو مقام آئے۔

[illegible] سے جو شہر [illegible] وہ بڑے [illegible] سے لے کر اس دنیا کے قصے سناتے تھے اور [illegible] [illegible] وہ کسی اور دنیا کا بیان ہے۔ میرے [illegible] کے اس ساتھی کا نام [illegible] [illegible] میں [illegible] اور [illegible] میں مل گئے تھے۔ وہ ایک [illegible] اپنے والد کے ہوٹل میں جا کے [illegible] [illegible] شہنشاہ [illegible] شاہ [illegible] کی تصاویر نمایاں تھیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ [illegible] [illegible] کے [illegible]۔

وہ [illegible] تھے [illegible] ہوٹل [illegible] کراچی کے مخصوص کلچر/اسکیپ کا حصہ ہوتے ہے۔ مجھے یقین ہے [illegible] کی [illegible] ہو جاتے ہیں [illegible] کوئی [illegible] خوش بات نہیں تھی کہ [illegible] شاہد احمد دہلوی کے سے انداز کا خاکہ لکھا جائے۔

شاہد احمد دہلوی سے پھوٹے [illegible] میرے [illegible] تھے، جنہیں ہم بچے [illegible] کہا کرتے تھے۔ ان کو

پکانے، کھلانے، دعوتیں کرنے اور طرح طرح کے لوگوں کو جمع رکھنے کا شوق تھا۔ چھٹی کے دن ان کی خواہش ہوتی تھی کہ سب اکٹھا ہوں، مل جل کر بیٹھیں، باتیں ہوں اور اہتمام سے پکی ہوئی چیزیں کھائیں۔ بے تحاشا بڑھتے ہوئے ٹریفک نے دور دور کے دیکھے بھالے راستوں پر اکیلے گاڑی چلانا ناممکن بنا دیا تب بھی انھوں نے چھوڑا نہیں۔ ان کا معمول تھا کہ سارے کنبے کو مدعو کر چلیں پڑے سب کو جمع کرنے نکلتے۔ گاڑی کی ڈگی تک میں لوگوں کو بھر لیتے تھے۔ جگن بھائی کے جیتی داماد! دوسرے لوگ رشک اور طنز سے کہتے۔ کسی نے تندوری روٹی کی فرمائش کر دی تو یہ تیور ہی آتے ہوئے انھوں نے گاڑی روکی (اس کے لیے کہنا قطعاً بے محل تھا اور بازار سے خرید کر سڑک پر کھانے کو بدتمیزی یا ... قرار دیا جاتا تھا) اور تنور سے بھری ہوئی چنگیری اٹھائے مسکراتے ہوئے واپس آئے۔ بدرو بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے بیٹے نے تندور کے ساتھ ہوٹل کھول لیا ہے، انھوں نے میری نانی کو بتایا جن کے چہرے پر خفگی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ بدرو کے بیٹے کے ہوٹل سے بہ صورت بدضرورت ہی روٹی خرید کر لائے گئے تو ہم سب کی نگاہوں سے اشارہ کر کے پوچھتے: بدرو؟ اس کے بیٹے کا ہوٹل؟ اتنی کا رعب اتنا تھا کہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ پھر انھوں نے خود ہی بتایا۔ یہ بدرو دلی میں فلاں نہاری والے کے ہاں کام کرتا تھا۔ شاہد احمد دہلوی نے اس دکان کی نہاری کا ذکر اپنی کتاب میں بھی کیا ہے۔ کباب بھی لگاتا تھا۔ خوب مصالحہ لگاتا تھا۔ یہاں کراچی میں تو لوگ ہر وقت نہاری کھا لیتے ہیں، اس نے دکان لگائی۔ اس نہاری روٹی کا ذائقہ مجھے اب بھی دھندلا سا یاد ہے، حالاں کہ وہ دستر خوان مدت ہوئی سمٹ گیا۔ نانی نہیں رہے تو پھر شیرازہ بندی بھی نہیں رہی، اور یہ بھی ممکن نہیں رہا کہ سارے لوگ شام کو یوں ہی اکٹھا ہو کر بیٹھیں اور کھانا ساتھ کھائیں۔ چٹخارے دار نہاری والا بدرو بھی غتر بود ہو گیا۔ زیادہ دن نہیں ہوئے کہ میں کسی اتفاق سے اس طرف سے گزرا تھا جہاں اس کے بیٹے نے دکان کھولی ہوئی تھی۔ وہاں اب فاسٹ فوڈ کی بڑی سی دکان کھل گئی ہے جس میں دن کے وقت بھی بجلی کی روشنیاں جلتی رہتی ہیں۔

سب رشتے دار ہمارے، پھوٹی آنکھوں کے تارے — نور جہاں کی ایک اور خاندانی، تقریباً تاریخی نظم میں ٹیپ کا مصرعہ کچھ اس طرح کا تھا۔ ان کی ایک ... شین کا نام بھی لیا جا سکتا ہے جنھوں نے گھر کے کاموں میں ہاتھ ڈالا لیکن مٹی مٹی سی رہی۔ سب ہی کی چھوٹی بڑی قسمیں ان کی طرف نکلتی تھیں اور ایک مرتبہ قرض خواہوں کو کسی عزیز کا مکان اپنا ہی گھر کہہ کر دکھا بھی گئے تھے۔ انھوں نے بعد میں ان شریف آدمیوں کا گھر سے نکلنا ہی دوبھر کر دیا۔ سب کو اندازہ تھا کہ یہ اپنے ہیں۔ کسی آس پاس میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن ان کا بھی کمال تھا کہ سب کی بار یہی ہوا کہ جن جن کو چونا لگا چکے تھے، وہی ان کی باتوں میں آ گئے۔ کوڑیوں کے مول زمین مل رہی ہے، انھوں نے اطلاع دی اور فوراً ہی ان سے ... میں، ہاتھ دھونے کے طریقے باور کرائے گئے۔ سوائے ایک کے، سبھی نے پیسے ... تھے اور ان مکانوں کی ... سماجی تاریخ ... کسی کو سر چھپانے کے لیے جگہ کی شدید ضرورت نہیں

کی۔ پھر بھی زیرِ تشکیل سے فقط پیسہ بنانا اور کسی نہ کسی طرح امیر ہو گئے۔ ابھی وہ علاقہ بسا بھی نہیں ہے۔ میرا ایک بھتیجا ہے۔ سرکاری پارٹی کا آدمی ہے۔ اور اس دوران اس کی ترقی بڑی ہوئی ہے۔ آتے پیسے لے گا۔ زمین مل جائے گی۔ بعد میں یہ بڑی ہی ہوتی رہے گی کچھ کچا پکا تعمیر کر لو۔ خود نہیں رہنا تو کرایہ پر اٹھا کے یا تو دوسرے کو بیچ دو۔ ایک مرتبہ جو پارٹی تشکیل دی گئی اور وہ سب اس علاقہ کو دیکھ بھی آئے۔ ایک سستی سی زمین پر کچھ عمارتیں کھڑی ہونے سے تیار تھے۔ اس میں سرکاری طاقت دو تین واسطوں سے کس طرح دولت ہوتی ہے۔ حکومت کے اس کا ایک حصہ ہے۔ دوسرا حصہ وہ لوگ اس طرح وصول کرتے ہیں۔ زمین میں اس (power politics) کس طرح قدرتی سیاست (and grabbing) سے زیادہ دور چلی گئے۔ ان باتوں کا کسی کو پوری طرح اندازہ نہیں تھا۔ ملکی سے پیش نظر شہر میں کی طرح سے ہو رہے ہیں لیکن جانے نہیں ان کا شہر ہوتے ہی بنیاد ہوں گے ان کے لیے ایک آدھ دوست کچھ سرمایہ بھی، شعور رکھتے ہیں۔ قرض لیتے۔ سب خصوصاً تعلیم یافتہ، مشہور سیاسی جماعت کے نام پر ہم کہہ گیا ہے، سستی بن جائے گی۔ قرض میں ڈوبے گی۔ وہ زمین کو کہیں کی نہیں۔ میں تو کچھ کہیں نہیں کہہ سکا لیکن یہ کچھ عرصے بعد دوسرے سے سنا وہ بیچ کا آدمی، وہی جو اپنے آپ کو سرکاری پارٹی کا لیڈر بنایا کرتا تھا، وہ پھر نظر نہیں آیا۔ میرے شہر کی سیاست کے طریقہ واردات کے مطابق غائب ہو گئے۔

ان واقعات میں نہیں شک کی بنیاد پر کوئی بیان دے سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے بعض لوگ دانستہ اس میں ملوث ہوں یا کوشش کی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں ان کی حیثیت اور اختیار سے زیادہ رسوخ والے لوگ شامل ہوں۔ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

دوبارہ سفر پر روانہ ہونے والے میرے شہر جیسی علیحدہ مملکت نے سپہ گیری و ٹرسٹ کا کام کر رہے تھے۔ اور لوگوں کے، یہ دوسری کہانی ہے۔

سکولوں کی پڑھائی سے تنگ آئے ہوئے دو دن کے شاید ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ایوب خان کی حکومت ڈانواں ڈول تھی اور وہ اقتدار علی بھٹو جیسے لوگوں سے چھوٹ رہی تھی۔ ان کے استقبال کے لیے سٹیشن جانے والا ہجوم ہمارے سکولوں کے آگے گیٹ تک پہنچ گیا۔ شہر کے تعلیمی ادارے بند ہونے جا رہے تھے۔ ہڑتالوں کا طور ہو رہا تھا جیسے شہر فیصلے کی گھڑی پر آن پہنچا ہے۔ ان ہی دنوں ہم نے عرض کی تھی تو اس سے کچھ پہلے دنوں کیا ایوب نے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ ہم سکولوں سے باہر نکلتے ہیں تو دو پیسے کی ملتی تھی۔ ہم بچے کی طرح ہوتے کہ کلاس کی ہوائی کا رخ بھی نہیں کی طرح پر کھی ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے، سکولوں کی ڈیڑھ سو سالہ پرانی کشتی ڈوب گئی تک جو ہماری کلاس سے آگے نہیں بڑھ سکا ہی قد سے نہیں ملا۔ اور پھر وہ دن جب ۱۹۷۱ میں مشرقی پاکستان سے دور اس کلاس کے لڑکے کے ہاتھوں میں گرانٹ انڈیا کا اسٹیمپ دیکھ کر

Scanned with CamScanner

بوڑھی مسز ایملی مالاڈ مارے، جو انگریزی کی نگرانی کے ساتھ ساتھ ہمیں انگلش پڑھایا کرتی تھیں، تاسف بھرے لہجے میں سرزنش کی تھی کہ جنگ سبھی کو تباہ کرتی ہے، اور ہم سب جیسے نادان گئے تھے۔ فادر پنٹو اور فادر ریمنڈ کے موقع بے موقع نصیحت بھرے لیکچر، مسٹر روبی نیزرتھ کے قصے، کیپر کنٹر بلڈنگ کی خصوصی کلاسیں، کلاسوں کے دوران اردو بولنے پر پابندی، اسکول کے بارے میں احساسِ تفاخر اور دسویں جماعت کی انگریزی کی ناقابلِ فراموش مسز چندرا گیانی، جو مجھے اور امیر داؤد علی کو الگ سے اعلیٰ درجے کے ناول دیا کرتی تھیں کہ کورس کی کتاب معمولی ہے، تم یہ ضرور پڑھو، اور گرومندر کے آگے عامل کالونی میں ان کے گھر دیوالی کی مبارک باد کے لیے جانا مجھے اب بھی ایک خواب کی طرح یاد ہے۔ ہم نے سنا کہ وہ اور ان کی بیٹی چمپا بمبئی چلی گئی ہیں۔ خدا معلوم اب کہاں ہیں۔ گرومندر میں ایک مکان خالی کھڑا ہے۔

اسکول سے نکل کر کالج جانا میرے لیے ایک کلچرل شاک بھی تھا جس کی ٹیس اب بھی اٹھتی ہے۔ ڈی جے کالج، پھر ڈاؤ میڈیکل کالج، یہاں میری ملاقات ایک اور قسم کے ہجوم سے ہوئی۔ اپنے ساتھیوں کا ہجوم۔ اسکول میں پرانے برطانوی کولونیل انداز کے مینرز اور گڈ بریڈنگ پر زور تھا، لیکن کالج میں دھکم پیل تھی اور دھکی مار کر آگے راستا بنانا پڑتا تھا۔ سیڑھیوں پر دھکیلے جانے کا خوف تب سے بیٹھا ہوا ہے میرے اندر۔ ڈی جے کالج میں پڑھائی کے بوجھ کے ساتھ یہ احساس بھی تھا کہ اس نفیس اور شان دار عمارت کو سب استعمال کر رہے ہیں، لیکن اس پر فخر یا اس کے لیے اپنائیت نہیں۔ ہم صرف دو سال کے لیے اس کالج میں آئے ہیں۔ ساڈا چڑیاں دا چنبا، بابل اساں اڑ جانا۔ ہمیں اصل میں تو میڈیکل کالج میں داخلہ چاہیے، بس وہ مل جائے۔ ایسے ادارے اصل میں زندگی کی درس گاہیں ہوتے ہیں۔ لیکن میرے نصیب میں لمبی اُڈاری نہیں۔

ہاں بل طلب کون ہے طعنہ زن ہے۔ اس شہر کے کوسموپولیٹن کردار کا ذکر مثبت انداز میں کرتے ہوئے دل ڈرتا ہے کہ اب کوئی طعنہ مارے گا کہ یہ جڑ سے اکھڑے ہوئے لوگوں کا یوٹوپیائی خواب ہے۔ ایسا خواب جس کی آرزومندی میں اس کو پانے کا نہیں، اپنے ہی کو کھو آنے کا احتمال ہے۔ وہ ایک کثیر اللسانی، کثیر النسلی اور کثیر العقیدہ معاشرے کا خواب دیکھتی ہیں، ایک اہم شاعرہ کے شعری مجموعے پر دیباچہ لکھتے ہوئے قابلِ احترام ناقد نے انھیں گویا رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے اور اس خواب کو تشکیل، بقول ان کے، گم شدگی کا نتیجہ قرار دے کر اس کے ڈانڈے اکھنڈ بھارت کے سپنے سے ملا دیے ہیں۔ اکھنڈ بھارت ــــ میں فوراً ڈر جاتا ہوں۔ کراچی میں پیدا ہونے اور پلنے بڑھنے کے بعد یہ الفاظ مجھے ماں کی گالی معلوم ہوتے ہیں۔ اس گالی سے بچنے کے لیے میں کثیر اللسانیت، کثیر النسلیت اور کثیر عقیدگی پر تین حرف بھیجنے کے لیے تیار ہو جاتا ہوں، یہ یکسر فراموش کرتے ہوئے کہ اس شہر کی جن درس گاہوں نے مجھے تعلیم دینے کی کوشش کی، وہاں یہ خواب دشمن یا غیر منطقی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ

Scanned with CamScanner

درس گاہیں رواداری کے معبد تھیں — ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ بھی مدرسے کا حصہ تھیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ [illegible] والے ہر رنگ یک بیک سے مغلوب ہو گئے اور مذہبی عصبیتیں [illegible] جاتیں: وہ نہیں تھیں، جو ناممکن ہو! [illegible] سب نے لوٹ گئے کے میرے ساتھ ڈاؤ میڈیکل کالج میں۔ یک دوسرے سے مختلف ہونے کا [illegible] کلاس پکنک، رسول ڈے اور دوسری تقریبات میں اس کی مستحکم عقل فوری فوراً حاصل کرنے کا آسان ذریعہ تھی۔

مختلف ہونے اور اس معیار پر تقسیم ہونے کا احساس بھی تھا نہیں۔ یہ احساس اسی وقت سے ہو جاتا جب فرسٹ ایئر کی کلاسیں شروع ہونے کے بعد گروپ بنے اور ڈیسکشن [illegible] بٹ ہو جاتیں۔ طویل اور پراسرار ڈسیکشن ہال میں ایک ترتیب سے رکھی ہوئی پتھر کی سفید میزوں پر دو دو کی قطار میں نظر آتے — سخت اور سیاہ پڑے ہوئے، [illegible] سے عاری، محض گوشت پوست کے لوتھڑے! سیال کھالوں میں [illegible] ہوئے۔ جس کی تیز بو ہال کا دروازہ کھولتے ہی ہوش پر حملہ آور ہو جاتی۔ کوئی ایک مردہ [illegible]۔ گروپ [illegible] کے حساب سے [illegible] گئے تھے اور چار چار پانچ پانچ لڑکوں کو جسم کا ایک حصہ الاٹ کر دیا جاتا تھا [illegible] مردہ جسموں کی [illegible] سال کے لیے ہال میں ایک [illegible] کی طرح وہاں کا [illegible] گھومتا [illegible] ڈاؤائٹس (Dowites) کی [illegible] جانے کتنی کلاسوں سے [illegible] کے حوالے سے [illegible] میں مشہور تھیں [illegible] سے تو صیت [illegible] اور اسی ڈائی سکشن کے دوران [illegible] والی couple list [illegible] کے ساتھ [illegible] دھیرے دھیرے بڑھنے والی [illegible] نہیں۔ [illegible] مجھے اپر لمب (upper limb) [illegible] قطع [illegible] ڈائی سکشن پارٹنر [illegible] ڈائی سکشن [illegible] حصوں کے ان علیحدہ علیحدہ حصوں نے ہمارے طبقے متعین کر دیے ہیں۔

[illegible] لڑکوں سے ملاقات ہوتی تھی [illegible] معلوم ہوتا تھا۔ لیکن یہ طبقے کچھ مستقل سے ہو گئے۔ [illegible] (Thorax) [illegible] کا [illegible] ہے۔

[illegible] رستوں پر [illegible] تھے۔ کیا ڈائی سکشن ہال اور کیا [illegible] ڈاؤ میڈیکل کالج بھی [illegible] یاد [illegible] اس وقت کے [illegible] (Class Representative) [illegible] کلاس [illegible] لڑکوں سے [illegible] پریکٹس کر رہے ہیں، یہاں

سنتی ہو، نغموں باقی بچے ہیں، کہ اتنے میں میرے پیچھے سے ناصر نے، جو اُن دنوں الی ہوے میں ریڈیڈیمی سے چھٹی پر آیا ہوا تھا، زور سے ہانک لگائی، "یہ تم پرلے والے کیا سکوٹ کر رہے ہو؟"

اب تو اُن دنوں کا سادہ بیان بھی افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ قابلِ احترام نقاد نے مجھے پھر سے ڈالی سکشن میں بھیج دیا۔ ان دنوں ہم ڈالی سکشن کر رہے تھے لیکن کٹے پھٹے عضو، مسخ شدہ لاشیں دیکھنے کے عادی نہیں ہوئے تھے ۔ ایسی لاشیں جن کی اہم ترین بات ان کی لسانی شناخت ہو۔ ان دنوں ہم بچے ہوئے تو تھے لیکن کٹے نہیں تھے۔ وہ دن بھی گزر گئے۔

گزرے ہوئے دنوں کو لوگ یاد کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ فلم کی ریل سی چل پڑتی ہے ___ لیکن اگر ایسا ہو کہ جن سینماؤں میں وہ فلم دیکھی گئی، ایک ایک کر کے منہدم کیے جاتے نہیں؟ ان کو بیتے ہوئے اتنا زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا مگر ان دنوں کی علامتیں اس تیزی سے غائب ہوتی جا رہی ہیں جیسے کبھی ان کا نام و نشان بھی نہیں رہا ہوگا۔ اور آخر میں وہی سر ریگ رواں شہر باقی۔ جہاں سے میں نے کتابیں خریدیں وہ بک اسٹال دکان بس بڑھا گئے اور جہاں فلمیں دیکھیں وہ سینما ہال تو سیج شہر کی رو میں آ کے ان کی جگہ شاپنگ مال بنا دیے جائیں۔ وہ دن دور نہیں جب میں پوری طرح اپنے ان کی طرح ہو جاؤں گا جو پرانے فلمی گانے (بلکہ مارکیٹ کی اصطلاح میں "کیسل گانے") ان کے ساز بجنے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ کیا؟ ہاں، یہ فلم سن ۱۹۶۳ میں لکھنؤ میں دیکھی تھی، نشاط سینما میں فلم دیکھنا ایک ایسی تقریب تھی جس کا اندازہ وڈیو جنریشن کے لوگ نہیں کر سکتے۔ بچپن میں والٹ ڈزنی پروڈکشن کی فلمیں اور سرکس کی فلمیں، سارے گھر کو ایک ساتھ اور اسی پابندی کے ساتھ دکھائی جاتی تھیں جس طرح سال کے سال چیچک کے ٹیکے لگا کرتے تھے۔ بڑی فلموں کے دیکھنے پر پابندی تھی۔ گھر والوں کے بغیر پہلی فلم میں نے میڈیکل کالج میں آنے کے بعد دیکھی۔ اداکارہ شبنم کے ابتدائی دور کی فلم تھی "تلاش"، جس کا re-run ہو رہا تھا (ان دنوں ایسی باتیں اخباروں کے مطابق پبلک کے بعد اصرار پر ہوا کرتی تھیں) اور سرور کے کہنے پر اس کا ساتھ دینے کی خاطر جانا پڑا۔ اس قسم کی کئی فلمیں سرور نے مجھے دکھوائیں۔ فلم سے زیادہ مجھے اس کے دوران چلنے والا سرور کا رواں تبصرہ یاد ہے۔ "دیکھو، یہ ڈھاکا ہے"، اس نے سکرین پر نظر آنے والی عمارتوں کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے اور آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔

اکتا دینے والی سے معروف کلاسوں سے "کٹا مار کر" سینما ہال میں رنگ برنگی تصویری تتلیاں پکڑنے کا عمل میلون (Melvyn) سے سیکھا۔ اس کے ساتھ پیلیس میں ڈاکٹر ژواگو دیکھی، ریکس میں اسے لاٹ ان ونٹر دیکھی، ریو میں سے میں فار آل سیزنز دیکھی ___ اب ان میں سے کوئی سینما ہال باقی نہیں۔ ابھی پچھلے سال ہی تو وڈیو فلمیں دیکھ دیکھ کر گھبرا جانے کے بعد، پرانے وقتوں کی یاد تازہ کرنے کے لیے، انعام اور افتخار کے ساتھ نشاط سینما میں کوئی فضول سی فلم دیکھی تھی ___ ڈاکٹر صاحب،

Scanned with CamScanner

جلدی چلیے، فلم شروع ہونے والی ہے! کسی نے مڑ کے کہا تھا اور ہم معتوب گئے تھے کہ دوستی، پہچانے گئے — اب وہ سینما ڈھایا جا رہا ہے اور تھوڑے دنوں میں لوگوں کو یہ بھی یاد نہیں رہے گا کہ نادرو شاہ والے بس سٹاپ کا آخر یہ نام کیوں ہے۔ اب اگر تعطیلوں میں سے کوئی کراچی آیا تو کسی سینما ہال کے بدلے مقام پر یہ افسانوی ساخت کے رسٹل ہوٹل کی مدت سے بند پڑی ہوئی ڈھیے دار عمارت کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر کارلوس ڈرمنڈ ڈی اینڈراڈے کی نظم To a Hotel Scheduled for Demolition کے یہ مصرعے پڑھوں گا:

You were Time itself and presided
Over the fevered recognition of fingers
Love without any real place in the city
Over collusion of swindlers over the expectancy
Of employment, over stagnation of governments
Over the life of the nation in terms of the individua
And over mass movements that came spilling their ways
Into the monastic arcade that houses your streetcars

کوئی آ بھی گیا تو یہ نظم کتنی بار اور کس کس جگہ پڑھیں گے ہم؟

In the heart of Rio de Janeiro
Absence
In the wail of evening papers
Absence
Worm consuming apple
Worm consuming worm
Worm worms worm

یہاں سے یہ سب، وہاں سے وہ سب۔ شہر کے نقشے میں خالی جگہیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ایسی ہی ایک خالی جگہ کا نام میٹروپول ہے۔ تیرھویں جماعت سے لے کر میڈیکل کالج، ہاؤس جاب اور ایک ہی شعبے میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے کیریئر کا آغاز یہ سب ہم سب طالب علم ہماری متوازی زندگیاں (parallel lives) رہی ہیں اور طویل رفاقت، جس میں اس وقت ایک خلیج سی آ گئی جب اس نے میرج حاصل کر لیا۔ پچھلے کرسمس پر ہر سال کی طرح دوپہر کے کھانے کے دوران جب میز پر اس کی بی بی کے پالے ہوئے یہ ٹرکی سے سجے ہوئے تھے، انھوں نے کہا کہ یہ مکان چھوڑنا ہی پڑے گا۔ رہیں گے تو میسوری تو ہمیں سے اور اب تک وہ دلالوں کا دباؤ، اسٹیٹ ایجنٹس کے آگے برداشت کرتے آئے ہیں، لیکن ریڈیو کے مخصوص بہ سے ادارے ہیں سے ہوتے ہوئے ڈاؤ میڈیکل کالج کے دونوں طرف بلیٹ

ن گئے ہیں جن کی وجہ سے جینا دوبھر ہو گیا ہے۔ خیر تو اس سٹریٹ میں تھوڑے دنوں کے بعد کوئی مکان نہیں رہے گا اور وہ کنکریٹ جنگل کا حصہ بن جائے گی۔ میں کراچی میں پیدا ہوئی تھی۔ نوجوان لوگ تو امریکا جا رہے ہیں، اس لیے کہ وہ جا سکتے ہیں۔ میں کہاں جاؤں؟ اب گھر سے باہر نکلتی ہوں تو لگتا ہے آس پڑوس کے لوگ میرے کپڑوں اور بول چال کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ میں نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب بھی کیا دیتا؟ پرانے پیانو کو دیکھنے لگا جس پر میلوں پریکٹس کرتا تھا۔ اس بار تمہارے کوائر گروپ نے کرسمس کونسرٹ کہاں پر کیا؟ میں نے بات بدلنے کے لیے پوچھا۔

میلوں کچھ کہتے کہتے میری طرف دیکھ کر چپ ہو گئی۔ آنٹی فی جیمیا نے جواب دیا: کونسرٹ کا اشتہار نہیں دیا۔ زیادہ لوگوں کو بلایا۔ اس بار فلاں پیرش میں کرسمس کی دعائے نیم شب (Midnight Mass) نہیں ہوئی کیوں کہ ایک مذہبی تنظیم نے دھمکی دی تھی کہ اگر گرجا میں روشنی ہوئی تو تمہاری عورتوں کو اٹھا کر لے جائیں گے۔

کچھ کہتے کہتے چپ ہو جانے کی اب میری باری تھی۔ بات بے ڈھب ہو گئی ہے، دونوں کو احساس تھا۔ اس وقت وہ اور ہم اقلیت در اکثریت بن کر ایک ہو گئے تھے۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ میری بھی آخری کرسمس ہے۔ انکل سکروج (Uncle Scrooge) ڈکنز کے صفحات سے نکل کر میرے شہر پر حاوی ہو گئے ہیں اور بیمار و منحنی سی یہ آواز بہت مدھم ہو جائے گی:

"It's Christmas time. God bless us all!"

سوچ رہا ہوں اب سے ۲۵ دسمبر کو Merry Quaid e Azam کہا کروں گا۔ آخر کو نام میں کیا رکھا ہے۔

"الفت کلفت رکھے گا" ابو کو بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا خیال آتا کہ وہ ٹیلی فون اٹھا کر نمبر ملاتے اور دوسری طرف کسی خصوصی آواز کا موصول کر لینے کے بعد یہ الفاظ ادا کرتے۔

ان الفاظ اور ان میں پنہاں پراسرار اشارے سے ایک گفتگو شروع ہو جاتی جو دوسرے لوگوں کے لیے معنویت نہیں رکھتی تھی۔ بہت بعد میں پتا چلا کہ ان کی مخاطب بڑی پھپھو ہیں۔ "الفت کلفت رکھے گا..." ان الفاظ کی طرح ان کا جواب بھی طے تھا، اور مکالمے کا حصہ بھی۔

"کلفت عیوض رکھے گا..." ادھر سے جواب ملتا۔

"عیوض نبی رکھے گا" وہ کہتے۔

"نبی پھر الفت رکھے گا..." جواب پھر گھوم جاتا۔

یہ سلسلہ اس طرح بہت دیر تک اور دور تک چل سکتا تھا۔

وہ اسپتال میں تھیں، تب بھی بڑی خیریت کے جواب میں ابو کو یہی کہلوایا تھا: ہم ٹھیک ہو رہے ہیں۔ الفت کلفت رکھے گا۔ اس وقت تک میں اس راز سے واقف ہو چکا تھا۔ برسوں پہلے شیخ

Scanned with CamScanner

میں جو [illegible] دودھ گھر سے [illegible] اس کا [illegible] نے ایک دن اطلاع دی کہ اس نے
کم [illegible] ہے [illegible] بچے کا نام کیا رکھے
گا، اور بچہ کس کا ہے گا...

دوسرے دن [illegible] میری پھپھو کا [illegible] جب وہ
ریڈیو پاکستان سے [illegible] پروگرام [illegible] کا [illegible]
[illegible] عمارت جس [illegible] کا [illegible]
ہے۔ شاید [illegible] ہے۔

ریڈیو پاکستان، پاکستان [illegible] میری پھپھو کا پتہ بدل گیا۔
[illegible] شہر میں [illegible] کا [illegible] تو بڑھتا جا رہا
ہے۔ شاید [illegible] حاصل [illegible] گئی ہیں۔

[illegible] کی تلاش میں [illegible] ایک نے [illegible] کے ساتھ
[illegible] محلے والوں سے
تعلقات نبھانے کو بہت اہم سمجھتے ہے۔ [illegible] لیکن [illegible] کو کون پڑھے۔
میرے [illegible] وہ کس سے پوچھیں [illegible] لغت کیا رکھے گا؟

میرے [illegible] ایک [illegible] سے [illegible] محلے کا [illegible] احتیاط
کا سامان [illegible] جیسے [illegible] کے معنی کا [illegible] کی باتوں کا [illegible] فلاں صاحب
[illegible] مطلب [illegible] ہوتا ہے۔ [illegible] سال جو
صاحب [illegible] گاؤں میں [illegible] یہاں [illegible] کا
[illegible] صاحب [illegible] طالب علموں سے [illegible] کیسے کیسے [illegible] جواب ملے
[illegible] چوہدری [illegible] ٹھیک ہے [illegible] کو ایک جیپ اور [illegible] دیا جائے۔
کافی [illegible] جیپ [illegible] طالب علم [illegible]
کم بخت، یہ پڑھا لکھا ہے تم نے؟

اب یہ گفتگو بدل گئی ہے۔ طالب علموں نے مسئلہ [illegible] (در حقیقت [illegible]) جواہات کے
[illegible] طالب علموں میں نقل کا رجحان
بڑھ گیا۔ [illegible] ممتحنوں
کا [illegible] لڑکوں کو نقل کرنے سے روکنے کی کوشش کی تھی،
[illegible] کا شیشہ [illegible] اور [illegible] کوئی مدد [illegible]
شہر کا محاورہ بدل گیا ہے۔

گلابی رنگ کے weeping plaster میں قلعہ بند نظر آنے والا کر عملی کارکردگی ــــ آغا خان یونیورسٹی۔ میں نے یہاں بھی پڑھ ڈالا تھا۔ ڈو میڈیکل کالج سے نکل کر عملی زندگی کے آغاز پر میں ایک اور عملی تر درس گاہ سے وابستہ ہو گیا، لیکن زندگی کی اس درس گاہ سے جو سبق سیکھے ان کا رنگ ڈھنگ اور تھا۔ زندگی کا جو رخ یہاں نہایت قریب سے دیکھنے کو ملا، ہمارے جیسے متوسط طبقے کے لوگ اس سے دامن بچا کر ہی گزر جاتے ہیں ــــ وہ بے کس آبادیوں کی زندگی۔

سول اسپتال میں نفسیاتی امراض کے شعبے میں کام کرنے کے دوران (میری ایک اور مدت) عادی نشے بازوں کی دیکھ بھال اور علاج بھی میرے ذمے تھا۔ مجھے لیاری کا وہ نوجوان یاد ہے جو نشے کے توڑ کی حالت میں اپنا خون بیچنے کے لیے چیخ رہا تھا۔ لیاری کی گلیوں میں عادی نشے بازوں کا سروے کرنے کے لیے ہم "اسنوبال میتھڈ" استعمال کر رہے تھے، یعنی ایک نشے باز سے دوسرے کا پتا پوچھا، پھر اس سے کسی دوسرے کا، یہاں تک کہ مطلوبہ تعداد پوری ہو جائے۔ اس تلاش کے دوران یہ دھندلا سا خیال تھا کہ گولیاں دے کر علامات مرض ختم کر دینا کوئی حل نہیں ہے، مسئلے کو جڑ سے پکڑنا چاہیے، کچھ اور کرنا چاہیے۔ اس کچھ اور کی تلاش نے آغا خان یونیورسٹی کے ابھرتے ہوئے شعبۂ علوم صحت عامہ میں پہنچا دیا، جہاں ڈاکٹر جان برنٹ نے بتایا کہ اس قسم کے کام کمیونٹی کی سطح پر سودمند ہوتے ہیں اور شہری علاقوں میں صحت کی کیفیت مختلف حکمت عملی کا مطالبہ کرتی ہیں۔

گلابی قلعے کے اندر کام چلاؤ قسم کی چھوٹی سی جگہ ہے جسے "بیک آفس" کا نام دیا گیا ہے۔ ساڑھے آٹھ بجے صبح یہاں گہماگہمی شروع ہو جاتی۔ میڈیکل اسٹوڈنٹ اور ڈاکٹر نکلنے کی تیاری کر رہے ہیں، کتابیں اور کاغذ اکٹھا کیے جا رہے ہیں، بچوں کے گروتھ چارٹ اور حفاظتی ٹیکوں کے فلاسک سنبھالے جا رہے ہیں، نرسیں گھومتی دکھ رہی ہیں، کسی نہ کسی کو سفری کٹ لے کر ہنگامی صورت کا کام پڑ رہا ہے، گاڑیاں تیار کھڑی ہیں، فیلڈ سائٹ جانا ہے ــــ اورنگی، گریکس ویلیج، چنیسر گوٹھ، عیسیٰ نگری، اعظم بستی، بابا جزیرہ ــــ کراچی کی چند پسماندہ بستیاں جہاں آغا خان یونیورسٹی نے ان علاقوں کے باشندوں کے تعاون سے پرائمری ہیلتھ کیئر کے پروٹوٹائپ ماڈل تیار کیے ہیں۔ ہر علاقے کی منتخب خواتین کو اپنی مدد آپ کے تحت بنیادی صحت کی ضروریات لوگوں تک پہنچانے کی عملی تربیت دی گئی ہے۔ ہر علاقے میں ایک چھوٹے سے سنٹر میں محلے کا نقشہ لگا ہوا ہے جس پر سرخ، سبز، زرد پنوں سے "at risk" گھروں کی نشان دہی کی گئی ہے کہ یہ نیم خواندہ خواتین انھیں شناخت کر سکیں۔

ان گلیوں کی خاک چھاننا، ورکرز کے ساتھ ہوم وزٹ، لوگوں کے ساتھ لین میٹنگ، بستی کے سربرآوردہ افراد سے ملاقاتیں اور ان سے sustainability اور empowerment کے تصورات پر مشاورت کرنا، ہیلتھ ورکرز کو چن چن کر پروگرام میں شامل کرنا، پھر ان کی ٹریننگ اور روزمرہ کام کی جانچ پڑتال، ان کے کام کے نتیجے میں ان علاقوں میں بہتری کا ایک رجحان، اس رجحان کی پیمائش کے لیے

Scanned with CamScanner

انفارمیشن سسٹم اور اس کے مینجمنٹ ٹولز۔ یہ ان ورکرز کالیکٹو میں ہماری ورکشاپ کرنا، طالب علموں اور ڈاکٹروں کی پوری ایک جماعت کا صحت کی حالت کو بہتر کرنے کے لیے ڈویلپمنٹ اور مینجمنٹ کے مسائل سے الجھنا ... ذہنی لحاظ بھی بڑے اور بیدار ذہنی نقشہ بھی اس دوران بدلا۔ ان کمیونٹیز کی زندگی کو قریب سے دیکھا تو تفصیل سے جانا کہ کراچی جیسے شہر میں ساری دنیا کے اپنے سامنے سمٹ کر ایک عالم گیر بستی بن جانے (globalisation) کے عمل اور تجربے سے گزر رہے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اسی شہر کی آبادی کا ایک حصہ معاشرے کے عمل سے marginalisation کا شکار ہے۔ کسی سیارے کی طرح، روشنیوں کے اس شہر کا دوسرا رخ بھی ہے جو تاریک ہے۔

تنگ گلیاں، تنگ مکان، بہتی نالیاں، کوڑے کے ڈھیر پر کھیلتے ہوئے بچے ___ باہر سے دیکھنے والوں کو ان بستیوں میں یہی نظر آتا ہے۔ لیکن اندر قدم دھرا ہو جیسے شہد کی مکھیوں کا چھتا، یہی ہل چل اور سرگرمی سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں کے مختلف codes اور body language کا ایک دفعہ اندازہ ہو جائے تو پھر یہ پتہ چلے اندر کتنے عالم سمیٹے ہوئے ہیں۔ جیسے گوٹھ کے کوہستانی محلے میں ڈاکٹر اشرف لاکھ کے ساتھ ہیلتھ ایجوکیشن سیشن، یہ ہیلتھ ورکر کا چندہ: جعلی آئل اور ڈورو تھی خان، جو غربت اور بیماری سے کس ... چیز کو ختم کرنے کے لیے گھروں کے اندر رویے تبدیل کرنے کی کوشش میں جٹ جاتی ہیں۔ کشتی میں بیٹھ کر باہر جاتے ماہی گیر نوجوانوں کی پوری پلٹن کام کے لیے تیار ہے لیکن لڑکے لڑکیوں کا سر پر کام کرنا ان کے لیے بڑی بات ہے۔ پھر اس کام کو فروغ پاتے ہوئے دیکھنا۔ سمندر کے راستے میں پڑی بستی گریکس جس کے ساتھ ساتھ سمندر سے نمک بنانے کی جگہیں بے کار پڑی ہیں۔ ایک ہی بستی میں چند قدم کے فاصلے پر کتنے الگ الگ گروہ ہیں: لکڑی کے مکانوں میں رہنے والے ذکری بلوچ، پکے مکانوں میں پنجابی کرسچین اور ساتھ محلے کے پٹھان، یہ میمن کی بستی محلے کے چند جن کی عورتوں نے سال بھر ہونے کے بعد سڑک پر ... کہ اس بستی کا باقی حصہ نہیں دیکھا تھا جس کو یہاں کے رہنے والے منی پاکستان کہتے ہیں۔ اعتماد قائم کرنے کے لیے اس محلے کی پرانی کمیٹی باجی کو ہیلتھ ورکر رکھا اور چند دن بعد اس کا دوپہر میں سامان سمیٹ ہوتا کہ ہم کراچی والے ایسا نہیں کرتے ہوں گے مجھے تو ساری زندگی کی دوپہر میں سونے کی عادت ہے۔ اس پر ڈاکٹر فرید وحدت والی سر پکڑے بیٹھے ہیں کہ اس مینجمنٹ پرابلم کا حل کیا ہے! ورنہ ہم بھی کیسی ویسی! ہیلتھ ورکر کی اسٹریٹیجک اور کمیونٹی کی توقعات۔ ڈاکٹر کمال سلام کے بنگلہ دیش واپس چلے جانے کے بعد یہ پروگرام مجھے سنبھالنا پڑا تو ترقیاتی کاموں سے عملی مسائل کا طوفانی پانی گلے لگے آگیا۔ یہ سارا سسٹم بہت جلد تاش کے پتوں کے گھر کی طرح ختم ہو گیا، اس وقت کے یہ اندازہ تھا شہر کی ہواؤں کا رخ بدل رہا تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی ہوا کی تحریر نہیں پڑھ سکتا۔

آنے والی تیسری شفٹ ساٹھ میں جانے گی۔ گڑبڑ کی کوئی نہ کوئی اطلاع آنے لگی تھی اور اسٹاف کے ... جانے کا فیصلہ میرے سر آن پڑا۔ یہ وہاں کے معمول کا حصہ بن گیا تھا۔ لیکن اس دن تو

Scanned with CamScanner

جیسے موجِ خوں سر سے گزر گئی جب ہمیں خبر ملی کہ ہمارے سنٹر سے تھوڑی دور علی گڑھ کالونی میں نامعلوم افراد نے رات گھس کر گھر لوٹ لیے ہیں، آبادی پر حملہ کیا ہے، کتنوں کو مار ڈالا ہے۔ یہ محض خبر تھی۔ تفصیل معلوم نہیں کہ کورنگی ہمارے شہر سے کٹا ہوا تھا۔ پھر ہماری ایک ورکر نے نہ جانے کس طرح سے ٹیلی فون کروایا کہ ہم تو جیسے گھروں میں بند بیٹھے ہیں، سبزی ترکاری آتی ہے نہ بجلی پانی ہے، بچے دودھ کے بغیر تڑپ رہے ہیں۔ حکام بالا سے خصوصی اجازت حاصل کی گئی اور سائرن بجاتی ایمبولینس میں دوائیں اور کھانے پینے کی چیزیں لے کر ہم روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر براسنٹ، ڈاکٹر فوزیہ، ڈاکٹر فریال، ڈاکٹر فرید، کوثر اور نجمہ ہم میں۔ ہمارے چوک سے ذرا آگے فوجی راستا روکے کھڑے تھے۔ ان کو اپنی شناخت اور اپنی آمد کا مقصد سمجھانے میں بہت وقت لگا، اور اتنی دیر میں لوگ جمع ہو گئے۔ ہمیں موقع مل جائے تو ہم اس کو مزہ چکھا دیں۔ ان کے افسرِ اعلیٰ سے کہا، اور اشارہ ان لوگوں کی طرف کیا جو رو رو کر یہ احوال بتا رہے تھے۔ جلا ہوا گھر، لٹا ہوا سامان۔ زار و قطار روتی ہوئی ایک برقع پوش عورت ہمیں اندر لے جا کر دکھانے پر مصر تھی۔ تباہ شدہ گھر کی کھڑکی میں سلاخوں پر ایک دھجی سی چپکی ہوئی تھی۔ میرے بیٹے کو مارنے کے لیے گھسیٹ کر لے جا رہے تھے تو اس نے یہ سلاخ پکڑ لی تھی، وہ عورت بتا رہی تھی۔ کاٹ کر الگ کر دیں۔ یہ اس کی انگلیاں ہیں۔

اس دن کا کسی کو بے چینی سے انتظار تھا۔ خوب رونق رہے گی عمار کی شادی پر۔ ارمان نکالنے کا پھر کون سا موقع ملے گا کہ لگے ہاتھوں ہم بہنوں کی اولاد میں سمجھ لیں کہ بس اب یہی لڑکی ہے جس کی شادی ہونی ہے۔ پھر اکرم چچا کب سے انتظام میں بھی لگے ہوئے ہیں۔ مہندی پر رت جگا ہوگا، رات بھر جھومر رہے گی، یہ طے کیا گیا تھا۔ وسیم نے دوستوں سے کہہ دیا ہے، گانے کی پارٹی جمے گی۔ دن بھر تو وسیم ایک موڈ میں سر سے رہتے ہیں؛ اس محفل کے لیے خاص تیاری کر رہے ہیں کہ سونگ بھریں گے، مادھوری دکشت کی نقل اتاریں گے اور عین ہیروئن کے انداز میں چنے کے کھیت میں ناچیں گے۔ ڈر تھا تو بس یہی کہ تقریبات میں ہڑتال، ہنگامے کی وجہ سے رنگ میں بھنگ نہ پڑ جائے۔ لیکن اس وقت تک سارے کام بخیر و خوبی ہو رہے تھے۔ محفل بھی رات بھر جمی۔ میں تو گھر چلا آیا کہ کل صبح مجھے اسلام آباد روانہ ہونا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی طارق بتاتا ہے کہ فجر کی اذان سن کر گانا بجانا بند کیا ہے اور سپیکر کے تار نکالے ہیں۔ وہ گھر آنے کے لیے اٹھا اور گیٹ تک پہنچا ہی ہوگا کہ تڑاتڑ فائرنگ کی آواز سے ساری گلی لرز اٹھی۔ وہ الٹے پیروں لوٹ آیا۔ صبح کا سناٹا گولیوں کی باڑھ سے گونج اٹھا۔ بے حد نزدیک سے آ رہی تھی آواز۔ ایسا لگتا تھا کہ ہمیں سامنے سے سنسناتی ہوئی گولیاں گزرنے لگیں گی، کہ ابھی فائر ہوگا، میدانِ جنگ یہیں بن جائے گا۔ اس آواز نے پسپا کر دیا سب کو اور نوبت یہاں تک آگئی کہ ایک کمرے میں بند ہو کر قفل لگا دیا۔ چھوٹے بچوں کو پلنگوں، صوفوں کے نیچے لٹا دیا گیا۔ گھبراہٹ کے مارے ایک عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔ جو لوگ اوپر کی منزل پر تھے، وہ نیچے نہیں آسکے۔ انھوں نے

دیکھ کر کیا ہو رہا ہے۔ موبائل ٹیم کی گاڑی کا رنگ گشت کرتی ہوئی گزری۔ اس کے بعد ایک سفید گاڑی آئی، جیسی ایمبولینس ہوا کرتی ہے۔ اس میں سے دو لڑکوں کو نکالا گیا — آنکھوں پر پٹی، ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے۔ ان کو دیوار کی طرف منھ کر کے کھڑا کر دیا گیا اور پھر گولیوں کی وہ بوچھاڑ کی، ان کے لوتھڑوں کے ساتھ اینٹ کے بھی چیتھڑے اڑ گئے۔ لاشوں کو یوں ہی چھوڑ کر سفید گاڑی چلی گئی۔ اس کے بعد موبائل ٹیم کی گاڑی پھر واپس آئی اور دیر تک گشت کرتی رہی۔ تفصیلات تو ہمیں بعد میں پتا چلیں؛ ٹی وی کے خبر نامے پر بتا رہے تھے کہ اس محلے کا امن بحال کیا جا رہا ہے اور یہ کہ پولیس مقابلے میں دو دہشت گرد مارے گئے۔

اخباروں میں بھی کوئی خاص تفصیل نہیں آئی۔ لیکن مسجد کی تقریب کے اختتام کے اس رنگ کو گھر والے شاید بھلا نہیں پائیں گے۔

میں نے دفتر سے واپس آ کر بچوں کے کمرے میں جھانکا۔ وہ شیلف بالکل خالی پڑا تھا جس پر چار سالہ اوشا کی گڑیاں اور سٹفڈ کھلونے رکھے رہتے ہیں۔ میں چونکا اور دل میں پہلا خیال آیا وہ چوری ڈکیتی کا تھا۔ سارے صدقے گئے، میرے بچے خیریت سے رہیں! میں نے گھبرا کر زور سے آواز دی۔ اوشا ہنستی ہوئی آئی۔ میں نے گڑیاں چھپا دی ہیں۔ اس لیے کہ ان کو کوئی لے نہ جائے۔ اس نے مجھے بتایا۔ ساری گڑیاں اور سٹفڈ کھلونے پلنگ کے نیچے ٹھنسے ہوئے تھے۔

...ن صاحب سے میرا تعلق دفتری کام کے حوالے سے تھا۔ اس لیے صبح سات بجے انھیں دروازے پر دستک دیتے ہوئے دیکھ کر تعجب ہونا فطری تھا، اور وہ بھی اتنے تڑکے پر۔ لیکن وہ اپنی آمد کا مقصد بھی نہیں بتا رہے۔ کچھ گھبرائے ہوئے سے، صوفے پر بیٹھے ہیں پھر آہستہ سے بولے: چھوٹا بھائی دو دن سے غائب ہے۔ وہی جو میرے ساتھ کام کرتا تھا۔ آپ نے بھی کئی بار دیکھا ہوگا۔

"ارے کیا ہوا؟" میں چونک گیا۔

"محلے کے لڑکوں کو لے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ وہ بھی... ان کی تلاش تو ہو رہی تھی۔ اور پھر وہی معمول تفصیلات — گھر والوں کی پریشانی، ماں کی بے حواسی، مختلف دروازے کھٹکھٹانا، تعلقات کے ذریعے کوشش... بے سود۔ پتا تو چل گیا ہے کہ کہاں ہے۔ لیکن..."

"لیکن کیا وہ آخر کیا چاہتے ہیں؟" مجھے شاید یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔

وہ کانپتی ہوئی تین انگلیاں اٹھا دیتے ہیں۔

میں نظریں جھکا لیتا ہوں۔ ہمارے جیسے لوگوں میں اتنی رقم گھر میں رکھی ہوئی نہیں ہوتی۔ عمر بھر کی کمائی سمجھی جاتی ہے۔

"ادھر ادھر سے کچھ بھی مل سکے، کوشش کر رہا ہوں۔ رشتہ داروں نے بھی آنکھیں پھیر لی ہیں کہ اتنا ... سے پیچھے ... جا ہیں دو دن... سامان بیچ رہا ہوں۔" ان کے لیے یہ ساری باتیں کہنا بے حد تکلیف دہ

ثابت ہو رہی تھی۔ کچھ نہ کچھ کر کے باہر بھی بھجوا دوں گا۔ کاروبار چاہے ٹھنڈے ہیں۔ جان تو بچی رہے گی۔ دوسرے بھائی کو بھی بھجوا دوں گا...

مجھے تذبذب میں دیکھ کر وہ حرفِ مطلب زبان پر لے آئے۔ "آپ میری مشین خرید لیجیے۔ تکلف نہ کریں۔ یہ مت سمجھیے کہ آپ میری مجبوری سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ بس یہ سوچ لیں کہ جتنی دیر لگے گی اتنی دیر میں کہیں میرے بھائی کو دہشت نہ پہنچا لے لیں..

اچھے بھائی کو فیصلے تک پہنچنے میں مجھ سے مدد ملی۔

یہ تو ان کو بعد میں پتا چلا کہ یہ سڑک تین گروہوں کے درمیان حد بندی ہے (جن میں سے ایک فریق وہ ہے جسے قانون نافذ کرنے والا ادارہ کہا جاتا ہے)، اور یہاں اس گڑھے کی وجہ سے گاڑی کی رفتار کم ہوئی تو کسی نے ڈرائیور کی کنپٹی پر پستول رکھ دیا۔ "نیچے اتر آؤ!" آواز کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

ڈرائیور اور گاڑی وہیں روک لیے گئے۔ اچھے بھائی سے کہا گیا کہ گھنٹے بھر میں اتنی رقم لے کر آ جائیں۔ "اور زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کریں کیوں کہ ہمیں سب معلوم ہے۔ آپ کا یہ پتا ہے۔ آپ یہاں رہتے ہیں اور اس دفتر میں کام کرتے ہیں۔"

اچھے بھائی شاید زیادہ گھبرا گئے ہوں گے کیوں کہ وہ ان کو تسلی دینے لگا۔ "گاڑی بھی مل جائے گی اور ڈرائیور کو بھی کچھ نہیں ہوگا۔ بس یہ خیال رکھنا کہ کوئی آدمی آ کر پوچھے کہ تم سے کیا باتیں ہو رہی تھیں تو کہہ دینا دوا کے لیے پیسے چاہییں۔"

انھوں نے یہی کہا جب ایک شخص نے آ کر درشت لہجے میں سوال کیا اور بتایا کہ اس علاقے کا چیف تو میں ہوں، یہ لڑکے مجھے بتائے بغیر واردات تو نہیں کر رہے۔

کہاں سے رقم کا بندوبست کیا گیا، کس طرح مطلوبہ رقم پہنچا کر گاڑی اور ڈرائیور دوبارہ ملے، ان سب تفصیلات کے بجائے اچھے بھائی کو وہ گفتگو یاد ہے جو وہ لڑکے آپس میں کر رہے تھے۔

"کیسے جانے دوں؟ اتنی مشکل سے چڑیا پکڑی ہے۔"

"عیش کرو۔ بارہ بجے پھر ملیں گے۔"

کئی دن تک کوئی آدمی آ کر ان کے گھر کی چیکنگ کرتا رہا۔ اچھے بھائی احتیاط اور خوف کی وجہ سے گھر بیٹھ گئے۔ اب یہ بھی کر لوں تو جاؤں گا، یہ بھی کر لوں، ذرا اور ٹھہر جاؤں — وہ کسی نہ کسی حیلے بہانے سے اپنی منتقلی کا فیصلہ ٹال رہے تھے۔ میں نے انھیں فیصلہ کن موڑ تک پہنچا دیا۔

چھوڑ کر چلے جانے کے لیے اب کراچی بہت مناسب شہر ہے۔

آپ وہاں سے کراچی ہی کیوں؟ آپ کو نہیں معلوم تھا کہ اس علاقے کی آج کل کیا پوزیشن ہے؟ جو سنتا ہے وہ اچھے بھائی سے یہی پوچھنے لگتا ہے۔ ہر ایک کے پاس سنانے کے لیے اپنے قصے ہیں۔

وہ علاقہ تو بٹا ہوا ہے، کوئی انہیں بتاتا ہے۔ سڑک کے ایک طرف حقیقی والے ہیں، دوسری طرف مجازی والے۔ بیچ میں ریڈ زون۔ لوگ وہاں سے گزرتے ہوئے کترانے لگے ہیں۔ ایک سے بچ گئے تو دوسرا۔

گوٹ اس خانے پر پہنچ گئی تو سانپ نگل لے گا۔ اس پر پہنچ گئی تو آگے سیڑھی ہے۔ اس طرف سے بچ کر نکلنا، ادھر سے چڑھنا۔ سانپ اور سیڑھی کا کھیل بن گیا ہے یہ شہر۔

ملبے، عمارتیں، لوگ، سڑکیں، لاشیں، ملبے کا ایک ڈھیر ہے جس کے اندر پھنس کر رہ گیا ہوں۔ شہر کا شہر ایک بند گلی میں ہے۔ راستہ کیسے ملے؟ سر پھوڑوں اور دیوار؟ عماد اندر آیا تو میں یوں ہی بیٹھے بیٹھے کافکا کی Description of a Struggle ایک بار پھر پڑھ رہا تھا اور اسی جملے پر اٹک گیا تھا جس کی نشان دہی ایک حالیہ کتاب نے بھی کی ہے:

'You're incapable of loving, only fear excites you.'

"آپ کے خیال میں اب کیا ہوگا؟" عماد پوچھتا ہے۔ میں چونک پڑتا ہوں۔ وہ کلاس سے چھٹیاں کر رہا ہے یہاں آیا ہوا ہے اور حیران پریشان ہے کہ جس کراچی میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا وہاں نہ گھوم سکتا ہے، نہ دیر تک گھر سے باہر رہ سکتا ہے۔ میں اس کو سیدھا جواب نہیں دے سکتا۔ وحشیوں کی آمد کا انتظار۔ میں اسے کوافی کی نظم سنانے لگتا ہوں کہ عہد زوال میں روما الکبریٰ کے شہریوں کے پاس بس یہی مشغلہ رہ گیا تھا۔ اور جب وسطی یوروپ کے وحشی قبائل فصیل شہر پر آکر حملہ آور نہیں ہوئے تو لوگوں کو مایوسی ہوئی کہ وحشی ایک طرح سے شہر کے مسئلے کا حل تھے۔

مگر عماد قائل نہیں ہوتا۔ "آپ بھی کہاں کی باتیں کرتے ہیں!" وہ تمسخر سے ہونٹ سکیڑ لیتا ہے۔ "یہ فضول کتابیں چھوڑیے، آج کی آوازیں سنیے۔" وہ پتلون کی پچھلی جیب سے کیسٹ نکال کر دیتا ہے۔ "یہ ایلس کوپر ہے۔" وہ کیسٹ چلاتا ہے اور ایک تیز بے ہنگم آواز میرے سر پر ہتھوڑے برسانے لگتی ہے:

From the start of life
To my dying day
In the dark of night
And the burning light of day
It's a bloody fight
But I can't walk away
I'm prime for the front line

Unholy war, unholy war,
I'll try, I'll fight until I die
Unholy, unholy war, unholy war
I see, I know, you'll always be
Unholy

Scanned with CamScanner

You see my burning fuse
From a mile away
I took your cruel abuse
Lord took away my shame
I learned to bite the hand
That used to pull my chain
We'll fight 'cause we ain't on the same side
We're in an unholy war, unholy war
I'll try, yeah I'll fight until I die
Unholy.

When I'm all alone, unholy
With your thoughts of pain, unholy
I can break on through, unholy
With just an ounce of faith, unholy
Unholy.

You're shaking in your boots
Because it's judgment day
I'll get my just rewards
And you'll have your hell to pay
There's no time to throw out the lifeline

Unholy war, unholy war
I'll try, I'll fight until I die
Unholy, unholy war, unholy war
I see, I know, you'll always be
Unholy.

[illegible] میں تو یہ سب میرا وہی شخص سنتا ہے۔ نہ مجھے ایسی موسیقی پسند ہے نہ یہ آواز۔ لیکن میں اس کو [illegible] بند نہیں کر سکتا، جیسے وہ آواز میرے دل اور دماغ کو چیرتے ہوئے گرم سوئی کی طرح داغ رہی ہو۔

کسی اور بات کا موں [illegible]، میں وزیراعظم پاکستان صاحب کی فصاحت بیان کا بہت معترف ہوں۔ ایک حالیہ ملاقات [illegible] میں انہوں نے کراچی کو دہشت گردی کا [illegible] قرار دیا ہے۔ میں اس بیان سے [illegible] rhetoric کے پرے [illegible] کی [illegible] نہیں ہوتی۔ دہشت گردی سے [illegible] میں [illegible] نہیں تو اور کیا ہے؟ میں ڈرتا ہوں کہ [illegible] کا [illegible] دہشت کا شکار ہو [illegible] کا سبب [illegible] میں بھی ڈرتا میری

[illegible] نہیں۔ پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا [illegible] ملک میں میرا [illegible] دیا ہے؟ نہیں [illegible] ہوں، مکمل [illegible] 'active victims' [illegible] ہیں [illegible] سکتے ہیں [illegible] نہیں [illegible] ہاں لوڈ [illegible] دودھ [illegible] شہد [illegible] سوہان [illegible] مقصد سے کیا گیا تھا۔ [illegible] میں کسی قدر [illegible] نہیں، ایک مشہور سوہان میں [illegible] چھپانے [illegible] شہد سوہان ہے۔ میں یہاں آ [illegible] کاڑی [illegible] دیکھتا ہوں۔ [illegible] کان میں کچھ کہتا ہے پھر چلا جاتا ہے۔ [illegible] مستقل [illegible] پوچھتا ہوں: کیا [illegible] ہے؟ [illegible] نہیں [illegible] قتل، دہشت گردی [illegible] باقی تفصیلات قصوں کے [illegible] ہیں۔ [illegible] سوہان کا حلوہ کھانے میں مشغول ہو [illegible] علاقے سے نکل [illegible] کہیں [illegible] نہیں [illegible] سوہان کی ایک لیڈی [illegible] کرتے کہتی ہیں۔

[illegible] میرے حلق سے اتر نہیں سکے۔

[illegible] کراچی میں [illegible] rationalize [illegible] کوشش کرتا ہوں۔ دماغ [illegible] بالکل خالی ہے۔ پھر کچھ دیر بعد کسی [illegible] شکست [illegible] سے [illegible] شروع کرتے وقت کہا تھا:

Behind us was madness, before us nothingness

[illegible] مجھے کچھ یاد نہیں [illegible] دماغ [illegible] ہو گیا ہو، [illegible] معلوم [illegible] سے پڑا ہوا ہوں۔ [illegible] علاقے [illegible] سے گاڑی چلا رہا ہے اور مجھے نہیں معلوم [illegible] ہیں۔ مجھے [illegible] میری گاڑی لے جا [illegible] ہے، ابھی تک کراچی

لیکن کب تک؟ اور کس حال میں؟ ناسٹر ڈیمس اور شاہ نعمت اللہ کی پیشگوئیاں مجھے میسر نہیں جن کے ذریعے میں اس شہر کے مستقبل کا حال بتا دوں جہاں آدھا شہر یہ دیکھا کرتا ہے کہ باقی آدھا کس طرح ہلاک ہو گا۔

یا پھر شاید یہ شہر ایسا نہیں ہے۔ میں نے اب تک جو کچھ دہرایا ہے وہ کثیر بیتی ہے، شہر بیتی نہیں۔ میرے پاس اس کا کوئی حل بھی نہیں ہے جسے کراچی کا مسئلہ کہا جانے لگا ہے۔ میں دوسروں کی طرح روز روز سارے برقیاتی ذرائع ابلاغ سے کراچی کے واقعات پر افسوس کا اظہار اور کراچی کے مسئلے کے حل کے لیے نیک خواہشات ارزاں کرنے سے، جس پر اپنی معنویت کے اعتبار سے بھی میں قاصر و بیزار ہوں۔ اس لاچاری کے سوا میرے پاس کوئی تجزیہ نہیں۔ ایک کہانی جس کا کوئی خاتمہ نہیں، جس طرح زاسیٹسکی (Zasetsky) نے کہا تھا۔ میں اب اسی طرح محسوس کر رہا ہوں۔

اس حوالے کی تفصیل کے لیے مجھے پروفیسر اے آر لوریا (A R Luria) کا حوالہ دینا ہو گا کہ اس عہد ساز روسی نیورو سائیکولوجسٹ کی کتابیں جو معلوم کہاں کہاں سے حاصل کر کے سول ہسپتال میں کام کرنے کے دوران نائٹ ڈیوٹی اور ایمرجنسی ڈیوٹی کے دوران فرصت کے چند ایک لمحوں میں گھونٹ گھونٹ پی جاتا تھا۔ ممکن ہے یہ کتابیں جدید تحقیق کے سامنے ناکارہ ہو گئی ہوں، لیکن آج کے کراچی کے حوالے سے مجھے *The Man with a Shattered World* بہت معنی خیز معلوم ہوتی ہے۔ ایک مریض کے اپنے تحریر کردہ شذرات سے لوریا نے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ ۱۹۴۳ میں جنگ کے دوران ایک نوجوان روسی سپاہی، جس کا نام زاسیٹسکی ہے، گولی لگنے سے زخمی ہو جاتا ہے۔ گولی اس کے دماغ میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے ذہنی انتشار کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس کی بصارت متاثر ہو جاتی ہے اور یادداشت گم ہو جاتی ہے۔ وہ لکھنا پڑھنا بھول جاتا ہے۔ اس کے حافظے سے الفاظ گم ہو جاتے ہیں اور وہ دیر تک ایک ایک لفظ کو ٹٹولتا اور یاد کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک جانے میں راستہ بھول جاتا ہے۔ بات اٹھاتے اٹھاتے اسے یاد نہیں رہتا کہ وہ کیا کر رہا تھا۔ اسے پوری طرح اپنے جسم اور اس کے طبیعی وجود کا احساس ہے نہ ارد گرد رکھی ہوئی چیزوں کے معنی کا۔ اس چوٹ سے صرف اس کی قوت متخیلہ متاثر نہیں ہوتی اور اسے اس زندگی میں، جو اس کے لیے بڑی حد تک ناقابل فہم ہو گئی ہے، کسی قدر معانی تشکیل دینے میں مدد کرتی ہے۔ لوریا کی تشخیص میں شبہے کی گنجائش نہیں:

> His mind had nothing to work with except undeciphered images and unrelated ideas

اس کا علاج پچیس سال چلتا رہا لیکن کھوپڑی کے اندر scar tissues پڑ جانے کا نتیجہ دورے کی شکل میں ظاہر ہوتا رہا۔ اس کے cerebral cortex کے نقصان زدہ حصے اصل حالت پر واپس نہیں آ سکتے۔ وہ جب بھی سوچنے کی کوشش کرتا، اس کے ذہن کو ان مٹے ہوئے حصوں کے گرد گھوم کر کام کرنا پڑتا تاکہ نئے سرے سے دوبارہ سیکھے اور گم شدہ علم کو کسی حد تک بازیاب کر سکے۔

Scanned with CamScanner

وہ پوری شدت کے ساتھ چاہتا تھا کہ ان مہلک خواب سے بیدار ہو جائے، ذہنی انجماد کی دیوار کی حالت کو توڑ کر باہر نکل سکے، دنیا کو واضح اور قابلِ فہم پائے، اور چاہتا تھا کہ اپنی زبان سے ادا ہونے والے ایک ایک لفظ کو شعوری اختیار سے… لیکن یہ ناممکن تھا۔

اس نے لکھا: وقت اڑا جا رہا ہے۔ دو دہائیاں گزر گئیں اور میں اس ہولناک پنجرے میں پھنسا ہوا ہوں۔ میں اس سے باہر نہیں نکل سکتا کہ صحت مند آدمی بن جاؤں جس کا حافظہ اور ذہن صاف ہوں۔

عام آدمی کبھی بھی میری بیماری کو نہیں سمجھ پائے گا، کبھی نہیں جان سکے گا جب تک وہ خود اس تجربے سے گزرے۔

اور یوں وہ ماضی کی طرف پلٹتا تھا کیونکہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ دنیا اتنی عجیب و غریب کیوں ہو گئی تھی، جنگ کیوں لازم ہو گئی تھی، اور اس کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا کوئی جواز تھا۔ پچیس سال پہلے وہ باصلاحیت نوجوان تھا جس کا مستقبل روشن تھا۔ آخر ایسا کیوں ہوا کہ اسے اپنا حافظہ گنوانا پڑا۔ جو علم اس نے حاصل کیا تھا وہ بھولنا پڑا اور ایک بے یار و مددگار اپاہج بن کر رہ گیا جسے ساری عمر کشمکش ("struggle") میں جتلا رہنے کی سزا دی گئی۔

دھیرے دھیرے اس نے لکھنا پڑھنا دوبارہ سیکھا اور اپنا احوال درج کیا۔ میری کہانی کا کوئی خاتمہ نہیں ہے، اس نے لکھا۔ وہ اس مہلک خواب سے جاگ جانا چاہتا تھا لیکن ذہنی انجماد کی دیوار سے مفر نہیں تھا۔

جانز کتاب کے بجائے اس کے چند جملے دوبارہ درج کیے ہیں۔ جیسے لکھنے والے نے کاغذ پر کلیجا نکال کے رکھ دیا ہو:

اگر جنگ نہ ہوتی تو دنیا انسانوں کے لیے بہت پہلے بڑی عمدہ جگہ بن چکی ہوتی۔ اس دور میں ہمیں موقع ملا ہے کہ ایک نئی اور حسین تر دنیا کی تعمیر کریں، تمام انسانیت کو پیٹ بھرنے کے لیے غذا، تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا، سر پر چھت فراہم کریں؛ صرف موجودہ نسل کے لیے نہیں بلکہ ان کے لیے بھی جو آنے والے ہیں۔

"اس دنیا کی مٹی اور پانی میں خام مواد اور طاقت کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ موجود ہے، ان میں کسی کمی سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں۔ جلد ہی خلا کا سفر بھی شروع ہو جائے گا — پہلے چاند، پھر دوسرے سیاروں کی طرف۔ اس سے ہمیں اور بھی موقع مل جائے گا کہ زندگی کو اور بھی بہتر بنا لیں، ان بادشاہ اور وسائل سے جو دنیا کے مقابلے میں دوسری جگہوں پر وافر مقدار میں موجود ہیں۔ ہم یہ سب کر سکتے ہیں، اگر جنگ نہ ہو…

ہم بھی یہ کر سکتے ہیں۔ مگر کولیاں چل رہی ہیں اور دنیا کا نقشہ ٹوٹ کر پارہ پارہ ہوتا ہوا چلا جا رہا ہو تو ہم اس شہر میں دیکھ سکتے ہیں جس شہر میں میں رہتا ہوں۔

**

محمد حنیف

ایک اخبار نویس کا کراچی

کراچی کے بارے میں پہلی خبر مجھے شہر میں پہنچتے ہی ایئرپورٹ کے ایک باتھ روم کی دیوار پر لکھی ہوئی ملی۔ یہ جناح ٹرمینل بننے سے بہت پہلے اور قصبہ کالونی کے سانحے کے چند دن بعد کی بات ہے۔ باتھ روم کے تعفن سے بیزار ہو کر کسی نے اطمینان سے اپنی خوش خطی کے جوہر دکھاتے ہوئے لکھا تھا: "پنجابیو! اپنے گاؤں واپس جاؤ۔ وہاں تمہاری بہنیں چُد رہی ہیں۔" اس سے ذرا نیچے کسی پنجابی نے بال پوائنٹ پین سے اپنی بھدی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا: "ہم بھی یہاں پہ اُن کا بدلہ لینے آئے ہیں۔" ادبی زبان میں شاید اسے مصرعے پہ مصرع لگانا کہتے ہیں۔

کراچی بھی ایک سویا ہوا جن تھا جس نے سہراب گوٹھ کے آپریشن کے بعد کروٹ لی تھی۔ سرکار اور اخبار یک دم منشیات فروشوں کے بے رحم اثر و رسوخ سے آشنا ہوئے تھے اور، جیسا کہ عام طور پر ہوتا آیا ہے، دونوں کو یہ خبر بہت تاخیر سے ملی تھی۔ شہر میں رہنے والا کوئی بھی عام سا نوجوان برسوں سے منشیات کے اڈوں، ان کے مالکان کے کوائف اور ان کے سودوں کی کوالٹی سے باخبر تھا۔ تازہ خبریں، بلکہ آنے والے مستقبل کی خبریں، جیسا کہ اکثر ہوتا آیا ہے، پبلک باتھ روموں، ہسپتالوں کی دیواروں اور تعلیمی اداروں کی تزئین شدہ یونینوں کے پمفلٹوں میں تھیں۔ رات گئے نشے میں دُھت نوجوان کسی پولیس والے کے پاس سے گزرتے ہوئے جیسے مہاجر کا نعرہ لگاتے۔ پنجابی، قومیت، قائد تحریک اور حقوق یا موت جیسے الفاظ کراچی کے باہر سے آنے والوں کے لیے ثقافتی اظہار تھے۔ سیاست کی زبان میں بات کرنے والے یا تو مہاجروں کو اُن کے قدوں سے ناپ رہے تھے یا دوسری طرف سندھ میں ایک نئی صبح کے طلوع کی بشارت دے رہے تھے۔ اندرون سندھ میں قوم پرستی کا عروج اور شہری علاقوں میں مہاجر قومیت کے نعرے ترقی پسند بیرونی مبصرین کے لیے ایک ہی سکے کے دو رخ تھے۔ اسی زمانے میں حیدرآباد کے قریب ہونے والی ایک سیاسی تقریب میں جی ایم سید نے الطاف حسین نامی ایک نوجوان کو ایک اجرک اور ایک کلاشنکوف تحفے میں پیش کی۔ کیا اس سے بڑی ضمانت متحدہ سندھ کے مستقبل کے لیے دی جا سکتی تھی؟

میری پہلی سیاسی اسائنمنٹ الطاف حسین کا ایک طویل انٹرویو تھا۔ یہ ایک ایسے انگریزی رسالے کے لیے کیا گیا جس کا نام گلیمر تھا اور ہم نے اپنے سبجیکٹ کو کچھ اسی بے رحمی سے پیش کیا جیسے ہم ان فیشن ماڈلز کو کیا کرتے جو رسالے کی مختصر زندگی میں اس کی وجہ شہرت تھیں۔ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت سرکائے گئے گریبان، سمندر کے پانی میں بھیگی ساڑیاں اور رومانی موضوعات۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ چھ مہینے کی مختصر زندگی میں گلیمر نے آزادیٔ اظہار اور شہوانیت کی حدوں کو کافی پیچھے دھکیل دیا تھا۔

پہلی نظر میں الطاف حسین کسی وڈیرے کے دبو داماد لگتے ہیں۔ سفید استری شدہ ریشمی کرتا اور پاجامہ، زری والا جوتا اور نگوں والی انگوٹھیاں جو روحانی تاثیر رکھتی ہیں۔ ان کے بال بہت احتیاط سے بلو ڈرائی (blow dry) کیے گئے ہیں اور ان کے پیچھے ایک ہاتھ سے بنا ہوا ان کا پورٹریٹ ہے جو انھیں ایک مسیحا کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ عزیز آباد میں ۱۲۰ گز پر بنے اس چھوٹے سے گھر کے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں ایک بڑا سا ایکویریم ایک کونے میں رکھا تھا جو کسی کارکن نے تحفے میں دیا تھا اور جس میں تیرتی مچھلیاں شیشے کی دیوار سے، جس پر بڑے بڑے حرفوں میں MQM لکھا تھا، سر مار رہی تھیں۔ سب سے زیادہ جس بات نے مجھے حیران کیا وہ الطاف حسین کا رے بان (Ray Ban) کا سیاہ چشمہ تھا جو انھوں نے چار گھنٹوں میں ایک دفعہ بھی نہیں اتارا۔ میری ایڈیٹر نے، جن کا سیاست کا علم مجھ سے کچھ زیادہ نہیں تھا، ماحول کو سازگار کرنے کے لیے ایکویریم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: کیا یہ مچھلیاں بھی مہاجر ہیں؟ الطاف حسین نے ایک انگلی سے اپنے چشمے کو پیچھے کی طرف دھکیلا، ایک قہقہہ لگایا اور گولڈ لیف والے ڈبے سے سگریٹ پیش کرنا شروع کیا۔

الطاف حسین کو سیاست سے زیادہ فوج میں جانے کا شوق تھا۔ وہ طالب علم کے طور پر بھرتی بھی ہوئے لیکن وہاں پنجابی حوالداروں نے جس طرح ان سے مہاجروں کی توقیر کرنے کے لیے سلوک کیا اس نے ان کا دل توڑ دیا۔ انھوں نے فوجی کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک گالی الطاف حسین نے اپنے انٹرویو میں دہرائی۔ دراصل یہ انٹرویو سے زیادہ خطاب تھا جس کے دوران انھوں نے سوالوں کی زیادہ پروا نہیں کی؛ جو کچھ کہنا تھا وہ کہا۔ میری شستہ اردو، جس کا اعتراف کئی اردو دوست بھی کرتے تھے، میری زیادہ مددگار ثابت نہیں ہوئی۔ جب میں ان کی تقریر کو کاٹ کر ایک سوال کرنے کی کوشش کر رہا تھا، الطاف حسین نے مہاجر طلبہ کے بارے میں اپنا خطاب جاری رکھتے ہوئے کہا: دیکھیں، آپ تو پنجابی ہیں، آپ سے ہماری کوئی دشمنی نہیں۔ ہمیں تو ان سے شکایت ہے۔ ہم نے تو یہ بھی چھوڑ دیا کہ میرے وقت کا حق حلق میں ہے یا پیٹ میں۔

یہ شاید اس لیے کہ علامہ اقبال کو اس لیے قومی شاعر مانا جاتا ہے کہ وہ پنجابی ہیں۔ الطاف حسین نے بڑی موٹر سائیکل کا قصہ بھی سنایا اور اگر کالا چشمہ نہ ہوتا تو مجھے یقیناً ان کی چمکتی آنکھوں کا بیان کرنا پڑتا۔ یہ موٹر سائیکل جو تحریک کے ابتدائی دنوں میں بڑی کارآمد ثابت ہوئی تھی، بعد میں پارٹی نے نوادرات میں شامل کر لی۔ ساری ... سے پی ایم ایس والے ڈرائیونگ ... چ

سکی۔ آپ یوں سمجھیں کہ اُن دنوں میں تحریک ہم نے اسی موٹر سائیکل پہ چلائی۔ لیکن اب اللہ کا ایسا کرم ہے کہ دو دو پجیرو ہمارے دروازے پہ کھڑی رہتی ہیں۔ وہ لوگ جو ہمیں دور سے ہی گیٹ سے لوٹا دیا کرتے تھے کہ ہم چندہ مانگ رہے ہیں، آج ہم سے ملاقات کا وقت مانگتے ہیں۔" الطاف حسین نے اُس دکاندار کی سی تسلی سے کہا جس کا کاروبار نیا نیا چل نکلا ہو۔

سیلف سنسر شپ کا پہلا تجربہ بھی مجھے اس انٹرویو کے چھپنے کے وقت ہوا۔ میں نے سوال و جواب کے ساتھ ایک تعارف لکھا جو ذاتی مشاہدات پر مبنی تھا۔ مچھلیوں والا مذاق چھپ گیا لیکن کالا چشمہ، جو میرے نفسیاتی تجزیے کی بنیاد تھا، تحریر میں سے بالکل غائب کر دیا گیا۔

اس بات کو چھ سال گزر جانے کے بعد میرے لیے اب بھی یہ ایک معمہ ہے کہ ذمہ دار مدیران کا ذہن کیسے کام کرتا ہے۔ قصبہ کالونی کے قتلِ عام کے بعد چند نوجوانوں نے شہر کے مضافات میں سڑک کی ایک ٹال پر سوئے ہوئے ایک پٹھان کا سر ایک بڑے پتھر سے کچل ڈالا۔ ایک نوجوان نے، جو اس گروہ میں شامل تھا، بعد میں قصہ سناتے ہوئے مجھے بتایا کہ تمام لڑکے جیئے مہاجر کے نعرے لگا رہے تھے۔ پٹھان کی کہانی چھپ گئی لیکن نعروں کا ذکر کاٹ دیا گیا۔ پھر تاج محل ہوٹل کے سامنے ایک کار میں سے ایک زخمی نوجوان کو پھینکا گیا۔ اسے اغوا کرنے والوں نے اس کے بازو پر خنجر سے جیئے سندھ کھود دیا تھا۔ زخمی نوجوان کا قصہ چھپ گیا لیکن جیئے سندھ پر لکیر پھیر دی گئی۔ اپنی ناتجربہ کاری میں مجھے یوں لگا جیسے میں نے کوئی چھوٹی سی فلم بنائی ہو اور سنسر بورڈ نے اس کا تمام ساؤنڈ ٹریک اور بیک گراؤنڈ میوزک نکال دیا ہو۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ ایڈیٹر کو صرف اپنی جان کا خوف نہیں تھا، ان کو اس بے احتیاطی سے ڈر لگتا تھا جس کے باعث نفرت کی چنگاریاں آگ بن سکتی ہیں۔ یہی نسخہ پچھلوں سے نفرت کے لاوے کو روکنے والے یہ صحافی گو کم تھے لیکن تھے، اور اب بھی ہیں۔ لیکن اُن کی یہ سادہ لوح کوششیں آج کل کے حالات میں عجیب لگتی ہیں۔ آج کوئی باہر سے آنے والا اگر کرائم بیٹ پر کام کرتے کسی رپورٹر کو دیکھے تو یہ سمجھے کہ وہ سٹاک ایکسچینج کے ریٹ چیک کر رہا ہے یا ویسٹ انڈیز کے اسکور اپ ڈیٹ کر رہا ہے۔ "کتنے ہوئے؟" "تمہارے پاس کتنے ہیں؟" "یہ دو کدھر سے آ گئے؟" "عثمان آباد میں ایک بوری سے ملے ہیں۔" اُن کی زندگی مختلف وقفوں میں بٹی ہوئی ہے: ایدھی فاؤنڈیشن کو فون، پولیس کنٹرول سے چیک، تینوں ہسپتالوں کو فون، ان سب سے ملنے والے اعداد کو جمع کرو، پھر کسی ہم پیشہ کو فون کر کے پوچھنا: "کل کتنے ہوئے؟"

اُس دن سڑک پر ہزاروں لوگ تھے۔ ۱۹۸۸ کے الیکشن کے بعد پی پی پی ورکرز دو دن کراچی کی سڑکوں پر جشنِ فتح منانے نکلے تھے۔ وہ خواتین جنہیں گیارہ سال تک چادر اور چار دیواری میں ڈھانپنے کی کوشش کی گئی تھی، گاڑیوں کی کھڑکیوں میں سے باہر لٹک کر ناچ رہی تھیں اور لڑکے فٹ پاتھ

پر کھڑے ہاتھ ہی ہاتھ ڈنڈے لیے گھور رہے تھے۔ یہ مناظر دیکھ کر ٹریفک کے سپاہیوں کی ہوائیں اڑی ہوتیں پہلے ریاست یافتہ شارع سے حول لیں اور ٹریفک کا نظام لڑکوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اسی جشن کے دوران آنے والے دنوں کی ایک جھلک بھی نظر پڑی۔ ایک سڑک پر جشن منانے والے ہجوم سے ڈرتے ہوئے ایک موٹر سائیکل سوار کو روکا اور مطالبہ کیا کہ چندہ دو اور جیسے مسافر کا دم نکلا۔ ان کی آنکھوں میں جھنڈے والوں کی بے رحمی تھی۔ اس نے مطالبے کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔ ایک چمکار سے ہوتے لونڈے نے آگے بڑھ کر گاڑی کی چابی کھینچ لی اور چیخ کر کہا: بولو جیے مہاجر! میرے کلیجے سے جو آواز نکلی اس نے خود مجھے حیران کر دیا۔ چاروں طرف لونڈوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر، جو چند لمحے پہلے تک تحفظ اور آزادی کا احساس دلا رہا تھا، یک وقت بے بس، مظلوم اور خطرناک نظر آنے لگا۔

دہلی سے شائع ہونے والے محدود اشاعت کے ایک انگریزی رسالے کے لیے لکھا۔ مقبول عام سے ایک مدیر نے مجھ سے ان کو شائع کرنے کے مشورے دیے۔ لیکن محدود اشاعت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ وہ تمام باتیں جو کسی کی شکایت یا ڈر میں نہیں چھپ سکتیں، ہم مینوں میں بڑی بڑی سرخیوں سے ساتھ چھپ جاتے ہیں۔ مگر پہلے آپ کو بتاتا ہوں کہ محدود سمجھنا ہی ایک غلطی ہو سکتی ہے۔ کلفٹن میں ہونے والے ایک متوالی جلسے کے دوران علاقے میں سے مارے رسالے کا نام لے کر تقریر شروع کی۔ بڑے ہوئے بال والی عورتیں، یہ ڈسکس کا پانی پیتے دیکھا۔ جلسوں سے ہمارے رسالے کی ماتوں مدیروں کا نام لے کر ہوتے کہا، یہ وہ صحافی ہیں جو ایک بوتل کے بدلے اپنا قلم بیچ دیتے ہیں۔ سب کو یقین ہے کہ ان سے پہلے کبھی کسی نے سب زبان استعمال کی ہے اور سب پہلے سیاست کا تمام ہادی باتیں کرنے لگے۔ اس کے بعد جو کہا گیا وہ کچھ ایسا تھا جسے ادبی زبان میں ناقابل اشاعت کہا جاتا ہے۔

مجھے یقین ہے ان میں سے بہت سے ابھی موجود تھے مگر کسی سے احتجاج کی توقع رکھنا عبث تھا۔ شہر سے باہر سب سے زیادہ خوف زدہ ہوتے ہیں، جہاں کوئی جلسہ جلوس لوگوں کی زندگیوں تک پہنچ پاتا ہے۔ وہ شخص کی سیر پر جا کر کا نمبر ہے۔ ان سے دور رہتے ہیں وہ بہت لولیٹ (low fa) ہو کر سامنے ہیں۔ پہلے ان سے ہی کے رہنے والے عزیزوں کا حال احوال پوچھتے ہیں، جشن منانے سے ڈرتے ہیں، پارٹی جھنڈے کا بہترین موقع کب ہے، اور دوسرے شہروں میں رہنے والے پہچان لیتے ہیں کہ وہ (war zone) میں رہ رہے ہیں۔ جب ہڑتال کی وجہ سے ان کی مصروفیت رکے، ای ڈی ایس کے دفتر میں پہنچ پاتی تو یہ پہلے مجھے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب ان کا چوہدری دوست پارٹی میں نظر آتا ہے تو اس کے ساتھ مل کر سیاست کے بارے میں بات کرتے ہیں، اور جب وہ سیاست دانوں سے ملتے ہیں تو ان کی بندوق کا رخ بیورو کریسی کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ اپنی ہٹ لسٹ میں ان کے نام چھاپ رہے ہیں۔ انہیں حکومت

اور اپوزیشن سے یکساں نفرت ہے۔ جب مشین گنوں کے پیچھے کھڑے اور ہوتے ہوئے رینجرز کا ٹرک ان کے گھر کے پاس سے گزرتا ہے تو ان کا بلڈ پریشر ذرا نیچے آتا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ کلفٹن میں اصل بدامنی اس وقت پیدا ہوئی جب آغا سپر مارکیٹ حادثاتی طور پر جل کر راکھ ہو گئی اور کچھ دنوں کے لیے انھیں تازہ مشروم ملنا بند ہو گئے۔

آپریشن کلین اپ شروع ہونے کے کچھ عرصے بعد فوج کے ایک کرنل نے، جو فیلڈ انویسٹی گیشن ٹیم کے کرتا دھرتا ہے، ایک آف دی ریکارڈ بریفنگ میں نظریہ پاکستان، ملک کو درپیش علاقائی خطروں اور اپنے خفیہ کیمروں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ٹیلی وژن کی اسکرین پر ایک کے بعد ایک نوجوان خالی نظروں کے ساتھ بتاتا کہ اس نے کتنے قتل کیے، کہاں سے اسلحہ لیا، کس کے حکم پر ٹرگر دبایا۔ ان نوجوانوں کے نام ہندی فلموں کے کرداروں کا چربہ لگتے اور یوں محسوس ہوتا جیسے انھیں خود بھی اپنے کارناموں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ ہم نے ہاتھ تک نہیں لگایا، کرنل بار بار دعویٰ کرتا۔ وہ وقتاً فوقتاً ایک کرسی کے ساتھ ٹکی جی تھری رائفل کو اٹھاتا اور نظریں ہم پر مرکوز کیے ہوئے، ننگے ہاتھوں سے مسلسل لوڈ اور اَن لوڈ کرتا جاتا۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن جب کوئی عورت کا نام لیتا ہے تو میرا خون کھولنے لگتا ہے، اس نے ٹی وی پر ایک نوجوان کی تصویر کو ساکت کر کے کہا جو اعتراف کر رہا تھا کہ وہ بھارت سے تربیت لے کر آیا ہے۔

جب ۱۹۸۸ میں حیدرآباد کا قتلِ عام ہوا، تو میں وہیں ڈیوٹی پر تھا۔ میرے ذمے سارے دن کی کارروائیوں کی رپورٹ تیار کرنا تھا۔ رات کو لاشیں گنتے گنتے تھک کر میں نے ایک پنجابی گانا گانا شروع کر دیا، بڑے نصیب مرے، وے ری ہویا پیار دا۔ میرے کمانڈر نے کہا، شہر میں لوگ مر رہے ہیں اور تم گا رہے ہو۔ میں نے کہا، میں فوجی ہوں اس لیے رو نہیں سکتا۔

پھر اس نے آپریشن کے آغاز میں پہلے کارنامے سنائے۔ میں نے ایک ایم این اے کو اٹھایا اور یہیں لے آیا۔ میں نے کہا دیکھو، میں تمھیں ہاتھ تک نہیں لگاؤں گا۔ مجھ سے بحث کرو۔ مجھے بتاؤ یہ مہاجر قوم کیا ہوتی ہے۔ دلیلیں دیں اس کو۔ صبح پانچ بجے وہ مجھ سے کہنے لگا، چھوڑو مجھے حقیقی والوں کے پاس لے چلو، پولیس کو بلاؤ۔"

اس کمرے میں کچھ آف دی ریکارڈ نہیں ہوتا۔ کرنل نے جی تھری کو کرسی کے ساتھ ٹکاتے ہوئے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر کچھ بٹن دبائے اور ٹی وی اسکرین پر ہم نے اپنے آپ کو دیکھا۔ میرے اس کمرے میں داخل ہونے سے لے کر بریفنگ کا ایک ایک لمحہ اسکرین پر فاسٹ فارورڈ میں دوڑنے لگا۔ کرنل نے بچوں جیسی مسکراہٹ کے ساتھ دونوں ہاتھ ہوا میں لہرا دیے اور ہمیں چیلنج کیا کہ اس کے کیمرے کا سراغ لگائیں۔ میں نے ریکارڈنگ کے آلات کو نظر میں رکھتے ہوئے خفیہ کیمرے کی تلاش میں نظریں گھمائیں تو دیوار کے کونے میں محمد علی جناح کا مشہور پورٹریٹ جس میں وہ ایک آنکھ کا چشمہ

کے مطالعے میں مصروف ہیں، نظر آیا۔ کرنل نے جی تھری کی طرف دیکھے بغیر ایک دفعہ پھر اس کا میگزین فٹ کیا۔ جنرل کے ایک آنکھ والے چشمے کے پیچھے سے شیشے کی ایک کرچ آنکھ میں پیوست ہو گئی۔

**

زینت حسام

گزرے دن، گزرتے دن

مجھے پشاور کے اس گھر کا صرف لکڑی کا وہ زینہ یاد ہے جس پر چلنے سے دھمک پیدا ہوتی تھی — ہم بچے اس پر کود کود کر چڑھتے اُترتے اور وہ دھمک ایک گونج میں بدل جاتی — یا پھر پرانی وضع کے خوب صورت نمونے والے ٹائلوں سے بنا چمکدار فرش۔ پشاور کے بازار میں واقع اس چھوٹے سے چار منزلہ مکان کے نچلے حصے میں جوتوں کی دکان تھی اور ہر منزل پر دو کمروں پر مشتمل ایک فلیٹ۔ پہلی منزل پر دادا دادی اور دادا کی پہلی مرحوم بیوی کی اولاد، جنھیں سب بچے محمود بھائی کہتے تھے، دوسری منزل پر رہتے تایا کا کنبہ، تیسری منزل پر امی ابا اور ہم بہن بھائی (اس وقت ہم دو بہنیں اور دو بھائی تھے) اور چوتھی منزل پر چچا کا کنبہ۔ میں اسی گھر میں پیدا ہوئی تھی۔ پشاور کے میٹرنٹی اسپتال میں کام کرنے والی ایک عیسائی نرس کی نگرانی میں۔

ابا بیس سال کی عمر میں، ستمبر ۱۹۴۷ میں، کانپور سے کراچی آئے تھے، امی اور ایک سال کی صبیہ (صبا آپی)، اور محمود بھائی کے ساتھ۔ پھر چچا اور تایا کا کنبہ آیا اور اس کے بعد دادا دادی کو بلایا گیا۔ چھوٹے تایا کانپور چھوڑنے کو تیار نہ ہوئے اور نہ ہی کوئی پھوپھا۔ لہٰذا چاروں پھوپھیاں اور کئی دوسرے رشتہ دار وہیں رہے۔ امی نانا اور ماموں صاحب ہی کی خاطر پاکستان آگئے تھے۔ دادا کا شمار مسلمانوں کے محلے کرنل گنج کے معزز لوگوں میں ہوتا تھا۔ دادا کا کپڑوں کی چھپائی، بلاک پرنٹنگ، کا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا۔ دادا نمازی پرہیزگار تھے اور انھوں نے بیٹوں کو بھی دین کی طرف راغب کیا۔ ایک مولوی بچوں کی تعلیم پر مامور تھے۔ بچے سکول بھی جاتے، لیکن زور دینی تعلیم پر رہا۔ مولوی صاحب مغربی تعلیم کے سخت خلاف تھے اور دادا کو، بقول ابا، بہکایا کرتے کہ بچوں کو سکول بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔ ابا بھاگ نکلے۔ مسجد سے بھاگ گئے۔ مولوی سے چڑتے۔ ابا کا کہنا ہے کہ ان خاندانی مولوی نے ابا کو دین کی طرف رغبت کرنے کے لیے اتنا زور دیا کہ ابا کا دل دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم سے بھی اچاٹ ہو گیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ابا نے سکول کا دوبارہ رخ نہ کیا۔ کاروبار سے بھی کم رغبت تھی۔ ان کے مشغلے تھے: فلمیں دیکھنا، کتابیں پڑھنا، دوستوں میں رہنا، گھومنا پھرنا، کباڑیوں کی دکانوں میں جانا، پرانی چیزیں، خاص طور پر پرانے کیمرے، خریدنا اور تصویریں بنانا۔ تقسیم ہند سے پہلے بنائی ہوئی ان کی کھینچی ہوئی

Scanned with CamScanner

ایک تصویر السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کے ایک عالمی مقابلے میں بھیجی تھی جس کو انعام بھی ملا تھا۔ ابا کے پاؤں میں چکر تھا، دل میں جنوں۔ لڑکپن ہی میں ہندوستان کے کئی شہر گھوم چکے تھے۔ اکثر دادا سے جھگڑ کر گھر چھوڑ جاتے۔ دوسری جنگ عظیم کے بارے میں جب جرمنی نے برما پر حملہ کیا تو آسام خالی ہونے لگا۔ ابا نے ٹرین پکڑی اور آسام روانہ ہو گئے۔ بتاتے ہیں وہ اس ٹرین میں واحد مسافر تھے۔ لڑکپن میں عشق ہو گیا تھا۔ ابا نے دھمکی دی کہ اگر اس لڑکی سے ان کی شادی نہ ہوئی تو وہ زہر کھا لیں گے۔ لیکن دادا بھی ضد کے پکے تھے۔ ابا اس بات پر بھی گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ پھر ایک سال بعد امی سے ان کا بیاہ کر دیا گیا۔ امی دادا کی پسند تھیں۔

کراچی میں پشاور کے ڈھب کے کاغذی بازار میں ہماری ساڑیوں، کمخواب، زربفت کا مشترکہ کاروبار شروع کیا گیا۔ دکان میں ایک دوچھتی ہوا کرتی تھی۔ ابا کو اب تک دکانداری سے دلچسپی نہ ہوئی تھی۔ انھوں نے دوچھتی پر دیوار سے لگے لکڑی کے کھانچوں پر اپنی جمع کی ہوئی کتابیں سلیقے سے جما دیں۔ جب ہم کراچی آئے تھے تو کتابوں سے بھرے کئی صندوق کانپور کی لائبریری کو دے دیے تھے اور صرف تین چار صندوق ہی ساتھ لا سکے تھے۔ دوچھتی میں فرش اور چاندنی بچھائی گئی تھی اور گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ دکان کی یہ دوچھتی دوپہر کے کھانے اور قیلولے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ ابا یا تو دکان میں پائے ہی نہ جاتے، یا آتے بھی تو سب سے الگ تھلگ اس دوچھتی میں بیٹھ کر کتابیں پڑھا کرتے۔ گھر چھوٹا تھا اس لیے وہاں دو چار کتابوں سے زیادہ نہ رکھتے تھے۔ کتابوں کا ذخیرہ اردو ادب اور شاعری کے نسخوں، دیوانوں، ادب لطیف، عالمگیر، ہمایوں، ساقی اور دوسرے رسالوں کے انبار پر مشتمل تھا۔ پچاس کی دہائی میں پاکستان سے نکلنے والے تمام رسالوں سویرا، نقوش، داستان گو، لیل و نہار، نصرت وغیرہ کے شمارے احتیاط سے سنبھال کر رکھتے تھے۔ اکثر رسالوں کی خود پکے رنگ کی جلد بنواتے اور ان پر نام emboss کرتے۔ یہ کام ابا کانپور میں بھی کرتے تھے۔ کتابوں کی دنیا سے میرا پہلا تعارف کاغذی بازار کی دکان کی اسی دوچھتی میں ہوا۔

میں جب پانچ برس کی ہوئی تو یہ مشترکہ خاندان پشاور سے نکل کر پیر الٰہی بخش کالونی کے ایک دو منزلہ مکان میں منتقل ہو گیا تھا جس میں گھنے امرود کے پیڑوں کی ڈالیں اور شاخیں دوسری منزل کے کمرے کی کھڑکی اور چھجے تک آتی تھیں۔ ہم بچے چلچلاتی دوپہر کی خاموشی میں کچے امرود توڑ توڑ کر کھاتے اور پیر کالونی کی خاک آلود گلیوں میں کھیلا کرتے۔ ایک سال بعد یہ منتقلی ہوئی۔ دادا کا انتقال ہو چکا تھا۔ محمود بھائی اپنے حصے کے سامان سمیت الگ ہو گئے تھے۔ اب ہم سب لوگ شہید ملت روڈ سے متصل بہار ہاؤسنگ سوسائٹی میں واقع ایک دو منزلہ مکان میں اٹھ آئے تھے جس میں چار فلیٹ تھے۔ ایک فلیٹ میں دادی کا ایک مختصر سا خاندان تھا — وہ خود اور دو لڑکے۔ مسعود اور ہارون۔ باقی تین فلیٹوں میں ہم سب، اور ابا کے بھائی اپنے وسیع خاندان اور بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ ۱۹۵۹ کی بات ہے۔

تب کراچی کی زمین ہم بچوں کے لیے ایک وسیع کائنات تھی۔ سوسائٹی میں اکا دکا مکانات تھے۔ ہماری گلی میں صرف تین مکان تھے۔ ہمارے مکان سے متصل مالک مکان، تقی صاحب، کا گھر، اور گلی کے سرے پر ایک اور مکان۔ باقی پلاٹ خالی تھے۔ دوسری گلیوں میں بھی یہی صورت حال تھی۔ ہر گھر کے احاطے میں اور احاطے سے باہر مختلف طرح کے پیڑ پودے ہوتے تھے۔ امرود، آم، شریفے، گلاب، چنبیلی، موتیا احاطے کے اندر، اور باہر بادام، جامن، املی، نیم، گل مہر، نوگل وغیرہ۔ ہمارے گھر کے عین مقابل ایک کھنڈر سا تھا۔ غالباً کسی نے چاردیواری اٹھائی تھی، پھر کسی وجہ سے دیواریں منہدم کر دی گئی تھیں۔ اینٹوں کے ملبے، ٹوٹی ہوئی دیواروں اور خودرو جھاڑیوں میں چھپکلیاں اور گرگٹ رینگا کرتے۔ احتشام بھائی جان اور انعام بھائی (میرے تایازاد بھائی) گلیل سے ان گرگٹوں کا شکار کیا کرتے۔ مجھ سے چھ برس بڑے ضیا بھائی کا وقت انعام بھائی کے ساتھ گزرتا۔ نورالصباح، عائشہ، احترام (تایازاد)، صبیحہ (چچازاد)، میں، عذرا اور ریاض — ہم بچوں کا غول زیادہ وقت باہر ہی منڈلاتا رہتا۔ ہم سب بہن بھائیوں کو باہر گھومنے کی یکساں آزادی تھی۔ ہم گلیوں اور سڑکوں سے سگریٹوں کے خالی پیکٹ اکٹھا کر کے ان کے قلعے اور مینار بناتے، جن کو بنانے سے زیادہ ڈھانے میں لطف آتا۔ کانچ کی چوڑیوں کے ٹکڑے چن کر انھیں آگ دکھا کر زنجیریں تیار کی جاتیں۔ تب کراچی میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر نہیں ہوتے تھے۔ پلاسٹک کی تھیلیوں کا رواج نہ تھا۔ کاغذ کی پڑیوں یا پھر سلے ہوئے کپڑوں کے تھیلوں میں سودا آتا۔ سڑکوں پر کاغذ، سگریٹوں کے ڈبے اور ٹوٹی پھوٹی چیزیں تو پڑی ہوتی تھیں، لیکن گیلا کچرا نہ ہوتا تھا۔

کراچی میں تتلیاں بھی بے تحاشا ہوتی تھیں۔ خاص طور پر برسات کے بعد تتلیاں امڈ آتیں۔ ہم بچوں نے تتلیوں کو مختلف نام دیے ہوئے تھے۔ سبز اور سیاہ بادشاہ تتلی، نارنجی پروں پر سیاہ و سفید دھبے والی ملکہ تتلی، عنابی جامنی شہزادی تتلی۔ انعام بھائی نے ایک چھوٹا سا جالی کا ڈبہ بھی بنایا تھا جس میں وہ تتلیوں کو پکڑ کر بند کرتے۔ مجھے اور نورالصباح کو تتلیاں چھونے کا بڑا شوق تھا۔ ہم منت سماجت کر کے ڈبے سے تتلی نکلواتے پھر ڈر کے ساتھ انگلیوں پر اترے رنگ ایک دوسرے کو دکھاتے۔ بارش کے بعد میدان میں بیربہوٹیاں امڈ آتیں اور سب بچے، جن کی خالی ڈبیاں لیے بیربہوٹیوں کو پکڑنے میں شام کر دیتے۔ پھر اپنی اپنی ڈھونڈی ہوئی بیربہوٹیاں گنی جاتیں اور پھیلی ہوئی ہتھیلیوں پر رکھی سرخ مخملی مخلوق پر انگلیاں پھیری جاتیں۔ آج ۱۹۹۵ میں یہ بات یاد کرتے ہوئے بھی عجیب سا محسوس ہوتا ہے کہ کراچی میں کبھی بچے تتلیاں اور بیربہوٹیاں پکڑا کرتے تھے یا یہ کہ کبھی یہاں قدم قدم پر بڑے بڑے سرخ پتوں والے بادام کے پیڑ ہوتے تھے اور زمین پکے ہوئے سرخ باداموں سے پٹی رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ کراچی سے بادام، امرود، جامن، شریفے اور املی کے پیڑ غائب ہوتے گئے اور شہر سفیدے کی لپیٹ میں آگیا۔

ابا اور امی دونوں ہی کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ امی بتاتی ہیں کہ ان دنوں مجھ سے دو سال چھوٹی بہن پیدا ہوئی، امی صالحہ عابد حسین کا ناول عذرا پڑھ رہی تھیں۔ میرے سے بڑے بھائی کا، میرا اور ان کا

Scanned with CamScanner

نام ہوا۔ احتشام الحق ان سے دو سال بعد دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ امی نے تحریر کیا تھا: ضیاالدین، رحمت النساء، طلعت النساء۔ طلعت ان دنوں تین چار برس کی ہوگی۔ نام ساتویں دن طلعت رکھ دیا گیا تھا، لیکن امی کو عذرا نام اس قدر پسند آیا کہ مہینوں سے طلعت کا نام بدل کر عذرا رکھ دیا۔ امی ہم بچوں کو کہانیاں پڑھ کر سنایا کرتیں۔ کتابیں خریدنے کا شوق سب بہن بھائی، مجھے اور عذرا کو بھی تھا۔ ہم اپنے جیب خرچ کا زیادہ حصہ کتابیں اور رسالے خریدنے میں صرف کرتے۔ اس زمانے میں بچوں کی اردو کہانیاں چار آنے، آٹھ آنے، روپے دو روپے میں آتی تھیں۔ انگریزی کی Archie کامکس دو آنے میں، باتصویر، عمدہ پیپر پر چھپی fairy tales ایک روپے میں مل جاتیں۔ یہ ۱۹۶۰ کی دہلی کی بات ہے۔ ہم بچوں کی کتابیں اور رسالے کوٹھی میں رکھنے کے لیے جگہ نہ تھی، سب ایسی کتابیں اور رسالے کاغذی بازار میں واقع دکان کی دو چھتی میں ڈھیر کر دیتے تھے۔ دو کمروں کا ہمارا فلیٹ تھا اور بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد۔ ابا صرف چند ایک کتابیں دیوار میں بنی الماری میں رکھ دیتے جس کے پٹ ہمیشہ بند رہتے۔ رات کو سونے سے پہلے بستر پر لیٹ کر ابا مجھ سے الماری کھلواتے جس کی کنڈی مجھے مونڈھے پر چڑھ کر کھولنی پڑتی۔ پھر ایک کتاب نکلواتے۔ مجھے صرف ایک کتاب یاد ہے، ممتاز مفتی کی علی پور کا ایلی۔ یہ ایک بے حد ضخیم کتاب تھی، مجلد، اور سبز اور خاکی ڈسٹ کور پر بہت سے مونڈھے بنے ہوئے تھے۔ میں یہ کتاب مونڈھے پر چڑھ کر احتیاط سے نکال کر ابا کو دیتی۔ مونڈھے کی سمت بنی ہوئی تصویر دیکھ کر ایک دفعہ میں نے پوچھا، ابا کیا یہ مونڈھے کی کہانی ہے؟ ابا نے ہنس کر کہا تھا، نہیں۔ ابا سے مجھے ایک شکایت تھی۔ وہ اس کتاب کے دو چار ہاتھوں صفحے پڑھ کر شاید سو جاتے، مجھ سے واپس رکھوا دیتے۔ مجھے یہ بے صبری کہ آخر ابا اسے فوراً پوری کیوں نہیں پڑھ ڈالتے۔

ابا کو گاڑی چلانے کا بڑا شوق تھا۔ وہ سیکنڈ ہینڈ گاڑی خریدتے اور ہر سال گاڑی تبدیل کرتے۔ سبھی آسٹن ہی تھیں۔ فورڈ کی سفید اسٹیشن ویگن کی یاد بے حد واضح ہے۔ وہ ہم بچوں کو بہت پسند تھی۔ پچھلے حصے میں بیٹھ کر ڈکی کا دروازہ کھول لیتے۔ خاندان کے تمام بچوں کو گاڑی میں بھر کر ابا سیر کرانے لے جاتے۔ گلشن میں کناٹ پلیس ہم بچوں کی پسندیدہ جگہ تھی۔ ہم سب گنبد نما گول عمارت سے ملحق پوری پتھر کی سی چکنی ڈھلان پر چڑھ کر پھسلا کرتے۔ اتوار کے اتوار پالس ہے، جھنڈے وال پیر ڈریو سٹ کا چکر لگتا۔ شام کو صدر میں واقع کیپیٹل چورن میں ہم بچوں کو آئس کریم کھلانے لے جاتے۔ منٹو پیر بھی ایک دو دفعہ گئے۔ سٹی ریلوے اسٹیشن اور ایئرپورٹ بھی تفریح کی غرض سے جایا کرتے۔ ابا کے ایک دوست تھے، ایم ایف آئس کریم فیکٹری کے مالک۔ ہم بچے اکثر ابا کے سر ہو جاتے کہ ہمیں ان کی فیکٹری کی سیر کرائیں۔ فیکٹری میر کے مضافات میں تھی اور آس پاس ان کے امرود کے باغات ہوا کرتے تھے۔ پہلے باغ میں جا کر جی بھر کر امرود کھائے جاتے۔ پھر فیکٹری کی سیر کرا کے آئس کریم کھلائی جاتی۔ آئس کریم سے ہماری مراد وہیں ملتی تو اسے پیچ کی جاتی بلکہ ایم ایف آئس کریم کے ڈبے بھی ساتھ ملتے۔ ہم بچوں کا مزہ تو ہوتا سیر کرنا ہی ہوتا۔ اگر کہیں دور نہیں تو پ

ہمیں سوسائٹی کی گلیوں ہی سے جھنڈا لہراتے لے جاتے۔ جبل پارک کے قریب ایک گلابی رنگ کا بنگلہ تھا گنبدوں، محرابی کھڑکیوں اور محرابی دروازوں والے اس منفرد بنگلے کے دو گیٹ تھے گاڑی کے، اور اندر سے پوری تھا۔ ہم یہیں تو پہ کھڑے ہو کر اس کی تعمیر دیکھا کرتے، بالکل پریوں کا محل۔ اس بنگلے پر اکثر سناٹا چھایا رہتا اور دونوں گیٹ ہمیشہ کھلے ہوتے۔ ایک گیٹ سے گاڑی اندر آتی اور دوسرے گیٹ سے نکل جاتی اور ہم بچے، گردن اس طرف موڑ کر دیکھتے رہ جاتے۔ اس بنگلے کا رنگ آج بھی گلابی ہے لیکن اب اس کے در و دیوار پر اس افسوس، معصومیت اور مہمان نوازی کی جگہ کرختگی اور سرد مہری نے لے لی ہے۔ دیواریں بلند ہو چکی ہیں اور بند آہنی گیٹوں کے باہر ایک چوکیدار بیٹھا ہوتا ہے۔

سال میں ایک دفعہ ایک تفریح کا موقع بندر روڈ پر بھی ملتا۔ یہ دن محرم کو نکلنے والے تعزیے اور علم کے بڑے جلوس اور ذوالجناح کے دیدار کا موقع ہوتا۔ یہاں ہم ماموں کے ساتھ جایا کرتے۔ نانا، نانی، ماموں اور بھائی اور میری خالہ طیبہ میں رہتے تھے۔ یہ شیعہ محلہ تھا۔ آدھے گھر سنیوں کے بھی تھے۔ ہم بچے عشرہ محرم سے نانی کے گھر رہنے آ جایا کرتے۔ محلے میں ہونے والی مجلسوں میں شریک ہوتے۔ چھریوں کا ماتم اور ذوالجناح دیکھنے کے چکر میں نو اور دس محرم کی راتوں کو جاگتے رہنے کی کوشش کرتے۔ جب نیند سے آنکھیں بوجھل ہونے لگتیں تو ہم نانی یا بھائی کو تاکید کر دیتے کہ ہمیں جلوس کے وقت ضرور اٹھا دیں گی۔ صحن میں بچھی چارپائیوں پر پڑ کر سو جاتے۔ واقعی ہمیں جلوس نکلنے پر جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا جاتا اور ہم بچے دروازے کھول کر دہلیزوں پر کھڑے ہو جاتے۔ تنگ گلیوں سے جب جلوس اور ذوالجناح گزرتے تو یہ سب اتنے قریب سے دیکھنے کی عجب خوشی ہوتی۔ بندر روڈ پر البتہ گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر ہم دیکھا جاتا۔ اس زمانے میں لوگ گھروں کے دروازے کھلے ہی رکھتے تھے۔ وہ بندر روڈ پر رہنے والے اتنے مہمان نواز ہوتے تھے کہ سب کو چھتوں اور سیڑھیوں پر بیٹھ کر جلوس دیکھنے کی خوشی اجازت دے دی جاتی تھی۔ خاص طور پر بچوں کو۔

اسی زمانے میں ابا نے سراج الدولہ روڈ کے اس پار دلکشا ہاؤسنگ سوسائٹی میں زمین خریدی۔ مکان کی تعمیر شروع ہوئی۔ اب ہم بچوں کی آوارہ گردی کا دائرہ وسیع تر ہو گیا۔ پلاٹ پر جانے کے سامنے ہم آس پاس کی گلیوں اور تھوڑے فاصلے پر واقع پہاڑی تک جانے لگے۔ یہ پہاڑی، جو جبل پارک کہلاتی ہے بڑے بڑے پتھروں، جنگلی جھاڑیوں، خودرو پودوں اور گھاس پھوس سے ڈھکی ہوتی تھی۔ پہاڑی پر دو تین پگڈنڈیاں ہوتی تھیں جسے لوگ سوسائٹی کے دوسرے حصے کو عبور کر کے ڈرگ روڈ (شاہراہ فیصل) تک پہنچنے کے لیے استعمال کرتے۔ لیکن پہاڑی پر ہم بچے کبھی سیدھے جانے کی ہمت نہ کر پاتے۔ احتشام بھائی جان سے پیچھے پڑتے کہ پہاڑی پر چلیں۔ اور سب بچے ان کے پیچھے پیچھے بھاگتے دوڑتے پہاڑی پر چڑھتے۔ پہاڑی کے اوپر سے دوسری طرف ڈھلان پر سے مکانات کھلونے اور سڑک پر چلتی موٹریں ماچس کی ڈبیاں نظر آتیں۔

ہم سب بچے دہلی مرکنٹائل سوسائٹی (ڈی ایم سی) ہائی اسکول میں پڑھتے تھے جو گھر کے قریب ہی

تی۔ جب میں پانچویں جماعت میں آئی تو لڑکیوں کی علیحدہ شاخ کھلی جو شہید ملت روڈ کے پار کوکن سوسائٹی میں واقع تھی۔ شہید ملت روڈ اس زمانے میں ایک تنگ اور ٹوٹی پھوٹی دو رویہ سڑک ہوا کرتی تھی جو ڈرگ روڈ کو جیل روڈ سے ملاتی تھی۔ سڑک کی دو پٹیوں کے درمیان ایک وسیع و عریض میدان تھا۔ گھر سے اسکول تک پندرہ منٹ کا فاصلہ تھا اور ہم بچے کھیلتے کودتے، شہید ملت روڈ کا میدان پار کرتے اسکول پہنچتے۔ (یہ سڑک ستر کی دہائی کے وسط میں چوڑی ہوئی۔) اسکول کے بعد اکثر میں، نور الصباح اور دو تین سہیلیاں گھر کی طرف لوٹتے اور گھر سے آگے واقع جمیل پارک چلے جاتے۔ (یہ سوسائٹی کا وہی پارک ہے جو ستر کی دہائی کے آخر میں کٹ کٹا کر چھوٹا ہوا، اسی کی دہائی میں یہاں رہائشی منصوبہ شروع ہوا جو شہریوں کے دباؤ کی وجہ سے اب تک کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔) مجھے یہ باغ بے حد پسند تھا۔ اس کی وجہ نفاست سے تراشی ہوئی ہری بھری باڑھیں تھیں جو باغ کو چھوٹے چھوٹے چوکور احاطوں میں تقسیم کرتی تھیں۔ یہ سبز دیواریں ہمارے قد سے اونچی ہوا کرتی تھیں۔ ہم ان سبز دیواروں کے گرد گھومتے اور دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی دنیا میں گم ہو جاتے۔ بے شک جب ہم باغ سے واپس لوٹتے تو پوچھا جاتا کہ ہم کہاں تھے لیکن یہ ہماری ماؤں کے لیے کوئی ایسی پریشانی کی بات نہ تھی۔ وہ پرسکون دور تھا کراچی کا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم بچیوں کی طرف سے ہماری ماؤں کو صرف ایک دفعہ پریشانی لاحق ہوئی تھی کہ بچیوں کے کانوں سے سونے کی بالیاں کوئی اتار نہ لے۔ ہوا یوں کہ ایک دفعہ میری چھوٹی خالہ زاد بہن روتی ہوئی گھر پہنچی کہ ایک بابا نے اس کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار لی ہیں۔ اس واقعہ کا ردعمل صرف یہ ہوا تھا کہ ہم سب بچیوں کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار دی گئی تھیں۔ ہمارا گھومنا پھرنا اسی طرح جاری رہا تھا۔

ساٹھ کے عشرے میں طارق روڈ پر کیفے لبرٹی کے آس پاس چند دکانیں کھل چکی تھیں۔ یہ اسٹیشنری، کتابوں اور کپڑوں کی دکانیں تھیں۔ لندن بک ہاؤس، گلستان بک اسٹال، اور پچھلی گلی میں (جو اب دوپٹہ گلی ہے) ایک دو اسٹیشنری کی دکانیں اور ایک چھوٹی سی لائبریری ہوا کرتی تھی۔ طارق روڈ ہمارے گھر سے پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ میں اور عذرا ہفتے میں کئی چکر لندن بک ہاؤس اور لائبریری کے لگاتے۔ کتابوں کے علاوہ ہم دونوں کو paper dolls جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ لندن بک ہاؤس سے باقاعدگی سے یہ کاغذ کی گڑیاں خریدی جاتیں۔ ہم دونوں اکثر اکیلے ہی طارق روڈ جایا کرتے تھے۔ کتابوں کا شوق ہم اس زمانے میں ایک چلتی پھرتی لائبریری سے بھی پورا کرتے تھے۔ اس لائبریری کا مالک ایک نرم گو، شفیق چہرے والا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جو سائیکل کی پشت پر بندھے بڑے سے تھیلے میں بچوں کی کتابیں ڈالے سوسائٹی میں گلی گلی آواز لگاتا گھوما کرتا۔ یہ لائبریری والا ہفتے میں دو تین دفعہ ہماری گلی میں بھی آتا۔ ہم بچے اس کا بے چینی سے انتظار کرتے۔

نیا گھر بنے میں چار پانچ سال لگے۔ وجہ مالی مشکلات تھیں۔ آخر جب کرائے کے مکان میں رہنا مشکل ہو گیا تو ہم نئے مکان میں شفٹ ہو گئے گو کہ ابھی چھوٹے موٹے کافی کام باقی تھے۔ گھر میں گیٹ بھی نہیں لگا تھا۔ امی، ابا اور ہم بچے (اب ہم چار بہنیں اور چار بھائی تھے) نچلی منزل میں مقیم ہوئے اور اوپر تایا اور

بچپن کے کیسے آباد ہوئے۔ یہ گھر ابا نے روایتی طرز پر بنوایا تھا، یعنی بیچ میں ایک آنگن تھا جس کے تین طرف کمرے، باورچی خانہ، غسل خانہ تھا اور چوتھی سمت ایک چھوٹی سی کھلی جگہ تھی، باغیچہ نما۔ کیاری میں پیڑ پودے لگائے گئے تھے — رات کی رانی، دن کا راجہ، چمپا اور چنبیلی اور درمیان میں گھاس لگانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس باغیچے اور گیراج کے درمیان کوئی دیوار نہ تھی اور آنگن بھی کھلا تھا۔ یعنی گیٹ سے داخل ہو کر بجائے صدر دروازے کے اس کھلی جگہ سے آنگن اور پھر کمروں میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ مالی دشواریوں کی بنا پر ابا تقریباً تین سال تک گیٹ نہ لگوا سکے۔ لیکن ہم سب اپنے کمروں کے دروازے کھلے رکھ کر اس تمام عرصے چین کی نیند سوتے تھے۔ اب تو کراچی کے وہ دن مٹھی میں ریت کے مانند ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔

گھر کے آنگن اور اس سے جڑے چھوٹے سے باغیچے کے ساتھ ایک بے حد خوش کن اور منفرد یاد وابستہ ہے۔ وہ یاد ہے چارلی چیپلن کی فلموں کی۔ ابا کو موسیقی، فلموں اور فوٹوگرافی کا شوق تھا۔ ابا کے پاس دو پروجیکٹر تھے۔ ایک چھوٹا سیکنڈ ہینڈ خاموش فلموں کے لیے، اور دوسرا بڑا جو ابا ۱۹۵۸ میں جاپان سے خرید کے لائے تھے (ابا کا بزنس کے سلسلے میں جاپان جانا ہوا تھا)۔ ابا اس زمانے میں USIS کے ممبر تھے۔ چارلی چیپلن اور ڈاکیومنٹری فلموں کی ریلیں وہیں سے لائی جاتیں۔ رات کے کھانے کے بعد باغیچے کی دیوار سے لگی کپڑے سکھانے کی ڈوری پر ایک سفید دھلی ہوئی چادر لٹکائی جاتی، ابا پروجیکٹر سیٹ کرتے، چھوٹے پیڑھے، موڑھے، دو پلنگ اور گھر میں پائی جانے والی تمام کرسیاں نکال کر آنگن میں بچھائی جاتیں، آنگن اور کمروں کی بتیاں گل کی جاتیں، اور ہم بچے اپنی اپنی سیٹیں سنبھالتے۔ کیاری میں لگی رات کی رانی اور چنبیلی کی مہک سے لبریز، کراچی کی خوشگوار ہوا آنگن میں تیرتی، اور ہم سب چارلی چیپلن کی مزیدار حرکتوں پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے!

لیکن ابا کبھی ہم بچوں کو فلم دکھانے سینما نہیں لے گئے۔ ہندوستانی اور انگریزی فلمیں اپنے دوستوں کے ساتھ دیکھا کرتے۔ ابا کے ان گنت جگری یار تھے — دلی کے تاجر وحید صاحب، بنگال سے بیوروکریٹ عالم صاحب، بہار کے انجینیر سید صاحب، پنجاب کے ٹھیکیدار شیخ صاحب، اور کراچی کے پارسی بلیموریا صاحب۔ سوائے ان بلیموریا صاحب کے، باقی سب کے گھروں میں امی اور ہم بچوں کا آنا جانا تھا۔ سب سے زیادہ دوستی وحید صاحب اور عالم صاحب کی فیملی سے تھی کیوں کہ ان کے بچے ہم بچوں کے ہم عمر تھے۔ سید صاحب کی نئی نئی شادی ہوئی تھی لیکن ان کی سوشیالوجی میں ایم اے پاس بیوی سے امی کی بھی دوستی ہو گئی تھی۔ بلیموریا صاحب کے ہاں اولاد نہ تھی، اور غالباً ابا کا خیال ہو گا کہ امی کی دوستی مسز بلیموریا سے شاید نہ ہو پائے، اس لیے وہ ہمیں بچپن میں ان کے گھر نہیں لے گئے۔ لیکن گھر میں بلیموریا صاحب کا تذکرہ بڑی زور شور سے ہوا کرتا تھا۔

امی کو بھی فلمیں دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ امی نے زیادہ تر فلمیں بیگم وحید اور بیگم عالم کے ساتھ

Scanned with CamScanner

دیکھیں۔ عالم صاحب اسسٹنٹ پروموشن بیورو میں ڈائریکٹر ہو گئے تھے اور جمشید کوارٹرز میں ان کی رہائش تھی۔ وحید صاحب ڈیسر روڈ کے ایک فلیٹ میں رہا کرتے تھے۔ پھر انھوں نے پی ای سی ایچ ایس میں مکان بنوایا اور وہاں منتقل ہو گئے۔ اکثر دوپہر میں امی چھوٹے بچوں کو سیدہ بیگم کی نگرانی میں یک جائی پر سونے کے حوالے کر کے میرے ساتھ پیچھے سے نکل آتیں۔ پھر ہم دونوں رکشہ میں عالم صاحب کے گھر پہنچتے۔ مسز عالم اور ان کی بیٹی شائستہ، جو میری ہم عمر تھی، فلم دیکھنے کے لیے بالکل تیار ہوتیں۔ وہ بھی اپنے چھوٹے بچوں کو پڑوسیوں کے حوالے کرتیں اور ہم چاروں بیوٹی، گلستان یا ناولٹی سینما پہنچتے اور تین سے چھ بجے کا میٹنی شو دیکھا جاتا۔ اس وقت میں اسکول کے زمانے میں راج کپور اور نرگس کی پرستار تھی۔ آگ، آوارہ، انداز، برسات اور بہت سی دوسری فلمیں دیکھیں۔ جب ستمبر ۱۹۶۵ کی جنگ کے بعد ہندوستانی فلموں پر پابندی لگی تو مشرقی پاکستان میں بننے والی اردو فلمیں آخری اسٹیشن، چندا، چکوری، تلاش وغیرہ بڑے شوق سے دیکھیں۔

عالم صاحب کے گھر ہم سب کو بہت مزہ آتا۔ سب سے بڑی شائستہ، اس سے چھوٹا شاہد اور پھر پیارا اس کا اصل نام کچھ اور تھا، شہناز اور محمود۔ بچے تو روانی سے اردو بولتے لیکن مسز عالم دو چار جملے ہی بول پاتیں۔ آپس میں وہ سب ہمیشہ بنگالی بولتے۔ اکثر ہم لوگ ایک دوسرے کے گھر دعوتیں کھایا کرتے۔ ہمیں ان کی مچھلی بھات ترکاری بہت مزیدار لگتی اور انھیں ہمارے گھر کے پکے کھانے بھاتے۔

شائستہ اور میں تیرہ چودہ برس کے ہو رہے تھے۔ شائستہ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں اور نمکین جیسی ملائم سبز جلد والی پرکشش لڑکی تھی اور میں ایک کونی جسم سے چپٹی ناک، اور نکلے دانتوں والی معمولی نہیں تھی۔ شائستہ مجھے لڑکوں کی باتیں بتاتی۔ پڑوس کے لڑکے، محلے کے لڑکے، اسکول کے لڑکے، اسکول کے سامنے بس اسٹاپ پر کھڑے ہونے والے شہر کے کالجوں کے لڑکے۔ لڑکے جو اس پر عاشق تھے۔ مجھ پر کوئی عاشق نہ تھا۔ میں رشک سے شائستہ کی باتیں سنا کرتی۔ لڑکپن کی یہ گہری دوستی ۱۹۷۰ میں ایک شام دوستی کی موڑ پر پہنچ کر ختم ہو گئی جب عالم صاحب کا خاندان کراچی چھوڑ کر ڈھاکے جا بسا۔

۱۹۷۰ کی دہائی اور موجودہ عشرے کے درمیان تیس برس گزر چکے ہیں۔ تیس برس۔ ان تیس برسوں میں اس شہر، اس زمین آسمان اور شہر کے مکینوں کی زندگی میں کتنی تبدیلیاں آئی ہیں۔ تیس برس کا طویل عرصہ تو نہیں۔ یہ شاید ہے۔ لیکن کیا کسی شہر کے محض تین عشروں میں اتنی سنگین تبدیلیوں کے متحمل ہو سکتے ہیں؟

***

ملیر کی گلیاں

ملیر کی یادوں کے ساتھ ہرے بھرے پیڑ وابستہ ہیں: امرود، آم، انار، نیم، گلاب، چنبیلی، موتیا۔ ہم بچے نانی کے گھر رہنے جایا کرتے۔ نانا اور ماموں کے کوارٹر ملے ہوئے تھے۔ ہر کوارٹر میں ایک کمرہ اور ایک بڑا سا آنگن تھا۔ نانا نانی کے ساتھ خالہ رہتی تھیں، اور ماموں، ممانی اور ان کے تین بیٹے ایک ساتھ۔ دونوں کوارٹروں کی درمیانی دیوار ۔ تھی بھی یہ ایک بڑا سا گھر نظر آتا۔ نانی کے آنگن میں امرود کے تین چار پیڑ قطار سے لگے ہوئے تھے اور ایک انار کا درخت تھا۔ ماموں کی طرف ایک بڑا سا نیم کا پیڑ اور موتیا، چنبیلی، اور گلاب کی جھاڑیاں تھیں۔

چھٹیوں کی دوپہر ہم بچے درختوں پر چڑھتے، امرود توڑ توڑ کر کھاتے، آنکھ مچولی کھیلتے۔ شام کو سڑک کے اس پار ملیر ریلوے اسٹیشن کی سیر کو جاتے اور اسٹیشن کے باہر ریل کی پٹریوں کے نیچے بنی پلیاؤں کے اندر بیٹھ کر اوپر سے جاتی ہوئی ٹرین کی آواز سنتے۔ رات کو نانی چارپائیوں پر صاف ستھرے بستر لگاتیں اور ہمیں کہانیاں سناتیں۔ اور ہم تاروں بھرے آسمان کو تکتے تکتے سو جاتے۔ یہ ۱۹۶۰ کی دہائی کی بات ہے۔

تب ملیر کے ہر کوارٹر میں آنگن اور پیڑ ہوتے تھے اور گلیاں صاف ستھری۔ ہواؤں میں امرود کی مہک اور چنبیلی کی خوشبو بسی ہوتی۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے پیڑوں کو کاٹ کر اضافی کمرے بنانے شروع کیے۔ کچے آنگن پکے ہونے لگے۔ پیڑوں کی تعداد گھٹتی گئی۔ گلاب اور چنبیلی کی جھاڑیاں بھی بتدریج کم ہوتی گئیں۔ کمروں کے باہر ٹین کے شیڈ ڈال کر برآمدے بنائے گئے۔ یہ ۱۹۷۰ کے عشرے کا ذکر ہے۔

آبادی بڑھتی رہی۔ نئی مربع گز پر بنے سوادر، اور روشن گھر گھٹنے ہوئے، چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں والے تاریک، ایک منزلہ، دومنزلہ بدصورت مکانوں میں تبدیل ہو گئے۔ گلیوں کی چوڑائی کم ہو گئی کیوں کہ لوگوں نے گھروں کے باہر ناجائز احاطے تعمیر کر لیے اور سیاہ آہنی گیٹ لگا لیے تھے۔ پیڑوں کی شاخوں کی جگہ اب ٹی وی اینٹینوں، سیاسی جماعتوں کے رنگ برنگے جھنڈوں اور ٹیلی فون کے بے ہنگم تاروں نے لے لی تھی۔ یہ ملیر کالونی تھی ۱۹۸۰ کی دہائی میں۔

اور آج، اپریل ۱۹۹۵ کی ایک صبح، میں ملیر کی ایک پکی سڑک پر چلتے ہوئے اس حصے پر قدم رکھتی ہوں جو کلاشنکوف کی گولیوں کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے چھلنی اور ایک انسان کے خون سے سیاہ ہے — وہ انسان جسے آج سے پندرہ دن قبل سڑک کے اسی حصے پر سفاکی سے قتل کیا گیا۔ میں ان تبدیلیوں کو گرفت میں لانے کی کوشش کرتی ہوں جو گزشتہ تین دہائیوں میں اس زمین اور اس زمین کے باسیوں کی روح میں در آئی ہیں۔ کتنی گمبھیر تبدیلیاں ہیں یہ۔ اور کتنا مسخ کر دیا ہے انھوں نے ملیر کو، جو کبھی ایک سرسبز اور پرامن وادی تھی، اور اس کے مکینوں کی روح کو، وہ سادہ لوح، مہمان نواز مکین جو

Scanned with CamScanner

پیڑوں، پھلوں، پھولوں، سبک ہواؤں اور زندگی سے محبت کرتے تھے۔

اس منظر کی تصویر میرے ذہن کے دریچے میں ثبت ہو کر رہ گئی ہے: دوپہر کا وقت ہے۔ زندگی کا کاروبار جاری ہے۔ سڑک کے کنارے بنی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں گاہک کھڑے اشیائے صرف کی خریداری میں مصروف ہیں۔ بچے گلیوں میں کھیل رہے ہیں اور عورتیں گھروں کی دہلیز پر کھڑی ایک دوسرے سے باتیں کر رہی ہیں۔ ایک کار سڑک پر رکتی ہے۔ سامنے حلوائی اور ڈرائی کلینرز کی دکانیں ہیں۔ گاڑی میں سے تین مسلح آدمی اترتے ہیں، ڈکی کھولتے ہیں۔ ایک دبلے سوکھے، نیم جان، کرتک تنے آدمی کو نکالتے ہیں جس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے ہیں، وہ اسے تپتی ہوئی تارکول کی سڑک پر پھینکتے ہیں، اس پر کلاشنکوف سے گولیوں کی بوچھاڑ کرتے ہیں، پھر اس کے چہرے پر ٹھوکر مار کر اطمینان کرتے ہیں کہ وہ مر چکا ہے یا نہیں۔ اور جب اس کا خون آلود سرکٹا چہرہ ایک طرف ڈھلک جاتا ہے تو گاڑی کا دروازہ کھول کر اطمینان سے بیٹھتے ہیں اور گاڑی تیزی سے سڑک پر چلتی ہوئی لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

لاش تین گھنٹے خون کے تالاب میں ڈوبی پڑی رہی۔ وہ ایک تنومند، خوبرو جوان تھا۔ کوئی لاش کے قریب نہ پھٹکا۔ سڑک پر زندگی کا کاروبار جاری رہا۔ البتہ ایک وحشت ناک خاموشی پھیل چکی تھی۔ لوگ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ اپنے کام جلدی جلدی نمٹا رہے تھے اور لاش کو کن انکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔ آخر کار تین گھنٹے بعد پولیس کی ایمبولینس پہنچی اور لاش اٹھا کر لے گئی۔ ہفتہ بھر وہ لاش مردہ خانے میں پڑی رہی۔ پھر کہیں جا کے اس کی شناخت ہوئی۔ پتا چلا کوئی فوجی تھا۔ سفید بالوں اور جھریوں بھرے چہرے والی بوڑھی خواتین موضوعِ سخن سے ہٹ چکی ہیں۔ میں ملیر کے اس گھر میں جس کی ان کے نوجوان بیٹے کے بارے میں بات کر رہی ہوں جو چند ماہ پہلے اس گھر کے اندر قتل ہوا تھا۔

اللہ رحم کرے ہم سب پر۔ ہمیں کیا ہو گیا ہے؟ کیا ہمارے اندر شیطان حلول کر گیا ہے؟ مقتول کی پھوپھی، تسبیح ہلاتی ہوئی، تیز تیز بولے جا رہی ہیں۔ مقتول کی ماں کسی سوگ میں گم ہوئی ہیں اور میں گھر کی عورتوں سے بات کر رہی ہوں۔

لوگ اتنے بے درد، اتنے بے رحم ہو گئے ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں کہ بھیڑ بکریوں کو بھی ایسے ذبح نہیں کیا جاتا۔۔ مقتول کی پھپھی تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہہ رہی ہیں۔ اس روز تو میں ظہر کی نماز کے بعد تسبیح پڑھ رہی تھی۔ ریحان دوسرے کمرے میں نماز پڑھ رہا تھا۔ ریحان کی ماں بھی نماز پڑھ رہی تھیں۔ دودھ والا دودھ دے کر جا چکا تھا اور میں دودھ کی تھیلی ہاتھ میں لیے باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی کہ سامنے میں نے ایک سفید کار گھر کے گیٹ پر رکی، تین آدمی بڑی بڑی مونچھیں لیے ڈراتے ہوئے اندر آ گئے اور چلا کر پوچھا: ریحان ہے؟ انھوں نے جواب کا انتظار بھی نہ کیا اور سیدھے اندر چلے گئے۔ ہمارے گھر کے ساتھ والا مکان ریحان کا ہے اور اندر سے ایک چھوٹا سا راستہ ہے جو دونوں گھروں کو ملاتا ہے۔ بس وہ سیدھے اس راستے سے ہوتے ہوئے اندر چلے گئے۔ ریحان ظہر کی نماز

Scanned with CamScanner

پڑھ رہا تھا، چچی یک دم سے خاموش ہو گئیں۔ پھوپھی، ماں اور چچی کی چیخوں اور بچوں کی خوف زدہ ہو کر رونے کی آوازوں کے درمیان قاتلوں نے کمرے میں داخل ہو کر گولیوں کی باڑھ ماری۔ ریحان کے ہاتھ نماز کے لیے بندھے ہوئے تھے۔ سینے پر بندھے ہاتھوں کے ساتھ کوئی آواز نکالے بغیر گر گیا۔ بائیس گولیاں نکلی تھیں جسم سے، وہ مجھے بتا رہی ہیں۔

یہ سب کچھ منٹوں میں ہو گیا اور قاتل جس راستے سے آئے تھے اسی راستے واپس ہو گئے۔ دو کے منہ پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے اور ایک جو درمیانی راستے پر گم ہو کر کھڑا ہوا تھا نقاب نہیں پہنے تھا، چچی نے بتایا۔

شاید آپ اسے پہچان سکیں؟ میں سوالیہ لہجے میں کہتی ہوں۔

میں؟ نہیں۔ نہیں۔ وہ گھبرا سی گئیں۔ مجھے اس کی شکل بالکل یاد نہیں، ہوش و حواس میں کہاں تھی تب"

گر پہچان بھی لیں تو کیا ریحان ہمیں واپس مل جائے گا؟ جانے والا تو گیا، پھوپھی تندی سے بولیں۔

پھوپھی مجھے وہ کمرہ دکھانے لے جاتی ہیں جہاں وہ قتل ہوا تھا۔ یہ ایک بہت تنگ سا کمرہ ہے جس میں صرف ایک صوفہ سیٹ ہے جو تین دیواروں کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ صوفے کی وسطی میز کو چوتھی دیوار کے ساتھ لگا کر رکھا گیا ہے اور کمرے کے وسط میں دری بچھی ہوئی ہے جس پر جائے نماز بچھائی جا سکتی ہے۔ چاروں دیواریں، اور صوفہ سیٹ گولیوں سے چھلنی ہیں۔ میں صوفے پر بیٹھی ہوں۔ ریحان کی چچی ہمارے لیے چائے لے کر آئی ہیں۔

ستائیس سالہ ریحان ایک بہن اور سات بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ ریحان کے باپ تیرہ سال پہلے طویل بیماری کے بعد فوت ہوئے۔ ریحان اس وقت آٹھویں میں تھا۔ اس نے پڑھائی جاری رکھی اور لیاقت مارکیٹ میں اپنے ماموں کی دکان میں بطور سیلزمین کام شروع کیا۔ بی کام کرنے کے بعد اس نے دوپٹوں کی دکان لگائی۔ دو چھوٹے بھائی اس کی مدد سے جمعہ بازار میں اسٹال لگاتے۔ پورے گھر کی ذمہ داری اس پر تھی۔

ریحان کے قتل کے بعد سب کچھ ختم ہو گیا۔ بھائیوں نے تین ماہ سے جمعہ بازار میں اسٹال نہیں لگایا ہے۔ ایک چھوٹے بھائی کی ذہنی حالت بگڑ گئی۔ عجیب بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔ پنڈی بھیج دیا تھا رشتے کے چچا کے پاس۔ لیکن کوئی خاص فرق نہیں پڑا ہے۔ گھنٹوں چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ خلا میں تکتا رہتا ہے۔ ہاتھ کھڑے کھڑے سینے پر باندھ لیتا ہے جیسے نماز پڑھ رہا ہو اور رونے لگتا ہے۔ میرا بھائی ستائیس سال کا تھا۔ اس کی شادی ہونے والی تھی۔ اور پتہ نہیں کیا کیا، پھوپھی کہہ رہی ہیں۔

کیا ریحان کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ تھا؟

پھوپھی اور چچی خاموش ہو جاتی ہیں۔

Scanned with CamScanner

انہیں کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ آپ ان کی ماں سے بات کریں [illegible] وہ بتا سکیں گی سب۔

رحمان کا تعلق [illegible] محلے کے لوگوں سے معلوم ہوا [illegible] تین سال پہلے رحمان کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ [illegible] آیا۔ [illegible] شروع کی تھی۔ اغوا کے بعد [illegible] کسی کو کچھ [illegible] وحشت زدہ رہا۔ [illegible] کھانا کھاتا [illegible] خود ہی [illegible] کچھ پوچھنے کی [illegible] ماں اور پھوپھی کے بیچ میں [illegible] وقت [illegible] لیکن ایک تسلی تھی کہ زندہ سلامت تو ہے۔ اب تو سب کچھ ختم ہو گیا۔ یادیں رہ گئی ہیں۔

ملیر، اے ون ایریا۔

[illegible] ۱۹۷۰ کے عشرے [illegible] صرف ایک [illegible] اور [illegible] ۱۹۸۰ کی دہائی کے اوائل میں [illegible] ۱۹۸۰ کی دہائی کے وسط میں [illegible] لیکن [illegible] علاقوں سے آنے والے لوگوں کے ہاتھوں [illegible] ۱۹۸۰ کی دہائی [illegible] ۱۹۹۲ [illegible] آپریشن کلین اپ [illegible] پیدائش [illegible] کا کام کیا۔

[illegible] ۳۵ [illegible] علاقوں [illegible] علاقے کا [illegible] ہیں۔

[illegible] گلی میں [illegible] روپے [illegible] تقسیم [illegible] ہیں

کہ اسلحہ خریدا جا سکے۔ غریب دودھ والا دس ہزار کہاں سے لاتا۔ بے چارہ یہ علاقہ چھوڑ گیا۔ خدا جانے اب کہاں دودھ بیچتا ہوگا۔

تو یہ حال ہے ہمارے علاقے کا۔ یہ غنڈے بدمعاش جن کے منہ سے ابھی دودھ کی بو آتی ہے، نہ صرف یہ کہ بھتہ مانگتے ہیں بلکہ تمہارے منہ پر کہتے ہیں کہ سب ختم ہو گیا ہے، بندوقیں لاتی ہیں، گولیاں خریدتی ہیں۔ سکینہ، عمر پچپن سے کچھ کم، مادری زبان پنجابی، سانس لیے بغیر بول رہی ہیں۔ تیس سال کے عرصے میں سکینہ نے اس علاقے کا جو اخلاقی اور معاشرتی زوال دیکھا ہے، اس نے ان کا سر چکرا دیا ہے۔

میں ان کے گھر میں بڑی خالہ کے ساتھ ان کے بیٹے کا حال پوچھنے آئی ہوں جو گلی میں چلنے والی گولیوں سے شدید زخمی ہوا تھا۔ میری خالہ گورنمنٹ کے ایک محکمے سے وابستہ ہیں اور اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اس علاقے میں رہتی ہیں۔

اس دن بہت فائرنگ ہو رہی تھی۔ احمد نے ہم سب کو اندرونی کمرے میں جانے کو کہا اور برآمدے میں آیا کہ گیٹ بند کر لے۔ خدا جانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے گیٹ ذرا سا کھول کر باہر جھانک لیا۔ ایک گولی اس کی دائیں آنکھ کے اوپر لگی اور وہ وہیں گر پڑا۔ باہر لڑکوں کی آوازیں آنا شروع ہوئیں: احمد بھائی کے گولی لگ گئی، فائرنگ بند کرو، فائرنگ بند کرو۔ فائرنگ بند ہو گئی۔ محلے کے لڑکے ہماری مدد کو آئے اور احمد کو ہسپتال پہنچایا گیا۔ دوسرے دن دو تین لڑکے میرے پاس آئے اور کہنے لگے: خالہ معاف کرنا، لیکن یہ ہماری گولی نہیں تھی جو احمد بھائی کو لگی۔ اور دیکھو ان کی ہمت۔ اور ہماری بے بسی۔ کیا کر سکتے تھے ہم؟ اگر وہ لڑکا بھی، جس کی بندوق سے چلی ہوئی گولی احمد کو لگی، ہمارے پاس آ جاتا تو ہم کیا بگاڑ سکتے تھے اس کا؟ کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ کوئی ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا۔ اور اٹھائے بھی کیسے؟ کوئی دو لفظ بول دے تو جان سلامت نہیں۔ سکینہ کہہ رہی ہیں۔ مال تو جیسے جانے کی ہوس نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔۔ وہ چپ ہو جاتی ہیں۔

جس دن میرے بھائی کو گولی لگی جی چاہتا تھا پورے ساری دنیا کو جلا کر راکھ کر دوں۔ احمد کی چھوٹی بہن کی آواز غصے سے کپکپا رہی ہے۔ وہ بی اے پاس ہے اور ایک دوا ساز کمپنی میں کام کرتی ہے۔ اس کی دو چھوٹی بہنیں سامنے دری پر بیٹھی مٹر کی پھلیاں چھیل رہی ہیں۔

یہ چھ بہنیں اور تین بھائی ہیں۔ احمد سب سے بڑا ہے۔ دو بہنیں نوکری کرتی ہیں۔ باپ کسی زمانے میں سپاہی تھے۔ اب معمولی پنشن ملتی ہے۔ احمد ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ پھر اسے فیکٹری سے نکال دیا گیا۔ فیکٹری نقصان میں جا رہی تھی لہٰذا بیس آدمیوں کی چھٹی ہوئی۔ ایک دفعہ احمد نے باہر جانے کی کوشش کی۔ آٹھ ہزار روپے تنگ آ کر کسی ایجنٹ کو دیے۔ لیکن پولیس والوں نے پکڑ کر واپس بھیج دیا۔

احمد دو سال سے بے روزگار ہے۔

میں خالہ کے ساتھ شہر کی گلیوں سے گزر رہی ہوں۔ اس علاقے میں بہت اسلحہ ہے۔ جہاں ایک

Scanned with CamScanner

والی گلی میں ہماں لڑکوں نے قبضہ کیا ہوا ہے۔ یہ گھر اسلحہ ڈپو بنے ہوئے ہیں۔ کبھی ان گھروں کے دروازے کھلے ہوتے ہیں اور قطار سے لگی ہوئی بندوقیں، کلاشنکوفیں اور گولیوں کی پیٹیاں نظر آتے جانے والے کو صاف نظر آتی ہیں۔ بندوقیں لٹکائے یہ لڑکے گولیوں کی پیٹیاں ادھر سے ادھر پہنچاتے رہتے ہیں۔ آج کل البتہ یہ لڑکے روپوش ہیں۔ جب سے دو ایجنسی مارے گئے ہیں، تب سے ادھر سکون ہے۔

یہاں دو بدنام ترین لڑکے ہیں حقی کے۔ ایک کو تو پولیس گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ محلے والوں نے سکون کا سانس لیا کہ چلو ایک تو کم ہوا۔ لیکن ایک نئے بندے (۱۸) کا واپس گلیوں میں گھوم رہا تھا اور ... میں لوگوں کو مار رہا تھا، دونوں روپے دبے ہیں۔ ان لڑکوں نے کمسن بچوں کو تنخواہ پر رکھا ہوا ہے جو پولیس یا دوسرے گروپ کے لڑکوں کے آنے کی اطلاع ہر وقت پہنچاتے رہتے ہیں۔ یہ بچے ... کے ... انھیں کہتے ہیں اسلحہ گروپ سے ان کو کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ لیکن حقیقی والے ان سے بھی بدتر ثابت ہوئے ہیں۔

ہم ایک گھر میں داخل ہوتے ہیں جس کا سربراہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی، پانچ بیٹوں اور پانچ بیٹیوں کا باپ، دو ... ایک ... کی کانچ ... ہوئی ہیں۔ میں ان سے بات چیت ... سب سے ... لڑکی بیس سال کی ہے۔ اس دن ... گلی کی نکڑ پر حنیف کی دکان سے ... حنیف ... کچھ مسلح ... گاڑی میں آئے اور گولیاں برسا کر چلے گئے۔ حنیف ... وقت ختم ہو گیا۔ ... سڑک پر پڑے رہے۔ کوئی اٹھانے نہیں آیا۔ ... کہ ... نے ... جب گولیاں چلنی بند ہوئیں تو وہ باہر ... سڑک پر پڑے ہوئے تھے۔ ... اسپتال جاتے وقت راستے میں ختم ہو گئے۔

میرے بیٹے ... کا کسی بھی پارٹی سے تعلق نہیں رہا، لیکن ... کی موت کے بعد یہ کیو ایم حقیقی دونوں ... نے دعویٰ کیا کہ ... پارٹی کے ... تھے۔ یہ جھوٹ تھا۔ بعد میں جب ... سے ... کی ... کیا۔ ... سب پارٹیوں کا ۹۱ اشتہار ... بیچ سکتے ہیں۔ ... آدمی ... میں دکھانے کے لیے ... غلط ڈھال رہا ہے۔ لیکن میرے ساتھیوں نے منع کر دیا۔

... پارٹی ... بچے ... دکھ ... سے ہماری باتیں سن رہے تھے۔

... دوکانوں ... چوکی ... تھے۔ وہ ... رہی ہے۔ ... مستقل اس خاندان میں دو کمانے والے ہیں۔

... کی ... ہوئی تھی ... دونوں ... باہر ... بہت ڈرتے تھے۔ ... سے ... دونوں بیٹے ... کی جان کو لیں گے۔ بہت ... نہیں ہو

رہی ہیں۔ کسی کو کیا معلوم تھا خود ہی واردات کا شکار ہو جائیں گے۔

کیا حکومت کی طرف سے کوئی معاوضہ وغیرہ ملا؟ نہیں صرف ایف آئی آر کی کاپی ملی جو پولیس نے خود درج کی تھی۔ اور ابا کی موت کا سرٹیفکیٹ جو اسپتال والوں نے دیا۔

لیاقت آباد میں بھی بہت برا حال ہے، جہاں میں رہتی ہوں۔ لیکن یہاں کے حالات تو بہت ہی خراب ہیں۔ ایک بوڑھی خاتون جو گھر میں مہمان آئی ہیں بتانے لگیں۔ دو مہینے پہلے میں یہاں آئی تھی۔ بس سے اتر کر گلی میں داخل ہوئی۔ میری نظریں نیچی تھیں کیونکہ میں صرف زمین کی جانب نظریں جمائے رکھتی ہوں کہ کسی پتھر سے ٹھوکر نہ کھاؤں۔ ادھر اُدھر تو دیکھتی نہیں۔ انھوں نے موٹے شیشوں والا چشمہ درست کیا، اور بولیں، "میں جب گلی میں داخل ہوئی اور نظر اٹھائی تو دیکھا تین لڑکے یہ لمبی لمبی بندوقیں کندھوں پر اٹھائے کھڑے ہیں۔ میں وہیں بت بن گئی۔ مجھ سے اگلا قدم اٹھائے نہ اٹھے۔ خوف تھا کہ ابھی ان لڑکوں نے گولی چلائی۔ ایک لڑکے نے میرے سفید بالوں اور جھکی ہوئی کمر کو دیکھتے ہوئے کہا، ماں ڈر گئیں؟ میں بولی، بیٹا ڈروں کیسے نہیں؟ بندوق جو اٹھائے ہوئے ہو۔ بولا، ماں تم تو پہلے ہی مری ہوئی ہو۔ تمھیں کیا ماریں!

ہم تنگ گلیوں سے گزر کر خالہ کے گھر واپس لوٹتے ہیں۔ یہاں منشیات کا مسئلہ بھی ہے، خالہ کہتی ہیں۔ ایک مکان کے باہر بنے ہوئے چبوترے پر ایک آدمی بیٹھا ہے ـــ سرخ آنکھیں، گالوں کی ہڈیاں نکلی ہوئی، خالی الذہن، خلا میں گھورتا ہوا۔

کچھ لوگ کھلم کھلا بیچتے ہیں ہیروئن۔ ایک پکڑا بھی گیا تھا۔ لیکن چھوٹ کے آ گیا۔ اس کا بھائی وکیل ہے۔"

میری خالہ کو حالات سے باخبر رہنا پڑتا ہے۔ ان کے بچے چھوٹے ہیں اور اسکولوں کالجوں میں پڑھ رہے ہیں۔ بڑی بیٹی کراچی یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے۔ دو لڑکوں نے تکنیکی ڈپلومے لیے ہیں اور اب ٹیکسٹائل ڈیزائن کا کام شروع کیا ہے۔ خالہ کی زندگی جدوجہد کی داستان ہے۔ شوہر کی مسلسل بیماری کی وجہ سے گھر بار کا پورا بوجھ ہمیشہ خالہ پر ہی رہا۔

اور اب میں سوچنے لگی تھی کہ چھوٹے بچوں کی تعلیم ختم ہونے کو آ رہی ہے اور وہ برسر روزگار ہونے لگے ہیں۔ سکون سے بقیہ دن گزر سکیں گے۔ لیکن اب یہ کھٹکا ہے، اور کہ... خالہ حسرت بھری نگاہوں سے گلیوں پر نظر ڈالتی ہیں۔ برآمدے میں سیمنٹ کی چادر ڈلوا کر لوہے کی جالی لگوا لی ہے۔ سفید پینٹ تازہ ہے۔ اور یہ محلہ جو تیزی سے تباہی کے گڑھے میں گر رہا ہے۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میں دلدل پر چل رہی ہوں۔ بس ایک تسلی ہے، اگر اسے تسلی کہہ لو، کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ ہم سب ہی اس دلدل میں دھنستے جا رہے ہیں۔ شاید آگے دلدل ختم ہو جائے اور زمین مضبوط، کون جانے۔ خالہ کے چہرے پر ایک موہوم سی مسکراہٹ ہے۔

* * *

کورنگی کی کہانی

صبح کے نو بجے ہیں۔ [illegible] کے [illegible] کی چمک [illegible] میں [illegible] کو آہستہ آہستہ [illegible] رہی ہوں۔ میں [illegible] کورنگی انڈسٹریل ایریا سے گزر رہی ہوں۔ دو رویہ چوڑی سڑک کے دونوں اطراف ملیں اور فیکٹریاں ہیں۔ کراچی کے سائٹ ایریا کے برخلاف، جہاں غیر ملکی کمپنیوں نے فیکٹریوں کے اردگرد پیڑ پودے، گل بوٹے لگا کر علاقے کو سرسبز کر دیا ہے، کورنگی انڈسٹریل ایریا بنجر اور خاک آلود ہے۔ یہاں دو چار ہی غیر ملکی کمپنیوں کے پلانٹ ہیں [illegible] اکثریت مقامی کارخانوں کی ہے۔ فیکٹریوں کے [illegible] کہیں کہیں گھاس کے قطعے ہیں اور پودوں کی دو چار قطاریں نظر آتی ہیں گویا کسی نے بادل ناخواستہ [illegible] علاقے کو خوش [illegible] کی [illegible] پھولوں کی [illegible] تنہا چھوڑ دیا ہو۔

[illegible] کورنگی [illegible] اور استعارہ کیا ہے۔

[illegible] خوف و دہشت اور نفرت و جنون کے جال میں الجھا ہوا۔

[illegible] کے [illegible] علاقوں کے مکینوں کے لیے کورنگی [illegible] شہر کا ایک چلتا پھرتا، پراسرار علاقہ [illegible] ایک [illegible] میں [illegible] گیا ہے: گولیوں سے چھلنی ایک لاش کورنگی میں پائی گئی۔

[illegible] ہے۔ دو [illegible] ایک [illegible] چل [illegible] ہیں۔ ایک پیلی ٹیکسی سڑک کے کنارے [illegible] ایک [illegible] ہاتھ میں لیے، ٹیکسی سے [illegible] تیز قدموں سے چلتا ہوا فیکٹری کے [illegible] ہو جاتا ہے۔ میں گاڑی روکتی ہوں اور ٹیکسی ڈرائیور سے راستہ پوچھتی ہوں۔ [illegible] سے [illegible] ہاتھ کو [illegible]۔ وہی ڈھائی [illegible] کورنگی ہے۔ میں گاڑی اسٹارٹ کرتی ہوں۔

[illegible] کورنگی کا [illegible] علاقہ ہے۔ سڑک پر [illegible] ہیں۔ ٹوٹے پھوٹے فٹ پاتھ پر لوگ چل رہے ہیں۔ کہیں کہیں [illegible] میں [illegible] ہیں۔ سڑک کے وسط میں [illegible] کیچڑ اور کوڑے [illegible] ہے۔ [illegible] کھیل رہے ہیں۔ میں گاڑی آہستہ کرتی ہوں اور لوگوں سے پتا پوچھتی ہوئی [illegible] ہوں۔ ایک [illegible] ایک لڑکا اور دو [illegible] عورتیں [illegible] کے پتا [illegible] ہیں۔ میں [illegible] سڑک [illegible] ہوں۔ سڑک کے ایک طرف [illegible] کی جھاڑیاں ہیں اور دوسری طرف ٹریفک: ایک [illegible] بیل، ایک گدھا گاڑی اور ایک ٹیکسی۔

[illegible] کی [illegible] ٹاپ [illegible] مشیروں [illegible] کردہ گریٹر کراچی ریسٹلمنٹ پلان کے تحت ۱۹۵۹ میں [illegible] ایک [illegible] کے [illegible] گئی تھی۔ اس وقت کراچی میں ایک لاکھ اکیس ہزار [illegible] کے [illegible] جھونپڑیوں اور کچے گھروں میں رہ رہے تھے۔ ۱۹۶۰ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ [illegible] سے [illegible] اور [illegible] کو شہر کے [illegible] کر کے [illegible]

میل پرے کورنگی اور نیو کراچی میں آباد کیا جائے۔ یہ بھی طے پایا کہ حکومت یک کمرے والے ۴۵ ہزار مکانات بنائے گی۔ لیکن ۱۹۶۴ تک صرف دس ہزار مکانات بنے تھے اور یہ منصوبہ ناکام قرار پا کر سرد خانے کی نذر ہو چکا تھا۔ کورنگی میں، رہائشی کالونی کے ساتھ ساتھ انڈسٹریل ایریا کی بھی داغ بیل ڈالی گئی تھی تا کہ کورنگی کے مکینوں کو روزگار کے لیے شہر نہ آنا پڑے۔ لیکن انڈسٹریل ایریا میں کارخانے اتنی تیزی سے نہ لگ پائے۔

یہ بستی پچیس سال پرانی ہے۔

میں شمشاد بھائی کا گھر تلاش کرتی ہوں۔ ان کا گھرانہ بیس سال سے کورنگی میں مقیم ہے۔ ان کی بیوی شکیلہ سے میں نے فون پر بات کی ہے اور انھوں نے مجھے کورنگی کے دو چار متاثرہ خاندانوں میں لے جانے کی حامی بھری ہے۔ یہ وہ خاندان ہیں جو کراچی کے حالیہ پُرتشدد واقعات سے براہِ راست متاثر ہوئے ہیں۔

شمشاد بھائی کراچی کے مختلف علاقوں کے مکانوں میں رنگائی کا کام کرتے ہیں اور عام طور پر گھر رات ہی کو پہنچ پاتے ہیں۔ ان کے نو بچے ہیں: تین لڑکے اور چھ لڑکیاں۔ سب سے بڑا لڑکا ۲۳ سال کا ہے اور سیوی میں ملازمت کرتا ہے۔ انیس سالہ علی محمد گھر کے قریب ہی ایک کریانے کی دکان پر بیٹھتا ہے۔ نویں جماعت کے بعد اس نے پڑھائی چھوڑ دی ہے۔

میں شکیلہ سے باتیں کرتی ہوں۔ ہم علی کے دوست نعمان کا انتظار کر رہے ہیں جو ہمیں ایک ماں کے پاس لے جانے والا ہے جس کا انیس سالہ بیٹا دہشت گردوں کے ہاتھوں بیس دن پہلے قتل ہوا ہے۔

شکیلہ کی بیٹی نے دالان کی ابھی ابھی دھلائی کی ہے۔ دوسری بیٹی کمروں کے فرش پر پوچا لگا رہی ہے۔ یہ تین کمروں والا ۸۰ مربع گز پر بنا مکان ہے۔ گیٹ کے چھوٹے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھلا ہوا ہے۔

دوسرے علاقے کے لوگوں کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ہم یہاں کیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ مسلسل خوف، فکر و اندیشے اور ذہنی تناؤ نے ہماری زندگی کو جہنم بنا دیا ہے، وہ کہہ رہی ہیں۔ ان کی آٹھ سالہ بیٹی محاصرے کی رات کے بعد بخار میں ہفتوں پھنکتی رہی۔ پلنگ سے لگ گئی تھی۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو کانوں میں انگلیاں دیے رہنے لگی۔ ذرا سی آواز پر پلنگ کے نیچے چھپ جاتی، ہر وقت سہمی اداس پڑی رہتی۔ ڈاکٹر کے پاس لے گئی تو اس نے کہا: بچی کے دل میں ڈر بیٹھ گیا ہے۔

میں بچی کو دیکھتی ہوں — دبلی پتلی، آنکھوں کے گرد حلقے، اور ہلکی سی سرخی۔ لگتا ہے جیسے دنوں تک روتی رہی ہے۔

میرا بیٹا جو کریانے کی دکان پر بیٹھتا ہے، خاموش رہنے لگا ہے۔ بہت خوش مزاج ہوتا تھا۔ ہمیشہ چہکتا رہتا تھا۔ اب تو چپ لگ گئی ہے۔ لیکن یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میری بڑی بہن کا گھرانہ بے حد پریشان

ہے۔ ان کا سب سے بڑا بیٹا اسپتال میں نفسیاتی ڈاکٹر کے زیرِ علاج ہے۔

شکیلہ کی بڑی بہن پڑوس میں رہتی ہیں۔ ہم ان کے گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ چھوٹے سے دالان کو بھی پانی سے دھویا گیا ہے۔ غالباً کورنگی میں پانی کی قلت نہیں ہے۔ میں سوچتی ہوں اور خاتونِ خانہ سے ہاتھ ملاتی ہوں۔

ایک شام دیکھا ننگے پیر گھر چلا آ رہا ہے۔ پیر مٹی میں اَٹے ہوئے، دراڑیں پڑی ہوئی ہیں۔ پوچھا جوتے کہاں گئے۔ کہنے لگا، کسی فقیر کو دے دیے۔ دوسرے دن قمیص بھی اتار کر کسی کو دے آیا۔ اپنے کپڑے بانٹنے شروع کر دیے۔ کہتا تھا غریبوں کو دے رہا ہوں۔ سکون ملتا ہے مجھے۔ پھر گھر کی چیزیں اٹھا اٹھا کر دینے لگا۔ برتن بھانڈے، ٹیپ ریکارڈر، بہن بھائیوں کے کپڑے، جوتے۔ سراج کی ماں مجھے دھیمے لہجے میں بتا رہی ہیں۔ سفید اور سرمئی بال ململ کے دوپٹے سے ڈھکے ہوئے، اندر کو دھنسی ہوئی بے رونق شربتی آنکھیں، جو گہرے حلقوں کے باعث کچھ اور بھی نمایاں ہو گئی ہیں۔ رخسار کی ہڈیاں نکلی ہوئی، چہرے پر باریک باریک لکیروں کا جال بچھا ہوا ـــــ کرب اور دکھ اور گزرے ہوئے برسوں کا جال۔ ساٹھ برس کی ہوں گی لیکن ستر پچھتر کی لگ رہی ہیں۔

پہلے تو میں سمجھا شاید [illegible] آ گیا ہے۔ شاید ابھی کسی سے اس کے اندر۔ کیوں کہ میں کچھ کہنے کی کوشش کرتا تو میری بات کاٹ دیتا۔ زور زور سے بولنے لگا تھا۔ سفید شلوار کرتے میں ملبوس، گھٹے ہوئے بالوں پر سفید ٹوپی اوڑھے ہوئے، خشخشی ڈاڑھی والے بزرگ، سراج کے والد بتا رہے ہیں۔

"تو کیا گھر میں توڑ پھوڑ بھی..." میں نے پوچھنا چاہا۔

"نہیں، ایسی بات نہیں تھی۔ توڑ پھوڑ نہیں کی کبھی اس نے۔" انھوں نے بتایا۔

"[illegible] چاہتا تو چھوڑ دیا ہو گا" میں نے سوچا [illegible] نہیں کی۔

"مسجد وہ برابر جاتا رہا۔ لیکن وہاں بھی عجیب سی باتیں شروع کر دی تھیں: امن چاہیے، سکون چاہیے۔ بس ایک ہی رٹ لگی تھی۔ امن چاہیے، امن چاہیے۔" سراج کی ماں بتا رہی ہیں۔

"دراصل لاشیں دیکھ دیکھ کر اسے کچھ ہو گیا تھا۔ گلی کے راستے سکوٹر پر آفس آتا جاتا تھا۔ روز شام مجھے آ کر بتاتا تھا، آج ایک لاش پڑی ہوئی تھی، گولیوں سے چھلنی، چہرہ مسخ ہوا۔ کیسے تڑپ تڑپ کر جان دی ہو گی۔ اور پھر جب محاصرہ ہوا، علاقے کے تمام لڑکوں اور مردوں کو فوجی لے گئے۔ اس کو بھی لے گئے۔ [illegible] سے [illegible] کا کارڈ دکھایا تھا، چھوڑ تو اسی دن دیا، لیکن اس کے بعد سے ہی اس نے الٹی سیدھی باتیں کرنا شروع کر دیں اور گھر کا سامان باہر لے جا کر بانٹنے لگا۔"

"دس بار دسمبر کا سامان بانٹ دیا۔ چھوٹا سا گھر ہے ہمارا۔ یہاں ہر چیز ضرورت ہی کی خریدی جاتی ہے۔ بے ضرورت چیزیں تو ہیں نہیں کہ بانٹنا شروع کر دیں اور کوئی فرق نہ پڑے۔ دس بارہ ہزار کا سامان بانٹ ڈالا اس نے۔" [illegible] سراج کی ماں نے [illegible]۔ شاید وہ سامان کی مالیت کے بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتیں۔

میں سوچتی ہوں: اس چھوٹے سے گھر کے مکینوں پر ان دنوں کیا بیتی ہو گی؟ گھر کے باہر قتل وغارت گری، دہشت گردی کی فضا، ایم کیو ایم الطاف گروپ، حقیقی، پولیس اور رینجرز کے درمیان گولیوں کی بوچھاڑیں، پولیس اور نامعلوم دہشت گردوں کے آپس میں مسلح مقابلے، گلیوں میں موت کے سائے۔ اور پھر محاصرے کی پیدا کردہ دہشت: گھروں کے اندر فوجیوں کا دندناتے ہوئے گھسنا، گھر کی چیزوں کو تہس نہس کرنا، الماریوں، صندوقوں کا سامان باہر پھینکنا —— ان ہتھیاروں کی تلاش میں جو وہاں نہیں ہیں، مکینوں کی فکر اور تشویش: اگر بیٹے کو پکڑ کر لے گئے تو کیا ہو گا؟ کیا کریں گے؟ کس کے پاس فریاد لے کر جائیں گے؟ کیسے یقین دلائیں گے کہ اس کا ایم کیو ایم سے کوئی تعلق نہیں؟ کیسے اس کی بے گناہی ثابت کریں گے؟ نہ کسی صاحبِ حیثیت کی سفارش ہے اور نہ جیب میں رقم۔ اگر لے گئے تو اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ زندہ واپس آنے کا کہ نہیں؟ اور گھر میں سب سے بڑے کماؤ پوت کی بہکی بہکی باتیں، گھر کی اشیا کو غریبوں میں تقسیم کرنا، باپ کی سرزنش، بیٹے کی روٹھی ہوئی آواز، چھوٹے بہن بھائیوں کا سہم کر دیکھنا اور ماں کی سرگوشیاں: جانے دیں، چھوڑیں بھی، غریبوں ہی کو تو دے رہا ہے، کوئی گناہ تو نہیں کر رہا...."

دس بارہ دن بعد مجھے احساس ہوا کہ اس کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ میں اسپتال لے گیا اسے۔ ایئرفورس کا اسپتال ملیر میں ہے۔ ڈاکٹر نے پوچھا، کیا چاہتے ہو؟ اس نے کہا، میں امن چاہتا ہوں صرف امن۔ ڈاکٹر نے سوال کیا، امن کیسے قائم کیا جائے؟ بندوق سے؟ کلاشنکوف سے؟ اس نے کہا، نہیں۔ صرف پیار محبت سے۔ ڈاکٹر نے کہا، اسے داخل کرنا پڑے گا۔

سراج کو اسپتال میں داخل ہوئے ڈھائی ماہ ہو چکے ہیں۔

سراج کی عمر ۲۵ سال ہے۔ گزشتہ سات سال سے پاکستان ایئرفورس میں ملازمت کر رہا ہے۔ کاغذ پر اس کی نوکری ایئر مکینک کی لکھی ہے۔ والد نے میرے دریافت کرنے پر بتایا۔ لیکن وہ سگنل میں کام کرتا ہے۔ انھوں نے سگنل پر زور دے کر کہا۔

بی اے پارٹ ون کا امتحان پاس کر چکے ہیں۔ کمپیوٹر کورس بھی کیا ہوا ہے۔ سامنے چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے دو دبلی سی چھوٹی بہنیں۔ چمکتی ہوئی شربتی آنکھیں، ناک میں لونگ، گالوں پر مہاسے، سر پر قرمزی چنری۔ وہ ماں کے پہلو سے لگی چارپائی پر بیٹھی ہوئی ہے اور والد صوفے کے دوسرے کنارے پر۔ کمرے کی دیواریں بے رنگ ہیں۔ فرج کونے میں رکھا ہے۔ ٹی وی سامنے اور ٹیلی فون تپائی پر دھرا ہے۔

بی اے کا امتحان کیا ملازمت کے دوران دیا؟ ہاں، بڑا محنتی اور ذہین لڑکا ہے۔ ایئرفورس کے کچھ تکنیکی کورس بھی کر چکا ہے۔ والد کے چہرے پر تشویش کی کیفیت ہے۔ بیٹے کا خیال ابھی تک ذہن سے نہیں گیا ہے۔

سراج کے ماں باپ ۱۹۴۹ میں پاکستان آئے تھے۔ ابتدا میں کراچی ایئرپورٹ کے قریب جھگیوں میں رہے، پھر ملیر اٹھ آئے۔ ۱۹۷۵ میں قرض لے کے ایک چھوٹا سا پلاٹ خریدا اور یہاں مکان

Scanned with CamScanner

[illegible] ہیں [illegible] میں وہاں تھا ۱۹۸۵ کے بعد [illegible] سے وہ مقتول ہو گئی
تھیں [illegible] وقت بھی [illegible] کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہاں تو صرف [illegible]
سے دو دو [illegible] کے بعد [illegible] تھی۔ [illegible] تین سال پہلے کی بات ہے۔ [illegible]
[illegible] گروپ کا [illegible] حقیقی دونوں کے لڑکے
[illegible] ہوئے ہیں [illegible] کے بعد [illegible] ہو جاتے ہیں [illegible] کی شامت آتی ہے،
پولیس اور [illegible] والوں کے ہاتھوں، وہ کہتے ہیں

سب ہی سارے گھر کی تلاشی لیتے آتے ہیں [illegible] صندوق سے نکال [illegible] میں
[illegible] ہوئے [illegible] دی۔ ہمارے کچھ
[illegible] پنڈی، ملتان اور لاہور میں شروع سے آباد ہیں۔ پنجاب آتا جاتا رہتا ہوں، اس لیے پنجابی آتی
ہے [illegible] پوچھ، جاپانی [illegible] کہا [illegible] ہیں۔ [illegible]
گھر کا [illegible] سامان۔ [illegible] کی [illegible] میں لگی ہے۔

[illegible] کی طبیعت [illegible] ہی ہے۔ [illegible] رہتا ہے۔ [illegible] میں
[illegible] ٹی وی دیکھتا ہے۔ [illegible] ہو چکی ہے۔ [illegible]
وہ [illegible] ہو گیا ہے۔ [illegible] ڈاکٹر کہتے ہیں [illegible] ہو جائے تب چھٹی ملے گی۔ عید پر آیا تھا
پانچ دنوں کے لیے، والد بیمار ہیں۔

[illegible] شفیق [illegible] آتے ہیں۔ [illegible] انتظار کرتے ہیں۔ [illegible]
آیا ہے [illegible] سوالیہ [illegible] چہرہ،
سوچ میں ڈوبی آنکھیں [illegible] خاموشی ہے۔ [illegible]

[illegible] قتل ہو [illegible] قاتل اس کی تلاش میں آئے تھے۔ اس وقت یہ
[illegible] شفیق مجھے [illegible] کوٹھی میں [illegible] ہیں۔ [illegible] گھر ہو تم
[illegible] ہے۔ [illegible] آپ [illegible] کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ [illegible] میں اس دن وہاں
کیوں نہ ہوا۔ موجود ہوتا تو مجھے قتل کر دیتے، جانے زندہ ہوتا۔

میں کالونی گھومتی رہی ہوں۔ گھر کے سامنے میدان ہے۔ [illegible] سڑک کی [illegible] سے جو
[illegible] نہیں تھے [illegible] وقت [illegible] میں [illegible] سے کوئی [illegible]
[illegible] ہیں [illegible] سڑک کے [illegible] ہیں اور دوسری جانب [illegible]
[illegible] قطار۔ [illegible] ہیں۔ دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دیتا،
[illegible] کا وقت ہے۔ [illegible] کو کاٹ کر میدان صاف کیا گیا
[illegible] دکان [illegible] ہیں [illegible] اور دودھ کی [illegible]
[illegible] ہوئی ہے۔

وہ بستی میں ان کے دروازے پر دستک دیتا ہے اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایک بوڑھا آدمی دروازہ کھولتا ہے۔ میں اور شمشیر اندر داخل ہوتے ہیں۔ لڑکے باہر ہی کھڑے ہیں۔

ہم صوفے پر بیٹھتے ہیں۔ کمرہ چھوٹا ہے اور فرش پر دری بچھی ہوئی ہے۔ معصوم لڑکے کی ماں ایک بھاری بدن کی عورت ہیں، چالیس کے پیٹے میں۔ ان کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی ہیں۔ وہ کمرے کا سامنے والا دروازہ، جس پر ایک موٹا سیاہ تالا لٹکا ہوا ہے، کھولتی ہیں۔ کمرے سے بند ہوا کی ایک جبستی ہوئی بو کا جھونکا بہہ جاتا ہے۔ وہ میرے برابر آ بیٹھتی ہیں۔ ایک وقت تھا ہم سب رات ہو جاتی تو دروازہ کھول کر اس کمرے میں سویا کرتے تھے۔ اب میں وہاں رات گزارتی ہوں۔ اب تو یہ موٹا تالا ہر وقت لگائے رکھتی ہوں۔ پھر وہ اس بھیانک صبح کا نقشہ کھینچتی ہیں جس کی یاد ان کی روح میں ہمیشہ کچوکے لگاتی رہے گی۔

صبح کے سات بجے ہوں گے جب کسی نے دستک دی۔ میں پڑوسیوں کے لیے آٹا گوندھنے کے بعد ہاتھ دھو رہی تھی۔ میں نے پوچھا، کون ہے؟ آواز آئی، دروازہ کھولیں۔ میں سمجھی خیر کا کوئی دوست ہوگا۔ کبھی میرا بھائی میرے گھر ہی رات رہ جاتا ہے۔ اماں کہاں بیٹھی ہیں۔ لیکن اس نے کہا ہمیں جانا ہے۔ چچا، منو کو بھیج دو۔ کیسٹ کا پوچھنا ہے، آواز آئی۔ میرے بیٹے نے حال ہی میں ویڈیو کیسٹ کی دکان سیٹ کی تھی۔

اس صبح منو کی آنکھ ذرا دیر سے کھل گئی۔ عام طور پر وہ دیر تک سوتا تھا اور نہا کے ہی اٹھتا تھا۔ آنکھ ٹھیک سے کھلی بھی نہیں تھی۔ لیکن اس کا اٹھنا جو آئی تھی۔ آنکھیں ملتا ہوا گیا۔ میاں بیٹھے ہوئے تھے، قمیص شلوار اور باہر نکل گیا۔ اماں ابھی آتا ہوں۔ اس آدمی نے چاہا اس سے کچھ کہنا وہ منو اس کے پیچھے چلا گیا۔ اور پھر مجھے گولیوں کی باڑھ کی دل دہلانے والی آواز آئی۔ میں سمجھی دو بارہ ہی ہو گیا ہے۔ میں باہر بھاگی کہ منو سے کہوں فوراً اندر آ جائے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان گولیوں کا نشانہ میرا بیٹا ہی بنا ہے۔ جب میں نے دیکھا تو بچہ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ گولیوں نے اس کے چہرے اور ٹانگوں کو چھلنی کر دیا تھا۔ آج تک محلے والوں نے میرے بیٹے کو کفن تک نہ دیکھنے دیا۔ اس وقت مجھے ہوش نہ تھا۔ بس اس نے مجھے ایک نظر دیکھا اور ختم۔

کتنا معصوم تھا میرا بچہ۔ ہر ایک سے محبت کرنے والا۔ محلے والوں کے کام کرنا۔ سب کا لاڈلا تھا۔ خدا معلوم اسے کیوں مار ڈالا۔ تین سال پہلے اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ بڑا عرصہ بیمار رہے۔ منو اس وقت نویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ باپ کے مرنے پر مجھ سے کہتا تھا، اماں تم فکر نہ کرو۔ بس اب میں گھر چلاؤں گا۔ پڑھائی چھوڑ دی اور ادھر ادھر چھوٹا موٹا کام کیا۔ جب مستقل روزگار نہ ملا تو بولا اماں میرا حصہ دے دو۔ چند سالوں میں تمہیں یہ روپیہ واپس لوٹا دوں گا۔ اس کے پراویڈنٹ فنڈ کے تیس ہزار پڑے تھے میرے پاس۔ اس نے ایک ویڈیو کیسٹ کی دکان لگائی تھی ایک ماہ پہلے۔

میں اٹھ کر منو کی سوگوار ماں سے اجازت چاہتی ہوں۔ سر پر دوپٹہ، جذبات سے عاری، ساکت

بہن کو بھی صدمہ ہو گیا تھا بھائی کی موت پر۔ وہ نویں میں پڑھ رہی تھی۔ اسکول چھوڑ دیا ہے۔ میرا چھوٹا بیٹا ساتویں میں پڑھ رہا تھا، وہ بھی اسکول سے اٹھ گیا ہے۔ ویڈیو کی دکان میں بیٹھتا ہے۔ کسی سے آگے نہیں پڑھنے کا ۔ ۱۵۰۰ روپے پنشن کے ملتے ہیں۔ میں نے والد صاحب کو گھر بلا لیا ہے تاکہ بچوں پر نظر رکھیں، گھر سے باہر نہ نکلنے دیں۔

کورنگی جیسے علاقوں میں اسکول بیچ میں چھوڑ دینے والے بچوں کی تعداد شہر کے دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ ہی ہوتی ہے۔ تشویش کے سبب والدین عام طور پر لڑکیوں کو اٹھا لیتے ہیں کیوں کہ وہ تمام بچوں سے اسکول کے اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ بعض گھروں میں کم عمری میں لڑکوں کو روزگار پر لگانا ضرورت ہوتی ہے یا پھر لڑکے پڑھائی میں عدم دلچسپی کی وجہ سے خود ہی اسکول چھوڑ دیتے ہیں۔ کراچی کے ہنگامے ہوتے رہے ان کی وجہ سے اسکول چھوڑنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ ان علاقوں کے اسکولوں کی رونق دن بدن تشدد کے واقعات کی وجہ سے آہستہ آہستہ ماند پڑتے ہیں۔

ہم گھر سے باہر آتے ہیں۔ لڑکے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے ہیں۔ اور ہمیں خدا حافظ کر کے جواب دیتے ہیں۔ شکیل کا بیٹا اور اس کا دوست ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہیں۔ وہ لوگ سمجھ رہے تھے یہ جماعت اسلامی والوں کی گاڑی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے جماعت اسلامی کا آدمی آیا تھا۔ فیچر لکھنے۔ لیکن جب اس کا معلوم آیا تو صرف جماعت کی تنظیموں نے مدد کی تھی۔ جماعت نے اورنگی میں یہ کیا، جماعت نے وہ کیا۔ وہ دہشت گردی کا تھا تو جماعت اسلامی بھی اورنگی میں موجود ہے کمیٹی میاں تھا یہ صرف اور صرف ایم کیو ایم کا علاقہ ہے۔

ہم شکیل کے گھر واپس ہوتے ہیں۔ ہمیں پیغام ملا ہے کہ ہم آپ لوگ کسی اور گھر نہ لے جائیں۔ یہ پیغام کل سے سیکٹر آفس میں آگیا تھا لیکن ہم تک نہیں پہنچا تھا۔ وہ کہتے ہیں آپ کو نائن زیرو سے اجازت لینی ہوگی، نعمان کہہ رہا ہے۔

میں اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں: میں نے آنے سے پہلے شکیل کو فون کیا تھا۔ شکیل نے پہلے چیئرمین سے تذکرہ کیا ہوگا اور اس نے اپنے دوست نعمان کو بتایا ہوگا۔ نعمان ایم کیو ایم کا کارکن ہے۔ نعمان نے اوپر سے رابطہ کیا ہوگا جو ایم کیو ایم کا سرگرم کارکن ہے اور بتایا ہوگا کہ میں فیچر کے لیے آئی ہوں۔ ان خاندانوں سے مل رہی ہوں جو دہشت گردی سے براہ راست متاثر ہوئے ہیں۔ اور سیکٹر آفس سے بات کی ہوگی جس نے سیکٹر انچارج سے رابطہ کیا ہوگا اور وہاں سے نائن زیرو فون کیا گیا ہوگا۔ اور نائن زیرو نے اجازت نہ دی ہوگی۔

میں نے پیغام اس وقت سنا جب میں متاثرین سے باتیں کر رہی تھی۔

میں کوئی سیاسی نوعیت کا مضمون نہیں لکھ رہی ہوں۔ میں صرف متاثرہ خاندانوں کی عورتوں سے باتیں کرنا چاہ رہی تھی۔ مجھے ان سے کوئی غرض نہیں کہ وہ کس پارٹی سے منسلک ہے، میں ان لڑکوں کو سمجھانے کی بے سود کوشش کرتی ہوں۔

Scanned with CamScanner

"تو کیا تم مجھے ان خاندانوں سے بھی ملاؤ گے جن کا کسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، میرا خیال ہے یہ مشکل ہو گا۔" وہ کچھ سوچتا ہے۔ "اچھا، میں مقصود بھائی کو پیج (page) کرتا ہوں۔" میں دوسرے کمرے میں شکیلہ کی بیٹیوں سے باتوں میں مصروف ہو جاتی ہوں اور نعمان فون کے پاس بیٹھ کر پیجر کے پیغام کا انتظار کرتا ہے۔ دن چڑھتا جا رہا ہے، اور میری بے صبری بڑھ رہی ہے۔ "آپ ٹھہریں، میں سینٹر والوں سے بات کرتا ہوں۔" وہ باہر جاتا ہے اور تھوڑی دیر بعد واپس آتا ہے۔ "ٹھیک ہے۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔" باہر ایک لڑکا کھڑا ہے۔ تیس کے لگ بھگ ہو گا۔ وہ میرا نام پوچھتا ہے۔ میں رسالے کا ایک شمارہ اسے دیتی ہوں۔ وہ رسالہ ہاتھ میں لیتا ہے، دو چار ورق الٹتا ہے اور مجھے واپس کر دیتا ہے۔ "میرے ساتھ آئیے،" وہ کہتا ہے۔ ہم تینوں چلتے ہیں۔ گلی کے اختتام پر ایک میدان ہے۔ میدان پار کرنے کے بعد ہم دائیں مڑتے ہیں اور پھر بائیں گلی کے کنارے پہنچتے ہیں۔ وہ آدمی کہتا ہے، "آپ یہیں رہیں۔ آفس میں لوگ بیٹھے ہیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ گلی سے نکل کر غائب ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک موٹا تازہ، چوڑا چکلا آدمی نمودار ہوتا ہے۔ یہ چالیس کے لگ بھگ ہو گا۔ میں اپنی کہانی دہراتی ہوں۔ "میں حیدرآباد بھی جانا چاہتی ہوں،" میں گڑگڑاتی ہوں۔ "آپ کو اس کے لئے اجازت لینا ہو گی۔ پھر آپ کو ہر گھر میں لے جایا جا سکتا ہے۔ [illegible]"

وہ رسالہ ہاتھ میں لیتا ہے اور ایک نظر ڈال کر واپس کر دیتا ہے۔ پھر دونوں آدمی گلی سے نکل کر غائب ہو جاتے ہیں اور میں نعمان کے ساتھ واپس چل پڑتی ہوں۔ جس گھر کی دیوار کے ساتھ ہم لوگ کھڑے باتیں کر رہے تھے اس کا دروازہ کھلتا ہے اور دو عورتیں سر نکال کر باہر جھانکتی ہیں۔ میں انہیں دیکھ کر مسکراتی ہوں۔ جواب میں وہ بھی مسکراتی ہیں۔ شاید یہ دیوار سے لگی سب باتیں سن رہی تھیں، میں سوچتی ہوں۔

گلی میں چلتے ہوئے مجھے لگتا ہے گھروں نے کھڑکیوں کی آنکھیں، دروازوں کی جھریوں، کھڑکیوں کی اوٹ سے مجھ پر اور نعمان پر لگی ہوئی ہیں۔ کوئی دروازہ کھل رہا ہے، کوئی کھڑکی بند کر رہا ہے۔ ایک گھر کی چھت سے ایک بوڑھا آدمی ہم دونوں کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ چلچلاتی دھوپ میں چھت پر کیوں؟ شاید اس محلے کے لوگ عام حالات میں بھی ایک دوسرے پر نظر رکھنے کے عادی ہیں، اور آج کل تو ہر کسی کے حالات بہت خراب ہیں۔ کوئی تعجب نہیں اگر وہ ہر ایک کو شبہے کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہو گئے ہوں۔

میں شکیلہ کے گھر واپس آتی ہوں۔ نعمان اب تک ہمارے ساتھ ہے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی گہری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری ہے۔ خدا جانے اندر کتنے طوفان دفن ہیں، میں سوچتی ہوں۔ محاصرے کے دن نعمان کو رینجرز لے گئے تھے۔ شاید دو دن رکھا۔ اس نوجوان پر کیا گزری ہو گی؟

"تم پڑھتے ہو؟" میں بات شروع کرتی ہوں۔

"میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی،" وہ کہتا ہے۔ "تین سال تک میں صدر میں ایک سنار

دکان پر کام کرتا رہا۔ پھر [illegible] دوسری کی دکان پر جانے لگا۔ [illegible] اور دکان [illegible]
ہوتی ہے۔ مجھ سے اب وہاں نہیں بیٹھا جاتا۔

[illegible] کل کیا [illegible]؟

[illegible] دکان پر دو بارہ جانے کا [illegible]۔

آج نہیں گئے؟ وہ خاموش ہے۔

[illegible] شادی شدہ ہیں [illegible] بیوی بچوں کے ساتھ [illegible] رہتے ہیں۔ [illegible] ساتھ نہیں رہتا۔

[illegible] آنکھوں پر [illegible] تک [illegible]۔ [illegible] وہ [illegible]۔ [illegible] آنکھوں پر [illegible] ہی [illegible]؟ [illegible]

[illegible] لو دیتے تھے۔ [illegible] چاہئیں [illegible]۔

[illegible]

[illegible] پوچھتی ہوں۔

سب دل کا لاوا پیدا ہو گیا ہے۔ وہ بچوں کی طرح مسکراتا ہے۔

[illegible] کا [illegible] نکل آیا۔ [illegible] کرتی ہوں۔

مستقبل کی [illegible] ہیں کل کا سوچنا ناممکن ہے۔ اب اس کی مسکراہٹ تھکی تھکی سی ہے۔

[illegible] ہوں کی [illegible] تاریک [illegible] اور [illegible] تنگ دائروں کے درمیان گھومتی [illegible]

[illegible] حرارت سے [illegible] ایا۔ [illegible] کہیں [illegible] جاتی [illegible] خالی [illegible]

[illegible] شخص کے لیے

ان کو سمجھنا مشکل ہے۔ کیا آپ کو کبھی یہ ڈر نہیں لگتا کہ کہیں آپ کے بیٹے بھی ان چکروں میں نہ آ جائیں؟ میں شدید سے سوال کرتی ہوں۔ ”مگر وہ ایم کیو ایم کے لڑکوں کے ساتھ تو اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ ہماری زندگی مستقل ان کے گرد گھومتی ہے۔ مجھے لگتا ہے میں خوف اور وسوسوں کی آگ میں جل کر خاکستر ہو جاؤں گی۔ ذہنی پریشانی اتنی شدید ہے کہ مجھے مستقل سر درد اور ہائی بلڈ پریشر رہنے لگا ہے۔ میں اور میرے شوہر اس کوشش میں ہلکان ہوئے جاتے ہیں کہ ہمارے لڑکے سیاست سے دور رہیں۔ یقین جانیے جتنی دیر میرا بیٹا دکان پر بیٹھتا ہے میں دروازے کی جھری سے لگی گلی میں دیکھتی رہتی ہوں — دکان نظر آتی ہے یہاں سے — کہ کس سے بات کر رہا ہے، کون آیا ہے دکان پر۔ اب تو ہمارے حالات میں کہ لڑکے خود بھی ایم کیو ایم سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے بچپن کے دوستوں سے قطع تعلق تو نہیں کر سکتے۔ انہیں گلیوں میں ساتھ ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے ہیں، ایک ہی اسکول میں پڑھے ہیں۔ کتنے دن کتنی شامیں اکٹھے گزاری ہیں۔ ہم اپنے بچوں سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم ان سے نہ ملو۔ دوسری بات یہ کہ اگر ہم چاہیں بھی تو اب یہ تعلقات ختم نہیں کر سکتے۔ ہمیں سب کے ساتھ ہنس بول کر رہنا ہے۔ یہ ہمارے اپنے مفاد میں ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سلام دعا رکھنی پڑتی ہے۔ ہر طرف مخبر لگے ہوئے ہیں۔ سی آئی اے کے، رینجرز کے، حقیقی کے، ایم کیو ایم کے۔

کیا میں تمہاری ماں سے مل سکتی ہوں؟ میں نعمان سے کہتی ہوں۔

کیوں نہیں۔ نعمان اٹھ پڑتا ہے۔ ہم دونوں اس کے گھر آتے ہیں۔ چھوٹا سا دو کمروں کا گھر ہے — ٹی وی، فرج، واشنگ مشین اور فون۔ اماں بوڑھی ہیں لیکن دبلی پتلی۔ جسم میں پارہ بھرا ہے، اور زبان ہر دم چل رہی ہے۔

جب جی چاہتا ہے چھلانگ مار کر آ جاتے ہیں۔ گھر کے دروازوں کو لات مار کر کھولتے ہیں۔ ایسے اکڑ کر اندر آتے ہیں جیسے دنیا فتح کرنے جا رہے ہوں۔ پورے گھر میں چھاپے مارتے ہیں۔ تہس نہس کر دیتے ہیں۔ ہمارے گھر میں ۲۶ دفعہ چھاپا مار چکے ہیں۔ چھبیس دفعہ! سب کچھ تہس نہس کر دیتے ہیں۔ ذلیل کرتے ہیں۔ حقارت سے میرے پیچھے چنگھاڑتے ہیں۔ اس میں میرا کیا قصور ہے اگر میرا بیٹا ایم کیو ایم میں ہے؟ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہو؟

نعمان کا بڑا بھائی ۲۳ سالہ سلمان ایم کیو ایم کا سرگرم کارکن ہے۔ وہ اس چھت کے نیچے ڈھائی سال سے نہیں سویا ہے۔ مجھے نہیں پتا میرا بیٹا کیا کھاتا ہے، کہاں سوتا ہے، کیسے جیتا ہے۔ مجھے اس کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ وہ سائے کی طرح آتا ہے ہمیں دیکھنے، اور دس پندرہ منٹ میں ہوا کے جھونکے کی طرح نکل جاتا ہے۔ میں چھاپوں کے خوف سے اور بیٹے کی ایک جھلک کی آس میں راتوں کو سو نہیں پاتی ہوں۔ میرے دونوں بڑے بیٹے میرے ساتھ ہی رہتے تھے لیکن آئے دن کے چھاپوں سے میرے پوتے پوتیاں بیمار رہنے لگے تھے۔ سکول بھی آئے دن بند رہتے ہیں یہاں۔ مجبور ہو کر میرے دونوں بیٹے شہر میں کرائے کے مکانوں میں اٹھ گئے ہیں۔

Scanned with CamScanner

آپ اپنے بیٹے سے نہیں کہتیں کہ یہ کیو ایم سے نکل جائے؟ میں سوال کرتی ہوں۔

وہ کہتا ہے میں نے اپنی زندگی وہاں لگا دی ہے۔ میرے سب دوستوں کی موت سے ... ہے۔ پارٹی چھوڑ دے گا تو کیا بچ جائے گا؟"

شروع میں آپ لوگوں نے منع کرنے کی کوشش کی تھی؟

وہ ۱۹۸۵ میں ایم کیو ایم میں شامل ہوا تھا۔ تب وہ تیرہ سال کا تھا اور آٹھویں میں پڑھ رہا تھا۔ اس کے باپ درزی کی دکان کرتے تھے۔ رات کو دیر سے لوٹتے تھے۔ گھر بار سے ہی فرصت نہ ملتی تھی۔ بس جب ہمیں پتا چلا اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ ہماری سنتا ہی نہ تھا۔

ستارہ کے والدین ۱۹۵۰ میں پاکستان آئے تھے۔ اس وقت وہ چھ مہینے کی تھیں۔ ... بیاہ ہوئے۔ ... سال کوٹ ... کے قریب جھگیوں میں رہتے۔ پھر پیسہ پیسہ جوڑ کر اورنگی میں چھوٹی سی زمین خریدی۔ ... سال سے اورنگی میں ہیں۔

میں باہر نکل آتی ہوں۔ ایک نو سالہ بچی ننگے پاؤں، میلی ڈاکن پہنے، خاک آلود گلی میں اپنے گھر کے باہر پودا اگانے کی کوشش کر رہی ہے۔ خوشنما سبز رنگ کا پودا۔ شاید منی پلانٹ ہے۔ بچی نے زمین میں گڑھا نہیں کھودا ہے۔ گلدان کے پچھلے حصے کو سخت پتھریلی زمین پر رکھ کر مٹی سے ڈھانپ دیا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے مٹی کو ہموار کرتی ہے اور پلاسٹک کے ایک پرانے مگ سے اس پر پانی انڈیلتی جاتی ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی صرف ایک چھوٹی سی بنیان پہنے، ننگے پاؤں، اس سارے عمل کو غور سے دیکھ رہا ہے۔

دوپہر کی تپتی دھوپ میں چمکتی ... خاک آلود، بے رنگ گلی میں ... سے جوڑ رہی ہے یا ... تنہا ... لاحاصل، اتنا بے مصرف کام۔

ماحول ایک ... سے متصل ہے۔ ... صرف ایک موہوم سی آرزو۔

تب ... ہوں۔ گلی کے موڑ پر ... کی ایک ... زمین پر پڑی ہے۔ مٹی اور دھول سے اٹی سبز پتیاں تیز دھوپ میں مرجھا چکی ہیں۔

* * *

ڈسٹرکٹ سنٹرل

... سے یا ... کی طرف آتے ہوئے، ... سے گزر کر آپ ... روڈ پر بڑھتے چلے ... کی طرف ... آپ کو بائیں طرف فٹ پاتھ پر ... [illegible]

Scanned with CamScanner

والے اسٹال نظر آئیں گے۔ پہلی دفعہ ان پر میری نظر چند سال پہلے پڑی تھی۔ اس رات مجھے یوں لگا تھا جیسے یہ اسٹال لیاقت آباد غریب آباد کے تشدد آمیز لاوے سے اچانک نکل کر وجود میں آ گئے ہوں۔ لکڑی کے چبوترا جس کے چار کونوں پر بانس لگے ہوئے، ان پر خوشنما سرخ چادر تنی ہوئی، چبوترے پر دھرا ایک بڑا سا مٹکا جس کا منہ سفید کپڑے سے ڈھکا ہوا، اور مٹکے کے پاس کرتے پاجامے میں ملبوس، سفید دوپلی ٹوپی سر پر اوڑھے، داڑھی والا شخص بیٹھا ہو۔ میں ستائشی نظروں سے ان قلفی والوں کی قطار کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ مجھے ان کی ہمت، ان کے استقلال اور ان کے منطق پر رشک آ رہا تھا۔ کراچی، ڈسٹرکٹ سنٹرل، میں اتنے تباہ کن، پرتشدد حالات کے باوجود سلیقے سے روٹی کمانے کے فن پر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ دو چار گاہک، جو غالباً قریبی گلیوں کے مکین ہوں گے، اسٹال کے سامنے پڑی کرسیوں پر بیٹھے تھے، اور ایک دو گاڑیاں فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی تھیں۔ اور ان میں بیٹھے لوگ غریب آباد کی خاص دلبہار قلفی کے مزے لے رہے تھے۔ قلفی واقعی بے حد خوش ذائقہ تھی۔

ایک اور دفعہ ہم ڈی ایچ اے سے گلشن ساحل کو الکرم اسکوائر کے پیچھے ان کے گھر چھوڑنے کے لیے اسی راستے سے گزرے تھے۔ اس دن شہر کے حالات بے حد خراب تھے۔ ایم کیو ایم کا ایک سرگرم کارکن تحویل میں مارا گیا تھا اور افواہوں کا زور تھا۔ لیاقت آباد میں دو بسیں جلائی جا چکی تھیں اور دوسرے دن ہڑتال کی تصدیق ہو چکی تھی۔ مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ سڑک سنسان پڑی تھی، گلیوں اور فٹ پاتھوں پر کوئی چلتا پھرتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور ایسے میں دلبہار قلفی والے اپنے اپنے چبوتروں پر خاموشی سے بیٹھے خالی سڑک کو تک رہے تھے۔ چبوتروں کے بانسوں سے بندھی ٹیوب لائٹوں کی نیلی دودھیا کرخت روشنی میں وہ پراسرار سے، کسی دوسرے سیارے کی مخلوق معلوم ہو رہے تھے۔

آج نومبر کی ستائیس تاریخ ہے، سن ۱۹۹۵، اور صبح کا وقت۔ میں اسی جگہ سے گاڑی چلاتی ہوئی گزر رہی ہوں۔ وہ تمام اسٹال اس وقت اجڑے پڑے ہیں۔ بانسوں پر سے سرخ چادریں غائب ہیں۔ فٹ پاتھ کے ساتھ والی آٹو گیراج اور مکینک کی دکانیں ابھی بند ہیں۔ میں سوچتی ہوں، کیا آج کل بھی شام میں قلفی والے اپنے ٹھیے جما کر روزی کماتے ہیں؟ میں دس نمبر لیاقت آباد کے چوراہے سے بائیں طرف مڑتی ہوں۔ چوراہے پر رش ہے۔ منی بسیں، کوچ، سوزوکی پک اپ، گاڑیاں، گدھا گاڑیاں، موٹر سائیکلیں، پولیس موبائلیں، رینجرز کی بکتر بند گاڑیاں اور پیدل چلنے والوں کی ریل پیل ہے۔ یہ لیاقت آباد ہے۔ دائیں طرف لیاقت آباد کی سپر مارکیٹ ہے جس میں چھوٹی بڑی دکانوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے اور جہاں ہر نوعیت کا سامان دستیاب ہے۔ جیسا کہ لیاقت آباد کے ایک مکین نے برمحل کہا، بیٹی کا پورا جہیز یہاں سے خریدا جا سکتا ہے — فرنیچر، بنارسی جوڑے، سوتی کپڑے، زیورات، برتن، الیکٹرانک کا سامان، گھریلو اشیاء، خشک میوہ، سوئی، دھاگے — لیاقت آباد سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔

اور وہ تھی لیاقت آباد — جو اب تک لالوکھیت کے نام سے مشہور ہے — اور اس سے ملحق

علاقے، اگرچہ آباد، پارہ پارہ مگر کوئی ... عرب آباد شہر کے اندر ایک شہر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پولیس سے بچاؤ، دہشت گردوں کی فائرنگ، ... کے محاصروں، ڈاکوؤں، بھتہ خوروں، قانونی اہلکاروں کے ہاتھوں دیہاڑی اور رشوت خوری سے باوجود کاروباری سرگرمیوں سے بھرپور، خود پرور اور علاقہ حسبِ معمول۔ یہ ہے کراچی ڈسٹرکٹ سنٹرل۔

لیکن اس سطح کے نیچے، اگر آپ اس علاقے کے رہنے والوں سے بات کریں تو آپ کو احساس ہوگا کہ ایک نظام ہے جو آہستہ آہستہ ٹوٹ رہا ہے ۔۔۔ معیشت میں جمود، ... ہوا سماجی ڈھانچہ اور تنزلی پذیر تعلیمی نظام

کاروبار تقریباً ٹھپ ہے۔ ... لوٹ مار ... ہوتی ہے۔ عام دنوں میں بھی اگر ... ہو تو ... جیل جاسکے کسی گرفتاری تو کوئی ... میں قدم بھی نہیں دھرتے۔ دکاندار ... خود دھرنے بیٹھے رہتے ہیں ... قدوس کہہ رہے ہیں۔ وہ پچیس سال ... کے ہو گئے، ... بال، سوئی شیشوں کی جھنک بڑھانے، جھرنے سے نقش کے ... نمایاں ہیں۔ لیاقت آباد ... مارکیٹ میں ... قدوس کی دکان ہے جس میں ... سلائی، کام ... ریشمی جوڑے ملتے ہیں۔ وہ اپنے بیٹوں اور کاریگروں کے ساتھ زردوزی اور سلائی کا کام کرتے ہیں۔

پہلے تو دور دور سے لوگ لیاقت آباد ... کرنے آیا کرتے تھے۔ کہاں کہاں سے گاہک آتے تھے ... شہر آباد، ... لیکن اب تو ... علاقوں سے لوگ بھی آتے ہوئے گھبراتے ہیں ... جانے کس وقت کیا ہو جائے

قدوس لیاقت آباد ہی میں ... مکان میں رہتے ہیں۔ ... آٹھ لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہیں۔ دو ... کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ ... علاوہ تو یہ بھی قدرے محفوظ ہے۔ وہ ... لیکن ... آباد سے نکل کر کسی ... قدوس کی بیوی بچوں کو ... کہہ رہی ہیں۔

یہاں ... قدرے محفوظ کا مطلب ہے ... کوئی پولیس مقابلہ ... کی کال ...

... تو ... کی بات ہیں۔ ... دور ... ہو تو لگتا ہے ... ہوتی ہے۔ ... دو سال ... ہوتے ہوئے ... ہے۔ ... کا شوہر ... نیوی میں ملازم ہے اور عموماً جہاز پر ہوتا ہے۔ ... اپنے دو کمروں کے گھر میں تالا ڈال کر زیادہ تر میکے میں وقت گزارتی ہے۔ "حالات اتنے خراب ہیں۔ اکیلے رہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ رات میں بھی ادھر ہی سوتی ہوں۔

... لڑکے ڈکا ڈالتے ہیں۔ ... سب کچھ لے جاتے ہیں، ... قدوس

بڑبڑاتے ہیں۔ "چوبیس گھنٹے دروازہ بند رکھنا پڑتا ہے۔ ایک زمانہ تھا باہر سے کنڈی لگا کر ہم پڑوس چلی جایا کرتی تھی،" ان کی بیوی پرانے وقتوں کو یاد کرتی ہیں۔ قدوس ملوکھیت میں چالیس سال سے رہائش پذیر ہیں۔ "پاکستان آ کر یہیں ڈیرا ڈالا تھا۔"

"یہاں کا تیسرا معمول ہے رینجرز اور پولیس کی کارروائیاں۔ وہ اسٹریٹ میں گھوم رہے ہیں۔ جس کو چاہیں پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ چھوڑتے ہی نہیں، گھر والوں سے مانگتے ہیں اور دس پانچ ہزار لیے بغیر نہیں چھوڑتے۔"

اور اگر لڑکے کچھ کہنے کی کوشش کریں تو کاٹ مار کر پھینک دیتے ہیں اور کہتے ہیں ایم کیو ایم سے مار۔ ابھی پچھلے دنوں سدھی ہوٹل کی طرف ایک بوری ملی تھی۔ لوگ کہنے لگے، تو پاؤں ہل رہے ہیں۔ رینجرز آ گئے۔ بوری اٹھا کر لے گئے۔ کیا کیا ہوگا اس کے ساتھ؟ کیا پتہ۔ مار مور کر پھینک دیا ہوگا،" ان کی بیوی بولے جا رہی ہیں۔

"اگر رینجرز سے آپ بچ نکلے تو علاقے کے لڑکے تو کہیں نہیں گئے۔ وہ تو بیٹھے ہیں آپ کے پیسے پر ہونگ ڈالنے کے لیے۔ پچھلے ہفتے میری دکان کے قریب ایک بڑی دکان ہے سوٹ کے کپڑوں کی، وہاں تین لڑکے مغرب کے وقت گاہک بن کر آ گئے۔ مارکیٹ کی دکانیں بند ہو رہی تھیں۔ ان لونڈوں نے کئی ہزار کے سوٹوں کے کپڑے خریدے۔ پیسے بھی نہیں دیے اور ساتھ میں دکان کی تجوری بھی لے گئے، ہتھیار لہراتے ہوئے۔ کون چوں چرا کر سکتا ہے ان حالات میں؟ چند دنوں پہلے تک یہ لڑکے تمام دکانداروں سے بھتا وصول کرتے تھے لیکن اب لوگ عاجز آ گئے ہیں ان مسٹنڈوں سے۔ گزارے بھر کے لیے ہی آمدنی ہو جائے تو بڑی بات ہے۔ ایسے میں کون بھتا دے؟ سب دکاندار ہمت کر رہے ہیں۔ ایک ماہ پہلے حیدری کی دکانیں اسی وجہ سے چار دن تک بند رہیں۔ دکانداروں نے بھتا دینے سے انکار کیا اور دکانیں بند کر کے بیٹھ گئے کہ جاؤ، کاروبار ہی نہیں کریں گے تو بھتا کہاں سے دیں گے۔ لیکن کتنے دن یہ معاملہ چل سکتا ہے؟ اور پھر لڑکے بھی کوئی کم نہیں ہیں۔ بھتا نہ دو تو دن دہاڑے لوٹ کر لے جاتے ہیں"۔

عبدالقدوس کے تین بڑے بیٹے زردوزی اور سلائی کا کام کرتے ہیں۔ دو بیٹے ایک چھوٹی سی اسٹیشنری کی دکان چلاتے ہیں۔ چھوٹے بیٹے نے انٹر سائنس کا امتحان پاس کیا ہے۔ اسے بی ایس سی میں داخلہ نہیں مل سکا ہے۔

"کالجوں میں پڑھائی کہاں ہوتی ہے اب؟" قدوس کی بیوی بولیں۔ "آئے دن تو سناٹے ہوتے رہتے ہیں۔ فائرنگ کے خوف سے والدین خود بھی زیادہ زور نہیں دیتے کہ کالج جاؤ۔ اب تو ٹیوشن سنٹروں کا راج ہے۔ یہ بھی جاتا ہے ٹیوشن سنٹر۔"

سترہ سالہ عدنان اردو سائنس کالج کا طالب علم ہے۔ وہ کالج کی زندگی سے بیزار ہے۔ کالج میں گروپ بنے ہوئے ہیں۔ جمعیت، پنجابی پختون، ایم کیو ایم، حقیقی۔ آئے دن لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جو

پڑھنے والے ہیں وہ گھبرا جاتے ہیں۔ کل میں کالج گیا تھا۔ فائرنگ ہو گئی۔ لڑکوں نے آپس میں کی۔ کیا کرتا؟ الٹے قدموں گھر کو لوٹ آیا۔ کالج میں داخل ہو تو مختلف پارٹیوں کے لڑکے کونے میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں آؤ، ہمارے ساتھ بیٹھو۔ جو لڑکے ان چکروں میں نہیں ہیں اور پڑھائی کرنا چاہتے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح سی آر سے حاضری پوری لگوا لیتے ہیں اور گھر یا ٹیوشن سنٹر میں کورس پورا کرتے ہیں۔

اگر لڑکے پڑھنے کے لیے کالج آ بھی جائیں تو ٹیچر اکثر غائب رہتے ہیں۔ یا پھر جلدی چلے جاتے ہیں۔ کلاس میں لڑکے کم تعداد میں ہوں تو ٹیچر پورا پیریڈ نہیں لیتے۔ بہرحال، بات صرف اتنی ہے کہ پڑھنا تو آپ کو خود ہی ہے۔ اگر آپ بغیر ٹیوشن کے پڑھ سکتے ہیں تو خود ہی منہ کھپائیں ورنہ ماں باپ کے پیچھے پڑیں کہ ٹیوشن کے پیسے دو۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ اگر مجھے بی ایس سی میں داخلہ مل بھی جاتا تو کیا مجھے اس کے بعد نوکری مل جاتی؟" وہ پوچھتا ہے۔

عدنان پاکستان امریکن کلچرل سنٹر میں داخلہ لے رہا ہے۔ "انگریزی بہتر کرنا چاہتا ہوں۔" آج کل کیا مشاغل ہیں؟ "دوپہر میں سٹیشنری کی دکان پر بیٹھتا ہوں۔ مال بیچنے بھی جاتا ہوں۔ گھر میں ہوتا ہوں تو رسالے وغیرہ پڑھتا ہوں اور میوزک سنتا ہوں۔ جمعے کو کرکٹ ہوتی ہے۔ محلے میں ٹیمیں بنی ہوئی ہیں۔ اور رات کو بیڈمنٹن کھیلی جاتی ہے۔ [illegible] کمیٹی نے حفاظتی اقدام کے طور پر لائٹ لگائی ہے۔ آٹھ سے دس بجے تک کھیلتے ہیں"۔

لیاقت آباد کے بچے اور نوجوان گھر میں قید ہو کر رہ گئے ہیں۔ بچوں کے تو باہر نکل کر گلی میں کھیلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ والدین کی کوشش ہوتی ہے کہ لڑکے بھی باہر گلیوں میں نہ جائیں۔ میرے کئی دوست لیاقت آباد کے مختلف علاقوں میں رہتے ہیں۔ کوئی دس نمبر میں ہے تو کوئی چار نمبر میں۔ لیکن میں ان سے ملنے ان کے گھر نہیں جا سکتا کیوں کہ ان علاقوں میں زیادہ گڑبڑ رہتی ہے۔ نہ معلوم کس وقت کوئی گولی کہاں سے آ جائے اور آپ اللہ کو پیارے ہو جائیں۔ گولی کے علاوہ دوسرا خطرہ یہ ہے کہ کہیں رینجرز آپ کو اٹھا نہ لے جائیں۔

عدنان کا کہنا ہے آج کل حالات قدرے بہتر ہیں کیوں کہ آس پاس کی گلیوں سے بوریوں میں بند لاشیں ملنا کم ہو گئی ہیں، اور پھر دس بجے رات تک گھر کے سامنے کھیل سکتے ہیں۔ لیاقت آباد میں ایسا وقت بھی آ چکا ہے کہ آٹھ بجے گلیوں میں ہو کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔

میں جب لیاقت آباد فرنیچر مارکیٹ سے گزرتی ہوں، بڑا میدان اور ریلوے پھاٹک عبور کرتی ہوں تو یہ پوش نگر کا آخری سرا ہے۔ بائیں جانب اورنگ آباد ہے۔ سڑک تنگ ہے اور دونوں طرف سے ٹریفک آ جا رہا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں — حمام، حلوائی، اسٹیٹ ایجنسیاں، بیکری، درزی، ویڈیو، ویلڈر۔ مین بلاک کے بعد تنگ متوازی گلیاں ہیں جو رہائشی علاقے میں کھلتی ہیں۔ اورنگ آباد کی گلیوں کے دونوں طرف ساٹھ مربع گز پر بنے یک منزلہ، دو منزلہ مکانات ہیں۔ گلیاں پکی ہیں۔ عقبی تنگ گلیاں بھی صاف ستھری ہیں۔ گٹر کے ڈھکن بند ہیں اور کوڑا کرکٹ بھی نظر نہیں آتا۔

Scanned with CamScanner

فضا جب مختصر ہونے کے لیے ایم کیو ایم کی لوکل باڈیز میں حکومت رہی، یہاں کی حالت سدھری تھی۔ لوگ اب تک صفائی ستھرائی کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

لیکن ان چھوٹے چھوٹے گھروں کی پختہ دیواریں مکینوں کے ذہنی تناؤ اور خوف سے گونج رہی ہیں۔ اس علاقے میں کئی مرتبہ پولیس چھاپے مار چکی ہے۔ رینجرز محاصرہ بھی کر چکے ہیں۔

چھوٹے قد اور گٹھے ہوئے جسم والی نسیمہ بچوں کے پیچھے میں میں۔ ان کی آنکھوں کے گرد گھیرے پڑے ہیں، دانت پان سے سیاہ ہو چکے ہیں۔ وہ کبھی سرگوشیوں میں اور کبھی اچانک تیز ہوتی ہوئی آواز میں مجھے اپنی روداد سنا رہی ہیں: "رات کے گیارہ بجے آئے تھے۔ ذرا سوچو، یہ چھوٹا سا گھر، اور دس موٹے تازے سپاہی تلاشی لے رہے ہیں! چیزیں الٹ پلٹ کر دیں۔ الماریاں، دراز، صندوق، سب کچھ کھول لیا۔ پھر ایک نے چلا کر پوچھا، لڑکے کدھر ہیں تمہارے؟ میں نے کہا صاحب، رات کی ڈیوٹی پر گئے ہوئے ہیں بچے۔ سلیمان کہاں ہے؟ دوسرے نے غرا کر پوچھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ انہیں سلیمان کا نام کیسے معلوم ہوا؟ نسیمہ کا بیٹا سلیمان گزشتہ پانچ سال سے سعودی عرب میں محنت مزدوری کر رہا ہے۔ وہ ارسلان کو اٹھا کر لے گئے۔ تئیس سالہ ارسلان ایک فیکٹری میں ملازمت کرتا ہے۔ نسیمہ کے شوہر تین سال سے بے روزگار ہیں اور بیمار رہتے ہیں۔ نسیمہ نے بڑے بیٹے کو اطلاع دی جو بیوی بچوں کے ساتھ قریب ہی گلی میں رہتا ہے۔

رات گزر گئی تھی اور ہم کچھ نہ کر سکتے تھے۔ میں نے اپنے ہوش بحال رکھے اور سلیمان کے کاغذات کی فائل بناتا رہا۔ اس کے بھیجے ہوئے ڈرافٹ کی نقلیں، سعودی عرب سے ساتھ لائے ہوئے کیسٹ ریکارڈر اور دوسری چھوٹی موٹی چیزوں کی رسیدیں۔ اس کے خطوط اور لفافے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اکٹھا کیے۔ اماں پوری رات بیٹھی روتی رہیں،" سبحان مجھے بتاتا ہے۔

صبح سویرے سبحان اماں کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر ارسلان کی تلاش میں نکلا۔ لے جاتے وقت بتانے تھوڑی ہی میں کہ کہاں لے جا رہے ہیں۔ ہم کراچی کے سو تھانوں میں گئے۔ زیادہ تر تھانوں کی پولیس بری طرح پیش آئی۔ کوئی ہماری کہانی سننے کو تیار ہی نہ تھا کہ سلیمان، جس کو رینجرز نے پوچھا تھا، پانچ سال سے ملک سے باہر ہے اور ارسلان جس کو لے گئے، اس کا ایم کیو ایم سے کوئی تعلق نہیں۔

"چند ایک تھانوں میں پولیس نے ہمارے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور بتایا کہ فلاں تھانے میں جاؤ۔ آخرکار ایک تھانے کے انچارج نے تفصیل سے ہماری کہانی سنی۔ اس نے سلیمان کے تمام کاغذات بغور دیکھے اور ہمیں یقین دلایا کہ اگر تمہارے بھائی کا ایم کیو ایم سے کوئی تعلق نہیں ہے تو تمہیں تمہارا بھائی واپس مل جائے گا۔ سات بجے شام کو آنا۔

شام کو جب نسیمہ اور سبحان پولیس اسٹیشن پہنچے تو ارسلان کو ان کے حوالے کر دیا گیا۔ انہوں نے ہم سے کچھ نہیں مانگا، گو کہ ہمیں بتایا کہ یہ کیس اتنا پیچیدہ تھا کہ انچارج کو سی آئی اے کے افسران کو کیس سمجھانے میں پورا ایک گھنٹہ لگا۔ اور یہ کہ اس کیس کے ہم سے دو لاکھ روپے طلب کیے جا سکتے

Scanned with CamScanner

ہے۔

دہشت تھی، دہشت۔ خدا ان کو زندگی دے۔ ان کو اپنی اماں میں رکھے! مجھے تعجب نہیں کہ نسیمہ ماشہ شکر کی کو دعائیں دیتی ہیں۔ اب یہاں وہ شخص جو اپنی ڈیوٹی سیدھے سادے طریقے سے، قانونی ضوابط کے تحت انجام دیتا ہے، انسان نہیں دہشت ہے۔ انہوں نے انکار سے بتایا کہ سلیمان کا نام اور ٹیلی فون نمبر ایک لڑکے کی جیب سے نکلا تھا جو پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ لہذا اب سلیمان کے نام کی فائل کھل گئی ہے اور وہ ان کو بیچنے آئے تھے۔

وہ لڑکا جس کی جیب سے سلیمان کا نام اور ٹیلی فون نمبر نکلا، اس کی فیملی دس سال پہلے اورنگ آباد میں رہتی تھی۔ سلیمان کی بچپن میں ان سے جان پہچان تھی۔ پھر وہ لوگ لیاقت آباد منتقل ہو گئے۔ اور پھر سلیمان پانچ سال سے سعودی عرب میں ہے لہذا کوئی رابطہ بھی نہ رہا تھا۔

سلمان کی آنکھوں میں پٹی باندھے رکھی اور اسے بہت مارا۔ چوبیس گھنٹے سے پانی پینے کو نہ دیا۔

کس نے مارا تھا؟

ناصروں نے کب مارتے ہیں؟ نسیمہ میرے سوال پر مسکراتی ہیں۔ باتوں سے مارتے ہیں وہ۔ جب سلمان گھر آیا تو اس کی حالت غیر تھی۔ بولا نہیں جا رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے، کپڑے پھٹے۔ پورے جسم میں درد اور بخار۔ ایک ہفتہ بخار میں پڑا رہا۔ چارپائی سے اٹھنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ میں نے کہا، دوستی بند کر ڈیوٹی پر جا۔ جتنے دن نہیں جائے گا، پیسے کٹیں گے۔"

سلمان کو پچیس سو ماہانہ تنخواہ ملتی ہے، غیر حاضری پر کٹوتی ہوتی ہے اور، جیسا کہ چھوٹے کارخانوں میں ہوتا ہے کسی قسم کی کوئی سہولت نہیں دی جاتی۔

نسیمہ کے دو لڑکے شادی شدہ ہیں لیکن وہ چھوٹے تین لڑکوں کی طرف سے بے حد پریشان رہتی ہیں اور ان کی صحت خراب رہنے لگی ہے۔ کلیم ساز فرقان نے ساتویں کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ پانچ سال طارق روڈ کے ایک گارمنٹ میں سے پیکنگ کا کام کیا۔ لیکن وہ مجھے صرف گیارہ سو دیتے تھے اور سولہ گھنٹے صبح سے رات تک کام لیتے تھے۔ تنگ آ گیا تو اس لیے کام چھوڑ دیا۔ کسی گیراج میں سیکھ لیا ہوں لیکن اب کام نہیں ملتا۔ آج کل سائٹ ایریا کی ایک مل میں پارٹ ٹائم نوکری کر رہا ہوں،" دبلا پتلا، شرمیلا فرقان مجھے رک رک کر بتاتا ہے۔

میں زندگی سے بیزار ہو گیا ہوں۔ اماں نے زندگی جہنم کر رکھی ہے۔ ہر وقت باہر نہ نکلو، گھر میں بیٹھو، کی رٹ لگائے رکھتی ہیں۔ جب سے بھیا کو پکڑ کر لے گئے میری اور بھی شامت آ گئی ہے۔ کیا کروں؟ کس سے بات کروں؟ میں جو چوبیس گھنٹے بند ہو کر گزاروں؟ میرا دم گھٹتا ہے۔ اور پھر میں جاتا ہی کہاں ہوں؟ زیادہ ہو گئے تو بیچ گلی ہی میں تو کھڑا ہوتا ہوں۔ اگر گھر میں رہ کر وی سی آر دیکھوں تو اس پر بھی اماں جھنجھلاتی ہیں کہ فلمیں مت دیکھو

Scanned with CamScanner

ہاں میں نہیں چاہتی کہ میرے بچے تمام وقت انڈین فلمیں دیکھتے رہیں۔ کبھی کبھار دیکھ لیں تو کوئی ہرج نہیں۔

نسیمہ کا چھوٹا بیٹا تیرہ سال کا ہے اور اس نے بھی پڑھائی چھوڑ دی ہے۔ تمام وقت گلیوں میں آوارہ گردی کرتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ اس کی وجہ سے مجھے ہائی بلڈ پریشر رہنے لگا ہے۔ میں تو چاہتی ہوں اٹھارہ سال کی عمر تک اس کی جلد از جلد شادی کر دوں، اگر کوئی نوکری لگ جائے اس کی۔ شادی کے بعد گھر تو بیٹھے گا بال بچوں کے ساتھ۔ نسیمہ کا خیال ہے۔ لڑکیاں مسئلہ نہیں ہیں۔ بڑی کی شادی ہو چکی ہے۔ ایک نویں میں پڑھ رہی ہے اور سب سے چھوٹی چھٹی جماعت میں۔ اسکول کے علاوہ وہ تمام دن گھر میں رہتی ہیں اور گھر کے کام کاج میں اماں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔

میں تو اس کا آج اسکول چھڑا دوں۔ مگر آج کل معلوم نہیں کیا ہو گیا کہ جو بھی رشتہ آتا ہے پڑھی لکھی لڑکی مانگتا ہے۔ اس کی منگنی کر دی ہے میں نے، لیکن لڑکا کہتا ہے جب بی اے کر لے گی تب شادی کروں گا۔ نسیمہ کہہ رہی ہیں۔ دس سال پہلے کالج یونیورسٹی کی پڑھی لڑکی سے کوئی شادی کرنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔"

پاپوش نگر میں بھی ڈاکازنی عام بات ہے۔ لڑکے چاہتے ہیں سب کچھ چھین کر لے جا رہے ہیں۔ لوگ ڈرتے بھی ہیں ان سے۔ کیوں نہ ڈریں؟ بندوقیں جو ہوتی ہیں ان کے پاس۔ لیکن اب تو ان کی دیدہ دلیری کا یہ عالم ہے کہ ڈنڈے اور پتھر ہی سے کام چلا لیتے ہیں۔ پچھلے ہفتے ساری گلی میں ڈھائی بجے رات ایک گھر میں لڑکا گھس آیا۔ وہ تو خیر ہوئی، خاتون خانہ کتنا پکار رہی تھیں۔ انھوں نے جو شور مچایا تو پتھر پھینک کر واپس چلا گیا۔ خیریت ہوئی کہ ان کے لگا نہیں۔

نسیمہ کے پاس ایسی لاتعداد کہانیاں ہیں۔

ساجدہ بیوہ ہیں اور اپنے دو غیر شادی شدہ بیٹیوں اور دو بیٹوں کے ساتھ پاپوش نگر میں گزشتہ پچیس سال سے رہ رہی ہیں۔ یہ مکانات اسی مربع گز پر بنے ہوئے ہیں اور گلیاں نسبتاً چوڑی ہیں۔

"دو سال پہلے یہاں حالات بہت خراب تھے۔ ایم کیو ایم اور حقیقی والے آپس میں لڑ رہے تھے اور بیچ میں ہم لوگ تباہ ہو رہے تھے۔ کاؤنسلر کے آفس پر قبضے کی جنگ جاری تھی۔ پھر ایک دن رینجرز آ گئے۔ آفس خالی کروایا۔ تالا ڈالا، لڑکوں کو اٹھایا اور چلے گئے۔ تب سے نسبتاً سکون ہے۔

ساجدہ پچاس کے قریب ہوں گی۔ بال ان کے سارے سفید ہیں۔ وہ ایک نرم گو خاتون ہیں، ٹھنڈے مزاج کی۔ زندگی کی دھوپ چھاؤں نے ان کو مضبوط بنا دیا ہے۔

"ہم یہاں پچیس سال سے ہیں۔ دو سال کے اندر اندر کئی پرانے مکین گھروں کو بیچ کر چلے گئے۔ جن علاقوں میں زیادہ گڑبڑ ہے وہاں سے لوگ ادھر منتقل ہو گئے ہیں۔ اب اس محلے میں کسی کو کسی کا پتا نہیں رہا۔" وہ کہہ رہی ہیں۔

پاپوش نگر کے وہ مکین جو چند برسوں پرانا گھر اونے پونے بیچ کر کہیں اور مکان خرید نے کی استعداد

Scanned with CamScanner

رکھتے ہیں یہاں سے جا چکے ہیں۔ ان گھروں میں وہ لوگ منتقل ہو رہے ہیں جو کبھی زرعی علاقوں میں سات مربع گز کے مکانوں میں رہ رہے تھے۔ اسی مربع گز کے رہنے والے ایک سو تین مربع گز کے مکانوں میں منتقل ہو رہے ہیں۔ اس غیر معمولی اور جبری منتقلی سے محلوں کے سماجی ڈھانچے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ یگانگت، اپنائیت، پڑوسیوں کا وقت پڑنے پر ایک دوسرے کے کام آنا، مل جل کر محلے کے مسائل کو حل کرنا، یہ ساری قدریں ٹوٹ رہی ہیں اور ان کی جگہ بے حسی، لاتعلقی، خوف، اندیشوں اور بے اعتمادی نے لے لی ہے۔

چند ماہ پہلے کی بات ہے کہ میں گھر میں بچیوں کے ساتھ اکیلی تھی۔ شاہد کام پر گیا ہوا تھا اور چھوٹا نوکری کی تلاش میں نکلا تھا۔ گلی میں شور ہونے لگا۔ ہمارے گھر کے باہر کچھ لڑکے کھڑے تھے اور شور مچا رہے تھے: اس گھر کو آگ لگا دو! میں نے کھڑکی سے جھانک کر پوچھا کیا بات ہے، تو بولے آپ کے گھر کی چھت سے کسی نے ہم پر پتھر پھینکا ہے۔ میں نے دروازے سے لگی کھڑی رہتے ہوئے، صبر و تحمل کے ساتھ لڑکوں کو سمجھایا کہ چھت پر کوئی نہیں ہے سوائے ان کے بوڑھے ماموں کے جو عرصے سے بیمار ہیں اور چارپائی سے لگے ہوئے ہیں۔ وہ چھت پر بیٹھ کر دھوپ سینک رہے ہیں۔ وہ اٹھ ہی نہیں پاتے تو پتھر کیا پھینکیں گے۔ لڑکوں نے کہا وہ خود آ کر دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے لڑکوں سے کہا انہیں ہرگز اندر آنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ جب میرا بیٹا کام سے آ جائے تو گھر آ کر تلاشی لے لینا۔ اسی جھگڑے میں محلے کے کچھ لوگ آ گئے اور بیچ بچاؤ کرایا۔ ان کی مداخلت سے لڑکے ڈھیلے پڑ گئے اور یوں معاملہ رفع دفع ہوا۔

پرانے محلے والے ہوتے تو یہ واقعہ میرے ساتھ ہرگز پیش نہ آتا۔ لیکن اب سب نئے لوگ ہیں۔ سوائے دو چار خاندانوں کے اور کوئی ایک دوسرے کو نہیں جانتا، نسرین نے بتایا۔

عبدالسلام کا گھرانہ خوش قسمت ہے۔ وہ اسی طرح دو سال پہلے وہ اب تیس سال پرانے مین روڈ پر واقع چھوٹا سا مکان بیچ کر گلستان سے آگے ایک نئی بستی کے مکان میں منتقل ہو گئے تھے۔ پرانے گھر میں زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ آئے دن ٹارگٹ کلنگ اور ہڑتال کے دن گھر سے ایک قدم باہر نہ نکال سکتے۔ عبدالسلام نے پرنٹنگ کا کام بھی گھر ہی پر کر رکھا تھا اور گاہکوں نے مال لینے کے لیے آنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک پیسوں کی تنگی، پھر مکان بیچنے کے لیے پریشان تھے۔ لے دے کر سستی قیمت میں مل گیا نہیں۔

عبدالسلام کے موجودہ دو منزلہ گھر میں کافی گنجائش ہے۔ تیسری منزل پر ٹین کی چھت ڈال کر ہال میں پرنٹنگ کے لیے مشینیں لگائی گئی ہیں۔ نیچے کی منزل کے کمرے میں سیٹ کیا ہے اور ساری مشینیں دیکھتے ہی بنتی ہیں۔ اس علاقے میں گھروں کے باہر آہنی گیٹ لگے ہوئے ہیں اور گلی کافی چوڑی ہے۔ یہ سب علاقہ محفوظ بھی ہے۔ لوگ یہیں تو سب کی پاپوش نگر ہیں۔ جب جب ہڑتال ہوتی ہے ان کا بیٹا گلشن میں واقع ایک غیر ملکی کمپنی میں کام کرتا ہے، دو تین دن کے لیے گھر نہیں آتا۔ کمپنی کی طرف سے شہر کے ہوٹل میں کمرہ دے دیا جاتا ہے۔ فون پر رابطہ رہتا ہے۔ پچھلے دنوں ان کے علاقے کی ... لڑکوں نے ٹیلی فون کی تاریں کاٹ ڈالی

نہیں۔ اب ٹیلی فون والوں نے زیرِ زمین تاریں بچھائی ہیں۔

ٹیلی فون کے کٹے ہوئے تاروں کی واردات کراچی میں معمول بن گئی ہے۔ لیاقت آباد سے کئی علاقے، پی آئی بی کالونی، ایف سی ایریا، شاہ فیصل کالونی اور نارتھ ناظم آباد میں ہفتوں اور مہینوں ٹیلیفونوں کو، ڈاکوؤں، دہشت گردوں، خدا جانے کون، کی کارستانی کا خمیازہ بھگتنا پڑا ہے۔

ڈسٹرکٹ سنٹرل کے باسیوں کے لیے زندگی دشوار تر ہوتی جا رہی ہے۔ کراچی کے حالات کی وجہ سے ان کو متفرق مسائل کا سامنا ہے۔

"جب آپ کو ملازمت کے واسطے انٹرویو کے لیے بلایا جاتا ہے تو سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے آپ کہاں رہتے ہیں؟ جیسے ہی آپ کے منہ سے لیاقت آباد، ناظم آباد، پاپوش نگر کا نام نکلتا ہے تو آپ کو دروازہ دکھا دیا جاتا ہے، معاف کیجیے گا ڈسٹرکٹ سنٹرل کے رہنے والوں کے لیے یہاں جگہ نہیں، ستائیس سالہ شمشاد تلخ لہجے میں بتا رہا ہے۔ جب نوکری کی تلاش میں چار پانچ جگہ اس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا" تو آخر مجھے جھوٹ بولنا پڑا۔ میں نے کہا میں سوسائٹی میں رہتا ہوں۔ سوسائٹی میں شمشاد کے رشتے دار رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں جب تین دن کی ہڑتال ہوئی تھی، الطاف حسین کے بھائی کے قتل کے ردعمل میں، تو شمشاد بڑی مشکلوں سے دفتر پہنچ سکا تھا۔ اب شمشاد کی زندگی میں یہ مشکل بھی شامل ہو گئی ہے۔ شمشاد اپنی بیوہ ماں اور چھوٹے بھائی کے ساتھ ناظم آباد کے ایک کمرے کے مکان میں رہتا ہے۔

بہت سے خاندان، جن کے لڑکے سیاست سے کسی طور وابستہ نہیں ہیں، اپنے لڑکوں کی طرف سے فکرمند رہتے ہیں۔ "اگر اتفاق سے آپ کا لڑکا ایم کیو ایم میں کسی کو جانتا ہے، خواہ یہ واقفیت سرسری اور عارضی نوعیت کی ہی کیوں نہ ہو، آپ کسی بھی مشکل سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کب گلی میں چھاپا پڑ جائے، محاصرہ ہو جائے۔" فاطمہ کہتی ہیں۔ فاطمہ بیوہ ہیں اور ان کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ ان کے ساتھ دوسری نوعیت کا واقعہ پیش آیا۔ "ایک دن محلے کے لڑکے ان کے گھر آ گئے۔ کہنے لگے، آپ کے دو بیٹے ہیں، ایک بیٹا الطاف بھائی کو دے دیجیے۔ میرے تو ہوش اڑ گئے۔ پریشانی سے برا حال کہ کیا کروں۔" بدقت تمام فاطمہ نے بیٹے کے لیے ریل کے ٹکٹ کا بندوبست کیا اور اسے پنڈی کسی دور کے رشتہ دار کے پاس بھیج دیا۔

سیکنڈ ایئر کا طالب علم راشد چار ماہ کرب اور اندیشوں میں گزار کر واپس چلا آیا۔ "مجھ سے وہاں نہیں رہا جاتا۔ اور پھر کب تک چھپیں؟ رہنا تو ماں کے ساتھ ہی ہے۔" راشد پریشان ہے کہ پڑھائی کا جو حرج ہوا ہے اس سے کس طرح نمٹے۔

سو زندگی جاری ہے۔ ڈسٹرکٹ سنٹرل میں۔

* *

بستی نگری کی زبانی تاریخ

کراچی تضادات کا مسکن بھی ہے۔ اس میں دو شہر بیک وقت موجود ہیں۔ ایک طرف دولت اور تمول کا شہر ہے، جو روشنیوں میں نہایا ہوا، بڑی سڑکوں، رہائشی منصوبوں اور تجارتی مراکز کا شہر، ویڈیو کلچر کا نمائندہ۔ اس کے عکس دوسرا کراچی ہے جسے بعض لوگ دیکھ کر ان دیکھا کر دیتے ہیں اور بعض لوگ دیکھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں، جس کے مناظر یکسر مختلف ہیں: ٹوٹے اور پھٹے کپڑوں میں بچے کوڑے کے ڈھیر پر کھیلتے ہوئے، تنگ گلیاں، بہتے گٹر اور نالیاں، کچے پکے مکانوں میں گنجائش سے زیادہ افراد ٹھنسے ہوئے، مسائل، بیروزگاری اور تشدد کی مسلسل یلغار۔ یہ کچی آبادیوں کا کراچی ہے۔ شہر میں جابجا نمایاں دولت کی علامات سے قطع نظر، شہر میں بنیادی سہولتوں سے محروم افراد کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ یہ کراچی کی صورت حال کی عکاسی کرتی ہے۔ ہوگا کی اصطلاح مستعار لیتے ہوئے ماہرین کے الفاظ میں، کراچی کی ترقی کی کلاسیکی مثال ہے جو عدم ترقی میں اضافہ کرتی ہے۔

کراچی میں شہری پیداوار کی تقریباً ۳۵ فی صد اور شہری اموات تقریباً ۱۰ فی صد ہوتی ہیں، جہاں پر شہر کی آبادی صرف قدرتی اضافے کے سبب ہر سال ۲.۵ فیصد کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ ملک کے دوسرے علاقوں سے نقل مکانی اس کے علاوہ ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ شہر میں ہر سال تقریباً دو لاکھ بچے پیدا ہوتے ہیں اور تقریباً ڈھائی لاکھ افراد نقل مکانی کر کے کراچی میں داخل ہوتے ہیں۔ اس بے تحاشا اضافے سے نمٹنے کے معاملے میں شہری انتظامیہ سست پیچھے رہ جاتی ہے۔ نقل مکانی کرنے والے افراد کی تقریباً دو تہائی تعداد کا مقدر وہ کچی آبادیاں ہیں جو پورے شہر میں جابجا کھمبیوں کی طرح اُگ آئی ہیں۔ کراچی میں چار جانب کچی آبادیوں کی قطار ایک دائرے کی شکل میں پھیلی ہوئی ہے۔ دیہی علاقوں سے آنے والے وہ افراد جو کسی خصوصی مہارت کے حامل نہیں ہوتے اور چھوٹی موٹی محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے خواہاں ہوتے ہیں، سر چھپانے کی صورت کی جگہ حاصل کرنے کی غرض سے غیر معیاری اور کام چلاؤ قسم کے مکانات بھی تعمیر کر لیتے ہیں۔ دہلی میں کچی بستیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے جگ موہن نے جو الفاظ لکھے ہیں وہ کراچی پر بھی صادق آتے ہیں: غربت کے مارے ہوئے دیہی علاقوں سے آنے والے افراد، جہاں جگہ کو خالی دیکھتے ہیں وہاں لکڑی، ٹین یا دفتی کی تعمیر کروا لیتے ہیں۔ ان کے لیے کوئی بھی جگہ بنجر، گندی یا خطرناک نہیں ہے۔ ابتدائی برسوں میں بھی کچی آبادیاں ریل کی پٹریوں کے ساتھ، گندے نالوں کے کنارے، کوڑے کے ڈھیر کے برابر، شہر کے مضافات میں اور ان ترقی کے لیے مخصوص کیے گئے خالی پلاٹوں پر بھی بن جاتی ہیں جو کسی عملی صورت اختیار کرنے کا نام نہیں لیتیں۔ ان میں سے بیشتر آبادیاں وقتی اور عارضی تھیں، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بنیادیں مضبوط ہوتی گئیں اور ان میں سے بعض پکی بستیاں بن چکی ہیں۔

اپنی ابتدائی صورت میں بھی آبادیاں کراچی کے لیے وہی حیثیت رکھتی تھیں جو دہلی کے لیے جھگی جھونپڑی، ممبئی کے لیے جھونپڑپٹی، مدراس کے لیے چیری اور کلکتے کے لیے بستی کی حیثیت ہے۔

کچی آبادیوں کا المیہ ان آبادیوں کی غیر قانونی اور عارضی حیثیت ہے۔ اس تصور سے، کہ مکمل طور پر یہ طے شدہ معیار سے کمتر ہونے کی نشاندہی کرتا ہے، اس امر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان آبادیوں کی بہتری و ترقی کی ضرورت ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کراچی میں ان آبادیوں نے اپنی بنیادیں مضبوط کر لی ہیں اور جہاں لوگوں نے ملکیت کا مطالبہ کیا، انہوں نے اپنے مطالبوں کو منوانے کے لیے قدم اٹھائے ہیں اور دوسری سہولتوں کے باقاعدہ حصول کی بھی کوششیں کی ہیں۔ ۱۹۸۲ میں حکومت سندھ کے مطابق کراچی میں ۳۳۷ کچی آبادیاں تھیں جو ۱۳۰۰۰ ایکڑ رقبے پر پھیلی ہوئی تھیں اور شہر کی آبادی کا ۳۷ فیصد حصہ ان میں مقیم تھا۔ ایک دوسرے اندازے کے مطابق شہر میں ایسی آبادیوں کی تعداد تقریباً بارہ سو ہے اور ان میں رہنے والوں کی تعداد شہر کی کل آبادی کے نصف کے قریب پہنچ رہی ہے۔

کراچی جیسے کثیرالقومی شہر میں کچی آبادیاں بھی متنوع نسلی اور سماجی ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان میں بہت سے خواص مشترک بھی ہیں جو انہیں شہر کے متمول علاقوں سے بڑی حد تک مختلف بنا دیتے ہیں۔ عام طور پر اس لحاظ سے خوشحال علاقے اور کم آمدنی والی آبادیاں دو مختلف دنیائیں ہیں۔ اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں رہنے والوں کے رویوں، ترجیحات اور دنیا کو دیکھنے کے انداز کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا یقینی ہے۔ جو شہری سہولتیں متمول طبقے کے تحت وجود میں آنے والے علاقوں میں میسر ہیں، کچی آبادیوں میں ان کا فقدان ہے۔ پانی، نکاس، بجلی، علاج، تعلیم جیسی سہولتوں کے معاملے میں یہ آبادیاں متمول علاقوں سے بہت پیچھے ہیں۔ پینے کے صاف پانی کی کمی یوں تو عمومی طور پر پورے شہر میں ہے، لیکن کچی آبادیوں میں شدید تر ہے۔ پائپ کے ذریعے پانی کی فراہمی محدود ہے۔ لوگ چند ایک مشترکہ نلکوں پر انحصار کرتے ہیں اور پانی بھرنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرنے والی عورتوں اور بچوں کی لمبی قطار عام نظر آتی ہے۔ انتظار کی طویل مدت اور پانی کی غیر یقینی دستیابی بعض اوقات دنگے فساد کا موجب بن جاتی ہے۔ جن آبادیوں میں یہ اجتماعی نلکے بھی میسر نہیں وہاں پانی برتنوں میں بھر بھر کر خریدا جاتا ہے اور یہ پانی دوسرے علاقوں کی بہ نسبت زیادہ مہنگا ہے۔ چنانچہ چیسر گوٹھ کے ایک گنجان حصے ڈوگری پاڑہ میں ۱۵ روپے کی اوسط روزانہ آمدنی میں سے تین یا چار روپے ہر روز پانی پر خرچ ہو جاتے ہیں۔ جن آبادیوں کو مستقل کر دیا گیا ہے وہاں بجلی کا قانونی کنکشن میسر ہے مگر وہ تناسب بہت کم ہے۔ دوسری آبادیوں میں لوگ اوپر سے گزرنے والے تاروں پر کنڈے ڈال کر بجلی حاصل کرتے ہیں۔ گندے پانی کے نکاس اور سوکھے کوڑے کے ٹھکانے لگانے کا مستقل انتظام عموماً دیکھنے میں نہیں آتا۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، کچی آبادیاں کم آمدنی، کم تعلیم، ناکافی سہولتوں، گنجان آبادی اور آبادی میں تیز رفتار اضافے سے عبارت ہیں، لہٰذا یہاں کے باشندے بیماری کا زیادہ نشانہ بنتے ہیں۔ مختلف ماہرین نے ترقی پذیر ملکوں کے شہری غربا (urban poor) کی صحت کا تجزیہ کرتے ہوئے مختلف عوامل کے تین گروہوں کی نشاندہی کی ہے جن کے باعث ان کی صحت کو مختلف خطرات لاحق رہتے ہیں۔ پہلے گروہ میں وہ عوامل ہیں جو براہ راست غربت کا نتیجہ ہیں جیسے کم آمدنی، محدود تعلیم اور ناقص غذا۔ دوسرا گروہ ان عوامل پر مشتمل ہے جو انسانی عمل کا نتیجہ ہیں مثلاً ناقص رہائش، کم جگہ میں زیادہ افراد، صنعتی اثرات، آلودگی، شور، ٹریفک اور وبائی امراض کے خطرات۔ تیسرے گروہ میں وہ عوامل ہیں جو سماجی اور نفسیاتی عدم استحکام اور

غیر صحت مند زندگی کے اثرات ہیں اور ذہنی بیماریاں، منشیات، سماجی جرائم وغیرہ ان عوامل سے براہ راست منسلک ہیں۔ کراچی کی کچی آبادیوں میں عوامل کے اس پورے سلسلے کے اثرات واضح ہیں۔ یہ اندازہ لگانا تو آسان ہے کہ کچی آبادیوں کے مکین بیماریوں کا مسلسل بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں، لیکن اس بوجھ کی مقدار کے بارے میں صرف قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔ کراچی شہر کے باشندوں کی صحت کے اعداد و شمار ناکافی بھی ہیں اور آسانی سے دستیاب بھی نہیں ہوتے۔

کراچی کی مختلف کچی آبادیوں کا جائزہ لینے کے بعد ۱۹۸۵ میں شہر کی ایک اعلیٰ غیر سرکاری طبی درسگاہ (آغا خان میڈیکل یونیورسٹی) نے چھ آبادیوں — اورنگی، کریکس، چنیسر گوٹھ، عیسیٰ نگری، اعظم بستی اور بابا جزیرہ — اور ایک متوسط طبقے کے محلے — کریم آباد — میں بنیادی صحت کے ترقیاتی منصوبے کا آغاز کیا۔ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا کے کیے ہوئے سروے کے نتائج سے ایک ہی شہر کے الگ الگ حصوں کے درمیان تفاوت کی واضح نشان دہی ہوتی ہے۔ اس سروے کے مطابق مذکورہ کچی آبادیوں میں پیدا ہونے والے ہر ایک ہزار بچوں میں سے اوسطاً ۱۲۳ بچے سال بھر کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں، جبکہ متوسط طبقے کی آبادی میں ایسے بچوں کی تعداد ۳۳ فی ہزار ہے۔ کچی آبادیوں میں ہونے والی تمام اموات میں سے تقریباً نصف ایک سال تک کی عمر کے بچے ہوتے ہیں، جبکہ متوسط محلے میں کل اموات کا ۱۷ فیصد حصہ اس عمر کے بچوں پر مشتمل ہے۔

اگرچہ دونوں آبادی عیسیٰ نگری اور متوسط طبقے کا محلہ کریم آباد ایک دوسرے سے بمشکل چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہیں، لیکن بیماریوں کی نوعیت (disease pattern) میں کئی درجوں کا فاصلہ ہے۔ عیسیٰ نگری میں موت زیادہ تر چھوٹے بچوں میں ہوتی ہیں اور ان اموات کا سبب اسہال، سانس کی بیماریاں وغیرہ ہیں جن سے بچاؤ کے طریقے بہت عرصہ پہلے دریافت کیے جا چکے ہیں۔ انیسویں صدی کے یوروپ کی طرح یہ چھوت کی بیماریاں ہیں۔ اس کے برخلاف کریم آباد میں اموات زیادہ تر بڑی عمر کے افراد میں ہوتی ہیں اور ان کا سبب ہائی بلڈ پریشر، امراض قلب، ذیابیطس، سرطان وغیرہ ہیں۔ ۱۹۶۰ کی دہائی کے شمالی امریکا اور برطانیہ کی طرح یہ غیر متعدی بیماریاں ہیں اور ان کی بنیاد طرز زندگی اور طرز عمل پر ہے۔ مذکورہ کچی آبادیوں میں سے ایک، چنیسر گوٹھ میں کیے گئے سروے کے مطابق بڑی عمر کے افراد میں غیر متعدی بیماریوں کا تناسب بھی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ چناں چہ کچی آبادیوں میں کم عمر بچے متعدی امراض میں اور بڑی عمر کے لوگ غیر متعدی بیماریوں میں تیزی سے مبتلا ہوتے جا رہے ہیں اور یہ آبادیاں خراب صحت کے دوہرے بوجھ تلے دبی ہوئی ہیں۔

کچی آبادیوں میں ذہنی اور نفسیاتی امراض میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ منشیات کا استعمال اتنی تیزی سے پھیلا ہے کہ ماہرین نے اسے بھی ایک قسم کی وبا قرار دیا ہے۔ سماجی عدم استحکام، ذہنی دباؤ، ترقی اور بہتری کے مواقع کا آگے چل کر محدود ہو جانا اور عوام کی بنیادی بحالی کو لاحق طرح طرح کے خطرات وہ عوامل ہیں جن کے باعث لوگوں میں نشہ آور اشیا کی طلب بڑھی ہے۔

اس سروے کو بنیاد بنا کر بنیادی صحت کے منصوبے کا آغاز کیا گیا۔ علاقے کی کچھ خواتین کو صحت کی کارکن کے طور پر تربیت دی گئی۔ علاقے کے بااثر اور سرگرم افراد کی بھی نشان دہی ہوئی اور ان کے ساتھ گفتگو میں وقتاً فوقتاً علاقے کے مخصوص مسائل، لوگوں کے رہن سہن اور یہاں آباد ہونے کے تجربے کی تفصیل

Scanned with CamScanner

دریافت کی جاتی رہی۔ عیسیٰ نگری کے لوگوں کے ان تجربات کو دستاویزی شکل میں محفوظ کرنے کا خیال بھی ایسی ہی کسی گفتگو کے دوران آیا۔

عیسیٰ نگری کراچی شہر کے جغرافیائی وسط میں حسن اسکوائر اور سبزی منڈی کے قریب واقع ہے۔ بلدیہ عظمیٰ کراچی (KMC) کا مجوزہ "ایوانِ شہر" اور ادارہ ترقیات کراچی (KDA) کا نو تعمیر شدہ سوک سنٹر بھی یہاں سے نزدیک ہے۔ شہر کے نسبتاً ترقی یافتہ محلوں سے نزدیک واقع ہونے کے باوجود یہاں بنیادی شہری سہولتیں حال ہی میں نکاسیِ آب کے اسباب کہیں جاکر میسر آنا شروع ہوئی ہیں۔ بارہ ہزار سے زیادہ افراد پر مشتمل یہ بستی چھ ایکڑ رقبے پر آباد ہے۔ روایتی سماجی اشاریوں (social indicators) کی رو سے اسے کراچی کی تمام کچی آبادیوں کی نمائندہ نہیں سمجھا جاسکتا کیونکہ مختلف کچی آبادیاں شہری ترقی کی مختلف منزلوں سے گزر رہی ہیں۔ تاہم اس آبادی کے جائزے سے بعض ایسے مسائل اور حالات کی نشان دہی ضرور ہو جاتی ہے جن سے کچی آبادیوں کے مکینوں کو گزرنا پڑتا ہے۔ عیسیٰ نگری کے جائزے کے مطابق وہاں ایک مکان میں اوسطاً سات افراد رہتے ہیں جبکہ کمروں کی تعداد عموماً دو یا اس سے کم ہے۔ ایک گھرانے کی اوسط آمدنی ۱۹۸۶ کے سروے کے مطابق ساڑھے بارہ سو روپے ماہوار ہے۔ یہاں کے ۴۷ فیصد باشندے ۱۵ سال سے کم عمر کے ہیں اور پانچ برس سے کم عمر کے بچے کل آبادی کا تقریباً ۲۰ فیصد حصہ ہیں۔

عیسیٰ نگری کے کچھ خواص کراچی کی دوسری آبادیوں سے مختلف ہیں۔ یہاں کی آبادی پنجابی مسیحی افراد پر مشتمل ہے جو ایک یا دو پشت پہلے شمالی پنجاب سے نقل مکانی کرکے کراچی میں آباد ہوئے۔ آئندہ صفحات میں پیش کیے جانے والے متن کو اس علاقے کی زبانی تاریخ (Oral History) کے طور پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی گفتگو ڈاکٹر عصمت اسلم نے مکمل احتیاط کے ساتھ ریکارڈ کی اور پھر اس کا متن تیار کیا۔ اس متن کو سامنے رکھ کر عیسیٰ نگری کے عصمت شہزاد اور محبوب جان نے دوسرے راویوں سے گفتگو ریکارڈ کی۔ ریکارڈ کی ہوئی گفتگو کو کاغذ پر منتقل کرتے ہوئے پوری احتیاط برتی گئی ہے کہ تلخیص اور تدوین کے باوجود راویوں کی باتیں انہیں کی زبان اور انداز بیان میں سامنے آئیں۔ اس لحاظ سے اس متن کے ذریعے کراچی کی کچی آبادیوں میں بولی جانے والی عام زبان کا مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

راویوں کی گفتگو کا تدوین شدہ متن ڈاکٹر عصمت اسلم نے تیار کیا اور اسے راویوں کی رضامندی اور تعاون سے حتمی شکل دی گئی تاکہ حقائق کے بیان میں کوئی غلطی نہ رہ جائے اور ان کا نقطہ نظر پوری طرح سامنے آسکے۔

(ا۔ ف۔)

Scanned with CamScanner

بنجمن نقوی شریف سوز
لیاقت منور بیکٹر بھٹی نسرین اسٹیفن
آصف شہباز محبوب جان

انٹرویو اور تدوین: آصف اسلم، آصف شہباز، محبوب جان

عیسیٰ نگری کی زبانی تاریخ

جس وقت آپ چھوٹے تھے، اس کی آبادی کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی، اس وقت لوگ کیسے رہتے تھے، کیا کام کاج کرتے تھے، وقت کس طرح گزرتے تھے۔ آپ اپنے بچپن کے حوالے سے اس کی آبادی کے بچپن کے بارے میں بتائیے، میں نے بنجمن سے پوچھا۔

اس بستی کی آبادی جس وقت وجود میں آئی تو ہم اس سے چار سال کے بعد اس علاقے میں آئے۔ ۱۹۶۰ میں دوسرے علاقوں سے لوگ یہاں آکر آباد ہوئے۔ ہم لوگ ۱۹۶۴ میں یہاں آئے۔ اس وقت یہ علاقہ تو ایسے، بالکل ایک گاؤں کی سی شکل تھی اس کی۔ ہمیں اس کی شکل ایسی لگی کہ جیسے ایک گاؤں سے نکل کر دوسرے گاؤں میں آگئے ہیں۔ ہمارا تعلق سیالکوٹ کے علاقے ناروال اور اس کے ایک گاؤں کھوکھووالی سے ہے۔ وہ ہمارا گاؤں بالکل اسی طرح [illegible] ہے، اب بھی موجود ہے۔ گاؤں میں بھی [illegible] ہوتی ہے [illegible] اس وقت تو [illegible] آبادی بہت کم لوگ یہاں تھے۔ تقریباً چار پانچ گلیاں تھیں، بس چھوٹی چھوٹی تھیں۔ [illegible] پنجاب سے آکر بسنے سے لوگ یہاں رہتے تھے، یعنی کہ کافی کھلی گلیاں ہوتی تھیں [illegible] مکان [illegible] تھے۔ کچے مکان سے ہوتے تھے، لوگوں کے دل بڑے [illegible] ہوتی تھیں [illegible] کی شکل میں تبدیل ہوتی گئی۔ جیسے جیسے لوگ یہاں آباد ہوتے گئے تو ان کے رشتہ دار آتے گئے اور وہ [illegible] رشتہ داروں کو پنجاب سے بلواتے گئے۔ لوگوں نے یہاں آکر جگہ [illegible] نہیں [illegible] دوسرے کاری [illegible] آکر بیٹھتے گئے۔ [illegible] آتے گئے [illegible] جیسے کہ میرا گھر یہاں ہے، میرے رشتہ دار آئے

ہیں تو وہ میرے ہی ساتھ آ کر رہیں گے۔ لوگوں کے پاس بڑے بڑے پلاٹ تھے۔ بڑی بڑی جگہیں لی ہوئی تھیں اور زمین کی قیمت بھی بہت ہی کم تھی۔ جس طرح آج لوگوں کے پاس گھر ہیں جن کی مالیت لاکھوں روپے ہے تو اس وقت پچاس روپے میں بھی گھر ملتا تھا، سو روپے میں بھی گھر ملتا تھا۔ ہم جس گھر میں آئے تھے وہ ہم نے تین سو روپے میں خریدا تھا، جب کہ آج اسی گھر کی قیمت ڈیڑھ لاکھ سے کم نہیں ہوگی۔ تو اس طرح لوگ آتے گئے۔ پھر جس کام کی طرف لوگ بڑھے وہ پنجاب کی نسبت یہاں ان کے لیے کرنا آسان تھا۔ کیوں کہ پنجاب میں ایک طرح کا سلسلہ تھا کہ جن لوگوں کی زمینیں ہیں اور جو کھیتی باڑی کرتے ہیں ان کے مڈ میں یہ لوگ کام کرتے تھے اور بزرگوں کے بزرگ اور خاندانوں کے پورے سلسلے وہ کام کرتے تھے۔ زیادہ تر لوگ کاشتکار کی حیثیت سے زمینوں کے مالک چودھریوں کے پاس کام کرتے تھے۔ اجرت بھی کم تھی۔ پیسہ بھی دیکھنے میں کم آتا تھا۔ کھانے پینے کی چیزیں موسم کے حساب سے مل جاتی تھیں۔ لیکن یہاں آ کر لوگوں کے پاس پیسہ آیا۔ یہاں آ کر لوگوں نے کم محنت میں زیادہ پیسہ دیکھا۔ اور پھر انھوں نے یہ فرق دیکھا کہ یہاں پر ٹائم بھی ہے۔ یعنی کہ آپ صبح جائیں اور شام تک گھر آ جائیں۔ یہ نہیں کہ صبح سے شام تک پھر رات تک لگے رہیں، اوپر سے جب جی چاہے کام کے لیے بلالیں۔ وہاں تو اپنے گھر میں بھی کام ہوتا تھا تو اس کے لیے چودھری سے اجازت لینا پڑتی تھی۔ یہاں تو ہم اپنا تھا۔ تو یہ چیزیں لوگوں کے لیے نئی تھیں۔ پھر ہمارے لوگوں کے لیے تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے مواقع بھی کم تھے اور شہر کراچی کا آپ کو پتا ہے، ان دنوں ہم نے سنا تھا کہ کراچی بڑا شہر ہے، وہاں تو جانا مشکل ہے، جو چلے جاتے ہیں وہ بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں۔ ان دنوں ہمارے لیے کراچی ایسا تھا جس طرح آج دبئی کو اور یورپ کو سمجھتے ہیں۔ تو ہم اس شہر میں آ گئے۔

اس علاقے میں جو لوگ آ کر آباد ہوئے وہ پنجابی تھے اور ان میں سے بھی کرسچن، کیوں کہ شروع میں جو لوگ یہاں آ کر آباد ہوئے تھے وہ کرسچن تھے۔ لوگوں کا رہن سہن ویسا ہی تھا جس طرح گاؤں میں چھوڑ کر آئے تھے، مثلاً مویشی پالنا۔ گلیوں میں بھی لوگ جانور پال لیتے تھے۔ شروع میں تو گھروں میں بھی اتنی جگہ ہوتی تھی کہ جانور رکھ لیں۔ رسم ورواج میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ پانی بجلی کی سہولت تو آپ کو پتا ہے، اب بھی پوری طرح نہیں ہے۔ اس وقت تو بالکل نہیں تھی۔ اس وقت اس علاقے کے لوگ بہت دور دور سے پانی لاتے تھے۔ آدمی کام پر چلے جاتے تھے، عورتیں سارا دن یہاں سے دو کلومیٹر دور اور تین کلومیٹر دور سے پانی لاتی تھیں۔ بڑی کوشش کے بعد لوگوں نے ایک نلکا لگوایا جو روڈ پر تھا۔ پوری آبادی کے لیے ایک نلکا۔ لیکن اس وقت آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔

آج کوئی دیکھے تو یقین بھی نہیں کرے گا کہ یہاں بالکل آبادی نہیں تھی۔ کھلا علاقہ تھا۔ ادھر ملک پلانٹ کی عمارت تھی اور اس کے بعد تین چار کلومیٹر آگے چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن تھا جہاں اب یہ کراچی سنٹرل اسٹیشن بن رہا ہے۔ آگے سیمنٹری تو تھی۔ وہ تو پاکستان سے پہلے کی ہے۔ غریب آباد کا علاقہ جس طرف سے وہاں تک کھیت تھے۔ جس سکول اور گلشن اقبال تو ہمارے سامنے بنا ہے۔ اس

طرف موچیوں کا کیمپ لگا ہوا تھا۔ سن ۶۵ کی جنگ میں بہت فوجی ادھر آئے تھے۔ بیس سال پہلے جب نمائش لگتی تھی جہاں اب سوک سینٹر ہے، اس کے سامنے، اور یہاں سے لوگ وہ نمائش دیکھنے آتے تو رات کے وقت بندر ان کا راستہ روک لیتے تھے۔ اس طرف گیدڑ بھی بہت تھے۔ جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں اور گھپ اندھیرا ہوا کرتا تھا۔ اس علاقے میں بجلی بھی بہت دنوں کے بعد آئی اور ناجائز کنکشن سے شروع ہوئی۔ گھروں میں لالٹین جلا کرتی تھیں اور دکانوں میں گیس کی بتی استعمال ہوتی تھی۔ یا کوئی پروگرام ہوتا تھا تو اس میں یہی استعمال کرتے تھے اور جس شخص کے پاس گیس ہوتی تھی، اس کی دوسرے لوگوں میں بڑی اہمیت ہوتی تھی اور لوگ کہتے تھے اس کے گھر میں گیس جل رہی ہے، جب کہ آج کسی کے گھر میں ٹیوب لائٹ بھی جل رہی ہو تو کوئی نہیں دیکھتا

اس وقت یہاں گھروں میں وہ پختہ والی گندی نالیوں کا سلسلہ نہیں تھا بلکہ لوگ گھروں میں کنویں سے کھود لیتے تھے، وہ رفع حاجت کے لیے بھی استعمال ہوتے تھے لیکن زیادہ تر ایمرجنسی کے لیے۔ ورنہ اس کام کے لیے باہر جاتے تھے۔ پورے علاقے میں کوئی سینیٹیشن سسٹم نہیں تھا۔ عورتیں شام کے وقت ٹولیوں کی شکل میں باہر جاتی تھیں۔ کپڑے دھونے اور نہانے کے لیے لوگوں نے جو کنویں سے بنائے ہوئے تھے ان کے اوپر چھت ڈال دیتے تھے اور جب وہ بھر جاتے تو یہ سب گلی میں چھوڑ دیتے اور یہ پانی گلی میں سے لگتا تھا اور نالے میں چلا جاتا تھا۔ یہ نالہ شروع سے ہے اور سیوٹاؤن کے علاقے کا ڈرینیج یہاں سے گزرتا تھا۔ اس نالے میں پہلے صاف پانی آتا تھا، پھر گندا پانی آنے لگا۔ صاف پانی اس لیے آتا تھا کہ کے ڈی اے کا جو پلانٹ ہے یہاں پر ایک چشمہ تھا اور اس چشمے کا پانی اس نالے سے گزرتا تھا۔ عورتیں یہاں پر کپڑے دھونے اور برتن دھونے جاتی تھیں جس طرح ندی پر جاتے ہیں۔ اب سارے علاقے کا کوڑا کرکٹ اس میں بہتا ہوا آتا ہے۔ آبادی بڑھنے لگی تو پھر اس طرح ہو گیا۔

جب میں یہاں آیا تھا تو مجھے لگا کہ میں ایک گاؤں سے نکل کر دوسرے گاؤں میں آ گیا ہوں۔ لیکن یہ گاؤں چپکے چپکے شہر بن گیا اور میں نے بھی گاؤں والے سے شہر والے ہونے کا فاصلہ طے کر لیا۔ لیکن یہ آہستہ آہستہ ہوا۔ مجھے خود بھی بعد میں پتا چلا۔ ہم کو ایک خوف رہتا تھا۔ آج سے دس پندرہ سال پہلے تک بھی یہ خیال تھا کہ یہ علاقہ مسلسل آباد نہیں رہے گا، لوگوں کو یہاں سے بھی ہٹا دیا جائے گا۔ اس لیے کہ ہم لوگوں کے پاس لیز نہیں تھی اور گورنمنٹ کا کچھ پتا نہیں، مختلف حکومتیں آتی تھیں، جاتی تھیں۔ لوگ وعدے کرتے تھے اس کو مستقل کرنے کے لیے، کہ اس کا الاٹمنٹ ہو جائے اور اس کو لیز مل جائے۔ اس کے باوجود لوگ اس بات پر توجہ نہیں دیتے تھے کہ ہمیں اس کو پکا کرنا ہے، ہم پکے گھروں میں شفٹ ہو جائیں۔ لیکن ساتھ ساتھ جب لوگوں کی آمدنی بڑھنا شروع ہوئی، کیوں کہ اس وقت مہنگائی کم تھی اور ضروریات بھی زیادہ نہیں تھے اور پیسے کی ویلیو بھی تھی، تو لوگوں نے آہستہ آہستہ گھروں کو بہتر کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد جس کا گھر ٹوٹتا تو اس نے یہی کوشش کی کہ اس کو بلاک سے بنایا جائے مٹی کے بجائے۔ وہ تبدیلی کا وقت تھا جب لوگوں نے ٹوٹے ہوئے گھروں کو مٹی کے بجائے سیمنٹ کے بلاکس سے بنانا

Scanned with CamScanner

شروع کیا۔ لیکن یہ آسان کام نہیں ہے۔ وہی بات تھی کہ لوگ اتنے عرصے سے رہ رہے تھے اور یہ خطرہ تھا کہ یہاں سے نکال دیے جائیں۔ پھر چکنی مٹی آسانی سے مل جاتی تھی اردگرد بہت مل جاتی تھی۔ بلکہ چکنی مٹی کا ایک حادثہ بھی ہوا۔ وہ اس طرح کہ جیسے لوگ کھودتے کھودتے رہتے ہیں اور اتنے گہرے چلے گئے کہ وہ تودہ گر گیا اور اس میں ایک دو بچے اور چند بڑے دب کر فوت ہو گئے۔ تو اس طرح ایک حادثہ بھی ہوا اور تبدیلی بھی آتی گئی۔ اور چکنی مٹی کا استعمال کم ہوتا گیا۔ اس کی جگہ لکڑی کی چھت ہے لگی اور ٹین بھی استعمال ہونے لگے۔

پانی کی تو بڑی مشکل تھی لوگوں کو۔ ساری ہی مشکلیں تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ یہ کوشش بھی کرتے تھے کہ کسی طرح مسائل کو حل کریں۔ شروع میں تو لوگ اس لیے خاموش رہے کہ آبادی کم تھی۔ ان کو ڈر تھا کہ حکومت یہاں سے بے دخل کر دے گی۔ تو جیسے جیسے آبادی بڑھتی گئی اور یہ مسائل بھی بڑھتے گئے تو لوگوں میں یہ احساس بھی ہوا کہ اپنے حقوق کے لیے لڑنا چاہیے۔ دس سال پہلے لوگوں نے اپنے طور پر وہ سیوریج کا سسٹم شروع کیا اور گٹر لائنیں بنوائیں۔ محلے کے لیے بھی کام کیا اور گلیوں میں گٹر لگوائے۔ لوگوں نے گھروں میں ٹینکے بنائے تھے لیکن گلیوں میں ٹینکے ایک ایک دو دو کر کے لگوائے۔ اس میں حکومت کی بھی مدد تھی لیکن زیادہ تر ہمارے اپنے لوگوں کی محنت تھی۔ جس کی مدد آپ کے تحت لوگ پیسہ جمع کرتے تھے، چیزیں خرید کر لاتے تھے، گڑھے کھدوانے تھے، اس میں ڈالتے تھے۔ اور اس طرح نکاسی کے لیے بھی خود کام کیا اور پانی کے لیے بھی۔ پنچایت سسٹم اب بھی ہے لیکن اس وقت زیادہ مضبوط تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ ہمارے مسئلے جو ہیں ہم ان کو مل کر اپنے طور پر حل کر سکتے ہیں۔ کافی دنوں تک یہ سلسلہ رہا۔ اس وقت لوگ ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے اور ایک دوسرے کو سمجھتے تھے۔ نہ پولیس سے لوگ ڈرتے تھے۔ درمیان میں ایک وقت ایسا آیا کہ لوگ ایک دوسرے کے بھی خلاف ہو گئے، ایک دوسرے سے ڈرنا اور عزت کرنا چھوڑ دیا اور ذرا سی جھگڑا جو ہوتا تھا تو پولیس تھانوں تک پہنچنے لگا۔ عیسیٰ نگری کا وہ وقت بھی ہم کو یاد ہے جب بیوپاروں تھانے کی پولیس اس علاقے کو سونے کی چڑیا کہنے لگی، اس لیے کہ لوگ آپس میں کسی نا اتفاقی رکھتے تھے اور پولیس والوں کو ذرا سی بات پر بھی اچھی خاصی رقم بٹورنے کا بہانہ مل جاتا تھا۔ یہ سلسلہ کم ہوا ہے لیکن اب بھی چل رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہماری بڑی وجہ ہے۔ یہ ہمارے نوجوانوں کے مسائل ہیں جن کی وجہ سے یہ ہوتا ہے۔ نوجوانوں کے مسائل ہیں، ہمارے بزرگوں کے مسائل ہیں اور ہمارے سیاسی لیڈروں کے مسائل ہیں۔

پچھلے کرسمس پر چرچ کے سامنے پہرہ دینے کے بہانے پولیس آ گئی۔ آئے تو تو آ گئے لیکن سارا دن لوگوں کو تنگ کرنا، عورتوں کو گھورنا، ہر سے ہر سے کہ یہ لا دو، وہ لا دو۔ جس وقت شروع میں ہم آئے تھے تو دو تین چرچ تھے۔ اب آپ دیکھیں جیسے جیسے لوگ بڑھے ہیں تو چرچ بھی زیادہ ہو گئے۔ پہلے تین چرچ تھے، آر سی، پریسبی ٹیرین، ایک چرچ آف پاکستان اور ایک پینٹی کوسٹ۔ اب دس گیارہ چرچ ہیں، اور ہر ایک میں ہمارا الگ الگ سلسلہ ہے۔ اس طرح تعلیم کا بھی ہے۔ لوگ زیادہ تر

ان پڑھ تھے جیسے عموماً لوگ کراچی میں آ کر دیہی یا دوسرے علاقوں میں جو لوگ آباد ہیں، وہ چاہے امیر ہوں یا غریب، ان میں تعلیم کا رجحان بہت کم تھا۔ تو اس علاقے میں بھی یہ رجحان پیدا ہوا، اور لوگوں نے محسوس کیا کہ بے شک وہ خود تعلیم نہیں حاصل کر سکے لیکن اپنے بچوں میں تعلیم کا انتظام کریں۔ تو لوگوں نے بہت کوشش کی۔ گورنمنٹ نے یہاں ایک اسکول کا اعلان کر دیا جو پرائمری تھا اور گورنمنٹ کی طرف سے بھی تھا۔ تو گورنمنٹ کا ایک ہی اسکول ہے لیکن پرائیویٹ اسکول چار، پانچ ہیں۔ تو وہ اسکول ایک شفٹ میں گورنمنٹ کی طرف سے چلتا ہے اور ایک شفٹ میں پرائیویٹ طور پر چرچ کی طرف سے۔ میں نے اس اسکول سے پڑھا۔ پھر علاقے سے باہر کے اسکول سے بھی پڑھا۔ اس وقت علاقے سے باہر کے اسکول میں بچوں کو نہیں بھیجا جاتا تھا۔ اب تو عیسائیوں میں کئی اسکول کھلے ہوئے ہیں اور بنگلوں میں بھی اسکول کھلے ہوئے ہیں۔ اس وقت ارد گرد بھی کوئی اسکول نہیں تھا۔ اب تو ساری سہولتیں مل سکتی ہیں۔

اب تو عیسیٰ نگری تقریباً کراچی کے وسط میں آ گئی ہے لیکن پہلے یہ شہر کا آخری آباد کونا تھی۔ یہاں تک کا روڈ بھی کچا ہوا کرتا تھا، کوئی بس بھی ادھر نہیں آتی تھی۔ یہاں بس کا انتظام نہیں تھا۔ [illegible] بڑی [illegible] سے پیدل [illegible] آیا کرتے تھے رات کے وقت۔ سبزی منڈی کے بس اسٹاپ تک جانا پڑتا تھا۔ ایک بس اس اسٹاپ تک چلتی، اس کے بعد دوسرا بس اسٹاپ بھی ہو گیا۔ لسبیلہ چوک روڈ کی ہوتی تھی جس کا نام پیر الٰہی بخش روڈ ہو گیا ہے۔ اب تو یہاں سے ہر طرف کو رستے نکلتے ہیں۔ یہ آبادی سے بستی بن گئی۔

آپ نے ٹھیک کہا کہ اس وقت یہ ساری سہولتیں موجود نہیں تھیں تو اس کے باوجود ہم میں بھی پڑھ [illegible] ہم بڑی مشکل سے یہاں سے گئے۔ اس وقت یہاں پر ہائی اسکول نہیں تھا۔ ہمارے اسکول کا کانٹریکٹ تھا [illegible] کے ایک اسکول سے، ہم وہاں شفٹ ہوئے۔ پیدل علاقے سے باہر نکل کر پڑھنے، وہ بھی بہت لمبا [illegible] ہمارے لیے۔ بسوں میں سفر کرنا، آنا جانا یہ سب۔ اس وقت یہ جو نہیں تھا جس طرح اب گلی گلی میں [illegible] کھیلا جا سکے، ہم فٹ بال کھیلتے تھے اور [illegible] ہوتی تھیں۔ کرکٹ کا تو نام نہیں تھا۔ گلی ڈنڈا ہم کھیلتے تھے۔ جس کو آج کل [illegible] آپ کو نظر آتا ہے، ہم تو [illegible] گراؤنڈ ہوتا تھا۔ گلی ڈنڈے سے لے کر [illegible] تک جو کھیل تھے وہ یہاں بہت تھے۔ ہم والی بال بھی کھیلتے تھے۔ گاؤں میں کشتی ہوتی تھی۔ ہاں پہلوانی کا شوق عام تھا۔ ہم سے جو بڑے تھے وہ کبڈی کھیلتے تھے اور پہلوانی کرتے تھے۔ [illegible] ہوتی تھی۔ وہاں شام کے وقت [illegible] جاتے تھے اور [illegible] کشتی دیکھنے [illegible] شادی [illegible] سارے [illegible]۔ پھر عیسیٰ نگری کا [illegible] ٹورنامنٹ شروع ہوا۔ دوسرے علاقوں سے لوگ آنے لگے۔ تو [illegible] دن یہاں [illegible] ہوتا تھا۔ ڈھول ڈھمکا ہوتا تھا، میلے کا سماں ہوتا تھا۔ دور دور سے لوگ آتے تھے۔ اس طرح سے مسلسل [illegible] ہوتے تھے [illegible] ہم [illegible] سے [illegible] ہیں۔ [illegible] کا [illegible] کھیلا [illegible] تھے۔ [illegible] بڑی بات ہے کہ [illegible]

پاس سائیکل بھی نہیں ہوا کرتی تھی۔ لڑکیاں گھروں کے اندر رہتی تھیں اور کہانیاں ہوتی تھیں اور پہیلی میں ہم کہتے ہیں باتاں یا بیاں، تو یہ سب ہوتا تھا۔ لوگوں کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا بڑا ہوتا تھا۔ اور مکانوں کی چھت اس طرح ہی ہوتی تھی۔ ایک چھت سے چلیں تو پوری گلی کراس کرتے ہوئے پہنچ جاتے تھے۔ ہم اپنے گھر سے اسلم اور ان کے گھر چھت سے ہی جاتے تھے۔ اب نہیں جا سکتے۔ نئے گھر بڑے کچی سے اور لوگ بنگلوں کی شکل میں رہنے لگے ہیں۔ ہمارا جو گھر تھا اس میں گراؤنڈ فلور پر ایک کمرہ اور ایک اور چھوٹا سا کمرہ ہوتا تھا۔ شروع میں تو ہمارے پاس ایک کمرہ تھا اور ایک ورانڈہ اور ایک ہمارے چھوٹا سا کچن سا ہوتا تھا اور اس میں چولہا جلتا تھا تو دھواں سارے گھر میں پھیل جاتا تھا۔ مٹی کا تیل استعمال کرنا بعد میں شروع کیا ہے۔ اُپلے جلتے تھے اور لکڑی۔ مٹی کا تیل مہنگا سمجھا جاتا تھا۔ لکڑی آسانی سے مل جاتی تھی، آس پاس کے علاقے میں جھاڑیاں تھیں ان سے کاٹ کر لاتے تھے۔ یہ بھی ہمارا کام تھا۔

دنگل ہوتے تھے، کشتی ہوتی تھی، اور باتیں ہوتی تھیں۔ یہ ساری باتیں بزرگوں کے سامنے ہوتی تھیں۔ ماشاءاللہ جوان تو آپ بھی رہے ہیں۔ آپ کو پتہ ہوگا کہ نوجوانوں کی باتیں اور بھی ہوتی ہیں، جن کا بزرگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ اس وقت نوجوانوں میں زیادہ تر بس یہی تھا کہ فٹ بال میں، کبڈی میں اور اِدھر اُدھر اور کچھ دوست ہو مل کر رہتے تھے ان کا کام تاش کھیلنا، پتا کھیلنا، بیٹھے رہنا۔ آج کل جس طریقے سے لڑکے کارنرز پر نظر آتے ہیں، اس وقت بہت کم ہوتے تھے۔ دو چار دوست اکٹھے ہوتے تھے تو وہ کسی کے گھر میں بیٹھ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ کسی نے کام کرنا ہے تو وہ بھی وہیں پر کر لیا اور اگر سونے کا ٹائم ہے تو وہ بھی۔ کبھی کسی اس کے گھر سو جانا، یا پھر اسکول کا کام مل کے کرنا۔ میں خود عارف کے گھر چلا جاتا تھا اور اُدھر سے انور بھی آجاتا تھا کہ چلو جی، عارف کے گھر میں سکول کا کام کریں گے۔ اور وہیں پر کھانا پینا ہو رہا ہے، وہیں پر گپیں لڑ رہے ہیں اور وہیں پر کھیل کود ہو رہا ہے۔ اور پھر اگر آپ دوسرے مسئلوں کے بارے میں پوچھنا چاہیں تو وہ بڑے مختلف تھے۔ ہم مانیں نہیں جی تو نہیں کہنا چاہیے، اس وقت کے حساب سے وہ کچھ برے تھے لیکن آج کل کے حساب سے وہ بہتر لگتے ہیں۔ اس وقت جو جوان تھے تو وہ عشق اور محبت کا سلسلہ ہوتا تھا لیکن آج کل لوگ محبت کا نام لے کر جنسی خواہش کی تسکین کی بات کرتے ہیں۔ اس وقت لوگ واقعی محبت کرتے تھے، اور کوئی بندہ کسی لڑکی سے محبت کرتا تھا تو وہ اس کی محبت صرف یہ نہیں ہوتی تھی کہ اس کو لیٹے، اس کو پکڑے۔ یہ سب تھا لیکن آج کی طرح نہیں تھا۔ خط و کتابت کا چکر زیادہ ہوتا تھا۔ جو لوگ پڑھے لکھے ہوتے تھے وہ ایسا چھوٹا سا بچہ ڈھونڈتے تھے جس کا اس گھر میں آنا جانا ہوتا تھا اور اس پر شک نہیں ہو سکتا تھا۔ تو اس وقت یہ ہوتا ہے قاصد بچے ہیں جو اور قصے چل رہے ہیں۔ اُدھر سے پورا پورا لو یہاں کا گانا آ رہا ہے تو اس طرف سے پورا مہدی حسن کا گانا لکھا ہوا جا رہا ہے۔ اس وقت فلمی گانوں میں بھی رشتے کا سلسلہ ہوتا تھا۔ اور گانے بھی پیسے ہوتے تھے، ساون بھر والے بل پر طلاسلے اور تیرے ساجن گھڑیاں بیتیں جیسے صدیاں بیتت نہیں ... کا بڑا سلسلہ تھا۔ اور جو لوگ ان پڑھ تھے ان کا کام تھا چکر بازی، اس گلی سے نکلے اور

گھوم کر چکر کاٹ کر پھر اسی گلی میں آ گئے۔ اور وقت ان کو پتہ ہوتا تھا، مختلف [illegible] آ رہا ہے تو [illegible]
لیے، اشارہ کر دیا۔ [illegible] سے [illegible] زیادہ ہوتا تھا۔ عیسیٰ نگری میں سب لوگوں کی چھتیں زیادہ اونچی ہو گئی
ہیں تو چھت سے اشارے ہوتے ہیں، ایک دوسرے کی طرف [illegible] چیزیں ادھر [illegible] رہتے ہیں۔

یہ نہیں کہ اس وقت یہ سب کچھ نہیں ہوتا تھا، لیکن اتنی بے حیائی نہیں تھی۔ جس طرح اب
علاقے میں کبھی کبھی کوئی لڑکا لڑکی ایک دوسرے کے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں تو اس وقت سے زیادہ نہیں نہیں
ہوتے تھے۔ یہ ضرور ہوتا تھا کہ کسی کا کسی کے ساتھ نام چل گیا۔ کچھ لوگ اس وقت کے ہیرو ہوتے تھے۔
اس وقت کے ہیرو [illegible] پینٹ جیسے تھے اور جس نے پینٹ پہن لی وہ ہیرو ہو گیا، چاہے وہ گھوٹا چھاپ
کیوں نہ ہو۔ پھر یہ فیشن نکلا کہ گلے میں رومال باندھ کر گھومتے رہتے ہیں۔ ایک کو چھوڑ، دوسرے سے
محبت کی، پھر اس کو چھوڑا۔ اس وقت کے کچھ ہیرو [illegible] ہیں۔ بڈھے ہو گئے ہیں پر [illegible]
ہیں۔ ہیرو تو آج کل بھی بہت گھوم رہے ہیں۔

پھر ڈرامے پارٹیاں بڑی ہوتی تھیں، ڈرامے کرتے تھے اور اس میں [illegible] ہوا کرتا تھا۔ پھر چرچ میں
کسی سے ملنے اور دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ اور چرچ چھوٹنے کا [illegible] ہوتا تو سارے عاشق باہر کھڑے ہوتے ہیں۔
آج کل بھی کھڑے ہوتے ہیں۔ چرچ میں بھی [illegible] نہیں باہر نکلی ہیں۔ لڑکا [illegible]
بھی کا کام کر لیا۔ چرچ [illegible] کرسمس کے دن بھی لوگ [illegible] جایا کرتے تھے۔ جلوس
کی شکل میں جا کر نماز ادا کرتے تھے۔ تب یہاں پر [illegible] میں بھی نماز شروع ہو گئی۔
[illegible] ہوتا تھا تو ایک طرف سے دوسری طرف جلوس کی شکل میں جاتے تھے، بڑا اچھا لگتا تھا۔ اب
لوگوں کے پاس وقت بھی کم ہے اور [illegible] رسومات [illegible] کا [illegible] بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ مذہبی ڈرامے
بھی ہوتے تھے اور سوشل ڈرامے بھی۔ علاقے میں جو [illegible] گھومتے رہتے ہوتے تھے وہ کوشش کرتے
تھے کہ ہمیں ہیرو کا چانس ملے۔ جب آبادی بڑھنے لگی تو لوگوں میں گروپ بازیاں بھی ہونے لگیں۔
[illegible] طور [illegible] یا چرچ کمیٹیاں پروگرام بناتی تھیں۔ کرسمس
والے دن میلہ لگتا تھا۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ [illegible] کے تہوار ہوں۔ تھوڑے، کھانے پینے کی
چیزیں [illegible] کھیل، گانا بجانا، [illegible] آتشبازی وغیرہ ہوں۔ اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ کسی کے گھر
خوشی ہوتی تھی تو [illegible] ایک لڑکا [illegible] سیر [illegible] اور [illegible]
[illegible] وغیرہ [illegible] جاتے تھے۔ [illegible] پھر یہ ہونے لگا کہ کسی کے گھر بچہ پیدا
ہو [illegible] خوشی کا اعلان کر رہے ہیں۔ [illegible] اس وقت سے ہی پہلے
سے چلا آ رہا ہے۔ [illegible] اب
[illegible] گلوکار بلاتے ہیں اور ٹکٹ رکھتے ہیں۔ جو
پیسے کمانے والوں نے [illegible] وہ سب ٹکٹ میں لگا دیتے ہیں۔

ایک کرسمس میلہ [illegible] آج سے اٹھارہ انیس سال پہلے کی بات ہے۔ سڑک کے

سامنے کیتھولک سوشل سروس والوں نے معذور بچوں کے لیے سنٹر بنایا تھا جہاں ان کو دن بھر رکھنے کا انتظام تھا۔ سلائی سنٹر تھا اور ڈاکٹر بھی بیٹھتا تھا۔ اسی سنٹر کو مزید ڈیولپ کرنے کے لیے ہم نے میلہ کیا۔ اس میلے میں اسٹال لگائے۔ کھیلیں رکھیں۔ اور ہم نے ایک اسٹال لگایا ناچنے کا۔ اس وقت ٹیپ ریکارڈر کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ ٹیپ ریکارڈر پر گانے سننے کے لیے بہت لوگ آتے تھے۔ تو ہم نے سوچا کیوں نہ ٹیپ ریکارڈر لگا کر اس سے آمدنی کی جائے۔ اس پر ناچنے کا کردار میں نے کیا۔ میرے ساتھ دوسرے بھی تھے۔ میں نے مونچھیں صاف کر کے لیڈیز کپڑے پہنے اور ڈانس کیا۔ اس کے اوپر ٹکٹ لگائی۔ اس میں بہت لوگ آئے اور ایک گانا ختم ہوتا تھا تو پچاس لوگ دوسرے گانے کی فرمائش کرتے تھے۔ اس وقت بھی وہ بڑا عجیب تھا اور عیسیٰ نگری میں پہلی مرتبہ اس طرح ہوا۔ لوگوں نے اس کا برا نہیں مانا بلکہ بہت پسند کیا۔ لیکن اب میں سوچتا ہوں تو مجھے خود عجیب سا لگتا ہے۔

> باہر سے ایک جیسی نظر آتی ہیں کچی آبادیاں لیکن اگر سطح کے نیچے ذرا کرید جائے تو ایک دوسرے سے خاصی مختلف معلوم ہوتی ہیں۔ روزمرہ زندگی کی بنیادی سہولتوں کے حصول کی جنگ ہر جگہ ایک کہانی سے جڑ کر اپنی جڑیں لگانے کی کوشش سے شروع ہو کر بہت آگے تک چلی جاتی ہے۔ عیسیٰ نگری پہلے ایک کچی آبادی تھی جہاں آج بنیادی سہولتیں میسر ہیں۔ حد بندی اسمبلی میں منتخب ہونے والے دو اقلیتی نمائندے اسی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان تمام عمل کے پیچھے جو تنظیمی اور سماجی کام ہوتا رہا ہے اس کے بارے میں محبوب جان اور عصمت شہبار کے سوالوں پر شریف [illegible] نے تفصیل بیان کی۔

میں ۱۹۶۲ میں عیسیٰ نگری آیا۔ اس وقت کچھ بھی نہیں تھا، ایک میدان تھا جس میں آکر ہم نے ڈیرا ڈالا تھا۔ ہم نے جھگیاں بنائیں، پھر آہستہ آہستہ مٹی کے گھر بنائے۔ اس وقت کسی قسم کی ضروریاتِ زندگی حاصل نہیں تھیں۔ اس وقت جتنی آبادیاں ہیں ان کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ یوں سمجھیے کہ ہم ایک قسم کے جنگل میں آکر آباد ہوئے تھے جہاں چوری، جوئے بازی اور ڈکیتیاں عام تھیں۔ اور ناجائز کاموں کی وجہ سے جن لوگوں کو قتل کر دیا جاتا تھا، انھیں یہاں [illegible] والے قبرستان میں پھینک جاتے تھے۔ یہاں پر آباد ہونے کا مقصد تو یہ تھا کہ یہاں اس وقت کل اسی نوے گھر تھے۔ جو لوگ یہاں آباد ہوئے تھے انھوں نے اپنے رشتے داروں کو کراچی کے دوسرے علاقوں سے اور پنجاب سے بلوایا۔ چونکہ یہاں زمین کے معاملے میں کوئی بندش نہیں تھی بلکہ جس کا جتنا جی چاہا اس نے زمین حاصل کر لی اور اس طرح عیسیٰ نگری آباد ہو گئی۔ یہاں صرف چند لوگ تعلیم یافتہ تھے جن میں ڈاکٹر چیمہ، ڈاکٹر [illegible] اور [illegible] شامل تھے۔ باقی تمام ان پڑھ لوگ تھے جن کا آبائی پیشہ کاشت کاری تھا لیکن یہاں کراچی میں صرف محنت

مزدوری کرنے کے لیے آئے تھے۔

ضروریات زندگی تو کسی نہ کسی طرح پوری ہوتی ہیں جیسی ہمارے زیادہ تر لوگوں کی بیری کی طرف نہ کسی طرح گزر بسر کر رہے ہیں۔ جب ہم یہاں آئے تھے تو ہمیں بہت زیادہ تنگ کیا جاتا تھا، یعنی یہ مسئلوں کی تنگی تھی۔ لوگ ہمیں اس بات کا ڈر دلاتے تھے کہ یہ لوگ واپس آتے ہیں۔ تو اس مشکل کو ہم پہلے حل کرنا چاہتے تھے جو صرف لیڈر کی صورت ہی میں ہو سکتی تھی۔ ہم لوگوں نے سوچا کہ یہ مسئلہ حل ہو جائے تو ضروریات زندگی خود بخود حل ہو جائیں گی۔ اس سلسلے میں ہم نے کافی لوگوں کو یہاں بلایا جن میں لیڈر اور مختلف سیاسی و سماجی جماعتوں کے لوگ شامل تھے لیکن ہمارا کوئی مسئلہ حل نہ ہو سکا۔

ہم نے یہ کام ایک جماعت کی صورت میں کیے تھے جس کے صدر جناب ... تھے۔ اس جماعت کی وجہ سے دوسری برادریوں سے اختلاف بھی پیدا ہوئے۔ اس کے نتیجے میں دوسری جماعت بھی بنی جس کے صدر جناب ... صاحب تھے۔ ان دونوں جماعتوں میں لڑائی جھگڑے بھی ہوئے اور کام بھی چلتا رہا۔ ہم نے اپنی تنظیم کے ذریعے بہت کام کیے جن میں سب سے پہلا کام ہم نے یہ کیا کہ لوگوں کے راشن کارڈ بنوائے۔ یہ سارے کام اس گروپ کی مختلف کمیٹی کے لوگ کیا کرتے تھے اور یہ رجسٹرڈ تنظیم تھی۔ اس تنظیم کے ذریعے تمام لڑائی جھگڑے جو ہوا کرتے تھے حل کیے جاتے تھے اور پولیس کو موقع نہیں ملتا تھا کہ وہ یہاں آ کر مداخلت کرے۔ اس کے علاوہ ہم نے ایک اور تنظیم کی بنیاد رکھی جو طالب علموں کے لیے تھی اور یہ تقریباً ۱۹۶۶ میں قائم کی گئی۔ اس کے علاوہ ہم نے کمیونٹی سنٹر کے ذریعے ڈسپنسری، سلائی سنٹر اور ڈسپنسری کھولی۔ یہ کام ہم نے مسٹر ... کے ساتھ مل کر کیا جن کا تعلق ... سوشل سروسز سے تھا۔ دوسرے لڑکے لڑکیوں کی طرح میں نے بھی سوشل ورک کی ٹریننگ لی۔ اس میں شامل لوگوں سے ہم نے کہا، آپ ملازمت نہ کریں کیونکہ جب بیر ہو گی تو مشکل پیش آئے گی۔ لیکن موسم کے لحاظ سے اور دوسری مشکلات کے پیش نظر کچھ ملازمت رہنے کے قابل نہیں تھے، بارش وغیرہ میں بہت نقصان ہوتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ بھٹو صاحب نے بیرون ملک جانے کا راستہ کھول دیا تو یہاں کے لوگ بیرون ملک جانے لگے اور وہاں سے پیسہ بھیجا جس سے مختلف لوگوں نے اپنے گھر بنائے۔ اس زمانے میں لوگ تعلیم سے زیادہ نا آشنا تھے اور ان کے پاس کوئی ہنر نہیں تھا۔ زیادہ تر لوگ کے ایم سی میں سینیٹری ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ تھے، لیکن آج کل بہت سے نوجوان ڈرائیونگ اور سلائی کے پیشے سے وابستگی اختیار کیے ہوئے ہیں۔

عیسیٰ نگری کی تنظیم کے علاوہ ایک اور تنظیم ہم نے سارے کراچی کے لیے بنائی جو کرسچین ویلفیئر آرگنائزیشن تھی۔ اس میں تیرہ دوسری تنظیمیں شامل تھیں جن کا تعلق سلاٹر ہاؤس، ناظم آباد، لیاقت آباد اور دوسرے علاقوں سے تھا۔ اس وقت کے ایم سی میں لوکل باڈی کے الیکشن ہونے والے تھے لہٰذا ہم نے لوگوں سے کہا کہ ہم لوگوں کو ایک آدمی کھڑا کرنا چاہیے اور جو الیکشن لڑنا چاہتا ہے وہ سامنے آئے۔ لیکن کسی نے ہماری بات نہ مانی۔ صرف جوزف گل تھے۔ اس لیے الیکشن میں کھڑے ہونے کی

خواہش کا اظہار کیا جو ہم نے قبول کر لی۔ بعد جب وہ الیکشن جیت گیا تو اس نے عیسیٰ نگری کی ترقی کے لیے جو سب سے پہلا کام کیا وہ پانی کا تھا۔

باہر سے لوگوں کو بلوا کر کمیونٹی سنٹر میں جلسے کیا کرتے تھے۔ تو ہو سکتا ہے کہ سی ایس ایس والوں سے ہمارے اختلافات ہوئے جس کے نتیجے میں انھوں نے ہمیں تنظیم سے بند کر دی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ہم سیاست میں نہ آئیں۔ لیکن جب تک ہم سیاست میں نہ آتے ہم ترقی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ہمیں سیاسی لوگوں کو ملانا پڑا۔ اس زمانے میں سی ایس ایس والوں کا ایک تعلیم یافتہ ہوشیار ورکر ہوا کرتا تھا جس کے ذریعے تمام کام ہوتے تھے اور اس وقت یہ ڈینیئل جاوید ان کے ساتھ کام کرتا تھا وہ پڑھتا بھی تھا۔ جی ہاں، یہی ایم پی اے ڈینیئل جاوید۔ اس نے ہمارے ساتھ مل کر کام کیا۔ اس وقت ہم ایک رسالہ بھی نکالتے تھے۔ یہ لوگ ... ہم نے اس رسالے کا ایڈیٹر ڈینیئل جاوید مقرر کیا تھا۔ اسسٹنٹ کے طور پر میرا نام آتا تھا۔ رسالے کا سارا کام میرے ہاتھوں سے ہوتا تھا اور اس کی تقسیم وغیرہ ڈینیئل جاوید نے دے رکھی تھی۔ یہ رسالہ تقریباً ڈیڑھ سال تک چلا۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ اس کا سارا ریکارڈ میرے قبضے میں نہیں تھا۔ اس رسالے سے ڈینیئل جاوید کو خوب فائدہ ہوا۔ بعد اس لیے ہو گیا کہ رسالے کے لیے فنڈ نہیں تھا۔ وہ روپیہ کہاں گیا، یہ مجھے نہیں معلوم۔

چھوڑیں جی اس بات کو۔ بتا رہا ہوں کہ اس علاقے کا نام عیسیٰ نگری کیسے رکھا گیا۔ یہاں ہمارے چوہدری غلام مسیح جو اب فوت ہو چکے ہیں۔ ہوا یہ کہ گلی نمبر ۱ میں یہ بخاری کی طرف بلوچ صاحب نے یہاں آ کر تندور اور ہوٹل کھولا جسے ہمارے لوگوں نے پسند نہیں کیا، اس لیے کہ وہ لوگ باہر سے آئے تھے۔ شام کو چوہدری غلام مسیح اور یوسف مسیح چوپال میں بیٹھے تھے جو کہ موجودہ کیتھولک چرچ کی جگہ پر کھلی زمین تھی۔ انھوں نے کہا کہ یہ سلسلہ آگے بڑھے گا اور یہ لوگ تنگ کریں گے، تو وہاں فیصلہ ہو کر جو کوئی ان کے ہوٹل سے خریداری کرے گا اسے ۵۰ روپیہ جرمانہ ہو گا اور ۵۰ جوتے مارے جائیں گے۔ اس فیصلے پر لوگوں نے متفقہ طور پر عمل کیا اور تین چار دن بعد ہوٹل والے یہاں سے چلے گئے تو چوتھے دن ہم شام کو چوہدری غلام کو لے کر آئے۔ وہ بہت خوش ہوئے کہ لوگوں نے ان کے فیصلے پر عمل کیا ہے۔ ان کے منہ سے اچانک نکلا کہ ہم عیسائی ہیں اور یہ عیسیٰ نگری ہے، سو اس دن سے ہم نے اس کا نام عیسیٰ نگری رکھ دیا۔ اس سے پہلے چونکہ ہم لوگ لیاقت بستی سے آئے تھے اس لیے عام طور پر لوگ اسے بھی لیاقت بستی کہنے لگے تھے۔ وہاں سے ہم لوگ اس لیے اٹھ گئے تھے کہ وہ جگہ گورنمنٹ کو پریس کے لیے درکار تھی اور اس وقت مہاجرین کی آبادکاری کا سلسلہ بھی تھا۔ ایوب خان صاحب نے لانڈھی میں مکان بنوائے تھے اور وہیں مہاجرین کو آباد کیا جا رہا تھا۔ ہماری کوشش تھی، اس میں میرے والد دولت مسیح اور حاکم مسیح، اور لوگ بھی شامل تھے، انھوں نے بی ڈی ممبر جو تھے، نام مجھے یاد نہیں، ان کے ذریعے ہمارے بزرگوں کا پولیس سے رابطہ ہوا تو بی ڈی ممبر نے کوشش کی کہ ان لوگوں کا بھی کوئی انتظام ہونا چاہیے۔ تو ان کی کوششوں سے ہمارے لیے بھی لانڈھی میں مکان منظور ہوئے۔ جب بزرگوں نے اس کی

[illegible]

کو قبول کیا۔ پھر ہم نے ووٹ ہم نے شروع کر دیے اور دوسرے علاقوں مثلاً سولجر بازار میں بھی ہمارے سلیم کھوکھر نے الیکشن لڑا اور کامیاب ہوئے۔ آج وہ ایم پی اے ہیں۔ سلیم کھوکھر کی کامیابی سے جو وہ لوگ جو نہیں پڑھتے تھے انھوں نے یہ بھی دیکھا اور علاقے میں ترقیاتی کام ہونے لگے۔ یہاں پانی آیا، گٹر بنے، بجلی آئی، گیس آئی۔ جب گورنمنٹ دیکھتی ہے کہ کسی جگہ ہماری تو اس قسم کی سہولتیں خود بخود آجاتی ہیں اور منتخب نمائندے سے رابطہ بھی ہو جاتا ہے۔

میں تعلیم کی بات بھی کرنا چاہتا ہوں۔ آرگنائزیشن کے پلیٹ فارم سے ہم نے یہاں ایک پرائمری اسکول کھولا جو کہ ہمارے اپنے ہی ایک گھر میں تھا۔ اس وقت ہمارے پاس دریاں بھی نہیں تھیں۔ اس وقت جو ٹیچر رکھا گیا وہ مائیکل جاوید تھا لیکن جب ایک اور تنظیم بن گئی تو انھوں نے ہم پر کیس کر دیے۔ ہم پہ کیس بنے جس کی وجہ سے پڑھائی کا سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک دفعہ ہم سیر و تفریح کے لیے بچوں کو چڑیا گھر بھی لے کر گئے۔ وہاں پر چھ سال کا ایک بچہ گم ہو گیا۔ باوجود کوشش کے وہ ہمیں نہ مل سکا۔ دوسرے دن ایک پٹھان اس کو ہمارے پاس لا کر چھوڑ گیا۔

سکول دوبارہ اس طرح کھلے کہ یہاں صرف ایک ہی مشن تھا، کیتھولک مشن۔ ان کی خواہش تھی کہ ہمیں وہ جگہ مل جائے جس پر اس وقت چرچ آف پاکستان ہے لیکن وہ نہیں مل سکا۔ کیتھولک مشن میں اس وقت دو ہی برادرز ہوا کرتے تھے، انھوں نے یہاں دو پلاٹ لیے۔ پھر دو یہاں مشن ہو گئے۔ اس وقت جو چرچ آف پاکستان تھا وہ میتھوڈسٹ مشن تھا، اس نے یہاں ایک سکول کھولا۔ وہ ایسے کہ پادری واکر اور ان کی جو بیوی تھی وہ تعلیم بالغاں کا سلسلہ شروع کیے ہوئے تھی تو اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے پرائمری اسکول بھی شروع کیا۔ جب یہ ہوا تو میں اس وقت کیتھولک چرچ کمیٹی کا جنرل سیکرٹری تھا۔ اس وقت ہم نے ماسٹر جیکب مل کو رکھا اور مسٹر انتھنی کے والد صاحب تھے۔ انھوں نے سکول کھول لیا۔ یہاں سب سے پہلے دریاں ڈالی گئیں اور سب سے پہلے جو استاد تھے وہ ماسٹر یوسف تھے اور ماسٹر جان تھے، ان کی بیوی تھیں۔ اس طرح ان اسکولوں نے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر پادری واکر سے میتھوڈسٹ والوں سے اختلاف ہو گئے تو انھوں نے نیا چرچ بنا لیا اور اس کو جوبلی چرچ کا نام دیا۔ اس میں سکول بھی تھا۔ اس طرح میتھوڈسٹ والوں نے سکول کھول لیا اور ان کے سکول کا ایک آدمی تھا اس نے ان کا اسکول چھوڑ کر اپنا اسکول کھول لیا۔ اس طرح یہ سلسلہ چل نکلا۔ اب میں عوامی چرچ میں اپنا سکول چلا رہا ہوں۔ وہاں چپڑاسی سے لے کر منیجر تک سارے کام کرتا ہوں۔

میں یہ بھی آپ سے سوال کرتا ہوں کہ خدا نے مجھے خاص طور پر عیسیٰ نگری کی خدمت کے لیے پیدا کیا ہے۔ میں کسی اور جگہ بھی جا سکتا تھا، تو یہاں پر ایک عجیب بات ہے کہ میں بزرگوں کی تنظیم کا بھی جنرل سیکرٹری رہا ہوں، نوجوانوں کی تنظیم کا بھی، لڑکیوں اور خواتین کی تنظیم کا بھی جنرل سیکرٹری رہا ہوں۔ ہر قسم کی تنظیم میں نے بنائی ہے۔ اس وقت کے نوجوانوں کے ذہن میں تفرقات تھے۔ اس وجہ سے بھی کہ انھیں پانی دور دراز علاقوں سے لانا پڑتا تھا۔ لیکن آج کا نوجوان پڑھ کر سوچ کر اپنا مسئلہ

Scanned with CamScanner

نہیں کرتے کہ موٹر سے پانی کھینچ لیا جائے۔ وہ سہل پسند ہو گئے ہیں۔ میں اس کو یوں دیکھتا ہوں کہ وہ سوچتے ہیں ہمارے بزرگوں نے بہت کچھ کر دیا ہے۔ ان سے گیپ پیدا ہو گیا ہے۔ اس میں ہماری غلطی ہے۔ ہم نے یہ کیا کہ جب ہمارے کونسلر بن گئے، ایم پی اے بن گیا، تو ہم یہ سمجھنے لگ گئے کہ ہمارے تمام مسائل حل ہو گئے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ یہاں کی تنظیم بااثر ہوتی۔ جب تک ایک مضبوط تنظیم نہ ہو کوئی ہمارے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ ایم پی اے ہمارے لیے آواز اٹھا سکتا ہے، پیسے لے سکتا ہے، گٹر لائن لے سکتا ہے، لیکن وہ اس کو سنبھال نہیں سکتا۔ اس کو صرف علاقے کی تنظیم سنبھال سکتی ہے۔

آج کل کے نوجوانوں میں سب سے بڑی برائی تو یہ ہے کہ جو لوگ کے ایم سی میں ملازم تھے وہ یا تو ریٹائر ہو گئے یا باہر چلے گئے۔ جو ملازمت فیل ہوتی اس پر اپنے بچوں کو لگا دیا ہے۔ ان کو تنخواہ تو ملتی ہے، چاہے وہ کام کریں یا نہ کریں۔ تو جب کوئی فارغ ہو گا تو اس کا ذہن خالی رہے گا۔ کہتے ہیں خالی ذہن شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ ان کے پاس جو پیسے ہوتے تھے تو انھوں نے ڈرگ کا استعمال شروع کر دیا۔ ان کی دیکھا دیکھی اوروں نے بھی یہ کام شروع کر دیا۔ پچھلے چار پانچ سال میں ڈرگ کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں شعر بھی لکھے ہیں۔ ایک شعر آپ کو سناتا ہوں۔ میں پنجابی میں بھی شاعری کرتا ہوں اور اردو میں بھی۔ شریف مسیح نام ہے اور سوز مسیح تخلص ہے۔

> انسانی زندگی کے لیے بنیادی سہولیات آج بھی عیسیٰ نگری میں محدود ہیں۔ اور یہ محدود سہولتیں بھی بڑی کوشش اور جدوجہد کے بعد حاصل ہوئی ہیں۔ ان سہولتوں کے حصول اور علاقے کی ترقی کے بارے میں لیاقت مسور نے، جو سیاسی اور سماجی کاموں میں فعال رہے ہیں، انٹرویو کے دوران بعض تفصیلات بتائیں۔

شروع میں عیسیٰ نگری میں جھونپڑیاں تھیں، اس کے بعد لوگوں میں خود شعور پیدا ہوا اور اس شعور سے یہ ہوا کہ لوگوں نے محسوس کیا یہاں مکان ہونے چاہییں، جو جھونپڑیاں اچھی نہیں ہیں، مضبوط نہیں ہیں۔ لوگوں نے کچے مکان مٹی کے گارے سے بنائے۔ یہ لوگوں کی اپنی ایک سوچ تھی۔ چودھری سسٹم یہاں پر رائج تھا اور چودھریوں کی پنچایت ہوتی تھی، وہی فیصلہ کرتے تھے۔ لوگوں نے پانی کے بارے میں بھی سن ۶۰ کے بعد محسوس کیا۔

جہاں تک آپ کا سوال ہے کہ یہ شعور کیسے آیا، تو بات یہ ہے کہ جب لوگ مل کر بیٹھتے ہیں، گفتگو کرتے ہیں، باتیں نکلتی ہیں تو سوچ پیدا ہوتی ہے اور شعور آتا ہے۔ ہم لوگ تو نہیں، ہمارے بزرگ جو ہیں ہم ہیں، بیٹھتے تھے۔ آپس کی باتوں کا فیصلہ تو اسی کے بارے میں پنچایت میں ہو جاتا تھا۔ جب ایک جگہ لوگ بیٹھتے ہیں، تو ایک دوسرے کا خیال ہوتا ہے۔ ہمارے لوگ باہر زیادہ کام کرتے تھے، چاہے کسی کسی کا

نہیں تھا۔ نوجوان لوگ جس طرح ہوتے ہیں، مجھے معلوم نہیں وہ کیسے ہیں کہ محلے گلیوں میں ہیں یہاں سے بیٹے نہیں بھی کچھ۔ کچھ کرنا چاہیے اور حل کرنا چاہیے۔ تو سوسائٹی نوجوان دور ہیں رہے ہیں۔ مسئلوں کی بھی رہی ہیں اور یہ کلفٹن، ڈیفنس کی طرف رہتے ہیں۔ لوگوں کا لگاؤ ہوتے ہیں دور ہیں، ہم خود موجود رہا ہے۔ تو اس وجہ سے جب یہ لوگ بھی بیٹھتے تھے تو وہ گروہ کی کہانیوں کے بعد، یا کہانیوں سے پہلے، یہ بیٹے مسائل بھی ڈسکس کرتے تھے اور مسائل کے حل کے لیے بھی گفتگو کرتے تھے۔ اس زمانے میں جو مسائل تھے، ان میں تین مسائل اہم تھے۔ پانی نہیں تھا، گٹر لائن نہیں تھی اور بجلی نہیں تھی۔ اس وقت پانی کا مسئلہ حل تو نہیں ہوا لیکن دور سے پانی لاتے تھے۔ مستقل بنیادوں پر یہ مسئلہ حل نہیں ہوا۔ ایک حل تھا جس پر پوری عیسیٰ نگری گزارا کر رہی تھی۔ خیر آبادی بھی کم تھی۔ پانی کی لائنوں سے گزارا ہو رہا تھا۔ پائپ لائن گزر رہی تھی، لوگوں کو ضرورت تھی اور ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ لوگوں نے پائپ لائن توڑی اور وہاں سے حل لیا، پورے علاقے کے لوگوں کو پانی ملتا تھا۔ اس کے بعد لوگوں نے سیوریج لائن کا مسئلہ حل کیا۔ لوگوں نے گھروں کے سامنے گٹر کھدوائے اور سارا فضلہ، پانی وغیرہ اس میں گرتا تھا۔ سال چھ مہینے بعد اس کو ختم کر دیتے تھے یا خالی کروا دیتے تھے۔ شارٹ ٹرم میں کام کروا لیتے تھے۔

اس کے بعد میں دوسرے دور کی بات کروں گا۔ سن ۸۰ کے بعد لوگوں نے محسوس کیا کہ وہاں بجلی نہیں اور یہ گٹروں کا سسٹم اچھا نہیں ہے، یہ بھر جاتا ہے اور مستقل نہیں ہے۔ سیوریج لائن ڈالی گئی اور لوگوں نے اپنے طور پر پانی کی لائن ڈلوائی۔ اس سلسلے میں جو لوگ سیاسی طور پر کام کر رہے تھے ان کا کیا کنٹری بیوشن تھا تو میرے خیال میں صحیح سیاست شروع ہوئی ہے ۱۹۸۵ کے بعد۔ اس سے پہلے سیاست ہوتی رہی ہے، سیاسی شخصیات ہوتی رہی ہیں، ۸۵ سے اس لیے شروع ہوئی ہے کہ ہمیں جداگانہ انتخاب ملے۔ جب جداگانہ انتخاب ملتے ہیں تو ظاہر ہے اب آپ اور ہم بھی سیاست پر بات کر رہے ہیں اور جداگانہ انتخاب نہیں ہوتے تو ہمیں بھی کسی مسلمان ایم پی اے، یا ایم این اے یا کونسلر کے پاس جانا پڑتا۔ اور ہاتھ جوڑ کر بیٹھنا پڑتا۔ آج کم از کم یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے ایم پی اے، ایم این اے کے پاس بیٹھتے ہیں، ان کو بات بھی سنا سکتے ہیں اور سن بھی سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ میں جداگانہ کی حمایت اس لیے کر رہا ہوں۔ اس وقت سیاسی شخصیت اسلم مارٹن تھے اور مقصود ڈار۔ میرے نزدیک ان کی کوئی خدمات ایسی نہیں ہیں جو لوگوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی ہوں۔

سیاست کی وجہ سے یا سماجی سرگرمیوں کی وجہ سے لوگوں کی زندگی میں تبدیلی آئی تو سماجی سرگرمیوں سے چینج آئی۔ شروع میں ہم نے ایک سماجی تنظیم بنائی تھی جس کا میں فاؤنڈنگ ممبر ہوں۔ اس کا نام تھا، انجمن مسیحی نوجوانان کراچی۔ انجمن نے یہاں کی نوجوان نسل کو شعور دیا ہے۔ ہر کام میں، یعنی سیاست میں، کھیل میں، ادب وغیرہ میں۔ انجمن نے یہ کیا، سیاسی طور پر انجمن نے یہ کام کیا کہ بلدیاتی الیکشن تو شروع ہو چکے تھے ۸۰ کے بعد، تو پہلے دوسرے علاقوں کے کونسلر ہوا کرتے تھے تو ۱۹۸۷ میں انجمن کے پلیٹ فارم سے ہم نے سلیم کھوکھر کو نامزد کیا، سلیم کھوکھر جیتے۔ اس کے بعد

دونوں کی زندگی میں تو نہیں، عیسیٰ نگری کی زندگی میں یہ تبدیلی آئی کہ عیسیٰ نگری کو پیر جی سلیم کھوکھر کے آنے کے بعد اور پانی، گلی، یہ وہ حاصل ہوئے۔ تو سیاسی سرگرمی سے ترقیاتی کام ہوئے۔

۷۰ سے ۸۰ تک عیسیٰ نگری کا ایک دور ہے۔ اس دور میں یوتھ کے حوالے سے کچھ ایکٹیوٹیز تھیں۔ اس زمانے میں یوتھ ڈرامے کرتی تھی، زیادہ مذہبی تھے لیکن سوشل کم ہوا کرتے تھے۔ پانچ سال تک ایک ہو گیا۔ مذہبی ڈراموں میں بھی سماجی پہلو سے کچھ نہ کچھ پیغام مل جایا کرتا تھا۔ اس دور میں اسلم مارٹن، یعقوب اور مقصود ڈار ڈراموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ یہ ایکٹیوٹی سال میں ایک دو بار ہوا کرتی تھی مذہبی تہوار کے وقت۔ عام دنوں میں نوجوان یہ کیا کرتے تھے کہ چھٹیوں کے دن ٹیوشن دیا کرتے تھے۔ کمیونٹی بیسڈ، فری تعلیم کلاسیں سے یہ کرتے، کمیونٹی سنٹر جو گلی نمبر ۲ میں ہے اور جس پر اب ایک بااثر شخص کا ناجائز قبضہ ہے، وہ عیسیٰ نگری کے نوجوانوں کے پاس تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوتی تھیں تو مجھے یاد ہے کہ یہاں کے جو پڑھے لکھے لڑکے تھے، وہ چھوٹے لڑکوں کو، مطلب یہ کہ ساتویں آٹھویں سے لے کر مڈل، پرائمری سے لے کر دسویں تک، ان کو وہاں چھٹیوں میں پڑھاتے تھے۔ ایک ہفتہ کلب بھی تھا اسی کمیونٹی سنٹر میں جس پر ناجائز قبضہ ہے۔

میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ سیاست کی وجہ سے تمام ترقی ہوئی ہے۔ سوال جو ہے، لوگوں کا شعور بھی بیدار تھی۔ سیاست میں آنے کے بعد یہ ہوا ہے کہ تیزی آئی ہے کاموں میں۔ مطلب یہ کہ کام پہلے بھی ہو رہے تھے۔ پانی تو پہلے بھی آ گیا تھا، وہ گلیوں میں تھا، سلیم کھوکھر کے جیتنے کے بعد گھروں میں بھی آ گیا۔ مطلب یہ کہ شروع سے ہی ترقی کا عمل جاری رہا ہے اور بعد میں آنے والے لوگوں نے اسے آگے بڑھایا ہے۔

اس دور میں خواتین کا کیا کردار رہا ہے، یہ مشکل سوال ہے۔ خواتین کے لیے کسی نے باقاعدہ کوشش نہیں کی۔ ہو سکتا ہے اس سلسلے میں کوئی کوشش کی ہے۔ ہیلتھ سنٹر بنا تو اس کے بعد سے یہ رابطہ قائم ہوا۔ جب سنٹر تھا تو خواتین نام بھی دیتی تھیں، میٹنگ میں بھی آتی تھیں۔ آج بلا کر تو دیکھیں۔ دس کو بلائیں گے تو دو آئیں گی۔ ہمارا معاشرہ خواتین کو اجازت نہیں دیتا۔ وہ ایسی مشکلات بتائیں گی کہ میرا بچہ بیمار تھا، خاوند نے اجازت نہیں دی۔ خواتین کام تو کرنا چاہتی ہیں۔ ۷۰ میں لڑکیاں یوتھ میں شامل تھیں، ۸۰ میں آ کر یہ کٹ گئی ہیں۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے لیکن ۷۰ میں لڑکیاں سوشل کاموں میں شامل رہی ہیں۔ اب خواتین موجود ہیں، کام بھی کرنا چاہتی ہیں، آنا چاہتی ہیں، لیکن ان کا پلیٹ فارم نہیں ہے۔ اب ایک تنظیم بنائی ہے جس کا میں صدر ہوں، اس میں خواتین ممبر بھی ہیں جو ہمارے ساتھ کام کریں گی۔ ہماری تنظیم ہیلتھ اور ایجوکیشن کے لیے، منشیات کے خلاف کام کر رہی ہے اور انسانی حقوق کے لیے کام کر رہی ہے۔

جیسے جیسے عیسیٰ نگری میں ترقی ہوئی ہے، شہر بھی ایسی ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا ہے۔ پہلے کبھی محسوس ہوتا تھا کہ کبھی بستی، رشتے کے حوالے سے یا پیشے کے حوالے سے کوئی تعصب

طرح کام کر رہے ہیں۔ عام سطح پر، محلوں کی سطح پر تعصب رہا ہے، لیکن اب کم ہو گیا ہے۔ اس وقت شاید ایجوکیشن کم تھی اور پیشے کے حوالے سے لوگ تنگ کیا کرتے تھے۔ ہمارے بزرگوں سے جو میونسپل کارپوریشن میں ملازم تھے، انھوں نے کوشش کی کہ اپنے بچوں کو تعلیم دلوائیں۔ جو تعلیم نہیں حاصل کر سکے انھوں نے کوشش کی کوئی ڈرائیور بن گیا، کوئی مکینک بن گیا، کسی نے سبزی کا ٹھیلا لگایا، اس طرح پیشہ بدلنے کی کوشش کی۔ اب اس طرح کے [illegible] وغیرہ کم ہیں۔ اب جو ہے ڈائریکٹ تعصب آ گیا ہے کہ آپ نوکری کر رہے ہیں اور [illegible] کوئی رہیں ہے وہ لوگ اس سے جتنے نکلے ہیں تو یہ ترقی ہیں [illegible] ہے تو [illegible]۔ پچھلے دنوں [illegible] جاوید کے ساتھ [illegible] کہ اس سے کچھ [illegible] کے لیے [illegible] سے سویپر کے بجائے [illegible] کی [illegible] میں [illegible] تک [illegible] کی۔ [illegible] جاوید کچھ [illegible]، لیکن وہ [illegible] سے [illegible] ہیں، [illegible] کامیاب ہوئے ہیں تو سب [illegible] کر [illegible] سے [illegible] ایسی حرکت [illegible] سکتے ہیں۔ [illegible] لوگوں کی ایسی سوچ ہے تو [illegible] کے ساتھ [illegible] کچھ نہیں رکھتے۔ اس تعصب سے [illegible] ہمیں تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ ہمارے [illegible] سے تو [illegible] کچھ رکھتے ہیں۔ اس کام سے نکل سکتے ہیں۔ جب تعلیم آئی ہے تو شعور آتا ہے شعور آتا ہے تو پھر [illegible] ترقی کی سوچتا ہے اور جب ترقی کی سوچتا ہے تو [illegible] کی سوچتا ہے، علاقے کے حالات بدلتا ہے، ملک [illegible] بدلتا ہے۔

ترقی حاصل کرنے کے [illegible] علاقے میں [illegible] سال [illegible] ہیں۔ ۶۳ سے ۹۵ تک [illegible] لیا۔ آج ہمارے پاس سب کچھ ہے، [illegible] ہے، [illegible] ہے، پانی ہے [illegible] کی ہیں کمی [illegible] ہے اور اس پر [illegible] کی ہے [illegible] کی ہے [illegible] بچے جو [illegible] سے [illegible] میں [illegible] علاقے کے لوگ [illegible] کی کمی [illegible] شدت سے محسوس [illegible]۔ اب [illegible] پلیٹ فارم ہے۔ دو [illegible] ہیں، دو [illegible] کی [illegible] پارٹی ہے، [illegible] کچھ بچے لوگ ہیں جو [illegible] کے پاس چلے جاتے ہیں، کسی [illegible] کے پاس چلے جاتے ہیں۔ [illegible] ہماری [illegible] کام کر رہی ہے، ایک پلیٹ فارم [illegible] ہمارے پاس [illegible] کوشش کر رہے ہیں [illegible] کو پیشے کی طرف، جو پہلے [illegible] کے شعور [illegible] ترقی تک پہنچ، [illegible] کوشش کر رہے ہیں پہلے لوگوں کو [illegible] ہیں [illegible] ذریعہ [illegible] ہیں۔

[illegible] کے لیے [illegible] پارٹی بن سکی اور جہاں طاقت آتی ہے وہاں پارٹیشن ہوتی ہے۔ آپ دیکھیں [illegible] کی مثال ہے۔ جب حقیقی والوں کے ساتھ طاقت آئی، انھیں [illegible] کی طاقت ملی تو وہ علیحدہ ہو گئے [illegible] کے ساتھ [illegible] کو [illegible] سے یہاں تک [illegible]۔ [illegible] کے پاس جب طاقت آئی تو [illegible] کو [illegible]۔ [illegible] سے دیکھ [illegible] میں [illegible] مستقل تو [illegible] کی علیحدہ [illegible] ہے۔ [illegible] طاقت کے [illegible] ہوا کہ وہ [illegible] آ گئیں [illegible]

سوشوں سے دو پارٹیاں بن گئیں۔

[illegible] کے علاوہ اور بھی مسائل [illegible] ہیں۔ [illegible] کا ایک [illegible] [illegible] [illegible] بھی [illegible] ہیں۔ [illegible] سے خاصی [illegible] [illegible] [illegible] بھی [illegible] ہیں۔ ان میں چوری اور ٹھگی دینے والے بھی ہیں۔ [illegible] ان کی چوری کی جاتی ہیں۔ [illegible] کے خلاف [illegible] [illegible] ہیں [illegible] ہیں اور دوسرے [illegible] سے بھی [illegible] [illegible] ایک [illegible] [illegible] [illegible] وغیرہ [illegible] نہیں سمجھیں گے۔

[illegible] ہیں۔ [illegible] [illegible] ہیں، [illegible] کے حقوق [illegible] [illegible] [illegible] کا [illegible] ہے۔ [illegible] [illegible] [illegible] کو [illegible] [illegible] بات [illegible] آپ [illegible] دیا تھا، آپ [illegible] [illegible] لیڈر شپ [illegible] [illegible] ہوئے ہیں۔

> [illegible] سماجی عمل [illegible] [illegible] تبدیلیاں [illegible] سماجی عمل کا [illegible] [illegible] سماجی عمل اور [illegible] [illegible] ہے۔

[illegible] سماجی [illegible] ہیں [illegible] کا [illegible]

میں کچھ تعلق ہے۔ عیسیٰ نگری کا ماحول یہ تھا کہ جو لوگ یہاں آ کر بسے وہ پنجاب کا پس ماندہ طبقہ تھا۔ وہاں کے جاگیرداروں کا ستایا ہوا اور کچلا ہوا طبقہ تھا۔ جیسے ہم ذہنی پسماندگی کہہ سکتے ہیں، وہ پسے ہوئے تھے، ان کا جو اثر تھا وہ ساتھ لے کر آئے تھے۔ وہ خود جاگیردار تو نہیں تھے، لیکن ان کا جو ذہن تھا اس پر جاگیرداری کا اثر تھا اور یہ جو بگڑا ہوا رجحان تھا اس کی وجہ سے شروع میں یہاں کافی رکاوٹیں پیش آئیں۔ لوگ آپس میں بٹے ہوئے تھے، ایک دوسرے کی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ورنہ باہمی اعتماد جو ہونا چاہیے اس کا فقدان تھا۔

ایسے کام بھی تھے جو اس علاقے کے مفاد میں تھے لیکن اس چوہدری سسٹم اور چوہدراہٹ کی وجہ سے ختم ہو گئے۔ یہاں پر ایک فادر جان ڈیبروز ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے بڑی بھی کوشش کی کہ بیرونی مدد سے اس علاقے کی اپ لفٹ ہو جائے۔ وہ ہاؤسنگ کا ایک پروجیکٹ بھی لائے تھے یہاں پر۔ اور یہ جو کمیونٹی سنٹر ہے جس پر آج کل ایک ایم پی اے صاحب کا قبضہ ہے، اس کو سٹور بنا دیا گیا۔ وہ ہم نے اپلائی کیا کہ سارا جو ہاؤسنگ میٹیریل ہو گا وہاں پر جمع کیا جائے گا اور وہ کمیونٹی کے استعمال میں آئے گا۔ لیکن ایسا ہوا کہ یہاں پر چوہدراہٹ سسٹم جو تھا اس نے اس کو فیل کر دیا۔ کیونکہ لوگوں نے کہا کہ عیسیٰ نگری میں فلیٹ بن رہے ہیں اور ہم کو وہاں رہنا پڑے گا تو ہم بکریاں کہاں باندھیں گے۔ کسی نے ان کو یوں سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم صفائی کریں گے تو کچرا اٹھانے والے کہاں سے آئیں گے۔ کسی نے کہا ہم بھینسیں کہاں باندھیں گے۔ تو یہ وہ چیزیں تھیں جو لوگوں نے کہیں۔ اس کے پیچھے محرکات یہی تھے کہ لوگوں کی ذہنی پسماندگی بہت تھی۔ یہ لوگ تعلیمی لحاظ سے پسماندہ تھے، معاشی لحاظ سے پسماندہ تھے، سماجی لحاظ سے پسماندہ تھے جس کی وجہ سے وہ اس پروجیکٹ کو سمجھ نہیں سکے اور سارا وہ پروجیکٹ چوہدراہٹ کی نذر ہو گیا۔

یہ چیزیں ہمارے مشاہدے میں آئیں۔ اس وقت ہم لوگ چھوٹے تھے اور جو لوگ ہم سے بڑے تھے یا تھوڑے بہت پڑھے ہوئے دوست تھے وہ بھی یہ دیکھتے تھے کہ پسماندگی اور بگڑے ہوئے ذہن کا آپس میں ایسا سٹرکچر تھا کہ اس کو توڑنا بہت مشکل نظر آتا تھا اور جو یہ تھوڑے بہت سمجھدار دوست تھے ایسا ڈسٹریشن ذہنوں میں لگاتے تھے، وہ بھی [illegible] آگیا، یہ قول جیسے ادارے کام کرتے تھے اور یہاں تک ان کی یکسوئی ہو گئی تھی۔ تو اس سوچ کو توڑنے میں بڑی مشکل تھی۔ لیکن میں نے محسوس کیا ہے اس سارے عمل میں کچھ تو پلاننگ ہوتی ہے اور قدرتی فیکٹرز بھی ہوتے ہیں۔ تو جیسا کہ ۸۵ء میں یہاں ایک واقعہ ہوا کہ کچھ ہمارے مسیحی طلبہ ذمہ دار لوگ اور کچھ ہمارے پڑوس میں جو مسلمان تھے ان میں سے طلبہ ذمہ دار لوگوں میں لڑائی ہوئی اور تین مسیحی نوجوان شہید ہوئے تو اس وقت عوامی تحریک ذہن میں بنی۔ اس وقت جو عیسیٰ نگری کی قیادت تھی وہ چوہدراہٹ سسٹم کے پاس تھی اور وہ اس واقعے کا سامنا کرنے میں ناکام رہی۔ انہوں نے کہیں پر مفاہمت کر لی جس کا لوگوں میں ردعمل پیدا ہوا۔ یہ واقعہ ہماری تاریخ میں جس نے اس سسٹم پر ضرب لگانے میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ اور یہی واقعہ تھا جس کی

[illegible] کہ نہیں ہی آگے تک پڑھنے کا [illegible] کہ نہیں [illegible] ہوئے حالات میں کچھ [illegible] پڑھنے کا۔ ہمارے چودھری جو تھے ان کا بس بھی تھا کہ بچے کو پڑھوا دیا جاتا ہے، پیسے دیے، چھوڑ دیا، یا کوئی [illegible] کی یا تو غلط طریقے سے۔ تو یہ ساری چیزیں لوگوں میں [illegible] لیکن لوگ اس قابل نہیں تھے کہ اس کو [illegible] یہ اجتماعی مسئلہ بن گیا اور اس کے بعد چل سو چل ہوا۔

اس کے بعد [illegible] اس وقت، انھوں نے بہت سارے instances [illegible] تو آپ نہیں کہہ سکتے لیکن کچھ بھی سماجی برائیاں [illegible] مثلاً جب [illegible] صاحب کا دور آیا تو شہر میں [illegible] تو انھوں نے slum [illegible] کام کیا [illegible] طور پر کام کیا۔ [illegible] انھوں نے مختلف طور پر ایسے کام کیے کہ لوگوں کا شعور بھی [illegible] آگے چل کر انھوں نے [illegible] مستقل [illegible] تیار کیا۔

[illegible] سیاسی شعور کے حوالے سے بات کی، لیکن [illegible] سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ سیاسی حقوق کی بھی بات کی [illegible] جدوجہد کی۔ میں وہ طلباء والی بات آپ کو بتا [illegible] جدوجہد تھی [illegible] مقاصد بھی تھے [illegible] مقاصد [illegible] کامیاب بھی [illegible] ترقی ہوئی ہے [illegible] بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ [illegible] لیکن مجموعی طور پر [illegible] کے مقابلے میں بہتر کام کیا ہے۔

[illegible] کی بات کی ہے، ان کا گراف بہت اچھا تھا۔ اس نے [illegible] جدوجہد کا۔ آپ [illegible] میری بات کر [illegible] ایک مشترکہ جدوجہد تھی۔ جو کچھ [illegible] تعلیم کا [illegible] بہت [illegible] گیا ہے، لیکن وہ جو چیز تھی،

میں ۷۷، ۷۸ کی بات کر رہا ہوں، اس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے لوگوں نے محسوس کیا ہو کہ وہ ایم پی اے کے آنے سے ہماری جدوجہد رک گئی ہے۔ اب لوگوں کی ریت اس طرح کی جا رہی ہے کہ ان میں جدوجہد پیدا نہ ہو۔ لوگ ان ہی کی طرف دیکھتے ہیں اور وہ بھی لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ طاقت ہم میں ہی ہے۔ لوگوں کو جب آپ یہ جا کر کہہ دیں گے کہ آپ کا کام میں کر دیتا ہوں تو آپ تو گھر جا کر سو جائیں گے۔ تو آپ تو یہ سمجھیں گے کہ ایم پی اے ہے ہمارے پاس۔ ہمارا کوئی اور کام نہیں رہا۔ نوجوان طبقہ ایک طرح سے یرغمال ہو کر رہ گیا ہے کہ ہمارے دکھوں کا مداوا ہمارے لیڈر ہی ہیں۔ جب تک یہ لیڈرشپ ہے ہمارے لیے بھی بہت مشکل ہے۔ لوگ مفادات کی توقع رکھتے ہیں۔ اب نوجوان بھی کام کرنے کے بجائے یہ سوچ کر آتے ہیں کہ جس طرح ان کو فائدے ہوئے ہیں اور پیسہ کمایا ہے، وہ بھی اس طرح کریں، تو اس کام میں بھی ایم پی اے کی وجہ سے ایک چمک دمک آ گئی ہے۔ میں نہیں کہتا کہ ہمارے لیڈرز نے کوئی انوکھا کام کیا ہے۔ جو کچھ پاکستان میں ہو رہا ہے، عیسیٰ نگری بھی اسی سسٹم کا حصہ ہے، چھوٹا سا حصہ۔ ہم جس طرف جا رہے ہیں تو لوگوں کی محرومیاں کسی منطقی نتیجے پر پہنچیں گی۔

> علاقے کی دوسری عورتوں کی طرح نسرین سٹیفن کی زندگی بھی ایک مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے، ایسی جدوجہد جس کا محور اس کا گھر اور بچے ہیں۔ عیسیٰ نگری کی گلی نمبر ۶ میں برات گھر کے سامنے ایک چھوٹی سی دکان ہے جہاں روزمرہ کی ضروریات کا عام سامان ملتا ہے۔ یہ دکان نسرین چلاتی ہے۔ اس دکان کے اوپر اس کا گھر ہے۔ گھر اور کام کی اس جدوجہد کے بارے میں نسرین اسٹیفن نے تفصیلات بتائیں۔

علاقے میں سی ایچ ڈبلیو (کمیونٹی ہیلتھ ورکر) کا کام شروع ہوا تو سنٹر میں میری بڑی بہن جوزفین صدیق سے چائے وغیرہ بنا کر دینے کا کام لیا۔ ٹریننگ شروع ہوئی تو وہ بھی ساری باتیں سنتی تھی۔ اس نے ڈاکٹر صاحب سے کہا یہ کام میں بھی کر سکتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کا امتحان لیا اور وہ سی ایچ ڈبلیو بن گئی۔ وہ مجھے بھی اس کام میں لے آئی۔

اسٹیفن اور میں ۱۹۷۶ میں کراچی آئے۔ ہم نے عیسیٰ نگری میں رہنا شروع کیا۔ اسٹیفن چھوٹی موٹی مزدوری کرتا تھا۔ ہمارے پاس کوئی رقم نہیں تھی کہ اپنا کام شروع کریں۔ وہ پھل سبزیاں بیچتا تھا یہاں سبزی منڈی سے لے کر۔ لیکن ٹھیلا لگانا بھی اتنا آسان نہیں تھا جتنا ہم سمجھتے تھے۔ اسٹیفن کے پاس اپنا ٹھیلا نہیں تھا۔ اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ ٹھیلا خرید لے۔ ٹھیلا اچھا خاصا مہنگا آتا ہے۔ ٹھیلا کرائے پر بھی مل جاتا ہے لیکن اس کے لیے ضمانت ضروری ہوتی ہے۔ ٹھیلے کا مالک ضمانت کے بغیر

Scanned with CamScanner

فیصلہ نہیں دیتا، اس لیے کہ کوئی ان کا فیصلہ لے کر واپس آئے تو وہ کیا کرے گا؟ منشیوں میں سے بھی پنجاب سے آیا تھا، ان کا انصاف کیوں ہوتا؟ کسی دن وہ فیصلہ پھر بھی لاتا تھا۔ لیکن پورا نہیں پڑتا تھا۔

یہاں ساری عورتیں کام کرتی ہیں۔ جو باہر نہیں جاتیں وہ بھی کچھ نہ کچھ کام ضرور کرتی ہیں۔ میرے شوہر نے باہر کام کرنے کی اجازت نہیں دی اس لیے میں نے دکان کے بارے میں سوچا۔ گاؤں میں میری ماں نے گھر میں چھوٹی سی دکان کھولی ہوئی تھی۔ مجھ کو نے سمجھ تب لکڑی کے تختے لگا کر چھوٹی چھوٹی چیزیں رکھ دیں۔ یہ میری دکان بن گئی۔ ہمارے بچے بڑے ہو کر بڑی بیٹی لگی تو ہمیں آمدنی ہونے لگی۔ گھر کے ساتھ ساتھ دکان چلانا بڑا مشکل تھا۔ گھر کا کام بھی کرتی تھی، دکان بھی دیکھتی تھی۔ ایک دفعہ میرا چھوٹا بچہ تیل کے کنستر میں گر گیا۔ بڑی مشکلیں تنگی میں ہیں ہے۔ پندرہ سال ہو گئے ہیں دکان چلاتے ہوئے۔ اب انہیں کوئی نوکری اور کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ دکان پر بیٹھتی ہے۔

میں پانچ سال ہو گئے میں نے ہی پیچ ڈیزائن کا کام کیا۔ درزی کا کام بھی میں نے سیکھا ہے۔ لیکن زیادہ کیس نہیں کراتی۔

دکان پر بیٹھ کر میں نے دیکھا کہ عورتیں کتنی مجبور ہیں اور کسی مشکل سے گھر چلاتی ہیں۔ دکان والوں سے ادھار چلتا رہتا ہے۔ سب پیسے نہیں ہوتے تو سارے مہینے کا سودا شروع میں منگا کر رکھ لیں، اور مہینے کی آخری تاریخوں میں ادھار زیادہ چلتا ہے۔ یہاں کے دکان دار سودا منگاتے ہیں ان سے بچے پیسے ہیں میں نے زیادہ گھروں کا سودا دیا ان کے سال مہینے بعد میں گھی، چاول، آٹا، چینی، مٹی کا تیل صابن وغیرہ کا حساب کرتی ہے۔ پھر حساب لگا کر اگر میں جو مال سیٹھ سے تھوک بھاؤ پر چیزیں لا کر دوں تو ان کی بچت ہوتی ہے کیوں کہ ان کو بازار سے کچھ کم ریٹ پر چیزیں مل جاتی ہیں اور یہ لوگ مہینے کے شروع میں پیسے دے دیتے ہیں۔ اس طرح ہم بہت بچت شروع کر سکتے ہیں۔ منشی والوں نے میری مدد کی، بینک سے قرض دلوایا اور خود بھی قرضے کا انتظام کیا۔ سسٹم میں کام ختم ہو گیا اور بچت سکیم بھی چل نہیں سکی۔ میں نے بینک کا قرضہ اتار دیا ہے۔ بچوں کو تعلیم دلوا رہی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میری بیٹی ... تک کی تعلیم مکمل کرے۔

عیسیٰ نگری کے سماجی عمل اور سماجی ماحول کو ان کمیونٹی کی خود شناسی کی داستان بھی کہا جا سکتا ہے۔ گفتگو کے دوران یہ سوال بھی بنیادی طور پر شناخت کے ان کے لیے کیا ہوتا ہے جب کمیونٹی کو یہ پتا چلتا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں سے مختلف ہیں، یا ان میں اور دوسروں میں کوئی فرق ہے۔ یہ فرق اور ان کا احساس عیسیٰ نگری کے لوگوں میں مختلف طور پر ظاہر ہوتا ہے اور وہ اس کے بارے میں کئی حوالوں سے گفتگو کرتے ہیں۔ ایسی شناخت اور فرق

کے بارے میں بھی انتھونی سے تفصیل کے ساتھ بات کی۔

جب ہم کراچی میں شروع شروع میں اسکول جایا کرتے تھے تب بھی اس قسم کی بات ہوتی تھی اور کئی واقعات دیکھنے میں آتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ لوگ ہوٹل میں بیٹھتے تھے اور کسی کو پتا چل جاتا تھا کہ یہ سیسی نگری کے ہیں یا کرسچن ہیں تو اس وقت لوگوں کا رویہ ہمارے ساتھ تبدیل ہو جایا کرتا تھا۔ بعض دفعہ وہ منع کر دیا کرتے تھے کہ بھئی آپ لوگوں کو کس نے کہا ہوٹل میں بیٹھنے کے لیے اس طرح ایک اندرونی ذلت کا احساس ہوتا تھا۔ بعض دفعہ مارپیٹ بھی ہو جاتی تھی۔ میرے ایک دوست کے ساتھ ایسا ہوا۔ وہ لوگ کسی ہوٹل میں گئے۔ ہمارے علاقے کے ارد گرد بہت سی آبادیاں ہیں۔ بلوچ بھی ہیں، پٹھان بھی ہیں، ہندوستانی بھی ہیں تو وہاں کے کسی آدمی نے دیکھ لیا اور ہوٹل کے مالک سے کہہ دیا کہ یہ لوگ جو یہاں کھانے کے لیے بیٹھے ہیں اور جس آبادی سے آئے ہیں اور ان کے تو برتن علیحدہ ہونے چاہییں۔ ہوٹل کا مالک آیا اور اس نے بڑے برے طریقے سے بات کی کہ کیا گرمی ہوئی اور جھگڑا ہو گیا۔ وہاں موجود سارے لوگ ہمارے خلاف ہو گئے کہ تم کو کس نے کہا ہوٹل میں بیٹھو۔ اس وقت سے اب تک یہ معاملہ اسی طرح پڑا ہے۔

میں نے جس اسکول سے پڑھا ہے اس میں مسلم بھی تھے اور ہندو بھی تھے۔ ہندو بہت تھے کیوں کہ ان کی آبادی نزدیک تھی۔ ہمارے ساتھ جو مسلم پڑھتے تھے ان میں کبھی یہ بات نکل کر نہیں آئی تھی کہ آپس میں فرق سمجھا ہو یا اونچ نیچ کی بات کی ہو۔ اس وقت ہمارے ماسٹر دیہاتی سٹائل کے تھے۔ اب تو سب بڑا ماڈرن ہو گیا ہے اور لوگ انگریزی کو بہت فوقیت دیتے ہیں، اس وقت ایسا نہیں تھا۔ ہمارے حساب کے ماسٹر بڑے اچھے تھے، بہت اچھے ٹیچر تھے۔ ایک دفعہ سکول کے پرنسپل اور گورنمنٹ کی طرف سے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے کچھ لوگ آئے چیکنگ وغیرہ کے لیے تو اس وقت ماسٹر صاحب جس طریقے سے پڑھا رہے تھے تو وہ پنجابی اسٹائل میں میتھس پڑھا رہے تھے۔ ان لوگوں نے بھی ماسٹر کو اس نظروں سے دیکھا اور پرنسپل نے بھی انگریزی جھاڑی جیسے ماسٹر کو کچھ آتا جاتا نہیں ہے۔ ماسٹر صاحب اس طرح سے پوچھتے تھے کہ دو ماشا از یو ار نیم لو گئے؟

ہمارے کمیونٹی میں دوسری کمیونٹیز کے برخلاف بہت سی عورتیں گھروں سے باہر نکل کر کام پہ جاتی ہیں۔ اس کی وجہ سے بہت سے واقعات ہوئے اور اب بھی پیش آتے ہیں۔ ہمارے ہاں پردے کا کوئی اتنا رواج نہیں ہے، میل جول، گھروں میں آنا جانا ہوتا ہے، گلی میں نکل کر بیٹھنا، چھتوں پر بیٹھنا یہ سب ہوتا ہے۔ آس پڑوس کی آبادیوں میں اس طرح کی آزادی نہیں ہوتی تھی۔ عورتیں جب گھروں سے کام کے لیے نکلتی تھیں تو دوسرے لوگ ان کے لیے رکاوٹ بھی بنتے تھے۔ یہاں تک کہ خواتین جب گھروں سے نکلتی تھیں تو کچھ لوگوں کا کام تھا پیچھے سے ہوٹنگ کرنا، پتھر مارنے یا کوئی ٹوں مارنی یا ان کے لیے ایسے الفاظ نکالنے یا مذاق اڑانا ان کو پریشان کرنے کے لیے۔ ہمارے علاقے میں ایک تبدیلی

شروع سے یہ آئی ہے کہ بہت سی لڑکیاں پڑھنے کے لیے جاتی ہیں۔ اُس وقت بھی جب لڑکیاں جاتی تھیں تو ایک پرابلم ہوتی تھی کہ بچیاں جب گھر سے یونیفارم پہن کر نکلتی تھیں تو ان کو دور جانا پڑتا تھا کیوں کہ ان کے لیے نزدیک کوئی اسکول نہیں تھا، تو لڑکیوں کا گھر سے اسکول جانا اور اسکول سے گھر آنا ایک مسئلہ ہوتا تھا۔ اس طرح کے کئی واقعات پیش آئے۔

ایک دفعہ بات بڑھ گئی۔ باہر کے علاقے کے جو لڑکے تھے ان کی آہستہ آہستہ اتنی ہمت بڑھی کہ ہماری گلیوں تک آنا شروع ہو گئے۔ پھر چند لڑکیوں کی وجہ سے اس علاقے میں جھگڑا ہوا۔ یہ ۱۹۷۵ کی بات ہے اور عیسیٰ نگری کی تاریخ میں بنیادی واقعات میں سے ایک ہے، میں سمجھتا ہوں۔ دوسرے علاقے کا ایک لڑکا جو مسلسل ہماری لڑکیوں کا پیچھا کرتے ہوئے گلی میں اندر تک آ گیا۔ اور اسے جب روکا گیا تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی غلطی کو مانتا، اس نے اپنے آپ کو وہاں سے ہٹ جانا اور اپنی غلطی پر شرمندہ ہونے کے بجائے اس گلی کے نوجوانوں اور بزرگوں سے بدتمیزی بھی کی۔ بدتمیزی کرتے کرتے بات یہاں تک بڑھی کہ لڑائی جھگڑے پر چل گئی۔ اس لڑکے کا بیک گراؤنڈ کچھ اس قسم کا تھا، خاصا آوارہ لڑکا تھا۔ ہتھیار بھی اپنے پاس رکھتا تھا۔ بات بڑھ گئی تو اس نے ہتھیار نکال لیا۔ خنجر یا چاقو کوئی چیز اس کے پاس ہوتی تھی۔ جس آدمی نے اس کو روکا تھا اس کو بھی شدید زخمی کر دیا۔ وہ وہاں سے بھاگا تو لوگ اس کے پیچھے ہو گئے اور وہ بھاگتے بھاگتے سیدھا مسجد میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ عیسیٰ نگری کے کارنر پر دوسرے علاقے کے ساتھ مسجد ہے۔ وہ وہاں جا کر گھس گیا۔ کئی سال سے یہ مسجد آباد ہے، لوگ بھی آتے ہیں، کبھی کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ یہ شخص اپنی جان بچانے کے لیے مسجد میں چھپ گیا تو اس نے شور مچایا کہ جو عیسائی لوگ ہیں انھوں نے مسجد کو شہید کرنے کے لیے ہتھیار اٹھا لیے ہیں، مسجد کو بچاؤ۔ اس نے یہ کہا تو ارد گرد کے مسلمان بھائیوں نے دیکھا کہ عیسیٰ نگری سے بہت آدمی ہتھیار اٹھا کر آ گئے ہیں، مسجد کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ لوگ بھی نکل آئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ علاقہ میدانِ جنگ کی شکل اختیار کر گیا۔ دوپہر کا ٹائم تھا۔ ساتھ میں جو دوسری بستیاں ہیں، گرمان کالونی اور بلوچ کالونی، پٹھانوں اور ہندوستانیوں کی بستیاں ہیں، وہاں جا کر یہ لوگ کہہ آئے کہ عیسائیوں نے مسجد پر حملہ کر دیا، مسجد کو شہید کر رہے ہیں۔ بات پھیلتی پھیلتی سبزی منڈی تک پہنچ گئی۔ سبزی منڈی میں دوپہر کے ٹائم مزدور آرام کر رہے ہوتے ہیں۔ انھوں نے جب یہ سنا کہ مسجد پر حملہ ہو گیا ہے تو لاٹھیاں، ڈنڈے، جو بھی ان کے پاس تھا وہ لے کر میدان میں آ گئے۔ یہ میدان جو دونوں علاقوں کو ملاتا ہے، یہ جنگ کا میدان بن گیا۔ پولیس بھی اس وقت وہاں پہنچ گئی۔ پولیس والوں کا کردار آپ کو پتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ لوگوں کو روکتے، انھوں نے مسجد پر حملے کا سن کر مدد دینے کے بجائے فائرنگ کر دی۔ ہمارے لوگوں کے پاس ڈنڈوں کے سوائے کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اصل بات دب گئی اور مذہبی فساد شروع ہو گیا۔ اس میں تین لوگ مارے گئے جو اس لڑائی سے واقف بھی نہیں تھے۔ ان تینوں میں سے دو تو اسی وقت بے چارے اپنے کام سے تھکے ہارے آئے تھے تو ان پر لاٹھی ڈنڈے چارج کیے گئے اور وہ بھاگے تو پولیس نے ان پر فائر کر دیا۔ آج بھی ان کی

قبریں عیسیٰ نگری میں موجود ہیں اور اس بات کی شہادت ہیں۔ آج بھی ہر سال شہیدوں کے لیے دعا ہوتی ہے۔ اس کے نوجوان سالانہ پروگرام کرتے ہیں۔

تعصب صرف مذہبی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ کام کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو ہمارے مذہب کے ہیں لیکن ہمیں اپنے برابر کا نہیں سمجھتے۔ اتنا زیادہ تو نہیں لیکن اونچ نیچ کا، امیر غریب کا فرق ہوتا ہے۔

پہلے جو حالات تھے اور اب جو حالات ہیں ان میں تبدیلی آئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اتنے عرصے لوگوں کا ایک جگہ رہنا اور وہاں کے ماحول کو اپنانا، اس سے فرق پڑتا ہے۔ ساتھ ساتھ تعلیم سے بھی فرق پڑا ہے۔ تعلیم کا رجحان بڑھا ہے اور مسلم اور غیر مسلم میں یہ بھی ہوا ہے کہ ایک دوسرے کو قبول کرنے لگے ہیں۔ پنجاب میں یہ تھا کہ صرف ایک ہی پیشہ تھا جس میں جا سکتے تھے۔ یہاں لڑکے لڑکیوں کو ایک حد تک یہ موقع ملتا ہے کہ دوسرے پیشے بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ پنجاب میں یہ لوگ چودھریوں کے پاس کام کرتے تھے تو ایک ہی کام کر سکتے تھے۔ یہاں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ بہت سے شعبے ہیں جن کو اپنا سکتے ہیں۔

اس بات کی مزید وضاحت آصف شہباز نے کی۔

عموماً اس سلسلے میں ہماری خواتین کو جو پریشانیاں پیش آئیں وہ یہ نہیں کہ جن گھروں میں بھی یہ کام پر جاتی تھیں ان سے صفائی، جھاڑو پونچھ اور ٹائلٹ کی صفائی جیسے کام کرائے جاتے تھے۔ یہ احتیاط کی جاتی تھی کہ برتنوں کو نہ چھولیں یا گھر میں کوئی خاص کمرہ ہے تو اس میں نہ گھس آئیں۔ اس کی وجہ سے یہ احساس پیدا ہوتا تھا کہ ہم کو فرق سمجھا جا رہا ہے۔

بلدیہ میں، کے ایم سی میں یا لوکل باڈیز میں جو لوگ کام کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ وہ گٹر کی صفائی بھی کرتے ہیں، کچرا بھی اٹھاتے ہیں، روڈوں پر صفائی بھی کرتے ہیں، وہ زیادہ نشانہ بنتے ہیں۔ اب بھی جن علاقوں میں یہ لوگ کام کرتے ہیں ان کے ساتھ اس امتیازی سلوک میں کوئی تبدیلی نہیں آئی جو ان سے ساتھ پہلے روا رکھا جاتا تھا۔ تبدیلی جہاں آئی ہے وہ اس وجہ سے آئی ہے کہ صفائی کا کام کرنے والوں نے اپنے بچوں کو تعلیم دلوائی جس کی وجہ سے ان کو اپنے آپ کو دوسرے شعبوں میں شامل کرنے کا موقع ملا۔ ڈرائیور ہے، کارپینٹر ہے، مکینک ہے اور اس طرح کے جو دوسرے ٹیکنیکل کام ہیں ان میں آگے بڑھے۔ نرسنگ اور پیرامیڈیکل میں ہمارے بہت سے لڑکے جاتے ہیں۔

تعصب اور قبولیت کے بدلتے ہوئے تعلق کے حوالے سے نجمی انصوفی نے کچھ اور تفصیلات بتائیں۔

Scanned with CamScanner

بعض لوگوں نے تعصب برتا اور چھوت چھات کے باوجود فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکے۔ ذہنی تعصب کے باوجود جب اپنے فائدے کی بات آتی ہے تو پھر سب ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ ہمارے لوگوں کے وسیلے سے جن کو شراب حاصل کرنی ہوتی ہے وہ ضرور کرتے ہیں۔ یا پھر ہیروئن خریدنے آتے ہیں۔ وہ ہمیں نیچا سمجھتے ہوں گے لیکن ان چیزوں کے لیے ہم سے مدد مانگنے سے نہیں گھبراتے۔ رمضان کے دنوں میں علاقے کی گلیوں میں چھوٹی چھوٹی دکانیں کھلی ہوتی ہیں تو حسن اسکوائر سے یا سوک سنٹر سے وہ لوگ کھانے کی تلاش میں آ جاتے ہیں جو ویسے کبھی یہاں آنے کا تصور بھی نہ کریں۔ نعمان سنٹر اور دکان اب تو بہت فلیٹ بن گئے ہیں۔ رمضان میں عیسیٰ نگری میں گہما گہمی رہتی ہے۔ لوگ ان ہی ہاتھوں کے بنے ہوئے پان خریدنے آ جاتے ہیں جو ویسے عام دنوں میں تصور بھی نہ کریں۔ شراب کا بھی ہم سے زیادہ ہمارے مسلم بھائیوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔

تعصب کے حوالے سے ایک مثال ہے جو زیادہ مناسب تو نہیں ہے لیکن بہرحال حقیقت ہے۔ ہمارے ایک دوست حیدرآباد گئے اور وہاں ایک مکان کی جگہ دیں گے۔ یعنی کہ سمجھ لیں طوائف کے پاس گئے۔ بات چیت ہوئی اور سارے معاملات طے ہو گئے، ریٹ وغیرہ۔ جب کام کرنے لگے تو اس طوائف کی نظر ان کے جسم پر پڑی۔ اس طوائف نے کہا کہ ابھی ہم اتنے بے غیرت بھی نہیں ہوئے کہ عیسائیوں کے ساتھ کرتے پھریں۔ اور یہ کہہ کر اس نے ان صاحب کو وہاں سے واپس کر دیا۔

ان ہی لوگوں کو جب ہیروئن کی طلب ہوتی ہے یا اپنے دوستوں اور سہیلیوں کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ یہاں آنے سے نہیں شرماتے۔ برائی بہت سی دیواروں کو توڑ دیتی ہے۔

اس مسئلے سے بیکسٹر بھٹی کو اختلاف ہے اور وہ تعصب کے سوال کو دوسرے حوالے سے دیکھتے ہیں۔

اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ تعلیم بڑھی ہے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن آپ کیسی تعلیم کی بات کر رہے ہیں؟ پروفیشنل تعلیم کی بات کر رہے ہیں یا ذہنی ترقی کی بات کر رہے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس بات کو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ عیسیٰ نگری ایک چھوٹا سا علاقہ ہے اور اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے جس سے دوسری پسماندہ بستیاں تعلق رکھتی ہیں۔ آپ لیاری ندی کے علاقے میں جو لوگ رہ رہے ہیں ان کو دیکھ لیں، چنیسر گوٹھ چلے جائیں، یا لیاقت آباد کے چھوٹے چھوٹے علاقوں میں چلے جائیں۔ آپ ان کو اسی تناظر میں دیکھیں کہ وہ کن کن مسائل میں ہیں۔ یہ جو چیز چل رہی ہے یہ طبقاتی مسئلہ ہے۔ اس میں آپ کو پاکستان کے پچانوے فیصد لوگوں کو دیکھنا پڑے گا۔ جو بچہ بھی پیلے اسکول میں پڑھے گا وہ ایسے مسائل کا شکار ہوگا۔ تعصب تو ہے۔ مذہب کا تعصب، جاگیردار کا، ورکنگ کلاس کا تعصب چل رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

کراچی کی حد تک تعصب ختم ہو گیا ہے۔ اب اگر کوئی آدمی گندا ہو گا تو اس کے پاس کوئی بھی بیٹھنا نہیں پسند کرے گا۔ اس کو آپ تعصب نہیں کہہ سکتے۔ میرے بچے مسلم اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تعصب نہیں ہمارا احساسِ کمتری ہے۔ یہ تعصب صرف عیسیٰ نگری کے ساتھ نہیں ہے۔ یہ ٹرینڈ بن گیا ہے کہ جس کی سفارش ہے اسی کا کام ہو گا، چاہے وہ مسلم ہو یا کرسچن۔ جس کی سفارش نہیں ہے اس کو کوئی پوچھتا نہیں۔ ہاں، اگر میں پنجاب کے کسی پسماندہ علاقے میں ہوتا تو دوسری بات تھی۔ میں کراچی میں بیٹھا ہوں اس لیے آپ کی بات سے اختلاف کر رہا ہوں۔

> علاقے میں تبدیلی کے عمل نے لوگوں کی زندگی پر مثبت اور منفی دونوں طرح کے اثرات مرتب کیے ہیں۔ بعض مرتبہ یہ اثرات ایک ہی شخص کی زندگی میں بیک وقت موجود ہوتے ہیں اور عمر کے مختلف مراحل پر ان کا تناسب گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ ماحول کے مثبت اور منفی اثرات کے بارے میں محبوب جان نے اپنی ذاتی زندگی کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔

۱۹۶۵ میں کراچی ایسٹ کے علاقے پیر الٰہی بخش کالونی میں میری پیدائش ہوئی تھی۔ ہم لوگ ویسے تو پیچھے پنجاب سے ہیں، گوجرانوالہ کی طرف کے، لیکن ہمارے باپ دادا کراچی شفٹ ہو گئے تھے۔ پی آئی بی کالونی میں ہمارا گھر بہت چھوٹا سا تھا۔ ہماری پوری فیملی، تایا، چچا، وہ سب پی آئی بی کالونی سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر عیسیٰ نگری سے، وہ نئی نئی آباد ہوئی تھی، وہ وہاں شفٹ ہو گئے تھے تو پھر ہمیں بھی مجبوراً یہاں شفٹ ہونا پڑا۔ اور یہاں پانچ سال کی عمر میں، میں نے سینٹ میری سکول میں ایڈمیشن لیا۔ پانچویں تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۹۷۵ یا ۷۶ میں، بھٹو صاحب کا دور تھا، پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد طارق روڈ پر سیکنڈری اسکول تھا، چھٹی جماعت میں میں نے وہاں داخلہ لیا اور میٹرک تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ ۸۲ میں میٹرک کی۔ اس کے بعد اسلامیہ آرٹس کالج میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا۔ انٹر تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ یہ ہے میری تعلیمی کارکردگی۔

جب میں نے میٹرک پاس کیا تو میرے کچھ دوست تھے، لیاقت منور تھا، عمانوئیل استونی تھا، تو یہ کیونکہ مجھ سے ایک سال سینیئر تھے تو انھوں نے کیا کیا کہ لیاقت اسپتال میں جنرل نرسنگ کا کورس ہو رہا تھا، انھوں نے وہاں ایپلی کیشن دی اور مجھے بھی کافی مجبور کیا کہ تم بھی چلو، تم بھی چلو۔ میں نے کہا نہیں، مجھے جنرل نرسنگ نہیں کرنی۔ میرے خیالات کچھ اور تھے کہ میں کچھ بنوں۔ میں نے کہا نرسنگ میں مجھے کچھ اسکوپ نظر نہیں آتا۔ انھوں نے کہا کہ ہم بھی نرسنگ کے لیے جا رہے ہیں، تین چار ماہ کا جو پی ٹی سی کورس ہوتا ہے وہ کریں گے، اس کے بعد بھاگ آئیں گے۔ میں نے کہا کہ نہیں جی، مجھے وہ بھی نہیں کرنا۔ وہ ایک سنہری چانس تھا وہ میں نے مس کیا۔ اس کے بعد کمپیوٹر میں داخلہ لیا، وہ دو

سال کا کورس تھا۔ اس میں بھی میں پچاس فیصد لاتا تھا۔ پھر چھوڑ دیا کہ بعد میں کر لیں گے جب کہیں کام کر رہا ہوں گا۔ اس طرح یہ بھی بیچ میں سے مس ہو گیا۔ اصل میں یہ سب چکر ہوتا تھا وہ یہ تھا کہ میں نے جیسے ہی میٹرک پاس کی، اس دور میں انڈین فلمیں وڈیو پر لوگوں میں کافی مقبول ہو رہی تھیں، تو ہمارے گھر میں بھی اور دوستوں میں بھی انڈین فلمیں دیکھنے کا رجحان کافی بڑھ رہا تھا۔ یہ وی سی آر اور ٹی وی اس زمانے میں بہت مہنگے تھے اور ہم خرید تو نہیں سکتے تھے لیکن ہم اس کو کرائے پر لے آتے تھے، کافی دور سے۔ پانچ چھ سو روپیہ اس کا کرایہ ہوتا تھا۔ اس میں ہماری کافی دل چسپی بڑھ گئی۔ میں اور میرا ایک دوست تھا، ہم دونوں لے کر آتے تھے تو اپنے گھر میں یا کسی اور کے گھر میں، دوسرے لڑکوں سے، لڑکوں سے بیس بیس، تیس تیس یا پچاس روپے لے کر ان کو دکھاتے تھے۔ شروع ہی میں میرا دھیان پیسے کی طرف چلا گیا۔ اس وجہ سے کچھ پڑھائی میں [illegible] ایک سال اسی طرح چلتا رہا۔ پھر میں فرسٹ ایئر میں آیا تو میرا ایک دوست تھا، اس کے پاس ساٹھ ستر فلمیں تھیں اور میرے پاس پانچ چھ فلمیں تھیں، تو وہ مجھے کہنے لگا کہ ایسا کرتے ہیں کہ عیسیٰ نگری میں ایک چھوٹا سا وڈیو سنٹر کھول لیتے ہیں، تو اس طرح ہمارے اوپر کے اخراجات نکلتے رہیں گے، شوق بھی پورا ہو جائے گا اور پڑھائی بھی جاری رہے گی۔ لیکن اس نے میٹرک کے بعد چھوڑ دیا تھا اور میں فرسٹ ایئر میں تھا۔ میں نے اپنے گھر میں بات کی کہ ہم وڈیو سنٹر کھول رہے ہیں، تو میرے والد اور میری والدہ نے منع کیا کہ اس طرح تمھاری پڑھائی میں حرج ہو گا تو آپ اس طرح یہ بزنس نہ کریں۔ میں اپنے دوست کو لے کر گیا [illegible] میری ان سے پہلے سے بات چیت ہو چکی تھی کہ وہ مجھے کالج جانے سے پہلے، میری پڑھائی کے [illegible] ٹیوشن کے لیے [illegible] کرے گا۔ اس نے کہا کہ نہیں جی آنٹی جی، میں اس کو کالج کے لیے اور ٹیوشن کے لیے وقت دیا کروں گا اور اس کی پڑھائی میں کوئی حرج نہیں ہو گا۔ لیکن گھر والے پھر بھی نہیں مانے۔ میں نے ضد کی۔ انھوں نے پیسے نہیں دیے۔ میں نے جو میری جیب خرچی تھی، [illegible] چھ سات سو روپے، اسی سے کام کیا۔ ہم نے چھوٹا سا وڈیو سنٹر کھول لیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس میں کافی بچت ہوئی اور اس طرح وڈیو سنٹر چل پڑا۔ پھر میرا دوست [illegible] سائڈ ہو گیا اور میں پوری طرح اس کا ہو گیا۔ اس طرح میرے لیے [illegible] اسٹڈی ختم ہو گئی۔

شروع میں میرا رجحان تھا کہ ڈی ایس پی یا ایس ایس پی کی رینج کا کوئی افسر بننا چاہتا تھا۔ میں پولیس میں بھرتی ہونا چاہتا تھا۔ لیکن وہ نہ ہو سکا۔ میرے خاندان کا تعلق پنجاب سے تھا۔ تعلیم تو ان کے پاس بھی نہیں۔ پھر وہی ہوا کہ [illegible] کا کام زیادہ تھا، وہ صفائی کی طرف مائل تھے۔ تو شروع میں وہ صفائی کا کام کرتے تھے۔ اس کے بعد بھٹو صاحب کا دور آیا، پاسپورٹ وغیرہ بنے تو کافی لوگ جو تھے وہ باہر گئے اور اپنے خاندان کی ترقی کے لیے باہر کی طرف ان کا رجحان تھا۔ اسی طرح میرے والد صاحب کو بھی شوق ہوا کہ میں بھی باہر جاؤں، اس طرح ہمارے خاندان میں بھی ترقی ہو جائے گی۔ میرے والد صاحب نے کوشش کی۔ [illegible] تو میرے والد صاحب [illegible] چلے گئے۔ میرے والد صاحب کے جانے سے فرق یہ ہوا کہ گھر میں اگر پہلے تھوڑی خوشحالی تھی تو اب بھی خوشحالی ہو

Scanned with CamScanner

گئی، پہلے ہمارا گھر کچا تھا تو ہم نے اینٹوں والا گھر بنا لیا کیوں کہ عیسیٰ نگری میں وہ دور چل رہا تھا کہ ہر گھر کو توڑ کر بنا رہیں، کیوں کہ پہلے کچے گھر تھے تو ان کو توڑ کر پکے بنانے شروع کر دیے۔ تو اسی دور میں ہم بھی شریک ہو گئے اور اپنا گھر پکا کر لیا۔ لیکن یہ ہے کہ جہاں یہ ہوتا ہے کہ باپ کا سایہ اگر موجود نہ ہو تو ولد کچھ ڈسٹرب ہوتی ہے۔ لیکن ہمارا خاص طور پر ایسا نہیں تھا کیوں کہ شروع میں جیسے ہم نے ہوش سنبھالی تو ہمارے والد صاحب اتنے سخت آدمی نہ اس وقت تھے نہ اب ہیں۔ وہ بہت پیار کرنے والے آدمی تھے۔ مجھے نہیں یاد کہ انھوں نے کبھی ہمیں مارا بھی ہو۔ ہاں، ہماری والدہ جو ہیں، بہت سخت تھیں۔ کافی ہم بچوں پر پابندیاں تھیں کہ باہر نہ کھیلو۔ مار کٹائی بھی ہمیں والدہ سے ہی ملی۔

میٹرک کے زمانے میں یار دوست جمع ہوتے تھے، فرصت کا ٹائم پاس کرنے کے لیے۔ فلموں کی طرف میرا رجحان نہیں رہا پاکستانی فلموں کی طرف۔ یہ تو انڈین فلموں کی طرف ایک دم شوق چلا گیا۔ جیسے ہم پانچویں چھٹی کلاس میں تھے تو ہاکی مقبول تھی۔ بعد میں ہم پانچ چھ دوست ایسے تھے جو ڈنڈوں کی مدد سے ہی ہاکی کھیلا کرتے تھے۔ تھوڑی سی اور ہوش سنبھالی تو اپنی ہاکیاں خرید لیں۔ کبھی کبھی وہاں پر جہاں آج کمیونٹی سنٹر ہے، رانا جاوید صاحب کا گھر ہے، یہاں پر ایک چھوٹا سا گراؤنڈ ہوا کرتا تھا اور وہاں ہم کھیلا کرتے تھے۔ اس کے بعد ساتویں آٹھویں میں پہنچے تو ہم لوگ کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ اسکول سے میں آتا تھا تو ٹیوشن پر چلا جاتا تھا اور ٹیوشن سے ہی، اگر کوئی خاص میچ ہمیں کھیلنا ہوتا تھا شام کو، تو میرے دوست ٹیوشن سنٹر میں ہی آ جاتے تھے اور وہاں سے ان کے ساتھ مل کر چلا جاتا تھا۔ یا رات کو کہیں بیٹھ کر گپیں مار لیتے تھے۔ یہی رہتا تھا۔ اس کے بعد پھر وی سی آر، ویڈیو سنٹر۔ انڈین فلمیں اس زمانے میں بھی دیکھ رہے تھے۔ نئی نئی چیز کا شوق تھا۔ امیتابھ بچن اور دھرمیندر اچھے لگتے تھے اور کافی ڈانٹ کھاتے تھے۔

ہاں جی، دوسری قسم کی فلموں سے بھی تعارف تھا۔ کیوں کہ جب کرائے پر لے کر آتے تھے تو اس وقت بھی کچھ دوست ایسے ہوتے تھے جو کہتے تھے، نہیں جی، ہم تو پیسے دے رہے ہیں صرف بلیو پرنٹ کے لیے، تو آپ ایسا کریں کہ اگر چار فلمیں چلائیں گے تو تین آپ انڈین چلائیں اور ایک یہ چلا لیں، جو نہیں دیکھنا پسند کرے گا اسے باہر بھیج دیں گے اور جو دیکھنا پسند کریں گے وہ بیٹھ کر دیکھ لیں گے۔ تو وہ ہمیں لانی پڑتی تھیں اور لازمی ہم بھی، اس وقت تھوڑا سا ینگ بلڈ تھا، تو ہم بھی دلچسپی رکھتے تھے کہ چلیں خیر ہے، دیکھ بھی لیں گے۔ ایک دفعہ تو ایسے ہوا کہ میرا ایک کزن ہے، میرا ہم عمر تھا وہ بھی، تو وہ مجھے کہنے لگا کہ آج جو پروگرام چلے گا وہ صرف اور صرف بلیو پرنٹ کا چلے گا۔ کچھ اور ایسے ہی دوست تھے، انھوں نے پیسے دیے اور اس میں میں نے کوئی پیسہ نہیں دیا میں نے بس یہ کیا کہ وی سی آر اور ٹی وی اور فلمیں لے کر آیا اور بیٹھ گیا ان کے ساتھ۔ تقریباً پوری رات انھوں نے یہی چیزیں دیکھیں۔ رہی یہ بات کہ ان فلموں کو دیکھ کر شوق ہوتا تھا کہ ہم بھی یہ سب کریں، تجربے کریں، تو یہ چیز تو ہے، اس ٹائم پر کسی فلم کو دیکھ کر وہ نہیں رہتا تھا کہ کسی فلم کو دیکھ کر سوچ کرتے تھے کہ ہم بھی

Scanned with CamScanner

صورتیں ہیں یا سیرتیں ہیں تو دیکھ کر یہ چیزیں ہیں جیسے ہوتی ہی رہتی ہیں۔ اس میں لذت لیا ہے۔ یہی وہ تھی کہ پانچویں چھٹی کلاس میں لڑکیوں کو چھیڑنا یا لڑکیوں کی طرف دیکھنا یا ان کی باتیں کرنا۔ ہمارا تین چار لڑکوں کا ایک گروپ تھا، یہ سب ہم اس طرح لڑکیوں کے متعلق گفتگو کیا کرتے تھے۔ اس میں یہ وقت بھی ہے کہ ایک میرا کزن ہے، اس کی بہن سسٹر تھی، اس کی سہیلی آئی ہوئی تھی۔ ہم لوگ چھوٹے تھے تو اس کو پتا نہ کر اس کا دل اس طرف ہے تو ہم بیٹھے ہوئے تھے چارپائی پر۔ وہ لڑکی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ تو میرے کزن نے کہا کیا، وہ اس ٹائم تو یہی بات تھی، انگلی اس نے پیچھے رکھ دی۔ تو ہوگا کوئی سلسلہ ان میں۔ انگلی رکھ دی اور باتیں کر رہا ہے۔ جب انگلی لڑکی کو چبھی ہوئی تو اس نے ہمیں ڈانٹا۔ لیکن ہم لوگ اس وقت چھوٹے تھے جیسے بازاری عورتیں وغیرہ ہوتی ہیں، ہم لوگ اس طرف کبھی نہیں گئے میرے خیال سے زیادہ ہی نہیں گئے۔ جیسے یہ ہوتا ہے لڑکیوں کے ساتھ فرینڈشپ وغیرہ، تو یہ شاید دس سال کی ایج میں تھے تو یہ بھی ہوئی۔

یہ رہا ہے تب پتہ چلا کہ پڑھنے کا شوق اور اس کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ہیں جاننا چاہوں۔ پہلے تو میں اپنے گھر سے متعلق ہوں۔ کچھ خاندان ایسا ہوتا ہے کہ لڑکے والی پیدائش ہے یا باپ ہے یا چچا ہے۔ اس کی وجہ سے کچھ چیزیں رستے میں ملتی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے گھر میں کوئی بھی ڈرنک نہیں کرتا تھا۔ میرے والد صاحب وہ بھی صرف سگریٹ پیتے تھے تب سے۔ میں جب میٹرک میں تھا یا میٹرک پاس کیا تھا، اب تک بھی ٹھیک یاد نہیں ہے۔ تو میرے کزن کے وہ کسی گھر میں کام کرتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا نہیں تھا، پہلے چار پانچ جماعتیں پڑھ کر چھوڑ دیا تھا۔ تو کسی گھر میں وہ صفائی وغیرہ کا کام کرتا تھا۔ وہاں جو اس کا مالک تھا اس نے کہا کہ آپ لوگ جو ہیں ان کا کوئی خاص کوئی مسئلہ ہے، اس کا ٹیسٹ ہوتا ہے اور اس ٹیسٹ پر وہسکی ملتی ہے تو آپ یہ کریں کہ آپ مجھے لا کر دیا کریں اور جو پیسے ہوں گے وہ میں آپ کو دے دیا کروں گا۔ تو میرے کزن نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ اس نے ساری تعداد بیٹھ کی اور وہاں اسٹور پر گیا، کاغذات کچھ ملے اور اس کو وہ ٹیسٹ مل گیا۔ تو وہ مجھے بھی ایسے ہی لگے لا کر کیا کرتے ہو۔ میں نے کہا کہ دماغ پیتا ہوں۔ اس نے کہا، آؤ میرے ساتھ چلو۔ تو مجھے وہ ساتھ لے گیا۔ اس نے وسکی کی بوتلیں لیں اور اس نے اس کا ذائقہ تھا، وہاں پر دیں، اور اس نے مجھے بھی پیسے وغیرہ جو بھی کچھ تھا لے لیا۔ اسی طرح مجھے وہ آہستہ آہستہ اپنے ساتھ لے کر جاتا تھا۔ یا پھر پیسے ہوں تو میرے سے کچھ باہر کے خریدار ہوتے تھے، تو وہ کہنے لگے کہ یار آپ لوگوں میں یہ چیزیں ہیں۔ تو ہمارے محلے میں ایک دو لوگ تھے جو یہ چیزیں بیچا کرتے تھے۔ تو انہوں نے کہا کہ ہمیں وہ چیزیں لا کر دے دیں۔ تو میں نے وہ پچاس ساٹھ روپے لیتے، اس آدمی سے وہ چیز لے کر اس دوست کو پہنچا دی۔ اس میں میرا کوئی انٹرسٹ نہیں تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ میں نے دیکھا پھر مجھے پتا چلا کہ جو بھی اس کو وہ چیز آتی ہے تو اس کی چوری ہے اور میں روپیہ لوٹ سے نہیں لے سکتا۔ میں یہ خوشی سے نہیں۔ کچھ پیسے لے لوں۔ تو اس طرح سے ایک دو ... گھر میں رکھ لیں۔ وہ دوست آتے تھے، ان کو دے دیں۔ اس طرح

پیسوں کا تھوڑا سا لالچ جو سے ڈیولپ ہوا۔

خود چرس تو میں نے کافی بعد میں شروع کی، لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ ایک قسم کا ایڈکٹ بن جاؤں۔ اس کے علاوہ جو دوسرے نشے ہیں ان کے بارے میں بتاؤں۔ شروع میں تو ہم لوگ یہ چرس وغیرہ دیکھتے تھے کہ گلی کے کونے میں لڑکے کھڑے ہوتے چرس بھر رہے ہیں اور پی رہے ہیں۔ ہیروئن کا نام سننے میں نہیں آیا تھا۔ اس کے بہت بعد جا کر ہمیں پتا چلا کہ ہیروئن بھی کوئی نشہ ہے۔ اس کے متعلق بھی میرا ایک چھوٹا سا تجربہ ہے، وہ بتاتا چلوں۔ میرے ایک کزن نے ہیروئن پینی شروع کر دی۔ پہلے تو میں نے اسے سمجھایا کہ نہیں پیو، کیوں کہ اس کی والدہ بھی اس کے ساتھ جھگڑتی تھیں، ہم لوگ بھی سمجھاتے تھے۔ یہ دور تھا جب میں وسکی کی سیل میں ملوث ہو چکا تھا، وڈیو سنٹر بھی میرا چل رہا تھا۔ وڈیو سنٹر کی وجہ سے کچھ دوست پیسے الٹے سیدھے بھی بنانا شروع ہو گئے اور کچھ سے دوست بھی بن گئے۔ تو ایک دوست ہے میرا، اس دوست کا ایک دوست پولیس میں تھا، سی آئی اے میں۔ اس نے کہا کہ کل رات ایک کار آ رہی تھی ایئرپورٹ کی طرف سے، اسے روکا تو اس کار میں سے چرس برآمد ہوئی ہے، آپ کے علاقے میں پینے والے بھی ہیں اور بیچنے والے بھی ہیں تو آپ ایسا کرو کہ یہ جو چرس ہے میری یہ بکوا دو۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، میں بکوا دیتا ہوں۔ میں نے دو ایک بندوں سے بات کی تو انھوں نے کہا ہم لے لیں گے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تم اگر یہ بکواؤ گے تو اتنے فی صد تم لے لینا۔ کیوں کہ وہ ڈیلنگ میں نے کروائی تھی تو اس میں پیسے مجھے مل گئے۔ ایک اور دفعہ پھر تھوڑا سا میرے پاس آ گیا۔ وہ کہنے لگا کہ میرے دوست نے پاوڈر پکڑا ہے۔ اس وقت علاقے میں اس کی سیل ہو رہی تھی، عیسیٰ نگری میں اس کا عروج تھا۔ وہ مجھے کہنے لگا کہ اگر یہ کروا دو تو اس میں بھی تمھارا پرسنٹ ہے۔ میں نے علاقے کے کچھ لڑکوں سے کہا کہ ایک بندہ ہے، اس کو ٹیسٹ کر لو۔ اگر اس کے پاس صحیح ہے تو تم اس سے لے لو۔ انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے، آپ اس کا تھوڑا سیمپل لے لیں۔ وہ دوست آیا تو میں نے اس سے کہا کہ تھوڑا سیمپل دے دو، وہ لڑکے چیک کریں گے اور صحیح ہو تو تم سے لے لیں گے۔ اس وقت یہاں کے لوگ سہراب گوٹھ کی طرف جاتے تھے اور اس میں کافی خطرہ بھی تھا۔ انھوں نے سوچا کہ اگر کوئی بندہ یہاں دے جاتا ہے تو ہم یہاں سے لیتے ہیں، ہماری پریشانی کم ہو گی۔ خیر کچھ اس طرح کی بھی ڈیلنگ ہوئی اور ایک دو دفعہ میں اس میں بھی رہا۔ لیکن ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میرا ایک کزن بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کیا کیا کہ تھوڑا سا نکال لیا۔ کیوں کہ میں یہ چیز گھر تو نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں نے وہ اپنے کزن کے پاس رکھوائی ہوئی تھی کہ تم رکھ لو، کل وہ آدمی آئے گا تو اس کو واپس کرنا ہے۔ میرے دوست نے کیا کیا کہ لالچ کی بنا پر اس میں سوئی مار کر تھیلی میں سے تھوڑا سا پاوڈر نکال لیا اور اس نے بیچنے کی کوشش کی۔ کسی نے دیکھ لیا۔ کیوں کہ ہم لوگ تو یہ کام نہیں کرتے تھے، تو انھوں نے گھر میں اطلاع کر دی کہ ان کے پاس اتنا سا پاوڈر ہے اور یہ اسے بیچ رہے ہیں۔ گھر میں ہماری کافی جھاڑ جھپاڑ ہوئی کہ کیوں کر رہے ہو۔ ہم نے کہا کہ نہیں، ایک آدمی یہاں رکھ گیا تھا، وہ بھول گیا ہے تو ہم نے سوچا کہ پھینکنے سے بہتر ہے کہ بیچ دو۔ خیر، پھر ہم نے

Scanned with CamScanner

سے پکا نہیں بلکہ گھر والوں کے سامنے پھونک دیا۔ اس کے بعد میں نے توبہ کر لی کہ کوئی بھی آئے گا، میں اس کیس میں نہیں پڑوں گا۔

میں نے خود کبھی نہیں پی۔ البتہ یہ ہے کہ چرس جو ہے تو جب میں وسکی وغیرہ پی لیتا تھا تو میرے کچھ دوست ایسے تھے جو سگریٹ میں چرس پیتے تھے، وہ کہتے تھے کہ وسکی کے بعد چرس پینے سے نشہ بڑھ جاتا ہے۔ ویسے ہی تجربے کے لیے میں نے بھی پی۔ تقریباً پندرہ بیس دن پیتا ہی رہا۔ میرا ایک دوست ہے، میں تو کہتا ہوں وہ اچھا ہی تھا، تو جیسے ہی ہم پی کر نکلتے تھے، بہار کا … بن رہا تھا، گھر والے نہیں تھے، تو ہم نیچے … دوست اندر چلے جاتے تھے، پانچ چھ سگریٹیں پیں اور باہر آگئے۔ تو یہ دوست اس چیز کو … کہتا تھا۔ … تو ہم بھی سمجھتے تھے … تو جیسے ہی ہم باہر نکلتے تھے وہ کہتا تھا اوئے چرسی آگئے، چرسی آگئے۔ پھر مجھے کافی شرم آئی۔ میں نے ان دوستوں سے کہا کہ بھئی اگر تم چھوڑتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں تم میں نہیں بیٹھوں گا۔ ان دوستوں میں سے کچھ لوگوں نے تو چھوڑ دی، کچھ پی رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کے بعد میں نے بھی اسے ہاتھ نہیں لگایا۔

میں اب خود تو نہیں پیتا لیکن میں نے بہت سے لوگوں کو پیتے ہوئے دیکھا ہے اور بعد میں ان کے ساتھ کام بھی کیا ہے۔ اس لیے مجھے اندازہ ہے کہ یہ لوگ کس طرح پیتے ہیں، کہاں سے لاتے ہیں، اس عادت کے لیے کیا کیا کرتے ہیں، اس میں کیسے پھنس جاتے ہیں۔ میرا ایک چچازاد بھائی تھا اس کا ایک واقعہ آپ کو بتاتا ہوں، بقول اس کے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے کیوں استعمال کی۔ اس نے … ساری پیسے … اور شارٹ کٹ میں کما لیتا ہے۔ میرا یہ چچازاد بھائی بھی جرم … اور … میں شریک ہو گیا اس نے ہیروئن شروع کر دی۔ تین چار دفعہ پولیس نے پکڑا بھی۔ پھر چھڑا کر لے آتے رہا کرتے تھے۔ وہ معافیاں مانگتا تھا کہ اب نہیں پیوں گا، لیکن پھر ہیروئن شروع کر دیتا تھا۔ کچھ عرصے بعد ہمیں پتا چلا، کچھ لڑکوں نے ہمیں بتلایا کہ آپ کا بھائی جو ہے، اس نے ہیروئن بھی شروع کر دی ہے۔ ہم لوگوں نے چھپ کر تو پوچھا … اس نے کہا نہیں نہیں، کسی نے جھوٹ بولا ہے لیکن آخر کار ہمیں پتا چل گیا۔ اس کا میں نے ایک دفعہ ٹریٹمنٹ بھی کروایا تھا ڈاکٹر سلیم اعظم کے ہاسپٹل سے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تو نے کیسے یہ لالی؟ مجھے تو پتا ہی تھا کہ اس کے اثرات کیا ہوتے ہیں، رو کر وہ کے … تو نے دیکھے ہوئے ہیں۔ مجھے پتا ہے کہ بیوی بچوں پر بھی برا اثر پڑتا ہے، دوسرے رشتہ دار بھی عزت کرتے ہیں، پھر تو نے کیوں اس کو پینا شروع کر دیا؟ اس نے بتایا کہ اصل میں اس کی سالی تھی، اس کے ساتھ اس کی کچھ دوستی وغیرہ چل رہی تھی۔ تو اس کی بیوی کو پتا چل گیا تو اس نے ڈانٹ ڈپٹ اور … سے منع کر دیا۔ دوسرے یہ کہ اس کی سالی نے بھی سوچا ہو گا کہ یہ تو بالکل غلط چیز ہے، شادی بھی نہیں ہو سکتی اور اس سے … بھی ہے تو اس نے بھی ہیروئن پینا شروع کر دیا۔ … اس نے سالی کی محبت کی وجہ سے یہ شروع کر دی کہ وہ ذہنی طور پر اس سے دور ہو جائے۔ کچھ لوگوں نے اس سے کہا تھا کہ یہ ذہنی تسکین پہنچاتی ہے، اس نے یہ پینا شروع

Scanned with CamScanner

کی تو یک دو دفعہ اسے کافی تسکین ملی اور بعد میں وہ اس کا ایڈکٹ ہو گیا۔

علاقے میں کئی لڑکے ایسے ہیں جو لاتے ہیں، بیچتے ہیں، اپنی زندگیاں تباہ کر لیتے ہیں۔ بہت سارے تو اسی طرح کے چکروں کی وجہ سے اس میں پڑ گئے۔ بعض لوگ چرس وغیرہ استعمال کر رہے تھے تو وہ بھی اس طرف آ گئے۔ دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس کا ٹیسٹ یہ ہے، تو ایک ٹائم آتا ہے کہ آدمی کہتا ہے میں بھی اسے چیک کروں۔ آج چیک کر لوں، کل اس کو نہیں پیوں گا۔ اس وجہ سے آج پیتے ہیں، پھر کہتے ہیں کل پی لیتا ہوں، پرسوں نہیں پیوں گا۔ اس کے بعد وہ ایڈکٹ ہو جاتے ہیں۔ چرس کو چھوڑ کر بہت سے لوگ ہیروئن کی طرف آئے۔ یہ تو نہیں کہ چرس ختم ہو گئی، لیکن اس کی جگہ بڑی حد تک ہیروئن نے لے لی۔

بدقسمتی ہم لوگوں کی یہ ہے کہ ہیروئن عیسیٰ نگری میں بہت عام ہو گئی ہے۔ پہلے یہ لوگ دوسری جگہوں پر جاتے تھے، جیسے سہراب گوٹھ۔ افغانستان سے جو مہاجر آئے تھے، یہ چیزیں تو وہی لے کر آئے تھے اور سہراب گوٹھ پر ان کے کیمپ ہوا کرتے تھے۔ اس وقت عیسیٰ نگری میں بھی پینے والوں کی کمی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ یہاں تعداد بڑھتی گئی۔ اس کے بعد یہ ہوتا تھا کہ جس ایڈکٹ کے پاس تھوڑا سا پیسہ ہے، وہ وہاں سے کٹّا لے آتا تھا۔ اور اس کے بعد دوسرے نشئی جو اردگرد کے علاقوں سے آتے تھے، برابر میں جو سندھی بلوچی ایریا ہیں وہاں بھی یہ چیز آ گئی تھی۔ جب یہ چیز عیسیٰ نگری میں بڑھ رہی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ عیسیٰ نگری میں ہی بڑھ رہی تھی، یہ اردگرد اور پوری کراچی میں بڑھ رہی تھی۔ پوری کراچی میں ہیروئن پینے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ تو ان لوگوں نے وہ بیچنی شروع کر دی۔ ایک ایڈکٹ نے یک مشت پچیس یا پچاس گرام کی لے کر آتا تھا تو اس کا اپنا حصہ بھی نکل جاتا تھا اور دوسرے لوگ بھی سمجھتے تھے کہ ہمیں یہیں مل رہا ہے، کہیں اور نہیں جانا پڑ رہا۔ سہراب گوٹھ یا ناظم آباد نہیں جانا پڑے گا۔ تو ان لوگوں کی پوری چین سی ہوتی ہے، اگر وہ ایک آدمی کو کہہ دے گا کہ ہاں، میرے پاس ہے تو وہ دوسرے کو کہہ دے گا کہ تو وہاں نہیں جا، وہ دو نمبر گلی میں فلاں آدمی ہے وہ بیچ رہا ہے، اس سے لے لو اور اس کا مال بھی اچھا ہے۔ تو اس طرح سب تک خبر پہنچ جاتی ہے۔

بیچنے کے لیے لانے میں ایک میرا ایکسپیرینس ہے۔ ایک پٹھان تھا جو حسن اسکوائر پر رہتا تھا۔ میرا ایک دوست کالج میں میرے ساتھ پڑھتا تھا تو اس سے میں نے ذکر کیا کہ یار، ہمارے علاقے میں یہ کام ہو رہا ہے۔ اس وقت میں شراب کے کام میں کافی ہوشیار تھا، لے کر آتا تھا اور بیچتا تھا۔ روزانہ کی تقریباً آٹھ دس بوتلیں نکل جاتی تھیں۔ میرے دوست نے کہا کہ ایک پٹھان ہے میرا جاننے والا، اگر وہ تمہیں دے دے تو تمہیں یک چکر کے کم از کم چار سو پانچ سو مل جائیں گے۔ میں نے بھی کہا، چلو ٹھیک ہے، پیسے بھی ملیں گے اور خطرہ بھی نہیں ہے، تو میں یہ کام کر لیتا ہوں۔ تو میں کالج سے سیدھا اس کے گھر جاتا تھا۔ تو اس نے کہا کہ یہ جرنل جو ہے تمہارا، اس میں رکھ دیا کرو۔ تو میرا اس مضمون کا جو جرنل تھا، اس میں وہ پڑیاں اور پیکٹ پچیس گرام والے رکھ کر لے آتا تھا اور دوسری جگہ جا کر بیچ آتا تھا۔ اس طرح

Scanned with CamScanner

وہ بھی کمیشن دے دیتے تھے۔ اس طرح تقریباً ایک مہینہ یہ کام کیا۔ یہ تو سے غلط ہی لیکن میرا یہ جسٹ شارٹ ٹرم تھا۔ اس وجہ سے پولیس تک تو بات نہیں پہنچی۔ لیکن وسکی کا میرا کافی لمبا پیریڈ تھا اور اس میں میں پولیس والوں کے ساتھ کافی اِنچ رہا۔ … اس وقت میں تین چار دفعہ پکڑا گیا

ایک دفعہ تو جیسے ہی اسٹور سے نکلے، پکڑے گئے۔ پرمٹ ہوتا تھا اور پرمٹ پر تین بوتلیں ملتی تھیں لیکن ہمیں کچھ پرمٹ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی اور اسٹور والے ہمیں ٹکٹ پر دے دیتے تھے۔ جیسے ہی ہم اسٹور کی حدود سے نکلے تو پولیس نے ہمیں پکڑ لیا۔ میں تھا اور میرا ساتھی تھا۔ مجھے وہ کہنے لگے کہ تو چل ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن۔ میں نے کہا ٹھیک ہے صاحب اور اس سے کہا تم جاؤ، میں ان کے ساتھ جاتا ہوں۔ وہ لوگ پولیس اسٹیشن لے گئے اور مجھے وہاں بند کر دیا۔ بعد میں مجھے کہنے لگے، قصور تیرا نہیں ہے، جو تمہیں دیتا ہے قصور اس کا ہے، تو تمہیں گواہ بن جانا ہے اسٹیٹ سے۔ انہوں نے اور ایف آئی آر اسٹور والوں کی کاٹنی ہے۔ اصل میں ان کا پیسا چل رہا تھا۔ وہ اسٹور والوں سے ہفتہ لیتے تھے اور اسٹور والے ہفتہ دیتے نہیں تھے۔ جب یہ اسٹور کا مالک آیا، اس نے جتنے کی بات کی اور مجھے بھی چھوڑ دیا۔ یہ بالکل ایک دو گھنٹے میں نہیں … کے بعد میں واپس گھر آ گیا۔ لیکن جیسے میں وڈالا اسٹیشن پر ہوا کرتا تھا اور ہم بیچتے تھے … تو … کی … ہوتی … یہ … یہاں سے مل رہی ہے۔ تو ایک دو دفعہ جو ہمارے کسٹمر ہوا کرتے تھے … کہاں سے لے کر آتے ہیں؟ … بھی وہ وڈالا اسٹیشن … لے کر آتے ہیں۔ وہ میرے پاس آتے تو … اس وجہ سے … اور ہم لوگوں سے کسی … بات نہیں ہے۔ وہیں وڈالا اسٹیشن میں ہی چار سو روپیہ دیا اور پولیس والے چلے گئے۔ تیسرا … ایک دفعہ … اور میرا دوست … تھے۔ ایک اور دوست کے ہاں … نے مجھے … وہسکی لے آؤ، ہم کھانے کا سامان لے آتے ہیں اور وہیں بیٹھ کر کھانا کھا لیں گے۔ میں … قریب کے موڑ پر پولیس موبائل کھڑی تھی۔ ہم … انھوں نے مجھے … کہ میرے پاس شراب ہے … چھوٹے پانچ … ہیں۔ میں … وہ … بات ہے۔ انھوں نے موبائل میں سے بلایا … میرے دوست … پیسے … دے۔ … پیسے نہیں تھے۔ پولیس نے ہمیں پکڑ لیا۔ … انھوں نے کہا یہ شراب ہے تمہارے پاس، تم … انھوں نے میری ایف آئی آر کاٹ دی … پولیس کے ساتھ میں … بس … ایسا کرو کہ … دیا کریں … وہ خود آتے تھے، … اس وجہ سے پولیس کی طرف سے پریشانی نہیں رہی۔ لیکن یہ

ایک پیریڈ تھا کہ یہ کام مجھ سے ہوئے۔ جیسے جیسے میں نے اپنے آپ میں تبدیلی لانی شروع کی تو میں نے یہ کام بالکل بند کر دیا۔ لیکن یہ پولیس والے تو نہیں مانتے کہ آپ نے بند کر دیا ہے۔ ان کو تو یہ ہونا ہے کہ ابھی آپ کام کریں، ہمیں ہمارا شیئر چاہیے۔ پولیس والے میرے پاس آئے تو میں نے کہا کہ بند کر دیا ہے۔ جب تک یہ کام کیا آپ کو بتا دیا ہے۔ اب کچھ نہیں ہے تو کہاں سے دیں؟ وہ مانتے نہیں تھے۔ خیر جی، ان سے کافی تکرار ہوئی۔ اس وقت وہ چلے گئے۔ تین چار دن بعد میرے گھر چھاپا مارا۔ ایک چیز بھی میرے گھر سے نہیں ملی لیکن پھر بھی پکڑ کر لے گئے۔ پھر کچھ پیسے مجھے دینے پڑے۔ بعد میں اپنے دوست کو ساتھ لے کر گیا اور ایس پی سے بات کی۔ پھر معاملہ رفع دفع ہوا۔

میں نشے کی طرف گیا اور اس طرف سے واپس آ گیا۔ اس کی دو ہی وجوہات تھیں۔ ایک تو اس کی وجہ سے میری تعلیم ختم ہو گئی۔ میں نے شروع میں بتایا کہ میرا ایک خواب تھا، وہ ادھورا کیا بالکل ختم ہو گیا۔ مجھے پتا تھا کہ میں اب اسے حاصل نہیں کر سکتا۔ دوسرا یہ کہ شروع سے گھر والوں کی طرف سے میری کوئی سپورٹ نہیں تھی کیوں کہ گھر والے تو مجھے شروع سے منع کرتے تھے، لیکن میں تھوڑا ضدی تھا تو میں نے کسی اور کے گھر میں رکھ کر یہ وڈیو سنٹر میں رکھ کر گھر والوں کو پتا بھی نہیں چلنے دیا اور اپنے سیدھے کام کر لیے۔ لیکن گھر والوں کو جیسے ہی پتا چل گیا کہ اب یہ زیادہ آگے نکل گیا ہے تو مجھ پر پابندیاں بھی عائد ہونا شروع ہو گئیں اور ان پابندیوں کے ساتھ ساتھ میری وہ ایک ایج تھی میرج کی، کیوں کہ ہم لوگوں میں بیس بائیس برس کی عمر میں شادی ہو جاتی ہے۔ بائیس سال کی میری عمر تھی کہ گھر والوں نے رشتے کی بات کی۔ میں ویسے ہی کافی پاپولر ہو چکا تھا وسکی کے حوالے سے کہ یہ لڑکا وسکی بیچتا ہے۔ بات بھی پکی ہو گئی، دو تین ماہ کے بعد لڑکی والوں کو پتا چلا کہ یہ لڑکا وسکی بیچتا ہے، تو انھوں نے انکار کر دیا۔ تو گھر میں بھی کافی پریشانی آ گئی۔ اب وہ ہر وقت مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ تمھاری وجہ سے ایسے ہوا، اگر تم نہیں بیچتے تو آج یہ تو نہیں ہوتا۔ پھر اسی طرح میرج کے حوالے سے تین چار سال کا یہ پیریڈ گزر گیا۔ مجھے بھی کافی ٹینشن تھی کہ یہ غلط کام ہے جس کی وجہ سے رشتے کی بات میں ایسے واقعات آ جاتے ہیں۔ ایک واقعہ تو یہ ہوا کہ میری ایک جگہ بات چلی تو وڈیو سنٹر میں ہم تین چار دوست بیٹھے پی رہے تھے کہ دو آدمی آئے۔ کہنے لگے کہ جی۔ پہلے تو انھوں نے نام پوچھا۔ میں نے سمجھا کہ پولیس والے ہیں۔ کہنے لگے کہ جی، محبوب کس کا نام ہے۔ کہنے لگے کہ اچھا، پھر مجھے گھور گھور کر دیکھنا شروع کر دیا۔ کہنے لگے ہمیں فلمیں چاہییں، پنجابی کی۔ میں نے پوچھا کہ آپ پڑھے ہو؟ انھوں نے کہا ہاں، تو پنجابی فلموں کی لسٹ دے دی۔ اس آدمی کے دیکھنے کا اسٹائل اور تھا۔ اس نے لسٹ رکھ دی اور کہا، میں چلتا ہوں۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا کہ آپ ہیں کون؟ پہلے مجھے یہ بتائیں، کیوں کہ آپ فلمیں لینے تو نہیں آئے۔ تو وہ آدمی ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ میں فلمیں لینے ہی آیا ہوں اور بعد میں لے لوں گا۔ میں نے کہا نہیں، آپ نے ان میں سے ایک فلم بھی نہیں لی اور نہ مجھ سے پوچھا ہے۔ تو وہ آدمی کہنے لگا میں سلطان پور سے آیا ہوں، وہ۔ پتا نہیں اس لڑکی کا نام کیا تھا، اس کا ماموں ہوں۔ تو مجھے کافی شرمندگی

ہوئی کہ یہ بات تو ہی چل رہی ہے اور یہ ہو سکتا ہے مجھے چیک کرنے آئے ہوں اور میں ایسی حالت میں ان کے سامنے آیا ہوں۔ تو میں نے کہا اصل میں میرے دوست کی شادی تھی اور ہم لوگ یہاں پی رہے ہیں۔ وہ کہنے لگا نہیں نہیں، کوئی بات نہیں۔ میں نے ہی والدہ کو بتلا دیا۔ مجھے کافی شرمندگی ہوئی اور میری والدہ نے بھی رونا شروع کر دیا۔ میرا وہ رشتہ بھی گیا۔ اسی وجہ سے کہ سب کہتے تھے لڑکا تو پیتا بھی ہے اور پیٹتا بھی ہے۔ اس کے کچھ عرصے بعد میں نے چھوڑ دی۔ میں یہ سمجھ رہا تھا دو تین دفعہ میں نے ریکی بھی کیا تھا اس سلسلے کو لیکن پھر دوبارہ آ کر لوگ مجھے مجبور کر دیتے تھے۔ ارے یار، تو نے چھوڑ دی ہے، تیرے پاس نہیں ہے۔ چلو وہ آدمی ہے، مجھے سستی ہی دے دے گا اور اصل دل بھی دے گا۔ تو لو مجھے لا دے۔ باہر سے دوست بھی آنے تھے۔ تو میں پھر جاتا تھا اور کسی آدمی سے لا کر دے دی تو پھر دوبارہ وہ چیز ڈیولپ ہوتی تھی کہ اسی اور سے جو لا کر دیا ہے تو پہلے تو وہی رہی، تو کیوں۔ میں اپنا لے کر آؤں۔ پھر دوبارہ اسی چیز میں آ جاتا تھا۔ تو میں نے سوچا اور یہ تجربہ کیا کہ برائی اصل میں کہاں سے ہو رہی ہے۔ تو دیکھا کہ یہ وڈیو سنٹر سے بڑھ رہی ہے یہ بیماری۔ میں نے اپنا بہت سارا پیسے کا نقصان کیا اور وڈیو سنٹر کو بند کر دیا۔ کچھ اور دوست بھی تھے جنہوں نے میری مدد کی۔ جیسے ہی میں نے بند کیا، تو شروع سے میرے دل میں شوق تو تھا مختلف تنظیموں میں کام کرنے کا اور ان میں رہتے ہوئے بھی لگا ہوا تھا میرا ایجنسٹ ورمن تھا، زیادہ بہت نہیں تھا، لیکن میرے دوست تو وہی تھے جو میرے بچپن کے دوست تھے۔ جیسے ہی میں نے وڈیو سنٹر بند کیا اور فارغ ہوا تو پھر دوبارہ تنظیم میں چلا گیا اور آج تک خدا کا شکر ہے کہ اس چیز سے بچا ہوا ہوں۔

ہم پانچویں جماعت میں تھے جب عیسیٰ نگری میں آئے۔ اس وقت سے لے کر اب تک بہت سی تبدیلیاں دیکھی ہیں۔ ان میں اچھی تبدیلیاں بھی ہیں اور بری تبدیلیاں بھی۔ اصل میں یہ جو برائیاں آ رہی ہیں، اس میں یہ ہے کہ آدمی جب بالکل فارغ ہوگا تو اس کے سوچنے کا زیادہ رجحان غلط چیزوں کی طرف جائے گا۔ ویسے تو پورے پاکستان میں بے روزگاری کا مسئلہ ہے لیکن عیسیٰ نگری میں کافی زیادہ ہے۔ یہ بھی ہے کہ جوان جب بیکار ہو گئے ہیں کے ایم سی وغیرہ نے، تو بعض نے اپنی ولدیت کی ملازمت میں انٹری تو کروا دی ہے، لیکن وہ کام کرنے ہی نہیں جاتے۔ وہ اگر پڑھے لکھے بھی ہیں اور صفائی کے کام کو برا بھی سمجھتے ہیں، پھر بھی نام لکھوا دیا اور جاتے نہیں ہیں۔ گھر میں بیٹھے بٹھائے ہزار پندرہ سو روپیہ آ جاتا ہے۔ اس وجہ سے بھی ان کا رجحان غلط چیزوں کی طرف ہے۔ تاش بیٹھ کر کھیلیں گے۔ اگر جیت کر دکھا دو تو۔ اسی طرح وہ آہستہ آہستہ جوئے کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ جوئے سے ہی نکل کر۔ اگر کسی نے پیسے جیت لیے ہیں، ہزار پندرہ سو، تو دوسرے کہتے ہیں کہ آج تو نے جیتا ہے تو ہمیں پارٹی دے دے۔ تو وہ پارٹی کیا ہوگی، شراب کی ہو جائے گی۔ اسی طرح بڑھتے بڑھتے وہ آدمی مختلف برائیوں کی طرف چلا جاتا ہے۔

ان برائیوں میں ہیروئن بھی ہے، عیاشی بھی ہے۔ ہمارے علاقے میں کم سے کم دس پندرہ ہیں

جن کو ہم اپنی زبان میں زنورت کہتے ہیں۔ ... کے تو بھی کہتے ہیں۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ وہی لوگ جو زیادہ عیاشی کی طرف مائل ہوتے ہیں، شراب، ناچ گانا، یا اداکاری کی طرف شوق رکھتے ہیں، ان کی دوستی ہو جاتی ہے اور وہی عورتوں کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ ان کی ملاقات ہو جاتی ہے اور پھر ملاپ ہو جاتا ہے۔ اصل میں ترقی کے ساتھ ساتھ کچھ اچھی باتیں بھی ہوئی ہیں اور کچھ بری باتیں بھی ہوئی ہیں۔ پورے پاکستان میں، لیکن میں تو یہاں اپنے علاقے کی بات کر رہا ہوں۔ ہمارے علاقے میں ترقی ہوئی جس سے مراد یہ ہے کہ ایجوکیشن میں ترقی ہوئی، سماجی ترقی ہوئی۔ پانی نہیں تھا، گیس بجلی نہیں تھی، یہ چیزیں مل گئیں ہم کو۔ تو اس کے ساتھ ساتھ کچھ بری چیزیں بھی ڈیولپ ہوئیں۔ جیسے دیکھا ہے تو چرس پینے والے لڑکے چوری چھپے استعمال کرتے تھے جیسے اگر کوئی پی رہا ہے اور دور سے دیکھا کہ وہ آدمی آ رہا ہے تو اسے چھپا لیتے تھے۔ جیسے ہی وہ آدمی کراس ہو کر ان کے پاس سے چلا گیا، دوبارہ سگریٹ سلگانی شروع کر دی۔ اور کہیں دور کونے کھانچوں میں جمگھٹا کر بیٹھتے تھے۔ اب یہ ہے کہ پینا تو دور کی بات ہے، دوسروں کے سامنے بیچتے ہیں۔ پچھلے دنوں تو یہ تھا کہ ہمارے ایریا میں جو لڑکے بیچتے تھے، ہاتھوں میں آدھے کلو کی تھیلی ہوتی تھی اور اس میں پڑیاں ہیروئن اور چرس کی ہوتی تھیں، تو ایک طرف کھڑے ہو کر اور خریدنے والے لڑکوں کی لائن بنوا کر بیچتے تھے۔ ان کی بلا سے کوئی لیڈیز آ رہی ہیں یا کوئی معزز بندہ آ رہا ہے، یا باہر سے کوئی مہمان آ رہا ہے۔ اکثر تو ایسا ہوا کہ کسی کا کوئی مہمان آ رہا ہے باہر سے اور اس کی صحت تھوڑی سی ڈاؤن ہے تو دوسرا آدمی یہی سمجھے گا کہ یہ باہر سے آیا ہے اور پینے والا ہے تو اس سے کہتے تھے، چل بھئی لائن میں لگ جا۔ تو بس اطلاع نہیں ملی۔ لڑائی جھگڑے بھی ہوئے۔ اور دوسری برائی یہ ہے کہ ابھی ہمارے علاقے میں یہ زنورتیں بہت زیادہ ہیں۔ اور ان کا رہنے سہنے کا جو ڈھنگ ہے وہ بھی ترقی کر چکا ہے۔ شروع میں جہاں تک ہم نے دیکھا ہے کہ ہمارے علاقے میں تین چار اس قسم کے... فی الحال تو ہم آدمی ہی کہہ سکتے ہیں... تین چار آدمی تھے جن میں یہ چیزیں تھیں، عورتوں والے اسٹائل ہیں بولنے کے، چلنے پھرنے کے، یہ ان میں تھیں۔ تو اس کا یہی دیکھنے میں آیا تھا کہ گھر میں لڑکیاں زیادہ ہیں تو وہ بھی لڑکیوں کی طرح ہوتے تھے، لڑکیوں کے ساتھ کام کرتے تھے، آٹا گوندھ لیا یا برتن دھو لیے جھاڑو لگا لیا، تو اس سے وہ چیزیں پیدا ہو گئیں۔ لیکن وہ جو تین چار زنورتیں تھیں ہم نے دیکھا کہ ان کی جو ایج تھی میرج کی، اس پر ان کے گھر والوں نے ان کی شادی بھی کی، ان کے بچے بھی ہوئے لیکن وہ تھیں زنورتیں۔ لیکن اب دیکھتے ہیں کہ بارہ تیرہ سال کی عمر میں، وہ جوانی کی نشانیاں ہیں، وہ رونما ہو گئیں تو جو بڑی عمر کی زنورتیں ہیں ان کے ساتھ چلے جاتے ہیں، شامل ہو جاتے ہیں ان کے گروپ میں اور گھر سے تقریباً نکل جاتے ہیں، آوارہ ہو جاتے ہیں۔ ان زنورتوں نے گھروں کے قریب ہی اپنی جگہ بنا لی ہے۔ ہمارے علاقے میں کرائے پر مکان لے لیا، وہیں رہنا شروع کر دیا۔ وہیں ان کے برتن ہیں، کھانا پینا ہے۔ جس طرح کوئی دوسرا آدمی اپنا گھر بنا کر رکھتا ہے، اسی طرح یہ بھی اپنے گھر کو بنا سنوار کر رکھتی ہیں اور ان زنورتوں کو وہاں پر کوئی کچھ کہہ نہیں سکتی ہیں۔ تو یہ ہے کہ اب وہ شرمانے نہیں ہیں۔ اپنے گھر والوں کو بولتے ہیں ہم

Scanned with CamScanner

ہوتی ہیں۔ اپنے بھائیوں کے سامنے بھی اور ہمارے رشتہ داروں کے سامنے بھی وہی لیڈیز والے کپڑے پہنتے ہیں اور وہی لیڈیز والی چال۔ ان میں سے اکثر نے تو اپنا آپریشن تک کروالیا ہے۔ اور اب بالکل آزادی ہے۔ ہم کوئی جبر، ہم بھی کر رہے ہیں تو بالکل آزادی ہے۔ یہ چیز ڈیولپ ہوتی ہے۔

پچھلے دنوں ڈاکٹر صاحب نے سروے کیا، اس سلسلے میں وہ ان کا انٹرویو کر رہے تھے تو ہم انہیں وہاں لے کر گئے تو وہاں پتا چلا کہ ہوتی ہیں دو قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو سیکس کے حوالے سے ہیں اور دوسری وہ ہیں جو کسی کے گھر چلی گئیں، کسی کا بیٹا پیدا ہوا یا کسی کی خوشی ہے تو وہاں ناچ گا کر پیسے لے لیے۔ تو یہ ایک سماجی برائی ہے۔

شروع سے میں نے آپ کو بتلایا میرا زیادہ تر رجحان سوشل ورک کی طرف تھا۔ میں ساتویں آٹھویں کلاس میں تھا اس وقت ہمارا ایک گروپ سا ہوتا تھا آٹھ دس لڑکوں کا، کوئی آٹھویں میں تھا، کوئی نویں میں تھا۔ تو ہمارے ذہنوں میں بھی یہی کام تھا کہ علاقے کے مسائل جو بھی ہیں، ان سے نمٹنے کے لیے چھوٹا موٹا گروپ ڈیولپ کیا جائے۔ اسی زمانے میں، نبیل جاوید، جو موجودہ ایم پی اے ہیں، ان کی عیسیٰ نگری میں انٹری ہوئی۔ یہ اصل میں کوئٹہ کے رہنے والے ہیں۔ ہم لوگ چھوٹا سا گروپ بنانے کی کوشش کر رہے تھے تو یہ انٹر ہوئے۔ ہم لوگ کرکٹ کھیلتے تھے اور یہ بھی وہیں کرکٹ کھیلنے آتے تھے تو دوستی رہی۔ اور یہ ہم سے الگ ہو کر بینکنگ اور اسلحہ مارٹ کی طرف چلے گئے لیکن یہ کہ ہم لوگوں نے بھی ان کے ساتھ کام کیا۔ جیسے ہی ہم لوگ چھوٹا سا گروپ بناتے تھے تو اس میں بہت جلدی ٹوٹ پھوٹ شروع ہو جاتی تھی۔ یا تو ہم لوگ غیر تجربہ کار تھے یا کوئی چیز سوچتے تھے تو فوری طور پر کرنے کے چکر میں جاتے تھے تو اس وجہ سے گڑبڑ شروع ہو جاتی۔ مطلب یہ کہ میٹنگ نہیں ہو پاتی تھی، یا کوئی کام کرنا ہے تو اس کی پلاننگ کر لی، پھر اس کو چھوڑ دیا۔ کافی لڑکوں نے دیکھا کہ اس میں کام نہیں ہو رہا تو انہوں نے اپنی اپنی راہیں منتخب کر لیں اور ان میں چلے گئے۔ اس وجہ سے میں بھی کافی بددل ہو چکا تھا اس سوشل ورک کے چکر میں۔ کچھ لڑکوں نے سوچا کہ عیسیٰ نگری کے پلیٹ فارم پر پھر دوبارہ کوئی تنظیم بنائی جائے۔ تو اس وقت انجمن کی تنظیم موجود تھی، اسے بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرے پاس بھی آئے، سلیم کھوکھر تھا اور دو تین لڑکے اور بھی تھے۔ تو میں نے کہا کہ نہیں جی، مجھے تو کافی پریشانی ہوتی ہے، اگر یہ تنظیم تین چار ماہ چلے گی تو میں خود آ جاؤں گا، اس لیے کہ مجھے یہ تجربہ ہے کہ کوئی بھی تنظیم ہو ایک دو ماہ کے بعد بالکل بیٹھ جاتی ہے۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ میری وہ بات غلط نکلی اور انجمن کافی عرصہ چلی۔ بس پھر کچھ مشیت ہوئی کہ میں دوسری طرف چلا گیا اور آٹھ دس سال کا پیریڈ میں نے سماجی کاموں سے دور رہ کر گزارا۔ پھر غلط کام چھوڑ دیے، سوشل ورک کی طرف واپس آ گیا اور کمیونٹی انٹروینشن ٹیم کے ممبر کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اس پروجیکٹ میں کام کرتا رہا ہوں کہ علاقے کے نوجوانوں کو مثبت سرگرمیوں میں مصروف کریں تاکہ ان کو نشے کی طرف جانے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔

**

ذی شان ساحل

کراچی

اور دوسری نظمیں

سرورق اور ڈرائنگز
نفیسہ شاہ

قیمت: ۱۰۰ روپے

آج کی کتابیں
اے-۱۹، سفاری بالش، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

Scanned with CamScanner

کراچی کے مسئلے کو درست تناظر میں دیکھنے کے لیے اس امر حقیقت کا سامنا کرنا ضروری ہے کہ شہر کے تقریباً نصف باشندے کچی آبادیوں میں رہتے ہیں جنہیں غیر قانونی قرار دیا جاتا ہے جس کے باعث شہر کے وسائل پر ان غریب باشندوں کا حق سرکاری طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ان باشندوں کی تعداد، تخمینے کے مطابق شہر کی قانونی آبادی کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیزی سے بڑھ رہی ہے، اور اگر یہ رجحان جاری رہتا ہے تو آئندہ ایک دہائی کے عرصے میں شہر کی آبادی میں ان کی اکثریت ہو گی۔ چنانچہ کراچی شہر کو سمجھنے کے لیے کچی آبادیوں کا معرض وجود میں آنے کے عمل اور ان کے مسائل پر پوری توجہ دینا لازمی ہے۔ اگلے چار مضامین میں یہی کوشش کی گئی ہے۔

تسنیم احمد صدیقی حکومت سندھ کے محکمے سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے سربراہ ہیں۔ ان کا مضمون کچی آبادیوں کے قیام کے ان عوامل پر روشنی ڈالتا ہے جو کچی آبادیوں کے وجود کا باعث ہیں۔

کچی آبادیوں کو سب سے زیادہ شہر کے بیرونی علاقوں میں جہاں زمین کی قیمت تیزی سے بڑھ رہی ہو، منہدم اور بے دخلی کے خطرے کا سامنا رہتا ہے۔ حکومت جب اس زمین کے لیے غریب باشندوں سے یہ زمین خالی کرانا چاہتی ہے تو وہ اپنے گھروں کو بچانے کے لیے ہر قسم کے حربے استعمال کرتے ہیں اور اس طرح یہ تنازعہ کشمکش میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ عارف حسن اور کینتھ فرنانڈیز (Kenneth Fernandes) نے اپنے مضامین میں ایسی ہی دو آبادیوں سے متعلق تفصیلات پیش کی ہیں۔

عارف حسن کا مضمون The Sohrab Goth Massacre کے عنوان سے کراچی کے ماہنامہ ہیرالڈ کے فروری ۱۹۸۷ کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ کینتھ فرنانڈیز کا مضمون Kachi Abadis: Living on the edge کے عنوان سے شہری منصوبہ بندی کے بین الاقوامی جریدے Environment and Urbanisation کی جلد ۵ شمارہ ۱ (اپریل ۱۹۹۳) میں شائع ہوا۔

کینتھ فرنانڈیز کراچی کی مقامی تنظیم سے وابستہ ہیں جو پچھلی ایک صدی سے زائد عرصے سے کراچی میں آبادکاری اور شہری مسائل پر کام کر رہی ہے۔ وہ کراچی کے ایک غیر سرکاری ادارے Urban Resource Centre کے بانی سربراہ بھی ہیں۔ اس ادارے کا کام کراچی کے شہری مسائل اور معلومات کے بارے میں تحقیق اور دستاویزات جمع کرنا ہے جو اعداد و شمار اور معلومات کی صورت میں دستیاب کیے جاتے ہیں۔ URC کی جانب سے ایک سہ ماہی نیوز لیٹر Facts & Figures کے نام سے انگریزی اور اردو میں شائع ہوتا ہے۔

چوتھا مضمون جس میں کراچی میں سرکاری ملکیت کی زمین پر غیر قانونی قبضہ اور اس زمین کے پلاٹوں کی فروخت کے عمل، جس کے ذریعے یہ علاقے کچی آبادی میں تبدیل ہوتے ہیں، تفصیل سے روشنی ڈالتا ہے۔ یہ ایک ولندیزی محقق یان وان ڈر لنڈن (Jan van der Linden) کی تحقیق کا حاصل ہے۔ وان ڈر لنڈن ایمسٹرڈیم کی فری یونیورسٹی سے وابستہ ہیں اور ۱۹۷۰ سے ۱۹۷۵ تک کراچی یونیورسٹی کے تعاون سے مشترکہ تحقیقی پروجیکٹ ORP IV کے تحت کراچی میں شہری سہولتوں کی صورت حال کے موضوع پر چند کتابیں لکھ چکے ہیں۔ اس پروجیکٹ کے تحقیقی مقالات کا مجموعہ Karachi: Migrants, Housing and Housing Policy کے عنوان سے ۱۹۹۱ میں لاہور سے شائع ہوا۔ زیر نظر مضمون اسی کتاب سے لیا گیا ہے۔

تسنیم احمد صدیقی

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

کچی آبادیاں کیوں؟

کچی آبادیاں آخر کیوں بنتی ہیں؟ آخر تمام شہری عمدہ مکانوں میں، منصوبہ بندی سے بنائے گئے محلوں میں، تمام شہری سہولتوں کے ساتھ کیوں نہیں رہ سکتے؟ کیا لوگ خواہ مخواہ پسماندہ بستیوں میں رہتے ہیں؟ کیا یہ کچی آبادیوں کے باشندوں کا قصور ہے کہ وہ وہاں رہنے لگتے ہیں یا وہ کسی اور کے عمل کا نشانہ ہیں؟ اور، کیا غریبوں کا شہر میں آنا اُن کا جرم ہے یا یہ ریاست اور اس کے اداروں کی ناکامی ہے کہ انھیں ان کے آبائی علاقوں میں روزگار کے مواقع فراہم نہیں کیے جا سکے اور یوں شہروں کی آبادی بے تحاشا بڑھ گئی؟

اس مختصر مضمون میں انھیں جیسے سوالوں پر گفتگو کی گئی ہے۔

مال دار اور خوش حال درمیانہ طبقے کے لوگوں کے نزدیک کچی آبادیاں شہر کی بدصورتی ہیں اور وہ ان آبادیوں کے وجود سے نالاں ہیں۔ وجہ ظاہر ہے۔ اگر ان کے پڑوس میں کے درمیان کوئی کچی آبادی بن جائے تو ان کی جائیداد کی قیمت گھٹ جاتی ہے۔ وہ ان آبادیوں کو غلیظ اور ماحولیاتی طور پر آلودہ علاقوں کے طور پر دیکھتے ہیں جہاں ہر قسم کی سماجی برائیوں اور جرائم ـــــ منشیات، قمار بازی، عصمت فروشی وغیرہ ـــــ کے پھلنے پھولنے کے لیے سازگار ماحول ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ کچی آبادیاں سماجی اور سیاسی ہلچل کے مرکز ہیں۔

بہت سے اعلیٰ سرکاری افسر، شہری منصوبہ ساز، انجینیر اور ڈویلپر بھی کچی آبادیوں کے وجود سے متنفر ہیں۔ یہ آبادیاں ان کی حسِ جمال اور تجارتی مفادات کو ٹھیس پہنچاتی ہیں۔ وہ انھیں بل ڈوزروں سے مسمار کروا کر اس قیمتی زمین کو کثیر منزلہ عمارتوں یا خوب صورت باغات کے لیے استعمال کرنے کے خواہش مند ہیں۔ کچی آبادیوں کا وجود ان کی ناقص کارکردگی کی بھی عکاسی کرتا ہے کہ وہ شہر کے ماحول کو صاف ستھرا اور تجاوزات سے پاک رکھنے میں ناکام ہیں۔ اکثر و بیشتر یہ افراد غریب لوگوں کو آبادیوں کے قیام کا قصوروار ٹھہراتے ہیں اور غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) کو ان آبادیوں کی حمایت کا۔ یہ ایسے اداروں کے بھی خلاف ہیں جو کچی آبادیوں میں کسی ترقیاتی کام کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

بہت کم لوگوں کو احساس ہی نہیں ہوتا ہے کہ ان کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ ان سے بھی کم تعداد ان لوگوں کی ہے جو یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ آخر لوگ شہروں کا رخ کیوں کر رہے ہیں۔ کیا اپنے آبائی علاقوں کا محفوظ سماجی ماحول چھوڑ کر شہروں کی اجنبی دنیا میں قدم رکھنا آسان کام ہے جہاں دو وقت کی روٹی کے سوا کسی چیز کا آسرا نہیں؟ یہ بات جاننے کی کوئی بھی کوشش نہیں کرتا کہ یہ لوگ شہر کی لاکھوں کی آبادی میں شامل ہونے کے بعد کہاں بستے ہیں۔ انہیں رہنے کے لیے زمین اور دوسری سہولتیں پانی، ٹرانسپورٹ، بجلی کون مہیا کرتا ہے، اور کس قیمت پر؟ اور سب سے اہم بات کہ شہر میں آنے والے لوگ اپنی دو وقت کی روٹی کیسے حاصل کرتے ہیں؟

مال دار اور اوپر کے درمیانہ طبقے کے لوگ اپنے الگ تھلگ، محفوظ اور صاف ستھرے محلوں میں ہنسی خوشی رہتے ہیں جہاں ان کے لیے ٹرانسپورٹ، علاج، تعلیم کا بندوبست ہے۔ گھر میں نکاس اور فلٹر کیے ہوئے پانی کا انتظام ہے اور سپر مارکیٹوں، کلبوں، کھانے پینے اور تفریح کرنے کی عمدہ جگہوں کی دلکش دنیا موجود ہے۔ انہیں اس بات سے کچھ غرض نہیں کہ غریب کن حالات میں رہتے ہیں اور ان کی روزمرہ زندگی کی دشواریاں کیا ہیں۔ وہ بھلا انہیں اس سے غرض ہو بھی کیوں؟ یہ تو دو شہروں کی کہانی ہے: دو کلچر، دو دنیائیں، دو قومیں جو ایک دوسرے کے پاس آباد ہیں۔ دولت کی عدم مساوات کے بیچوں بیچ غریب باشندے جیتے مرتے رہتے ہیں۔ لیکن کیا کچی آبادیاں اوپر کے طبقے کے لوگوں اور شہری منصوبہ سازوں کی نظروں سے اوجھل رہ سکتی ہیں جب ان میں بسنے والے لوگ کراچی کی کل آبادی کے ۵۰ فیصد سے بڑھ چکے ہیں؟ کیا وہ ان خوش حال لوگوں کی زندگیوں میں خلل ڈالے بغیر الگ تھلگ قائم رہ سکتی ہیں؟ نہیں، اب ایسا نہیں ہو سکتا۔

کچی آبادیوں کے وجود اور ان کی بڑھتی ہوئی تعداد نے حکومت اور مال دار طبقوں کے لیے مسائل پیدا کرنے شروع کر دیے ہیں۔ جب آدھا شہر کچی آبادیوں پر مشتمل ہو ـــــ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کے رہنے والے زمین پر غیر قانونی قبضہ کیے بیٹھے ہوں، ان تمام ڈویلپمنٹ کی قیمت کا ایک پیسہ بھی سرکاری خزانے میں نہ پہنچا ہو، اور ان آبادیوں میں استعمال ہونے والے پانی، بجلی اور گیس کی قیمت ان سے متعلقہ محکموں کو نہ ملتی ہو ـــــ تو باقی آدھے شہر کے لیے مشکلات کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ جب کوئی معاشرہ اپنے کم خوش نصیب شہریوں کو جگہ دینے میں ناکام رہے تو اس کے اقتصادی نتائج تباہ کن ہو سکتے ہیں، لیکن اس مسئلے کی معنویت سمجھنے کی کسی کو فرصت نہیں۔

یہ کہانی کا ایک مکمل دائرہ ہے۔ دیہات کے غریب باشندے روزگار کی تلاش میں شہر آتے ہیں۔ سب سے پہلے انہیں زمین کا ایک ٹکڑا چاہیے جہاں کم سے کم بنیادی سہولتیں میسر ہوں اور اس زمین کی قیمت آسان قسطوں میں ادا کی جا سکے۔ یہ لوگ محنتی، باہمت اور ہوشیار ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض ماہر ہنرمند ہوتے ہیں، کچھ کا ہنر کم درجے کا ہوتا ہے۔ یہ لوگ سرکاری نوکریاں تلاش نہیں کرتے بلکہ اپنی صلاحیت سے خود روزی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر انہیں ایک چھوٹا سا پلاٹ مل جائے تو وہ اس پر اپنا

مکان تھوڑا بہت بنا کر وہاں رہنے لگتے ہیں اور اپنے وسائل استعمال کر کے اسے رفتہ رفتہ بہتر بناتے رہتے ہیں۔ وہ پانی، بجلی، گیس وغیرہ کی قیمت بھی ادا کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ لیکن حکومت انہیں رہنے کے لیے زمین مہیا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ چنانچہ وہ رہنے کے لیے قبضہ گیروں کے ہاتھوں میں جا پڑتے ہیں جو سرکاری زمین کو اپنی ملکیت ظاہر کر کے ان سے وہی قیمت وصول کرتے ہیں جو اگر حکومت اس کام کے لیے تیار ہوتی تو اسے بھی مل سکتی تھی۔

ایسا ہرگز نہیں ہے کہ کچی آبادیوں میں رہنے والے پانی، بجلی وغیرہ قیمت دیے بغیر حاصل کرتے ہیں، لیکن اصل بات یہ ہے کہ سرکاری محکمے انہیں یہ سہولتیں جائز طریقے سے مہیا نہیں کرتے۔ ان محکموں کا طریق کار بہت پیچیدہ ہے۔ بدعنوانی کا تناسب بہت زیادہ ہے۔ روز کی مزدوری کرنے والے لوگ کنکشن حاصل کرنے کے لیے ان کے دفتروں کے بے شمار چکر نہیں لگا سکتے۔ سو وہ لوگ یہ سہولتیں لائن مین اور والو آپریٹر کو مروجہ نرخ پر رقم ادا کر کے حاصل کرتے ہیں۔ انہیں قیمت ادا کیے بغیر بجلی اور پانی حاصل کرنے کا الزام دیا جاتا ہے، جبکہ وہ سرکاری نرخ سے زیادہ قیمت ادا کرتے ہیں اور استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔ اس عمل کے نتیجے میں سرکاری محکمے غریب اور ان کے اہلکار مالدار سے مالدار ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اس کی ایک مختصر سی مثال یہ ہے کہ کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن (KESC) زبردست خسارے میں چلتی ہے اور ڈویلپمنٹ اور مینٹیننس کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کی وجہ صرف کچی آبادیوں میں استعمال ہونے والی بجلی نہیں ہے۔ مالدار صنعت کار، سینماؤں، آئس فیکٹریوں، شادی ہالوں کے مالک اور اونچے گھر والے بھی بجلی چراتے ہیں؛ کارپوریشن کی لیبر یونینیں جعلی اوور ٹائم اور میڈیکل بل انتظامیہ سے زبردستی منظور کراتی ہیں؛ کارپوریشن کے اعلیٰ افسر ٹھیکے دیتے وقت بھاری کمیشن وصول کرتے ہیں۔ یہ سارا مالی بوجھ ان صارفوں کو اٹھانا پڑتا ہے جو اپنے بجلی کے بل باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں اور سخت مہنگائی اور بے تحاشا بڑھتے ہوئے سرچارج برداشت کرتے ہیں۔ اس طرح، اگر ہم مہینے بھر استعمال کی ہوئی بجلی کے بدلے کارپوریشن کو تین سو روپے ادا کرتے ہیں تو اس کا ایک تہائی حصہ محکمے کی بدعنوانی اور ناکارکردگی کی قیمت ہوتی ہے اور ایک تہائی اس چوری کی ہوئی بجلی کی جو امیروں اور غریبوں کے کام آتی۔

کچی آبادیوں کے باشندے

مقبول عام خیال کے برعکس، کچی آبادیوں کے باشندے نہ تو جرائم پیشہ ہیں، نہ منشیات فروش، نہ غیر قانونی پناہ گزین، نہ دہشت گرد اور نہ ہی بارود کے انقلابی۔ افسوس، انقلاب کے دن گزر چکے ہیں۔ یہ بالکل عام، قانون پسند، سیدھے سادے شہری ہیں جو کسی نہ کسی طرح اپنی روزی کما رہے ہیں۔ ان میں

Scanned with CamScanner

شہر نہیں کہ ان آبادیوں میں بھی سماج دشمن عناصر اور بدمعاش موجود ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کچی آبادیاں غیر قانونی پیشہ کرنے والوں کو رہنے کی جگہ دیتی ہیں۔ لیکن ان لوگوں سے کراچی کا کون سا محلہ خالی ہے؟ فرق صرف قوت برداشت کا ہے۔

سارے ہونے ملنے کو ان زبردست معاشی سرگرمی کی خبر ہی نہیں ہو پاتی جو ان کچی آبادیوں میں جاری و ساری ہے۔ دراصل یہ آبادیاں شہر بھر کی معاشی سرگرمی کی شہ رگ ہیں۔ یہی شہر کی صنعتوں کو بھی سرمایہ اور مزدور فراہم کرتی ہیں اور یہاں کے باشندے خود بھی چھوٹے پیمانے کی بے شمار اور قسم قسم کی صنعتیں چلاتے ہیں۔ یہاں تقریباً ہر مکان ایک ورکشاپ ہے جہاں پورے پورے خاندان پیداواری سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔ ان آبادیوں سے بڑے صاحب لوگوں کو ڈرائیور، بیگم صاحباؤں کو آیائیں اور ماسیاں، بڑے بیوپاری اداروں کو ٹائپسٹ اور سروس سینٹر کو ہر طرح کے کارندے ملتے ہیں۔ شہر کے عام مکینک، پلمبر، الیکٹریشین اور مزدور انہیں آبادیوں میں رہتے ہیں۔ یہ شہر میں جاری تعمیراتی سرگرمیوں کے لیے ہنر اور مزدور مہیا کرتے ہیں اور شہر کا پورا ٹرانسپورٹ کا نظام چلاتے ہیں۔ کیا کراچی جیسا بڑا شہر ان کے بغیر ایک دن بھی چل سکتا ہے؟

ملک کے دیہات اور قصبوں سے کراچی میں آ کر بسنے والے لوگ شہر کو اپنے ہنروں، تکنیکوں، ثقافتی طور طریقوں اور قدروں سے مالا مال کر رہے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو شہر کی زندگی کو متحرک رکھتے ہیں اور پاکستان کی معاشی ترقی اور ثقافتی اور لسانی یک جہتی کی کلید انہیں کے پاس ہے۔

شہر کی جانب نقلِ مکانی کے اسباب

کچی آبادیوں کے بیشتر باشندے دیہی علاقوں سے آئے ہیں جہاں ان کے لیے دو وقت کی روٹی کمانا دشوار ہو گیا تھا۔ ان کی شہروں کی طرف ہجرت کے کئی فوری اسباب ہوتے ہیں:

* موروثی زمینوں کا بٹوارہ۔
* آبادی میں سالانہ اضافے کی شرح ۳۰۲ فیصد سالانہ ہے۔
* بے تحاشا کاشت اور کیمیائی کھاد کے بڑھتے ہوئے استعمال سے زمین کا کٹاؤ بڑھ جانا، سیم اور تھور کا پھیلنا (ہر سال ہزاروں ایکڑ زمین اس طرح برباد ہوتی جا رہی ہے۔)
* جنگلات کا بے دریغ کٹنا، خاص طور پر شمالی علاقوں میں جس کے نتیجے میں سیلاب بار بار آنے لگے ہیں اور زرخیز مٹی بہہ کر جا رہی ہے۔

دیہی علاقوں میں فی کس قابلِ کاشت زمین کم ہوتی جا رہی ہے۔ ۱۹۵۱ میں فی کس قابلِ کاشت رقبہ ۴۶ء ہیکٹیئر تھا جو ۱۹۸۰ء تک کم ہو کر ۳۱ء ہیکٹیئر فی کس ہو چکا تھا۔ ۱۹۶۰ کی دہائی کے سبز انقلاب سے جتنی زیادہ پیداوار ہوئی وہ نئے بیجوں اور کیمیائی کھادوں کے استعمال سے صورت

حال میں اور شدت پیدا کی۔ زرعی سیکٹر کو مشینوں اور ٹیکنالوجی پر بہت سرمایہ لگانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خوش حال زمین داروں نے چھوٹے کسانوں کی زمینیں خرید لیں جو یہ خرچ برداشت نہ کر سکتے تھے۔

ان علاقوں میں معاشی مواقع نہ ہونے کے برابر ہے اور بے زمین ہونے والے لوگ وہاں کوئی اور پیشہ اختیار کر کے دو وقت کی روٹی حاصل نہیں کر سکتے تھے، چناں چہ انھوں نے شہروں کی طرف نقل مکانی شروع کی۔

جینے کا ہنر

جب یہ لوگ شہر میں آتے ہیں تو روزانہ اُجرت پر جسمانی محنت کا کام کرتے ہیں یا ٹھیلا چلا کر چھوٹی موٹی چیزیں بیچتے ہیں یا ایسا کوئی اور پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ اگر قسمت زور کرے تو کسی کمپنی یا سرکاری دفتر میں چپراسی یا چوکیدار لگ جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ لوگ شہر کی زندگی سے تعلق پیدا کرتے ہیں اور اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے لگتے ہیں۔ ان میں سے ہر قدم پر غیر رسمی سیکٹر ہی ان کی مدد کرتا ہے، کیوں کہ حکومت کی طرف سے کوئی تعاون یا امداد حاصل نہیں ہوتی۔ ان کی زندگی کو ذرا قریب سے دیکھیے۔ رہنے کے لیے زمین خریدنی ہو یا مکان بنانے کے لیے قرض حاصل کرنا ہو، یا ٹرانسپورٹ، پانی، بجلی وغیرہ کے مسائل حل کرنے ہوں، ہر جگہ غیر سرکاری، غیر رسمی سیکٹر ہی ان کے کام آتا ہے۔

ان کا اپنا علاج معالجے کا نظام ہے، اپنے تعلیمی ادارے ہیں، اپنی تفریح گاہیں ہیں۔ ان میں سے ہر چیز ان کی مالی استطاعت کے مطابق ہے، گھر کے قریب واقع ہے اور رہن سہن سے ہم آہنگ ہے۔ کم ہی لوگ اس بات پر یقین کریں گے کہ کچی آبادیوں کے بیش تر والدین اپنے بچوں کو تجارتی بنیاد پر چلائے جانے والے چھوٹے اسکولوں میں بھیجتے ہیں اور فی بچہ ۲۵ سے ۶۰ روپے تک ادا کرتے ہیں۔ یہ لوگ تعلیم کی اہمیت سے آگاہ ہیں اور سرکاری پرائمری اسکولوں پر انحصار نہیں کرتے جو ایک تو ہر محلے میں موجود نہیں ہیں اور جہاں ہیں بھی وہاں ان کا معیار نہایت گھٹیا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بعض کچی آبادیوں میں خواندگی کا تناسب ۸۰ فیصد تک پہنچا ہوا ہے۔

کچی آبادیوں کی قسمیں

کراچی کی کچی آبادیوں کو مجموعی طور پر دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) پرانی کچی آبادیاں جو اس وقت وجود میں آئیں جب ہندوستان سے چھ لاکھ مہاجر شہر میں آئے۔ پھر ۱۹۵۰ کی دہائی کے وسط سے، جب کراچی میں صنعتیں قائم ہونا شروع ہوئیں، بڑی تعداد میں لوگ

Scanned with CamScanner

ملک کے شمالی علاقوں سے آ کر شہر میں بس گئے۔ دونوں موقعوں پر حکومت اتنی بڑی تعداد میں بے روزگار اور بے گھر لوگوں کا بندوبست کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ چنانچہ دونوں موقعوں پر انہوں نے شہر کے مرکزی علاقے کے آس پاس کی خالی جگہوں پر قبضہ کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تب یہ سرگرمی بالکل خود رو طور پر ہوئی اور اس عمل میں دلالوں یا قبضہ گیروں کا کوئی حصہ نہ تھا۔ اس طرح آباد ہونے والے محلے بغیر کسی منصوبہ بندی کے، بالکل بے ترتیبی سے اور ان میں سڑکوں یا سہولتوں کی فراہمی کی کوئی گنجائش نہ رکھی گئی۔

(۲) ۱۹۷۰ء کے آس پاس، اور خصوصاً مشرقی پاکستان کے الگ ہونے کے بعد، مہاجروں کی ایک نئی لہر کراچی میں داخل ہوئی۔ حکومت ان بہاریوں کا پوری طرح بندوبست کرنے کے قابل نہیں تھی۔ تب ایک نیا عمل شروع ہوا۔ رہائش کی ان ضرورتوں اور ملک کے پیدا ہونے سے پیشہ ور قبضہ گیروں اور دلالوں پر مشتمل ایک نیا طبقہ وجود میں آیا۔ انہوں نے پھیلتے ہوئے شہر کی بیرونی سرحدوں پر واقع سرکاری زمین کے بڑے بڑے قطعات پر قبضہ کرایا اور ان پر غریب اور کم آمدنی والے لوگوں کے لیے چھوٹے چھوٹے پلاٹ بنائے۔ اس منصوبہ بندی میں انہوں نے کے ڈی اے کے طریقوں کی پیروی کی اور سیدھی سڑکوں، تجارتی علاقوں اور شہری سہولتوں کے لیے کھلی جگہوں کا انتظام رکھا۔ ضرورت مند لوگ انہیں نقد قیمت ادا کرتے اور انہیں اپنے پلاٹ کا فوری قبضہ مل جاتا۔ کوئی کاغذی کارروائی حائل نہ ہوتی۔ تمام سہولتیں انہیں آہستہ آہستہ اور طویل عرصے میں فراہم ہوتیں۔ یہ ملیر، قصبہ، اورنگی اور لانڈھی کی بڑی کچی آبادیوں کی ابتدا تھی۔

کچی آبادیوں کا ظہور شہر کے غریب باشندوں کی رہائشی ضرورتوں کا ایک حل ہے جو غیر رسمی سیکٹر نے پیش کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ شہر کی بڑھتی ہوئی حقیقت پسندانہ منصوبہ بندی کرنے کے سلسلے میں معاشرے کی ناکامی کا بھی مظہر ہے۔ اگر ہمارا معاشی نظام معاشرے کے تمام طبقوں کی ترقی کو مد نظر رکھتا، منصفانہ ہوتا اور تمام طبقوں کی سماجی اور معاشی حالت بہتر ہوتی تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کراچی شہر میں اس وقت ایک بھی کچی آبادی نہ ہوتی۔ کراچی شہر جسے ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کے اس خطے کا سب سے صاف ستھرا شہر کہا جاتا تھا۔ لیکن اگر اس شہر کی منصوبہ بندی پر شروع سے طاقتور ذہنیت والوں، ٹھیکیداروں، لینڈ مافیا، پیشہ ور سیاست دانوں اور نا اہل بدعنوان اور بے کردار سرکاری عہدیداروں کی بالادستی رہی ہوتی تو آج یہ شہر اس سے کہیں زیادہ بری حالت میں ہوتا۔

کچی آبادیوں کی مستقلی

۱۹۷۵ء سے اب تک کچی آبادیوں کی مستقلی وفاقی حکومت کی ریاستی پالیسی میں شامل ہے۔ اس سے پہلے حکومت کی کوشش یہ تھی کہ شہر سے ان آبادیوں کو ختم کر کے انہیں دور کے مضافاتی علاقوں میں مکان فراہم کیے

جائیں (جیسا کہ ۶۰-۱۹۵۹ کی کورنگی سکیم تھی) یا ادھورے تعمیر شدہ مکان مہیا کیے جائیں (جیسا کہ ۱۹۷۰ کی دہائی کے میٹرووِل پروگرام کا مقصد تھا)۔ لیکن یہ کوششیں ناکام رہیں۔ کچی آبادیوں کی مستقلی کا فیصلہ کرنے کے بعد ابتدا میں میونسپل کارپوریشن کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ کچی آبادیوں کے باشندوں کو لیز اور شہری سہولتیں فراہم کرے۔ لیکن ۱۹۸۷ میں ایک نیا محکمہ سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے نام سے قائم کیا گیا جس کا کام ان تمام کارروائیوں میں ربط پیدا کرنا اور کچی آبادیوں کی مستقلی کے عمل کو تیز کرنا تھا تاکہ اسے پانچ سال کے اندر اندر پورا کیا جا سکے۔

۱۹۸۹ میں کراچی سپیشل ڈویلپمنٹ پروگرام کے تحت ۲۰۰ کچی آبادیوں کی بہتری کے لیے ۱۳ کروڑ ۶۱ لاکھ ۶۲ ہزار روپے کی رقم فراہم کی گئی۔ یہ رقم ۵ کروڑ ۲۲ لاکھ کی اس رقم کے علاوہ تھی جو سندھ کے سالانہ ترقیاتی پروگرام کے تحت رکھی گئی تھی۔

لیکن اس سب کے باوجود کچی آبادیوں کی مستقلی اور بہتری کے کام کی رفتار بہت سست تھی۔ مقامی کاؤنسلوں اور کچی آبادی اتھارٹی کی کارکردگی کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۷۵ سے ۱۹۹۳ تک کے اٹھارہ برسوں میں ۱۲۹۳ غیر قانونی بستیوں میں سے (جنھیں دسمبر ۱۹۹۰ تک کچی آبادیوں کا درجہ دیا جا چکا تھا) صرف ۱۳۲ کی بہتری کا کام مکمل ہوا ہے۔ لیز یا جائیداد کی ملکیت کے کاغذات (PEC) فراہم کرنے کا کام بھی اتنا ہی سست ہے۔ کچی آبادیوں کے ۶۱۸،۸۱۵ مکانوں میں سے صرف ۲۹،۷۲۶ مکانوں کو لیز اور ۳۵،۲۲۳ کو پی ای سی مل سکی ہے۔ یہ رفتار ایک فیصد سالانہ سے بھی ذرا کم ہے۔ اس رفتار سے سندھ کی تمام کچی آبادیوں کو بہتر بنانے میں سو سال لگیں گے، بشرطیکہ اس عرصے میں کوئی نئی کچی آبادی وجود میں نہ آئے۔

اپنی ناکارکردگی، نااہلی اور بے بصیرتی کو تسلیم کرنے کے بجائے کچی آبادیوں سے متعلق سرکاری محکموں کے افسروں نے کچی آبادیوں کے باشندوں کے بارے میں کچھ عجیب و غریب اور غلط تصورات پھیلا دیے ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) کچی آبادیوں کے باشندے لیز حاصل کرنا ہی نہیں چاہتے۔ چوں کہ حکومت کے اعلان ہی سے ان کو زمین اپنے قبضے میں رکھنے کا غیر دستاویزی حق مل جاتا ہے، اس لیے انھیں دستاویزات حاصل کرنے سے کوئی دل چسپی نہیں رہتی۔

(۲) وہ اس قدر غریب ہیں کہ لیز کی رقم ادا نہیں کر سکتے۔ یہ رقم ان کی استطاعت سے باہر ہے۔ اگر اسے کم بھی کر دیا جائے تو وہ اتنی بچت نہیں کر سکتے کہ یہ رقم ادا کر سکیں۔

(۳) سرکاری محکموں اور لوکل کاؤنسلوں کے پاس وسائل اتنے کم ہیں کہ وہ تمام آبادیوں کی مستقلی اور بہتری کا کام انجام نہیں دے سکتے۔

ان تصورات کی جانچ کے لیے اکتوبر ۱۹۹۰ میں سندھ کچی آبادی اتھارٹی کی طرف سے لیز جاری کرنے کا ایک چھوٹا سا آزمائشی پروجیکٹ شروع کیا گیا۔ کراچی کی چار، اور حیدرآباد اور سکھر کی دو دو کچی

Scanned with CamScanner

آبادیوں کو اس مقصد سے منتخب کیا گیا۔ اسی دوران ترقیاتی سروے کے کام کے لیے کراچی اور سکھر کی چند کچی آبادیاں چنی گئیں اور ان آبادیوں کی بیرونی ترقیاتی تعمیر کے سلسلے میں یونیسف اور اورنگی پائلٹ پروجیکٹ نے لوگوں سے کم لاگت کے منصوبے تیار کر لیے۔

لیز جاری کرنے کا کام شروع کرنے سے پہلے اس بات کی تحقیق کی گئی کہ درخواست گزاروں کو لیز جاری کرنے کی راہ میں کیا رکاوٹیں ہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ ان کو لیز حاصل کرنے کی کوشش سے جو چیز باز رکھتی ہے وہ ان میں دلچسپی یا لیز کی رقم ادا کرنے کی صلاحیت کا فقدان نہیں بلکہ صرف لیز کا پیچیدہ طریق کار ہے۔ لیز جاری کرنے کے نظام میں مندرجہ ذیل خامیاں پائی گئیں:

(۱) طریق کار نہایت پیچیدہ و دشوار ہے۔ درخواست گزار کو اس پورے عمل میں کم از کم دس مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہر مرحلے پر مختلف دفتروں کے کئی چکر لگانے پڑتے ہیں۔ لیز کی منظوری میں دو تین مہینے لگ جاتے ہیں۔ درخواست گزار عموماً روز کی اجرت پر کام کرنے والے لوگ ہوتے ہیں اور اپنا کام چھوڑ چھوڑ کر نہیں آ سکتے۔ وہ آبادی کی حالت کے لحاظ سے پانچ سو سے دو ہزار روپے تک اس مختلف مرحلوں پر مختلف سرکاری اہلکار رشوت کے طور پر مانگتے ہیں۔ بعض صورتوں میں رشوت کی رقم لیز کی سرکاری رقم کے برابر پہنچ جاتی ہے۔

(۲) آبادی میں ترقیاتی کام کا طریق کار نہایت ناقص ہے۔ یہ بہت مہنگا بھی پڑتا ہے کیوں کہ بیشتر صورتوں میں نہ تو پہلے سے موجود ترقیاتی صورت حال کا جائزہ لیا جاتا ہے اور نہ لاگت کم کرنے کے لیے ڈیزائن میں تبدیلی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تعمیری کام ناقص ہوتا ہے کیوں کہ نگرانی نہیں کی جاتی۔

(۳) سڑکوں کو چوڑا کرنے کے لیے غیر ضروری اقدام کیے جاتے ہیں۔ اگر اس سے متاثر ہونے والے باشندوں آبادی کے بیس پچیس فیصد لوگ ہوں تو وہ باقی باشندوں کو لیز کی درخواست نہ دینے پر آمادہ کر لیتے ہیں۔ ان متاثرہ خاندانوں کی رہائش کا متبادل انتظام کرنا بھی بہت دشوار کام ہے۔ عموماً اس مقصد کے لیے زمین موجود ہی نہیں ہوتی۔

ان مشکلات سے نمٹنے کے لیے پورے عمل پر نظر ثانی کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اصل مقصد ناکامی کے اسباب کو دور کر کے لیز جاری کرنے کے کام کو تیز کرنا تھا۔ اس کے پیش نظر مندرجہ ذیل فیصلے کیے گئے اور انھیں تیزی سے عمل میں لایا گیا:

(۱) کام کو دفتروں میں محدود رکھنے کا سلسلہ ختم کیا گیا۔ فیصلہ ہوا کہ لوگ درخواستیں لے کر افسروں کے پاس نہ آئیں بلکہ افسر خود ان کے پاس جائیں۔ چنانچہ کچی آبادیوں میں لیز کیمپ لگائے جاتے ہیں اور وہیں تمام دفتری کارروائی کیمپ میں کی جاتی ہے۔ چھوٹے موٹے تنازعات لیز کیمپ کا سربراہ موقعے پر ہی آبادی کے باشندوں سے مل کر حل کرلے۔ صرف بڑے معاملات اور پالیسی پر اثر ڈالنے والے فیصلوں کے لیے ڈائرکٹر جنرل سے رجوع کیا جائے

(۲) لیز جاری کرنے کے مرحلوں کی تعداد کو کم سے کم کر دیا جائے۔

(۳) تمام طریق کار بالکل شفاف ہوں۔ لوگوں کو پوسٹروں، پمفلٹوں اور اعلانوں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی جائیں۔

(۴) آبادی کے باشندوں اور ان کے نمایاں افراد کو لیز کے کام میں شامل کیا جائے۔ وہ ایک کمیٹی بنا کر کام کے مختلف مرحلوں کی نگرانی کریں۔

(۵) انہدام صرف وہاں کیا جائے جہاں ناگزیر ہو کیوں کہ اکثر صورتوں میں یہ نہ صرف غیر ضروری ہوتا ہے بلکہ لوگ اپنے قبضے کا فالتو رقبہ چھوڑنے پر آسانی سے راضی بھی نہیں ہوتے۔

(۶) لیز کی رقم کو آبادی کے باشندوں کی مالی حالت کے مطابق رکھنے کے لیے ہر کچی آبادی کو ایک علیحدہ اکائی کے طور پر دیکھا جائے۔ اس مقصد کے لیے اس سارے ترقیاتی کام کو پیش نظر رکھا جائے جو لوکل کاؤنسلیں یا کاؤنسلر اپنے ترقیاتی فنڈ سے وہاں پہلے ہی کر چکے ہیں۔

(۷) ترقیاتی کام کی لاگت کو مدنظر رکھنے کے لیے جہاں کہیں ممکن ہو ڈزائن میں تبدیلی پر غور کیا جائے۔ اس طرح ترقیاتی کام کے لیے رقم کی کمی نہیں ہوگی اور وہ خود کفیل رہ سکے گا، کیوں کہ حکومت نے زمین کی قیمت دس روپے فی مربع گز بہت معقول رکھی ہے۔

(۸) معلوم ہو کہ آبادی کی مستقلی کا کام شروع کرنے سے پہلے صرف تین چیزوں کی معلومات درکار ہونا ضروری ہے: (الف) آبادی کا حالیہ نقشہ، (ب) ترقیاتی کام کا نقشہ اور (۳) فیلڈ بک جس میں ہر پلاٹ اور اس کے مالک کے بارے میں درست معلومات درج ہوں۔

یہ سب جوں ہی نافذ کیے گئے وہاں لیز کی درخواستیں دینے اور لیز کی رقم کے چالان جمع کرانے والوں کی بھیڑ لگ گئی۔ آٹھ مہینے سے کم وقت میں سعید آباد کچی آبادی اپنی تاریخ میں پہلی بار مالی طور پر خود کفیل ہو گئی۔ اس مختصر مدت میں اس نے لیز کی رقم کی مد میں ۸۹ لاکھ ۷۶ ہزار روپے جمع کیے جو اس کے سال بھر کے بجٹ کے برابر ہے۔ اس آزمائشی پروجیکٹ کے نتائج نے کچی آبادیوں کے باشندوں کے بارے میں تمام غلط تصورات کی نفی کر دی۔

**

عارف حسن

انگریزی سے ترجمہ: افضال احمد سید

سہراب گوٹھ کا انہدام

سہراب گوٹھ میں آپریشن ۱۲ دسمبر ۱۹۸۶ کو، علی گڑھ کالونی کے قتل و غارت کے دو دن بعد، شروع ہوا۔ یہ لسانی بنیادوں کا نہیں بلکہ گھروں، معاشی سرگرمیوں، کمیونٹی تنظیموں، تعلیم اور صحت کے اداروں اور کچی آبادی کی مسجدوں اور دستوں کا قتل عام تھا جو یہاں ۱۹۷۳ سے ترقی کرتی آئی تھی۔ یہ اپنے طرزِ معاشرت کی روایات کو مستحکم بنائے رکھنے کی ان کی سولہ سالہ جدوجہد کا قتل عام تھا جس پر انھوں نے ساٹھ لاکھ سے زیادہ روپے صرف کیے تھے۔ یہ قتل عام علی گڑھ کالونی کے قتل عام کے برخلاف، مافیا کے قاتل گروہوں نے نہیں بلکہ حکومت پاکستان نے، کچی آبادی کے مکینوں سے کیے ہوئے اپنے وعدوں، عوام کے بنیادی حقوق اور ریاستی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، کیا تھا۔

اس قتل عام سے ۳۰۰۰ پاکستانی اور ۱۲۰۰۰ کے قریب کوچی خاندان متاثر ہوئے۔ انھیں بے دخل کر کے سپر ہائی وے پر بنائے گئے تین کیمپوں میں منتقل کیا گیا، جہاں وہ خانہ بدوشوں کی طرح کھلے آسمان کے نیچے پڑے رہے۔

کوچی، کوچی یا پاوندے بھی کہلاتے ہیں۔ تاریخی طور پر یہ خانہ بدوش تھے جو موسم گرما میں وسط ایشیائی سطح مرتفع سے ہندوستان کے میدانی علاقوں کو ہجرت کیا کرتے اور موسم بہار کے آخر میں وسط ایشیا کو لوٹ جاتے۔ ۱۹۲۰ میں برٹش حکومت نے ان کی نقل و حرکت سرحد تک محدود کر دی۔ ۱۹۴۷ میں قیام پاکستان کے بعد سے ان کے لیے سرحد عبور کر کے ہندوستان جانا ممکن نہیں رہا۔ ۱۹۶۰ میں حکومت پاکستان نے ان کی ڈیورنڈ لائن کے ساتھ نقل و حرکت پر پابندی عائد کر دی۔ ان میں سے بہت سے لوگ قبائلی علاقوں اور صوبہ سرحد میں بس گئے اور پاکستانی شہری بن گئے۔

تمام خانہ بدوش گروہوں کی طرح کوچیوں کے پاس بھی کسی قسم کی منقولہ جائیداد (مثلاً زمین یا ملازمت) نہیں تھی۔ وہ مستقل آباد لوگوں سے، جن کے علاقوں سے ان کی آمد و رفت رہی ہے، انھیں ہمیشہ مشکوک سمجھا۔ ان کی چند دہائیوں کے دوران وسط ایشیا سے لوٹ کر میدانی ہندوستان تک آتے ہوئے وہ اپنے ساتھ سوتی کپڑے لے جاتے۔ واپسی پر وسطی ایشیا کے قالین، ریشمی کپڑے اور گھریلو

Scanned with CamScanner

اشیائے صرف کے فروخت کرنے والے بن گئے اور آج بھی پاکستان کے طول و عرض میں، ان میں سے کئی گھر گھر گھوم کر یہ اشیا فروخت کرتے ہیں۔

۱۹۷۱ میں تقریباً ۸۰۰ آکاخیل خاندان پشاور کے کوہی بارا سے نقل مکانی کر کے کراچی آ گئے۔ کراچی میں خانہ بدوشوں کے خلاف تعصب صوبہ سرحد کی بہ نسبت کم تھا اور یہاں بہتر معاشی مواقع میسر تھے۔ ابتدا میں انھوں نے ابراہیم حیدری میں ایک خیمہ بستی بسائی مگر ۱۹۷۲ کے اوائل میں وہ اپنے خیموں کو سہراب گوٹھ کے قریب لے گئے جو سپر ہائی وے پر بلوچوں کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ برادری کا ایک بزرگ حاجی فتح خان نے اس مقام کو منتخب کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا، "کوچی ہمیشہ شہر سے دور رہا کرتے ہیں اور ان دنوں یہ جگہ ایک ویرانہ تھی۔ ابھی نہ گلشن آباد ہوا تھا اور نہ پلازہ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ جگہ سڑک کے ساتھ تھی اور اس طرح ہم شہر تک اپنی اشیا فروخت کرنے آسانی سے جا سکتے تھے۔"

خیموں کی جگہ بتدریج مٹی کی دیواروں اور چٹائی کی چھتوں نے لے لی۔ پھر مٹی کی دیواروں اور چٹائی کی چھتوں کی جگہ کنکریٹ کے بلاک اور ٹین کی چھتیں آ گئیں۔ ابتدائی چند برسوں تک پانی شاہراہ پاکستان کے واٹر پمپ سے خرید کر گدھا گاڑیوں پر بستی میں لایا جاتا تھا۔ ۱۹۷۸ میں بستی کے مکینوں کی طرف سے ایک کوچی بزرگ حاجی حسن نے حکومت کو پانی کی فراہمی کے لیے درخواست دی۔ ایک سال بعد بلدیاتی اداروں کے انتخابات منعقد ہوئے اور اس بستی کا ایک باشندہ عارزہ خان کاؤنسلر بن گیا۔ اس کی کوششوں سے ڈسٹرکٹ کاؤنسل نے سہراب گوٹھ میں، جسے کوچی حاجی حسن کالونی لکھنا پسند کرتے تھے، ۱۹۸۰ میں پانی کی ایک مین لائن بچھائی۔ مین لائن سے گلیوں یا گھروں تک کنکشن لوگوں نے اپنے اخراجات سے پہنچائے۔ اس سسٹم کی نگہداشت کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ حکام پر بجلی کی فراہمی کے لیے دباؤ ڈالا گیا اور جس وقت دسمبر ۱۹۸۶ میں آبادی کو بے دخل کیا گیا، یہاں تقریباً آدھے سے زیادہ گھروں میں بجلی کے میٹر نصب ہو چکے تھے اور کے ای ایس سی کو بل باقاعدگی سے ادا کیے جا رہے تھے۔

جب شہر سپر ہائی وے کی طرف پھیلنے لگا، کوچیوں نے اپنی بستی کو ایک بازار میں تبدیل کر دیا۔ ۱۹۷۸ تک کراچی کے ہر علاقے سے لوگوں نے وہاں جا کر درآمد شدہ کپڑے اور کراکری خریدنا شروع کر دیا اور آکاخیل گشت لگا کر چیزیں بیچنے والوں کے بجائے دکان دار بن گئے۔ وہ اندر والا اور موتی دس مارکیٹ سے پاکستانی کپڑے اور کسٹم اور ایکسائز اہلکاروں سے غیر ملکی کپڑے خریدتے تھے۔ رباب خان، جس نے کالونی میں پہلی دکان قائم کی، یاد کرتے ہوئے کہتا ہے، "ہماری زیادہ تر خریدار ڈیفنس اور گلشن کی بیگمات تھیں۔ وہ ہمارے ہاں اس لیے نہیں آتی تھیں کہ ہماری اشیا ارزاں تھیں بلکہ شہر سے سہراب گوٹھ تک آنا ان کے لیے ایک تفریح تھی۔" شہر کے متمول علاقوں سے اس تعلق کی بنا پر آکاخیل لوگوں کی خوش حالی میں نمایاں اضافہ ہوا۔ ان میں بہتوں نے ٹی وی اور موٹر سائیکلیں خرید لیں۔ چند لوگوں نے وی سی آر، سوزوکی پک اپ حتیٰ کہ کاریں بھی خرید لیں۔

بستی میں متعدد اسکول اور کلینک بھی قائم ہوئے۔ پہلا اسکول رجب خان نے ۱۹۷۶ میں قائم

گئی۔ اس میں چھ کلاس روم اور سات ٹیچر تھے۔ یہ ٹیچر غیر پٹھان تھے اور حاجی حسن کالونی سے باہر سے آتے تھے۔ ڈیڑھ سو سے زیادہ مسکا تیل بچے، بے دخلی کے وقت، یہاں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ٹیوشن فیس دینے کے علاوہ مسکا تیل باشندوں نے اسکول کی عمارت کو بہتر کرنے کے اخراجات بھی برداشت کیے اور کلاس روموں میں پنکھے لگوائے۔ اس علاقے میں چھ اسکول تھے اور اس کے علاوہ ۲۰ سے زیادہ مسکا تیل لڑکیاں ڈی۔ بی۔ مصطفیٰ اسکول اور ایک اور سکول میں پڑھ رہی تھیں۔

۱۹۷ میں کراچی آنے والے مسکا تیل غیر تعلیم یافتہ تھے مگر ان اسکولوں کی وجہ سے ان کے ۱۸ سال سے کم عمر کے تقریباً تمام لڑکے اور بہت سی لڑکیاں روانی سے لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ بڑے بزرگوں کے برخلاف وہ پشتو لب و لہجے کی آمیزش کے بغیر اردو بولتے ہیں۔ اب یہ سکول ڈھا دیے گئے ہیں اور ۳۲ طالب علم جنہیں اس سال بورڈ کا امتحان دینا تھا، کراچی سے ۲۷ میل دور ایک ویرانے میں پڑھتے ہیں۔

کمیونٹی نے منصوبے دخلی کے خلاف جدوجہد شروع کر رکھی تھی۔ ۱۹۷۸ میں انہیں سندھ پبلک پراپرٹی (انسداد تجاوزات) ایکٹ ۱۹۷۵ کے تحت نوٹس ملے تھے۔ ان نوٹسوں پر عمل کرانے کی کوشش نہیں کی گئی کیونکہ، کمیونٹی کے بزرگوں کے مطابق، حکام سے سمجھوتا ہو گیا تھا۔ فروری ۱۹۸۳ میں کراچی کے شیعہ سنی فسادات کے دوران شیعہ محلے اور سنی سہراب گوٹھ میں فائرنگ کا تبادلہ ہوا اور سپر ہائی وے کچھ دیر کے لیے بند ہو گیا تھا۔ اس واقعے کے نتیجے میں اس کمیونٹی کو دوبارہ نوٹس بھیجے گئے جس کے خلاف اس نے عدالت میں اپیل کی۔ گورنر ایس ایم عباسی کی اس یقین دہانی کے ساتھ کہ مسکا تیل برادری کو سہراب گوٹھ سے نہیں ہٹایا جائے گا، حکومت سے مذاکرات اختتام کو پہنچے۔ کمیونٹی کے بزرگوں کے مطابق کمشنر سرور احمد نے انہیں ایک خط لکھا تھا جس سے گورنر کی یقین دہانی کی تائید ہوتی تھی۔ یہ خط صاحب کاؤنسلر عبادہ خان کی تحویل میں ہے جسے آپریشن کے شروع ہونے کے وقت گرفتار کر لیا گیا تھا۔

۱۹۸ میں ملتان مہاجر بھی مسکا تیل بستی کے قریب وجود میں آباد ہونے لگے۔ یہ تمام تر اردو بولنے والے لوگ تھے۔ ان کی اکثریت غریب تھی اور تعمیراتی اور صنعتی مزدوروں کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ چند لوگ ہوٹلوں اور چھوٹے کاروبار کے مالک تھے۔ یہ کچے مکانوں میں رہتے تھے اور اپنا پانی واٹر پمپ سے خود بھرتے تھے۔ انہی دنوں میں دیر، باجوڑ، مردان اور سوات سے آنے والے پٹھان بھی سہراب گوٹھ کے قریب آباد ہو گئے۔ یہ مسکا تیل نہیں بلکہ محسود، پشاوری اور محمند تھے۔ ان میں بیشتر ٹرانسپورٹر یا ٹرانسپورٹ کے شعبے سے متعلق مزدور تھے۔ اس مذکورہ بستی میں کئی متمول ٹرانسپورٹر بھی آباد ہوئے اور انہوں نے یہاں اپنا کاروبار شروع کیا۔ ان کی آمد سے نئی پٹھان بستیاں منشیات اور اسلحے کی تجارت کا مرکز بن گئیں اور علاقے کے غریب لوگ ان کے خدمت گزار بن گئے۔ صرف ان کی بیٹھک کی سرگرمیوں کی وجہ سے پورا سہراب گوٹھ بدنام ہوا اور اس کے تمام باشندوں کو سزا ملی۔

Scanned with CamScanner

۷ اپریل ۱۹۸۶ کو وزیر اعظم جونیجو نے لاہور میں ایک عظیم الشان جلسے میں کچی آبادیوں کی بابت سرکاری پالیسی کا اعلان کیا۔ جونیجو نے عوام کو بتایا کہ سرکاری زمینوں پر ۲۳ مارچ ۱۹۸۵ سے قبل بننے والی ۴۰ یا اس سے زیادہ مکانوں پر مشتمل تمام کچی آبادیوں کو مستقل کر دیا جائے گا۔ اکا خیل اس اعلان سے بہت خوش ہوئے اور خاص اجتماع میں انھوں نے وزیر اعظم کے حق میں دعائیں مانگیں۔ جونیجو کے ۷ اپریل ۱۹۸۶ کے اعلان اور اس کے بعد کراچی کے میئر کے بیان کے نتیجے میں اکا خیل علاقے میں زبردست تعمیراتی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ ٹین کی چھتیں توڑ دی گئیں اور ان کی جگہ کنکریٹ کی چھتیں پڑیں، دیواروں پر پلاستر ہوئے، مٹی کے فرش کی جگہ موزائیک فرش بنے، کنکریٹ کی جالیوں کی جگہ اسٹیل اور شیشے کی کھڑکیاں بنیں۔ دکانوں میں اسٹیل کے شٹر لگے اور لوگوں نے پانی کے نکاس اور گلیوں کو پختہ بنانے کے پروگرام شروع کیے۔ جن گھروں میں بجلی نہیں تھی انھوں نے کارپوریشن کو بجلی کے کنکشن کے لیے درخواستیں دیں۔ لوگوں نے بڑی پونجی اپنے مکانوں اور ماحول کو بہتر کرنے میں لگا دی۔ گلرنگ خان نے اپنے اس مکان پر ڈیڑھ لاکھ روپے صرف کیے تھے جس پر بلڈوزر چلا دیے گئے۔ اس رقم میں سے ۹۰ ہزار روپے اس نے ایک سود خور سے حاصل کیے تھے۔ اسے یہ رقم مع سود ادا کرنی ہوگی۔ عیسیٰ خان نے اپنے مکان کی چھت اور فرش پر ۶۰ ہزار روپے صرف کیے تھے اور شیر آغا خان نے اپنی قیمتی اشیا فروخت کر کے اپنے مکان اور دکان کو ٹھیک کرایا تھا۔ یہ سب کچھ اور اس کے علاوہ افراد کا جذباتی تعلق جو اس آبادی کے ساتھ قائم تھا، دسمبر ۱۹۸۶ کے تیسرے ہفتے میں فوج کے تحفظ میں کے ڈی اے کے بلڈوزروں نے خاک میں ملا دیا۔

۱۲ دسمبر ۱۹۸۶ کی صبح سہراب گوٹھ کے لوگوں نے جاگتے ہی یہ دیکھا کہ ان کی آبادی کو فوج نے گھیر لیا ہے اور قریبی پہاڑوں کی چوٹیوں پر پوزیشن لیے جوانوں کی بندوقوں کا رخ ان کی طرف ہے۔ مسجد سے کیے جانے والے اعلان سے انھیں پتا چلا کہ وہ کرفیو میں ہیں۔ تھوڑی دیر بعد پولیس نے ان کے گھروں کی تلاشیاں لینی شروع کر دیں۔ انھیں تلاشی کا کوئی وارنٹ نہیں دکھایا گیا جو کہ ضابطہ فوجداری کے تحت لازمی ہے۔ اس تلاشی کے آپریشن کی تفصیل، جو وہاں کے باشندوں نے بیان کی، سندھ میں ڈاکوؤں کے خلاف ہونے والے آپریشن سے ملتی جلتی ہے۔ پولیس زیورات، نقدی اور تمام قیمتی اشیا چھین کر لے گئی۔ لائسنس یافتہ بندوقیں لائسنس سمیت ضبط کر لی گئیں اور ان کی کوئی رسید نہیں دی گئی۔ شناختی کارڈ اور کئی گھروں سے بجلی کے کنکشن کے کاغذات اور موٹر سائیکلوں اور سوزوکیوں کی رجسٹریشن کے کاغذات بھی چھین لیے گئے۔ ان میں سے کئی گاڑیاں کہا جاتا ہے کہ گلزار ہجری تھانے میں موجود ہیں۔ بعض قیمتی اشیا بھی جو پولیس افسروں نے اپنے جوانوں سے برآمد کی تھیں، تھانے میں ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ لوٹ کے خلاف احتجاج کرنے پر ان کو زدوکوب کیا۔ اکا خیل علاقے میں تلاشی کا عمل ۲۴ گھنٹوں تک جاری رہا، جس کے دوران لوگ کرفیو کے باعث علاقے میں محصور ہو گئے۔ اس کے بعد بلڈوزروں سے مکانوں کو گرانے کا کام شروع ہوا۔ مسجد سے اعلان ہوا تھا کہ صرف سڑک کے کنارے کے مکانات

[illegible] ہیں [illegible] کی ایک [illegible] سے [illegible] سامان [illegible] ہیں۔ ماڑی والے
کے قریب سے [illegible] صاف کرنے سے اور دوسرے علاقوں کو [illegible] کرنے کا آغاز ہوا۔
[illegible] ایک [illegible] میں لوگوں کو [illegible] کا موقع ملا اور [illegible]، کھڑکیاں،
چھتوں [illegible] کی وجہ سے [illegible] اور چھتوں کے ساتھ
[illegible] نہیں۔ [illegible] جانی نقصان کی ہو۔ [illegible] وقت پر گھر سے نہیں
[illegible] ایک [illegible] کے نیچے دب [illegible] گیا۔ [illegible] اپنے [illegible] ہوئے گھر کے
سامنے بیٹھے ہوئے [illegible] کیمپ تک لے جانے کے انتظار میں
[illegible] سے گزر رہا ہے۔

[illegible] کا [illegible] اور دوسرے پاکستانی [illegible] سرحد تک، جس کا
[illegible] نہیں [illegible] میں شہر [illegible]
[illegible] آبادی کے [illegible] کراچی کی دوسری آبادیوں میں [illegible] میں
موجود تھے۔ [illegible] کیمپ میں۔ [illegible] ایک [illegible]
[illegible] ہے۔ [illegible] گھروں کو لوٹ گئے۔ [illegible]
[illegible] تھے۔ [illegible] کے پاس چلے گئے۔ [illegible] نہیں [illegible] تھے۔ [illegible]
[illegible] میں [illegible]
ہے۔

۲۲ [illegible] کا [illegible] ماڑی والے [illegible]
[illegible] منتقل [illegible] تھے جو [illegible]
[illegible] کیمپ میں [illegible] سے بچے [illegible]۔ شروع
[illegible] ایک [illegible]۔ [illegible] سے حکومت نے ہر
کیمپ [illegible] پانی [illegible] شروع کیے۔ [illegible] کہتا ہے، پانی بہت
[illegible] پانی [illegible] زیادہ [illegible] واپس لے جاتے ہوں۔ ان
[illegible] کو دیا ہے [illegible] صرف اتنا پانی
[illegible] ہے [illegible]۔

حکومت نے [illegible] کیمپ [illegible] کر کے پلاٹ دیے جن کی قیمت تو
[illegible] پلاٹ [illegible] پانی، بجلی اور ٹرانسپورٹ کی سہولتیں اس
[illegible] کے علاوہ کیمپ ماڑی والے سے [illegible] اندر سے
[illegible] پلاٹ [illegible] نہیں لیا گیا ہے۔ چنانچہ
[illegible] کہتا ہے۔ یہاں کوئی روزگار

نہیں ہے۔ ہم فاقے سے مر جائیں گے۔ ہم اپنے بچائے ہوئے پیسے خرچ کر رہے ہیں اور صرف قریب کے فارم سے مولیاں لے کر کھا رہے ہیں۔ ان کیمپوں میں رہنے والے لوگوں کو کوئی امداد نہیں ملی۔ صرف ابتدا میں ایدھی ٹرسٹ نے چند سو آٹے کی بوریاں دی تھیں۔ کھانے پکانے کے لیے چولھوں کی قلت ہے اور جلانے کا تیل تقریباً نہیں ہے۔

کسی کو ہماری فکر نہیں۔ ہمیں ہیروئن اور اسلحے کے اسمگلروں کے ساتھ ملوث کر دیا گیا ہے۔ ہماری تذلیل کی گئی، ہمیں ختم کر دیا گیا اور فراموش کر دیا گیا۔ ہمیں پاکستان چھوڑ دینا چاہیے اور ہندوستان یا روس چلے جانا چاہیے، حاجی فتح خان کہتا ہے۔ ہمیں ان جرائم کی سزا دی گئی ہے جو ہم نے نہیں کیے تھے، بنارس خان کہتا ہے، جو پٹھان کالونی میں ایک دوست کے گھر منتقل ہو گیا ہے۔ حکومت کو علم ہے کہ اسمگلر کون ہیں۔ حکومت کے اہلکار ان کے ڈیروں میں عیاشیاں کرتے تھے اور پارٹیاں دیتے تھے اور بھتا وصول کرتے تھے۔ حکومت کے یہ دلال چوروں کی طرح آپریشن شروع ہونے سے پہلے رات کی تاریکی میں بھاگ گئے۔ انھیں ڈیفنس اور کلفٹن نے پناہ دی، اور اب بھی دے رکھی ہے۔ انھیں ہم نے پناہ نہیں دی۔"

سہراب گوٹھ کو کامیابی سے ڈھا دیا گیا اور وزیر اعلیٰ نے وعدہ کیا کہ اسے ایک خوبصورت پارک میں تبدیل کر دیا جائے گا جو غالباً خیبر کی شہر پر فتح کی علامت ہوگا۔ مگر اس بڑی آبادی کو ڈھانے کے طریقِ عمل سے اہم قانونی اور اخلاقی سوالات پیدا ہوتے ہیں، جنھیں نظر انداز کرنے کا مطلب، اور باتوں کے علاوہ، پاکستانی آئین کے آرٹیکل ۱۴ کی خلاف ورزی کی حمایت اور حوصلہ افزائی ہوگا جس میں درج ہے کہ انسان کی عزتِ نفس اور اس کے گھر کی حدود واجب الاحترام ہوں گی

پولیس کا کسی گھر میں داخل ہونے کا اختیار واضح طور پر ضابطۂ فوجداری میں متعین کر دیا گیا ہے۔ سرچ وارنٹ جاری کیے بغیر کوئی تلاشی نہیں لی جا سکتی، کراچی کے ایک ممتاز بیرسٹر کا کہنا ہے۔ اس کے علاوہ تلاشی کے دوران علاقے کے کم از کم دو معززین کی موجودگی لازمی ہے۔ حتیٰ کہ اگر تلاشی کسٹم ایکٹ ۱۹۶۹ کے تحت لی جا رہی ہو، تب بھی ضابطے کی ان شرائط کو پورا کرنا لازمی ہے۔

کوچیوں کے گھروں کی بغیر وارنٹ تلاشی لینے کا دفاع کرتے ہوئے پولیس کے کئی اعلیٰ عہدے داروں کی دلیل ہے کہ اگر تلاشی اسلحے، منشیات اور اسمگل کیے ہوئے سامان کے لیے لی جائے تو سرچ وارنٹ کی شرط نظر انداز کی جا سکتی ہے۔ مگر پنجاب ہائی کورٹ نے ۱۹۸۱ میں مقدمہ شوکت حسین بنام ذوالفقار علی میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ قانون پولیس کا اسمگل شدہ سامان کی تلاشی کے لیے بھی املاک میں داخل ہونے کا کوئی عام حق تسلیم نہیں کرتا۔ حدود آرڈر، مارشل لا حکومت نے فروری ۱۹۷۹ میں نافذ کیا تھا۔ آرڈر کے سیکشن ۲۲ میں لکھا ہے، اگر کوئی کلکٹر، سرکاری افسر یا مجسٹریٹ، اطلاع ملنے پر اور ایسی تحقیق کے بعد جو اس کے خیال میں لازمی ہو، اس بات کا یقین کرنے کی وجوہ رکھتا ہو کہ کوئی جرم سرزد ہوا ہے، تلاشی کے وارنٹ جاری کر سکتا ہے۔ سیکشن ۲۲ اور ۲۷ میں اس امر کی صراحت موجود

[illegible] اس حالت میں بھی نافذالعمل رہے گا۔ [illegible] کے متعلق جج صاحب [illegible] نے باشندوں کو کوئی [illegible] نہیں دیا گیا تھا اور [illegible] علاقے سے دو یا اس سے زیادہ [illegible] کی [illegible] کا آپریشن غیر قانونی [illegible] ہے۔

[illegible] ۱۹۷۵ [illegible] ثابت ہو سکتی ہیں۔ [illegible] کے سیکشن ۳ [illegible] باشندوں کو [illegible] کا نوٹس دیا جائے [illegible] سیکشن ۳ کے تحت متاثرہ [illegible] کو متعلقہ [illegible] نوٹس [illegible] ہے۔ حکومت [illegible] سیکشن ۳ [illegible] کے [illegible] باشندوں کے مطابق [illegible] چھوٹے [illegible] پاکستان [illegible] تمام شہریوں [illegible] سیکشن ۱۲ [illegible] کے خلاف [illegible] حیثیت سے [illegible] کے خلاف سلوک کیا جائے۔

[illegible] آپریشن [illegible] ہو اور [illegible] کوئی [illegible] حقیقت [illegible] تھے، مگر اخباروں سے [illegible] کہتا ہے۔ [illegible] تھے تاکہ عوام کے لیے [illegible] اور [illegible] تمام حصوں کے [illegible] ہے۔ [illegible] جواب بہت آسان ہے۔ [illegible] ہیں۔ [illegible] کی قیمت [illegible] جائے گی۔

[illegible] ۳۳ کے ایک حصے کے [illegible] ۱۵۰ [illegible] پلاٹ [illegible] کے ڈویلپروں کے تسلط میں [illegible] آپریشن کے خاتمے کے بعد بڑی تعداد میں لوگوں [illegible] ۵ فیصد [illegible] ۱۵ فیصد [illegible] کروڑ روپے سے زیادہ ہو

Scanned with CamScanner

کی۔

کے ڈی اے کی معروف گلزار ہجری اسکیم سپر ہائی وے پر واقع ہے۔ اس کے ۳۰۰۰ ایکڑ رقبے پر دوسری تعمیرات کے علاوہ وسیع کثیر منزلہ عمارتیں اور رہائشی کمپلیکس بنیں گے۔ مقامی حکام جو بیشتر صورتوں میں طاقتور مفادی گروہوں کے خدمت گزار ہیں، ان رہائشی علاقوں یا پسندیدہ اسکیموں تک جانے والی سڑکوں پر واقع کچی آبادیوں والے علاقوں سے ناخوش ہیں۔ کراچی میں اس طرح کچی آبادیوں کو مٹانے کی کوششیں پہلے بھی کی جا چکی ہیں۔ اس تناظر میں سہراب گوٹھ کا قتل عام بامعنی ہو جاتا ہے۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر یہ آبادی کہیں اور واقع ہوتی تو کوئی آپریشن کلین اپ نہ کیا جاتا۔

اسٹیٹ ایجنسیوں کا کہنا ہے کہ اگر کوچیوں کو ہائی وے سے زیادہ دور بسایا جاتا تو رہنوں کی قیمتیں اس سے بھی زیادہ بڑھ جاتیں۔ اگر یہ درست ہے تو ممکن ہے کہ ان کے لیے حالات اتنے دشوار بنا دیے جائیں کہ وہ دوبارہ نقل مکانی پر مجبور ہو جائیں یا دوسری صورت میں حکومت ان کی موجودہ بستی کو عارضی قرار دے کر ان کو کہیں اور بسانے کا منصوبہ بنائے۔ ان کی حتمی منزل جہاں بھی ہو، یہ حقیقت واضح ہے کہ حکومت نے کچی آبادی اور سہراب گوٹھ کے دوسرے باشندوں کے ساتھ سخت بے انصافی کی ہے۔

**

کینتھ فرنانڈیز

[illegible]

بے دخلی اور بے گھری

ملک کی معیشت اور ترقی کی آبادیوں کو ڈھانے کے لیے بلڈوزر ایک مرتبہ پھر حرکت میں آ گئے ہیں۔ بے گھری اور بے دخلی کی اس مہم سے پیدا ہونے والے ملبے میں ان مسماروں تباہ شدہ زندگیوں کی، خطرناک حد تک زیادہ روپیہ لگے تو ہیں کی، دھاندلی اور تشدد کی کہانیاں دفن ہیں۔ زیادہ تر سرکاری محکموں اور عام لوگوں کی نظر میں بھی آبادیاں غیر قانونی بستیوں سے زیادہ کچھ نہیں ہیں اور قانونی اصطلاح میں ناجائز قبضہ ہی ہے۔ لیکن ہمیں ایک احساس سے چار سمجھا جانا چاہیے، کیونکہ ریاست ہی کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ تمام ہو سکے تو ہر شہری کو سر چھپانے کی مناسب جگہ جائز طور پر فراہم کرے۔ خاص طور پر اس ناکامی کے بعد شہر کے غریب باشندوں کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنے اس مسئلے کا اپنے طور پر کوئی حل تلاش کریں۔

ان خوش حال علاقے کے نزدیک یہ بے گھری آبادی سے اس علاقے کی زمین اور مکانوں کی قیمت کم ہو جاتی ہے۔ زیادہ تر خوب صورت سامنے اور زمین کی قیمت کو کم ہونے سے بچانے یا بڑھانے کے مقصد سے بھی آبادیاں، قبضہ نوٹس پر یا کسی نوٹس کے بغیر، مسمار کر دی جاتی ہیں اور ان کے مکینوں کو بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ بیشتر صورتوں میں انہیں شہر کے دور دراز کنارے پر پھینک دیا جاتا ہے۔ حالیہ قریب میں ہونے والی بے دخلیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا محرک صرف شہر کی رہائش نہیں ہے۔ اس عمل کا ایک اہم عنصر غیر قانونی طور پر قبضہ کی گئی زمین کو خالی کروا کے مالی منافع حاصل کرنا ہے کیونکہ ان زمینوں کی قیمت پچھلے چند برسوں میں کافی بڑھ چکی ہے۔ اسے غیر قانونی قبضے سے آزاد کروا کر بہت بڑے معاملے پر تجارتی ڈویلپرز کے ہاتھ فروخت کیا جا سکتا ہے جو اس پر عالی شان مکان اور فلیٹ یا شاپنگ سنٹر تعمیر کرتے ہیں۔ اس پس منظر میں یہ سمجھنا بالکل آسان ہے کہ کچی آبادیوں کو خوش حالی اور ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ کیوں قرار دیا جاتا ہے۔

* * *

Scanned with CamScanner

کراچی میں کچی آبادیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا سبب شہر میں آنے والی مہاجرت کی دو بڑی لہریں ہیں ـــــ پاکستان کے قیام کے وقت ہندوستان سے بہت بڑی تعداد میں آنے والے مہاجر، اور روزگار کی تلاش میں بہت بڑی تعداد میں کراچی آنے والے ملک کے شمالی علاقوں کے باشندے۔ کراچی کی آبادی، جو ۱۹۴۷ میں پانچ لاکھ سے کم تھی، ۱۹۹۱ میں ایک کروڑ تک جا پہنچی۔ شہر کی آبادی میں اس شدید اضافے سے رہائش کے بےحد مسائل پیدا کیے جو اب تک موجود ہیں۔

کراچی میں آنے والے بیشتر لوگ کم آمدنی والے طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور معاشی بہتری کی تلاش میں یہاں آتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس قانونی طور پر رہائش اختیار کرنے یا قانونی طور پر ڈویلپ کیے ہوئے پلاٹ خریدنے کے لیے نہ تو رقم ہوتی ہے اور نہ انھیں ایسا کوئی موقع ملتا ہے۔ سرکاری طور پر ڈویلپ کی گئی منصوبہ بند آبادیوں میں جگہ پانے میں ناکام رہ کر وہ خالی زمینوں پر آباد ہو جاتے ہیں (عموماً یہ زمین سرکاری ملکیت ہوتی ہے) اور متعلقہ حکام سے اجازت حاصل کیے بغیر اپنے رہنے کی جگہ تعمیر کر لیتے ہیں۔ ڈویلپمنٹ یا امپروومنٹ کے محکموں کی اصطلاح میں ان آبادیوں کو سب سٹینڈرڈ علاقے اور عام زبان میں کچی آبادیاں کہا جاتا ہے۔

کراچی میں ایک تخمینے کے مطابق اس وقت ۵۵۰ کچی آبادیاں ہیں، اور ان آبادیوں میں شہر کے ۴۰ فیصد لوگ رہتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کچی آبادیاں سرکاری زمینوں پر قائم ہیں جن پر لوگوں نے جائیداد کے قانونی حقوق حاصل کیے بغیر اپنے مکان بنا لیے ہیں۔ برسوں کے عمل میں ان آبادیوں کے مکینوں نے اپنی کوششوں کے بل پر ان علاقوں کی حالت میں رفتہ رفتہ بہتری پیدا کی ہے اور بجلی، گیس اور دوسری سہولتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کے گھروں نے بھی بتدریج کچی جھونپڑیوں سے نیم پختہ یا پکے مکانوں کی صورت اختیار کی ہے۔

شہری آبادی میں تیز رفتار اضافے کے دباؤ کے باعث زمین کے خالی پلاٹوں کی قیمت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ زمینیں، جن میں سے بعض پر کچی آبادیاں ۲۵ سال سے قائم ہیں، اتنی بیش قیمت ہیں کہ انھیں خالی کرانے کے لیے ہر قسم کے حربے کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ غیر قانونی طور پر آباد کی گئی زمین کو خالی کرانے کی کوشش میں حکام ان آبادیوں کے مکینوں کی ضروریات اور حقوق کو یکسر نظرانداز کر دیتے ہیں اور ان کے ساتھ نہایت غیر انسانی برتاؤ کرتے ہیں۔ اکثر ان لوگوں کو کسی قسم کی امداد دیے بغیر نکال باہر کیا جاتا ہے۔ (اس کی مثال رحمان آباد کے مکینوں کی بے دخلی سے دی جا سکتی ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔) جب کبھی بے دخل کیے جانے والوں کو متبادل پلاٹ دیے بھی جاتے ہیں، انھیں ان کے نقصان کا کوئی مالی معاوضہ نہیں دیا جاتا۔ علاوہ ازیں انھیں اپنے مکانوں اور اپنی زندگیوں کو ازسرِنو تعمیر کرنے کے لیے قرضے کی کوئی سہولت دستیاب نہیں ہوتی۔ ان میں سے جن لوگوں کے پاس قومی شناختی کارڈ نہ ہوں انھیں متبادل پلاٹ ملنے کا بھی کوئی امکان نہیں رہتا۔

Scanned with CamScanner

* * *

حکومت کو زمینوں پر غیر قانونی قبضے یا کچی آبادیوں کے مسئلے سے نمٹنے کی کوشش کرتے ہوئے ۳۰ سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ شہر بھر میں پھیل جانے والی کچی آبادیوں سے تشویش میں مبتلا ہو کر شہری اداروں نے بے شمار اقدامات اختیار کر کے شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی کے رہائش کے مسئلے کا قابل عمل حل دریافت کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ کئی بار تحقیق کرائی گئی ہے، منصوبے تیار کیے گئے ہیں اور اس مسئلے کے حل کی کئی تجاویز تیار کی گئی ہیں لیکن یہ تمام کوششیں غیر موثر ثابت ہوئیں اور شہر کی غریب آبادی کے رہائش کے مسئلے حل نہیں کر سکیں۔

شہر کا بلدیاتی ادارہ کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن (KMC) ہے جس کے اختیارات منتخب بلدیاتی نمائندوں کی کونسل کے ذریعے استعمال ہوتے ہیں۔ دستور کے مطابق ہر چار سال بعد کونسل کے انتخابات ہوتے ہیں جو شہر کے میئر اور ڈپٹی میئر کا انتخاب کرتی ہے۔ لیکن کراچی کی ترقیاتی منصوبہ بندی اور ان منصوبوں کو نافذ کرنے کا اختیار ایک سرکاری ایجنسی کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی (KDA) کے پاس ہے جسے پیشہ ور ماہرین چلاتے ہیں اور جو عوام کو کسی بھی طرح جواب دہ نہیں ہے۔ کے ڈی اے شہر کے کسی علاقے کا منصوبہ تیار کرتی ہے اور اسے ڈویلپ کرتا ہے، جس کے بعد اس علاقے کو کے ایم سی کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اس انتظامی بندوبست کے تحت کراچی کے شہریوں، خصوصاً غریب باشندوں، کو شہر کے ترقیاتی پہلو کے فیصلوں میں کوئی براہ راست یا بالواسطہ شمولیت حاصل نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اگر صوبائی حکومت کے خیال میں کارپوریشن اپنا کام درست طریق سے انجام نہیں دے رہی یا ناکام رہے تو ایک سرکاری حکم سے بلدیاتی اداروں کے صوبائی سیکریٹری کو اسے برطرف کر دینے کا اختیار حاصل ہے۔ اس طرح کارپوریشن مکمل طور پر صوبائی حکومت کے رحم و کرم پر ہے اور شہری منصوبہ بندی اور پالیسی سازی میں مقامی شہریوں کا عمل دخل بہت ہی کم ہو جاتا ہے۔

شروع شروع میں یہ خیال کیا گیا کہ شہر کے اندر قائم کچی آبادیوں کو وہاں سے نکال کر شہر سے دور نئے علاقوں [illegible] میں منتقل کر دینا کراچی کو ترقی دینے کا بہترین طریقہ ہے۔ اس نقطہ نظر پر تیار کیے گئے منصوبے [illegible] ماسٹر پلان کے تحت غریب باشندوں کے لیے بستیاں [illegible] قیمت پر دیے جاتے تھے، لیکن وہاں مکان تعمیر ہونے کے بجائے [illegible] سٹہ بازی (speculation) کا رجحان اور [illegible] حکومت کی ناکامی اس کے سبب میں شامل تھی۔ [illegible] منصوبہ [illegible] ناکامی کا سبب یہ تھا کہ یہ منصوبہ [illegible] کا حصول

مقصد تھا۔ ان بندی منصوبوں میں غریبوں کے رہنے کے لیے جو علاقے منتخب کیے گئے وہ روزگار کی جگہوں سے بہت دور واقع تھے اور مکانوں کی رہائشی قیمت بھی ان کی استطاعت سے باہر تھی۔ حکومت نے اپنی منصوبہ بندی میں ٹرانسپورٹ اور پانی کی فراہمی کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ چنانچہ ان منصوبوں کو ناکام ہونا ہی تھا۔

شہر کو پسماندہ بستیوں (slums) سے پاک کرنے کے سرکاری عزم کا نتیجہ میٹروول پروگرام اور کچی آبادیوں کے مکینوں کے لیے فلیٹوں کی تعمیر جیسی اسکیموں کی صورت میں برآمد ہوا۔ لیکن ان اسکیموں پر آنے والی لاگت اتنی زیادہ تھی کہ یہ غریبوں کے بجائے نسبتاً خوش حال لوگوں کے کام آئیں۔ اس کے علاوہ شہر کے غریب باشندوں کی تعداد میں اضافہ اسی تیز رفتاری سے ہوا کہ حکومت کے پاس ان سب کو رہائش کی سہولت مہیا کرنے کے لیے نہ تو وسائل تھے اور نہ صلاحیت۔

لیکن ان کچی آبادیوں میں رہنے والوں کی بے پناہ تعداد ـــ جو شہر کی کل آبادی کے نصف کے قریب پہنچ رہی ہے ـــ بجائے خود انہیں ایک طرح کی سیاسی قوت عطا کر دیتی ہے۔ اب ان سب آبادیوں کو بل ڈوزروں سے مسمار کر کے ان کے مکینوں کو بے دخل کر دینا ممکن نہیں رہا۔ کوئی اور چارہ نہ پا کر حکومت نسبتاً انسان دوست فیصلے پر مجبور ہو گئی کہ ان آبادیوں کو ریگولرائز (مستقل) کر دیا جائے ـــ یعنی یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ کچی آبادیوں میں رہنے والوں کو مالکانہ حقوق دے دیے جائیں گے اور ان آبادیوں کی حالت میں بہتری پیدا کر کے ان کو انفرااسٹرکچر اور چند بنیادی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

۱۹۷۸ میں مارشل لا کا حکم نمبر ۱۸۳ نافذ کیا گیا جس کے تحت ان تمام آبادیوں کو جو یکم جنوری ۱۹۷۸ تک قائم ہو چکی تھیں ریگولرائز کیا جانا تھا۔ اس تاریخ کے بعد وجود میں آنے والی آبادیاں غیر قانونی قرار دی گئیں اور انہیں مسمار کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ ریگولرائز کی جانے والی آبادیوں میں وہ آبادیاں شامل نہیں تھیں جو بجلی کے ہائی ٹینشن تاروں کے نیچے یا دریائی زمین، رفاہی پلاٹوں یا نجی ملکیت کی زمینوں پر قائم تھیں۔ ان استثنائی شقوں کو بعد میں مفاد پرست بلڈروں نے اپنے فائدے میں استعمال کیا اور متعدد ایسی کچی آبادیوں کو بھی مسمار کرا دیا جو مارشل لا کے اس حکم کے تحت قانونی طور پر جائز قرار دیے جانے کی مستحق تھیں۔

کچی آبادیوں کو قانونی حیثیت دینے کے اس اقدام کے باوجود اسی دور میں حکومت کی جانب سے بے دخلی کی بہت بڑی مہم چلائی گئی۔ پرائیویٹ ڈویلپروں نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا اور سرکاری ملازموں کو رشوتیں دے کر نہایت بیش قیمت زمینیں اپنے لیے خالی کروائیں۔ اس عمل کے نتیجے میں بہت سی آبادیاں جنہیں ریگولرائز کیا جانا تھا مسمار کر دی گئیں اور ان کی جگہ عالی شان بنگلے اور کئی منزلہ فلیٹ تعمیر کیے گئے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ حکومت نے جو محکمے غریبوں کا رہائشی مسئلہ حل کرنے کے مقصد سے قائم

Scanned with CamScanner

دیے گئے ہیں۔ اس مقصد کی تکمیل بھی کرنے ہوتے اور تعجب ہے۔ ان کے خلاف استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔ اس کی ایک مثال ۱۹۸۰ کی دہائی کے وسط میں گلشن میں جدید شادی ہال کے سامنے قائم کچی آبادی کا انہدام ہے جہاں ۲۲ مکانات مسمار کیے گئے۔ اس آبادی کے مکینوں کو زبردستی بے دخل کیا جبکہ یہ لوگ اس آبادی میں دس برس سے زائد عرصے سے رہ رہے تھے اور انہیں مارشل لاء کے تحت ریگولرائز ہونے کا حق حاصل تھا۔ اس طرح حال ہی کی بہت سی کوششیں کی گئی ہیں جن سے تعمیر کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ سیاسی مقامی حکومتوں کی مداخلت کو کس طرح سیاسی آبادی میں اس کی تفصیل آگے پیش کی جائے گی۔

کچی آبادیوں کے مکینوں اور بہت سے گروپوں اور غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) کی طرف سے سخت تنقید اور اخبارات میں مضامین شائع ہونے پر انہدام اور بے دخلی کی اس مہم کی رفتار سست کر دی گئی۔ اپریل ۱۹۸۶ میں اس وقت کے وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ ۲۳ مارچ ۱۹۸۵ تک قائم ہونے والی کچی آبادیوں کو ریگولرائز کیا جائے گا اور ان میں بہتری پیدا کی جائے گی۔ ۱۹۸۶ ہی میں ایک آرڈیننس کے ذریعے سندھ کچی آبادی اتھارٹی (SKAA) قائم کی گئی۔ اس نے سندھ کی ۱۹۸۷ کا سندھ کچی آبادی ایکٹ جاری ہونے پر اس محکمے نے حکومت کی پالیسیوں کے مطابق کچی آبادیوں کو ریگولرائز کرنے اور ان کی حالت بہتر بنانے کا کام شروع کیا۔ اس سے پہلے یہ کام کے ڈی اے کے کچی آبادی ڈیپارٹمنٹ کے ذمے تھا۔ نئے نام سے قائم شدہ محکمے نے اعتراف کیا ہے کہ ان کی کارکردگی کی رفتار کچی آبادیوں کی تعداد کے لحاظ سے ایک فیصد سالانہ سے زیادہ نہیں ہے۔

***

کچی آبادیوں میں رہنے والے بیشتر لوگ بہت قلیل وسائل کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ روزگار کے مواقع نہ ہونے کے باعث اپنے گھروں سے نکلنے پر مجبور ہوتے ہیں اور روزی کی تلاش میں کراچی کا رخ کرتے ہیں۔ یہاں آ کر بس جاتے ہیں۔ یہ لوگ رفتہ رفتہ اپنی مالی حالت کو کسی حد تک بہتر بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں اور اپنی سخت محنت سے کمائی ہوئی زیادہ تر رقم اپنے مکانوں کو رہنے کے قابل بنانے میں صرف کرتے ہیں۔

سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے مطابق کراچی کی بیشتر کچی آبادیاں ایسی ہیں کہ انہیں ریگولرائز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن محکمے میں مالی وسائل اور افرادی قوت کی کمی اس عمل میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ مقامی کاؤنسلروں کو اپنے حلقوں میں آنے والی کچی آبادیوں کو مستقل کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اور جب کسی ان آبادیوں سے ووٹ چاہتے ہیں تو وہ ان کے مطالبوں پر کان دھرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن کچی آبادیوں میں رہنے والوں میں ان مطالبوں پر زیادہ روپے کا رجحان نہیں ہے۔ کیونکہ کسی کچی آبادی کو

طور پر لیز حاصل کرنے کا عمل بہت پیچیدہ، سست رفتار اور مہنگا ہے۔

کچی آبادیوں میں جو لوگ مالکانہ حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں مندرجہ ذیل مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے:

(۱) سب سے پہلے انہیں مقررہ فارم پر درخواست اور مطلوبہ کاغذات داخل کرنے ہوتے ہیں یعنی حلقے کے کونسلر کا جاری کیا ہوا تصدیق نامہ کہ مذکورہ پلاٹ واقعی درخواست گزار کے قبضے میں ہے، گواہوں کے دستخط، حلف نامہ، قومی شناختی کارڈ کی نقل، پلاٹ کی ملکیت کے بارے میں کسی بیان کے غلط نکلنے کی صورت میں تمام ذمے داری لینے کا اقرار نامہ، دوسری دستاویزات مثلاً راشن کارڈ اور بجلی کے بل جن سے یہ تصدیق ہوتی ہو کہ درخواست گزار واقعی اس پلاٹ پر کافی عرصے سے رہ رہا ہے۔

(۲) اس کے بعد متعلقہ محکمہ ان تمام کاغذات کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔

(۳) موقعے کا معائنہ کر کے پلاٹ کے سائز اور رہائشی استعمال کی تصدیق کی جاتی ہے۔

(۴) پھر سائٹ پلان تیار کیا جاتا ہے اور مقررہ فارم پر اس رقبے کا تخمینہ لگایا جاتا ہے جس کے مالکانہ حقوق دیے جانے ہیں۔

(۵) منظور شدہ رقبے سے باہر کی تمام تعمیرات کو درخواست گزار خود مسمار کرتا ہے۔

(۶) تب منظور شدہ رقبے پر لیز حاصل کرنے کے اخراجات کا ڈیمانڈ نوٹ جاری کیا جاتا ہے۔

(۷) درخواست گزار یہ رقم کسی سرکاری بینک میں جمع کراتا ہے۔

(۸) یہ تمام مرحلے پورے ہونے پر مالکانہ حقوق کی دستاویز (لیز ڈیڈ) جاری کی جاتی ہے جس پر درخواست گزار کو رسیدی ٹکٹ لگوانے ہوتے ہیں۔

اس عمل کے مکمل ہونے کے بعد ہی مدت کے بعد لیز حاصل ہونے میں چار پانچ یا اس سے زیادہ مہینے لگ جاتے ہیں۔ ہر مرحلے پر درخواست گزار کا سابقہ سرکاری اہلکاروں کی بدعنوانی اور دھونس سے پڑتا ہے۔ اس عمل میں اسے پچیس تیس دن لگانے پڑتے ہیں جس کا مطلب کم آمدنی والوں کے لیے اتنے دنوں کی کمائی کا نقصان ہے۔ اس کے علاوہ چار سو سے بارہ سو روپے تک رشوت کی مد میں ادا کرنے پڑتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے سندھ کچی آبادی اتھارٹی نے اس عمل کے مرحلوں کو کم کر دیا ہے اور لوگوں کو اس سے آگاہ کرنے کے لیے تشہیری مہم بھی چلائی ہے۔

اس کے باوجود کچی آبادیوں میں رہنے والے زیادہ تر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ لیز حاصل کرنے کے بجائے بجلی، پانی، نکاسی اور گلی فرشوں کی سہولتوں کا مطالبہ کرنا زیادہ آسان، اور شاید زیادہ فائدہ مند ہے۔ ان سہولتوں کے حاصل ہونے سے نہ صرف ان کی زندگی کی مشکلات کم ہو جاتی ہیں بلکہ اس طرح انہیں بے دخلی کے مستقل خطرے سے کسی قدر تحفظ حاصل ہو جاتا ہے۔

رہائش کا عدم تحفظ شہر کے غریب باشندوں کی تشویش کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔ ظاہر ہے کہ لوگ ایسی جگہ کی تعمیر و ترقی پر اپنی کمائی ہوئی رقم خرچ کرنے سے ہچکچاتے ہیں جہاں سے انہیں کبھی بھی

Scanned with CamScanner

وقت نکالا جا سکتا ہو۔ کچی بستی پر مبنی ترقی صرف سرکاری محکموں کی شرکت اور خوشحالی کے ذریعے بھی ممکن ہے۔

کچی بستی پر کام کرنے والی ایک شہری تنظیم دروس و مساف ۱۹۸۰ کی دہائی کے آغاز سے کچی آبادیوں کے مکینوں کے حق میں کام کرنے میں مصروف ہے۔ کئی موقعوں پر اس تنظیم نے آبادیوں کو مسمار ہونے سے بچانے کے لیے عدالتوں سے حکم امتناعی حاصل کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے بے دخل کیے جانے والوں کو قانونی اور دیگر مشورے بھی دیے ہیں۔ اس تنظیم کے علاوہ بعض وکیل انفرادی طور پر بھی بے دخلی کا شکار ہونے والوں کی قانونی مدد کرتے رہتے ہیں۔ اس تنظیم اور ان وکلا کا یہ کام قابلِ تعریف ہے، مگر مکینوں کی رہائش کا مسئلہ ایک ایسا موضوع ہے کہ جس پر زیادہ سے زیادہ لوگوں اور گروہوں کی حمایت کی ضرورت ہے۔ رحمان آباد کے معاملے کے خلاف کئی غیر سرکاری تنظیموں، انسانی حقوق کے اداروں اور عورتوں کی انجمنوں نے اخبارات میں سخت بیانات جاری کیے تھے۔ لیکن ان بیانات کے بعد اس آبادی کے تحفظ کے لیے کوئی دیرپا مہم نہ چلائی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسی شہری تنظیم کی غیر موجودگی اور دوسرے عناصر کی بے حسی کے باعث اس آبادی کو مسمار کر کے یہاں کے مکینوں کو بے دخل کر دیا گیا۔

***

کراچی کے باشندوں کے پانچ گروہ بے دخلی کے خطرے کی مستقل زد میں ہیں:

(۱) وہ لوگ جو نجی پلاٹوں اور حکومتی اداروں کے خالی پلاٹوں پر مقیم ہیں۔ جوں جوں ان زمینوں کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے، پرائیویٹ ڈویلپر انھیں بے دخل کروا دیتے ہیں یا یہ جگہ خرید لیتے ہیں۔

(۲) منظور شدہ کچی آبادیوں میں رہنے والے، جنھیں آبادی کو بہتر بنانے کے عمل میں اپنی جگہ چھوڑنی پڑتی ہے۔

(۳) شہر کے مرکزی علاقوں میں رہنے والے جہاں زمین کی قیمت بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ان میں شہر کے درمیان سے گزرنے والے دریائے لیاری کے دونوں کناروں پر قائم آبادیاں شامل ہیں۔

(۴) ان علاقوں میں رہنے والے جہاں بڑے بڑے ترقیاتی منصوبے شروع کیے جا رہے ہیں، مثلاً سیلاب سے بچاؤ کی اسکیمیں یا شاہراہوں کے منصوبے۔

(۵) نسلی قوموں، مثلاً بنگالیوں اور افغانوں، اور مذہبی اقلیتوں، مثلاً عیسائیوں اور ہندوؤں، کی آبادیاں۔

پچھلی دہائی میں بڑے پیمانے پر بے دخلی کی مہمیں بہت زیادہ نہیں چلیں۔ وجہ یہ تھی کہ شہری

حکومت کمزور اور اخلاقی جواز سے محروم تھی۔ جوں ہی شہر کے مدیاتی دوروں کو سیاسی جواز حاصل ہوگا، آبادیوں کے انہدام کا عمل تیز ہو جائے گا۔

بدسلوکی اور توہین سے گزرتے رہنے کے باعث شہر کے غریب باشندے خود پر اور دوسروں پر اعتماد کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ اپنی حالت کو اپنے مقدر کی خرابی قرار دیتے ہیں۔ شہر کے لیے فکرمند افراد اور گروپوں کے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ غریبوں کے اعتماد کو تقویت دینے کی کوشش کریں تاکہ وہ اپنے حقوق اور اپنا وقار حاصل کر سکیں۔ وسیع تر حمایت اور منظم مزاحمت کی غیر موجودگی میں نہ صرف پرتشدد اور غیر قانونی بے دخلیوں میں اضافہ ہونے کا امکان ہے بلکہ جبر اور تشدد کے اس رجحان کے بھی مزید زور پکڑنے کی توقع ہے۔ کراچی شہر میں صرف ایک قسم کی ترقی ہو رہی ہے جو مال دار اور طاقت ور لوگوں کے فائدے میں ہو۔ کچی آبادیوں میں رہنے والے مردوں اور عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے کوئی قانون موجود نہیں ہے۔ بلکہ اکثر صورتوں میں قانون کو شہر کے غریب باشندوں کو ان کے بنیادی حق — یعنی سر چھپانے کی جگہ — سے محروم کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ بے دخلیوں کو جائز ثابت کرنے کے لیے قوانین میں کمزور پہلو تلاش کر لیے جاتے ہیں، غیر قانونی ادائیگیاں کی جاتی ہیں اور یوں ایک اور کچی آبادی کو مسمار کر دیا جاتا ہے۔

***

۱۹۹۲ کے آغاز میں کراچی کے تقریباً دس ہزار باشندے رحمان آباد کی چھوٹی پرسکون بستی کے ۸۵۰ مکانوں میں رہ رہے تھے۔ اس بستی کی زندگی کے پچیس برسوں میں ان باشندوں نے اپنی زندگیوں کو ایک ایک اینٹ رکھ کر تعمیر کیا تھا اور قریب کے علاقوں میں روزی کما رہے تھے۔ اچانک، ۲۳ فروری ۱۹۹۲ کو، کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن کے بل ڈوزر، پولیس کی حفاظت میں وہاں آ پہنچے اور انھوں نے پوری بستی کو مسمار کر دیا۔ اس کے بعد ہونے والے واقعات میں بستی کے کئی باشندے ہلاک اور متعدد زخمی ہو گئے اور بہت سوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ بستی کی کئی عورتوں کو جبری زنا کا نشانہ بنائے جانے کی بھی اطلاعات ہیں۔ بستی کے رہنے والوں کی سیدھی سادی زندگیاں اچانک تباہی کا شکار ہو گئیں۔

رحمان آباد فیڈرل بی ایریا بلاک ۵ میں عائشہ منزل کے پیچھے واقع ایک کچی آبادی تھی جس کے ارد گرد ۳۰۰۰، ۶۰۰۰ اور ۱۰۰۰۰ [illegible] کرائے لگتے تھے۔ رحمان آباد کے مکینوں نے اپنی برسوں کی قلیل آمدنی کو جوڑ جوڑ کر اپنے کچے اور پکے مکان تعمیر کیے تھے۔ ان میں سے اکثر لوگ فیکٹریوں میں روزانہ اجرت پر کام کرنے والے مزدور، گاڑیوں کے پیچھے چیزیں [illegible] کرنے والے اور خوانچہ فروش تھے، اور کچھ عورتیں آس پاس کے بنگلوں میں گھریلو ملازماؤں کے طور پر کام کرتی تھیں۔ وہاں رہنے والے ۸۰

فیصد لوگ بنگالی، اور باقی پنجابی اور پٹھان تھے۔

[illegible]

ان میں سے بعض لوگوں کو کورنگی اور بلدیہ میں ۶۰ مربع گز کے متبادل پلاٹ دیے گئے۔ ساڑھے پانچ سو متاثرہ خاندانوں میں سے صرف چار سو کو متبادل پلاٹ الاٹ کیے گئے۔ باقی لوگوں کے پاس سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ رہی، کیوں کہ پلاٹ حاصل کرنے کے لیے قومی شناختی کارڈ کا ہونا لازمی تھا جس سے یہ لوگ محروم تھے۔ اس اثنا میں خالی کرائی گئی زمین کا صرف ایک حصہ پارک میں تبدیل کیا گیا ہے، جبکہ باقی حصے پر رہائشی پلاٹ بنا دیے گئے ہیں۔

جون ۱۹۹۲ میں کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن کو برطرف کر دیا گیا اور فوج نے شہر میں امن و امان قائم کرنے کی ذمے داری سنبھال لی۔ اس اقدام سے شہر کی انتظامیہ پر مہاجر قومی موومنٹ کی گرفت ختم ہو گئی۔ مقامی کاؤنسلر بھی اسی لسانی تنظیم سے وابستہ تھا اور رحمان آباد سے بے دخل کیے جانے والوں کو محسوس ہوا کہ اب وہ اپنے چھوڑے ہوئے علاقے میں واپس جا سکتے ہیں۔ ان میں سے کچھ نے اس زمین پر جھگیاں ڈال لیں اور رفتہ رفتہ پرانی حالت کو بحال کرنے لگے۔

تب ۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ کو جھگیوں میں آگ لگا دی گئی۔ ساری جھگیاں جل کر راکھ ہو گئیں۔ دو شیر خوار بچے ہلاک اور متعدد لوگ شدید زخمی ہوئے۔ مقامی لوگوں نے آگ لگوانے کا ذمے دار سینیٹر زاہد اختر کو ٹھہرایا۔

کئی غیر سرکاری تنظیموں اور اخبار نویسوں کی دل چسپی لینے کے باعث متاثرین کو عارضی مدد حاصل ہوئی۔ معاملہ اب عدالت میں ہے اور متاثرہ خاندان اپنے اس حق کو حاصل کرنے کے لیے قانونی جنگ لڑ رہے ہیں جس کا ان سے سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے نوٹیفکیشن میں وعدہ کیا گیا تھا۔

***

رحیمہ خاتون کہتی ہے: دیکھو، یہاں کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ نہ پانی ہے نہ بجلی۔ بس تیز ہوا ہے، دھول مٹی اور سامنے سمندر... کوئی ہماری مدد نہیں کرے گا۔ مجھے تو یہ فکر ہے کہ میرے بچے کیا کھائیں گے۔ رحیمہ خاتون جس جگہ کی بات کر رہی ہے وہ کورنگی ہے جہاں اسے اور اس کے خاندان کو منتقل کیا گیا ہے۔ وہ تقسیمِ ہند کے تقریباً چھ سال بعد کراچی آئی تھی اور تب سے مختلف کچی آبادیوں میں رہتی چلی آئی تھی۔ آخر کار وہ غیر قانونی طور پر فیڈرل بی ایریا میں عائشہ منزل کے پیچھے رحمان آباد کے پاس بس گئی تھی اور رفتہ رفتہ کئی برس کی محنت میں اس نے اپنا مکان پکا کرا لیا تھا۔

پچھلے سال اگست میں ہمارے علاقے کے کونسلر نے بتایا کہ تمھیں یہاں سے نکلنا پڑے گا۔ ہم نے پوچھا کہ آخر ہم جائیں گے کہاں۔ اس نے کہا کہ فکر مت کرو، میں اس کے بدلے میں پلاٹ دلوا دوں گا۔ کچھ لوگ تیار نہ ہوئے کیوں کہ اس نئی جگہ پر کچھ بھی نہیں تھا۔ اور پھر ہماری روزی کا کیا ہوگا؟ ہمارے کونسلر نے بتایا کہ وہاں پہنچنے کے ایک ہفتے کے اندر اندر ہمیں ساری سہولتیں مل جائیں گی۔ ہمیں اس کی

Scanned with CamScanner

بات پر شک تھا لیکن ہم کیا کر سکتے تھے؟ ہم غریب لوگ ہیں۔ ہمارے پاس نہ پیسہ ہے نہ طاقت۔ ہمارے پاس راستا ہی کیا تھا۔

پھر ۲۶ اگست کو کونسلر پولیس اور بہت سارے آدمیوں کے ساتھ آیا اور ہم سے کہا کہ سامان باندھ لو، تمہیں کوٹھی سے ہٹا رہے ہیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میرے بچوں کا کیا ہوگا؟ میں ان کو کہاں سے کھلاؤں گی؟ ہمیں یہاں کام کب ملے گا؟ اور میری نوکری؟

ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ان لوگوں کے پاس بندوقیں تھیں۔ مرنا کون چاہتا ہے؟ ہم نے اپنا جو تھوڑا سا سامان تھا سمیٹا اور مکان کی جتنی چیزیں بچائی جا سکتی تھیں بچائیں۔ سب عورتیں رو رہی تھیں۔ ہم نے ایک ایک پیسہ جوڑ کر بڑی مشکلوں سے مکان بنائے تھے اور اب سب گرایا جا رہا تھا۔

ہمیں ایک رقبے میں پلاٹ دیے گئے۔ یہاں کوئی کیسے مکان بنا سکتا ہے؟ دو مہینے پہلے پانی کی [illegible] سی تھی تو سارے میں پانی بھر گیا تھا۔ پلاٹ کی قیمت ہزار روپے ہے۔ دو قسطوں میں دینی ہے۔ سات سو پہلے جمع کرانا ہے۔ روپے کہاں سے لائیں؟ ایک سال ہو چکا ہے۔ دو وقت کی روٹی ہی مشکل سے چلتی ہے۔ بچے بچیں پیسے؟ ہمیں ڈھنگ سے کون دے گا؟ ہم سڑک کے دوسری طرف آ پڑے ہیں۔ یہ جگہ ذرا اونچی ہے۔ مگر یہ بھی عارضی ہے۔

کونسلر نے کہا تھا کہ ایک ہفتے میں ساری سہولتیں مل جائیں گی۔ اب تک صرف پانی کا نل ملا ہے۔ اس میں بھی پانی رات کو دو بجے آتا ہے، صرف دو گھنٹے کے لیے۔ یہاں تین سو گھر ہیں۔ ہمارے حصے میں صرف تین کنستر آتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو بالکل پانی نہیں ملتا۔ انہیں بھی اپنے حصے میں سے دینا پڑتا ہے۔

ہم صرف جھگیاں ہی ڈال سکتے ہیں۔ پکا مکان بنا سکتے نہیں ہیں۔ مردوں کے لیے تو زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ وہ کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ مگر ہم عورتوں کے لیے بڑا مسئلہ ہے۔ یہاں رہنا اس قدر مشکل ہے۔ ہوا تیز چلتی ہے تو کبھی کبھی تو جھگیوں کی چھتیں اڑ جاتی ہیں۔ پھر یہ جگہ شہر سے اتنی دور ہے کہ آنے جانے میں روز کے دس روپے لگتے ہیں۔

جب شہر میں تھے، ہم شہر میں تو تھے۔ وہاں کام بھی مل جاتا تھا۔ مرد بھی گھر چلانے کے لیے تھوڑا بہت کما لیتے تھے۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ وہاں کچھ لوگوں کی دکانیں تھیں یا چائے کے کھوکھے تھے۔ عورتیں آس پاس کے بنگلوں میں کام کرتی تھیں۔ ہم مہینے میں آٹھ نو سو روپے کما لیتے تھے۔ اب وہاں آتے جاتے ہی روز کے دس روپے خرچ ہو جاتے ہیں اور مہینے میں پانچ چھ سو روپے بچتے ہیں۔

یہاں مرد دن ہو تو گھر پر سب بے کار بیٹھے ہیں۔ پرانی آبادی میں کچھ لوگ قریب کی ہوٹل میں کام کرتے تھے، دوسرے مزدوری پر۔ کچھ ٹھیلے چلاتے تھے۔ یہاں کہاں ٹھیلا چلائیں؟ خریدنے والا کون ہے؟ سڑک یہاں سے بڑی دور ہے۔ اور سامان خریدنے کے لیے بھی تو پیسہ چاہیے۔ پیسہ کس کے پاس ہے؟ کچھ مردوں نے مچھلیاں پکڑنے کا کام شروع کیا تھا۔ مگر اب مچھلی پکڑنے پر بھی پابندی لگ گئی

Scanned with CamScanner

ہے۔ ان کی حالت بہت خراب ہے۔

اب عورتوں ہی کو کام کرنا پڑتا ہے۔ کام پر جانے اور واپس آنے ہی میں دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ اگر میں کام نہ کروں تو میرے بچے بھوکے مر جائیں۔ ہر چیز اتنی مہنگی ہو گئی ہے... جو لوگ سب سے زیادہ غریب تھے وہی یہاں آئے۔ جن کے پاس تھوڑا بہت پیسا تھا وہ نہیں آئے۔ انھوں نے موسیٰ کالونی میں یا کہیں اور کرائے پر رہنا شروع کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ کم از کم روزی کی جگہ سے تو قریب رہیں گے۔ اگر ہمارے پاس کچھ پیسے ہوتے تو شاید ہم بھی اپنے کام کی جگہ کے پاس ہی کہیں رہنے لگتے۔ ہماری قسمت ہی خراب ہے۔ نہ کسی کو ہماری پروا ہے نہ کوئی کچھ کرتا ہے ہمارے لیے۔ ہمیں خود ہی پھر سے ایک ایک پیسا جوڑ کر اپنے گھر بنانے پڑیں گے۔

**

Scanned with CamScanner

یان فاندر لِنڈن

انگریزی سے ترجمہ اور تلخیص: فہمیدہ ریاض

دلّال آباد

> Herzog was all too aware of the layers upon layers of reality — loathsomeness, arrogance, deceit and then — God help us all! — truth as well
>
> (Saul Bellow: *Herzog*)

کراچی شہر میں کم آمدنی والے طبقوں کی رہائش کے بندوبست کا اہم ترین حصہ زمین کی غیر قانونی پلاٹ بندی اور فروخت پر مبنی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس غیر رسمی نظام نے بے حد اہمیت حاصل کر لی ہے، اور لوگوں سے (غیر منظم طور پر) زمین پر جھگی ڈال کر بیٹھ جانے کے طریقے کو قریب قریب ختم کر دیا ہے۔ اس نظام کے تحت وجود میں آنے والی کچی آبادیوں میں مندرجہ ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں:

-- یہ آبادیاں شہر کے بیرونی کناروں پر بنائی جاتی ہیں۔
منظم طور پر بسائے جانے کے باعث ان آبادیوں کا نقشہ بہتر ہوتا ہے اور پلاٹ کا رقبہ کسی قدر بڑا ہوتا ہے۔

-- ان کو ڈیولپ کرنے والے شخص کے اثر و رسوخ کے باعث یہاں آ کر آباد ہونے والوں کے لیے بے دخلی کا خطرہ نسبتاً کم ہوتا ہے گو کہ ان کے پاس ملکیت کا کوئی باقاعدہ ثبوت موجود نہیں ہوتا۔

-- نقشے کے بہتر ہونے اور بے دخلی سے قدرے محفوظ ہونے کے باعث یہ آبادیاں کم آمدنی والے طبقوں کے لیے رہنے کی پرکشش جگہیں بن جاتی ہیں۔ لیکن شہر سے اور روزگار کی جگہوں سے دور واقع ہونے کے باعث ٹرانسپورٹ کے اخراجات زیادہ ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں کسی زمین پر جھگی ڈال کر بیٹھ جانے کے برعکس ان آبادیوں میں پلاٹ خریدنا پڑتا ہے۔ ان تمام اسباب کا نتیجہ یہ ہے کہ ان آبادیوں میں آ کر بسنے والے شہر کے غریب ترین لوگ نہیں بلکہ ان سے ذرا بہتر مالی حالت والے ہوتے ہیں۔

اس آخری خصوصیت اور بے دخلی سے تحفظ اور بہتر ابتدائی منصوبہ بندی کے باعث ان

Scanned with CamScanner

آبادیوں کے نمودی مکانوں میں ڈویلپمنٹ کی سطح نسبتاً بہتر ہوتی ہے۔

دنیا کے دوسرے بڑے شہروں کے برخلاف، کراچی میں یہ آبادیاں قائم کرنے والے لوگ سرکاری زمین پر قبضہ کر کے ان کی پلاٹ بندی اور فروخت کا کام کرتے ہیں۔ اس لیے کراچی کی ان آبادیوں، اور ان کے قائم ہونے کے نظام، کا مطالعہ بہت کارآمد ہو سکتا ہے۔ اس مضمون میں میں نے کراچی کی ایک ایسی ہی غیر قانونی آبادی کے قیام کی کچھ تفصیلات پیش کی ہیں۔ ایک غیر قانونی طور پر چلنے والے نظام کے بارے میں جمع کی گئی تفصیلات بعض اوقات ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں۔ لیکن اس نظام کے مختلف کرداروں سے بات چیت کر کے میں ان تفصیلات کو معقول حد تک درستی کے ساتھ متعین کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ جہاں کہیں ضروری تھا، میں نے کرداروں کے اصل نام بدل دیے ہیں اور اس آبادی کا نام اور اس کے بارے میں بھی بعض کم اہم تفصیلات تبدیل کر دی ہیں تاکہ اسے پہچانا نہ جا سکے۔

پس منظر

کراچی کے شمال مغرب میں واقع علاقے اورنگی میں زمین کی غیر قانونی پلاٹ بندی اور تقسیم کا کام ۱۹۶۹ سے جاری ہے۔ اورنگی کا علاقہ بیشتر بنجر زمین اور پہاڑیوں پر مشتمل ہے اور پہاڑیوں کی قطاروں کے بیچ میں کہیں کہیں وسیع وادیاں ہیں۔ ۱۹۶۵ کے بعد سے کے ڈی اے نے اورنگی کے تین حصوں میں پلاٹ اور شپ اسکیمیں شروع کیں جن میں مکان بنانے کی جگہ اور کچھ سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں، اگرچہ شروع شروع میں وہاں کسی قسم کی سہولت دستیاب نہ تھی۔ ان اسکیموں کے شروع ہونے کے بعد جلد ہی ان کے ارد گرد غیر قانونی آبادیاں بننے لگیں، اور ۱۹۷۰ کے آغاز تک اندازاً تین ہزار خاندان ان اسکیموں کے ارد گرد آباد ہو چکے تھے۔ ۱۹۷۱ کے بعد کئی لاکھ بہاری خاندان بنگلہ دیش سے پناہ گزین بن کر پاکستان پہنچے۔ یہ لوگ نہ صرف تعداد میں زیادہ تھے بلکہ نسبتاً زیادہ تعلیم یافتہ اور ہنرمند ہونے کے باعث لیبر مارکیٹ میں زیادہ سخت مقابلہ کر سکتے تھے، لہٰذا مقامی آبادی کے کئی گروہوں کے لیے ان کی آمد پریشان کن تھی۔ حکومت نے ان کو پاکستان میں داخلے کی اجازت دی تھی لیکن ان کی کراچی میں آبادکاری اور بحالی کے سلسلے میں کوئی وسیع پروگرام شروع کرنے کو تیار نہ تھی جہاں یہ لوگ اپنے شہری پس منظر کے باعث آباد ہونا چاہتے تھے۔ کئی سمتوں سے یہی آوازیں اٹھ رہی تھیں کہ کراچی پہلے ہی سے زیادہ مہاجرین کو جگہ دے چکا ہے اس لیے ان لوگوں کو پاکستان میں کسی اور جگہ بسایا جانا چاہیے۔

ایسی صورتِ حال میں جتنے زیادہ غیر سرکاری لوگ اور تنظیمیں بہاریوں کی آبادکاری میں حصہ لے کر ان کو نظروں سے اوجھل کر سکتیں، حکومت کے لیے اتنا ہی بہتر تھا۔ "ہم پٹھانوں سے مقابلہ نہیں کر سکتا"، کے ڈی اے کے ایک افسر نے کہا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ آبادکاری کا کام غیر قانونی پلاٹ

Scanned with CamScanner

بندی کرنے والوں کے لیے چھوڑ دینا زیادہ مناسب سمجھتا ہے جو اکثر پشان دلالوں کی وساطت سے کام کرتے ہیں۔ اس طرح زمین کی غیر قانونی تقسیم کے نظام کو بڑی تقویت ملی۔

اس سے پہلے بھی یہ کام کرنے والے آبادکاروں کا دعویٰ تھا کہ وہ شہر میں آنے والے کم حیثیت باشندوں کو کم قیمت پر زمین فراہم کر کے ایک اہم سماجی خدمت انجام دیتے ہیں۔ بہاریوں کے معاملے میں یہ دعویٰ اور بھی قوی ہو گیا کیوں کہ یہ نئے آنے والے نہ صرف غریب تھے بلکہ پناہ گزیں بھی تھے جن کے پاس جانے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ چوں کہ حکومت علی الاعلان اور کم لاگت پر ان کی آبادکاری کا کام کرنے سے قاصر تھی، اس لیے غیر قانونی آبادکاروں کی پوزیشن اور بھی مضبوط ہو گئی اور ان میں سے بہت سوں نے اس صورتِ حال سے پورا فائدہ اٹھایا۔

غیر قانونی آبادکاروں کے لیے پہلا مسئلہ اپنے عمل کے لیے تحفظ حاصل کرنا اور دوسرا مسئلہ اولین خریداروں کو وہاں بسنے پر آمادہ کرنا ہوتا ہے۔ اکثر نئی آبادیوں میں پہلے چند سو پلاٹ برائے نام قیمت پر، اور کبھی کبھی مفت، دیے جاتے ہیں۔ سو پچاس خاندانوں کے وہاں آباد ہو جانے کے بعد بنیادی سہولتوں کے سنگین مسائل ــــ پانی، ٹرانسپورٹ، روزمرہ ضرورت کی چیزوں کی دکانیں وغیرہ ــــ رفتہ رفتہ کم ہونے لگتے ہیں۔ یوں یہ نئی آبادی پلاٹ حاصل کرنے کے خواہش مندوں کے لیے زیادہ پرکشش ہو جاتی ہے۔ یہ موقع آنے کے بعد سے پلاٹوں کی قیمت متواتر بڑھتی جاتی ہے اور آبادکار کو منافع حاصل ہونے لگتا ہے۔

نئی آبادی شہر سے جتنے زیادہ فاصلے پر ہو، اولین بسنے والوں کو آمادہ کرنا اسی قدر مشکل ہوتا ہے۔ وہ پلاٹ حاصل کرنے کے لیے بہت کم رقم ادا کرتے ہیں، لیکن اس کے بدلے انھیں شروع کی سخت دشواریاں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ درحقیقت یہی لوگ ایک ویران علاقے کو شہری آبادی میں تبدیل کرتے ہیں جس کے نتیجے میں وہاں زمین کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان دشواریوں کے پیشِ نظر انتہائی غریب اور مجبور لوگ ہی اس کام پر آمادہ ہوتے ہیں، گو کہ یہی وہ لوگ ہیں جو ٹرانسپورٹ کا خرچ برداشت کرنے یا روزگار کی جگہوں سے دور بسنے کی سب سے کم استطاعت رکھتے ہیں۔

ان تمام ابتدائی مشکلات سے یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ شہر کے بیرونی کنارے پر بننے والی آبادیاں اس قدر سست رفتاری سے کیوں بڑھتی ہیں۔ کسی پہلے سے قائم آبادی سے اور آگے بننے والی آبادی میں آنے کے لیے لوگ تبھی آمادہ ہوتے ہیں جب پہلے والی آبادی کسی قدر مستحکم طور پر قائم ہو چکی ہو اور وہاں کے پلاٹوں کی قیمت نئی قائم کی جانے والی آبادی کے مقابلے میں خاصی بڑھ چکی ہو۔ ١٩٧٣ تک نئی قائم کی جانے والی غیر قانونی آبادی میں پہلے پہل بسنے والوں کو آمادہ کرنا خاصا دشوار ہو چکا تھا۔ لیکن کئی لاکھ بہاری خاندانوں کے آ جانے سے ایسے لوگ بڑی تعداد میں مہیا ہو گئے جن کے پاس رہنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ علاوہ ازیں، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، سیاست دانوں اور سرکاری اہلکاروں کی جانب سے غیر قانونی آبادکاری کے کام کے لیے تحفظ بھی آسانی سے فراہم ہونے لگا۔

Scanned with CamScanner

ممکن ہے اس سوچ پر کچھ افراد اور تنظیمیں واقعی نیک نیتی سے پناہ گزینوں کی امداد کرنے کے مقصد سے اس کام میں شامل ہوئی ہوں، لیکن عمومی طور پر زمین کی غیر قانونی تقسیم کا یہ سلسلہ سے موجود نظام قائم رہا۔ پناہ گزینوں کی بڑی تعداد کی آمد سے یہ نظام تبدیل ہونے کے بجائے مزید مستحکم ہوا۔ اس سلسلے میں خاص بات یہ تھی کہ اورنگی میں بہاری پناہ گزینوں کی بحالی اور آبادکاری کے مقصد سے متعدد آبادیاں قائم کی گئیں جن میں سے ہر آبادی میں پناہ گزین خاندانوں کی محدود تعداد ـــ اکثر صورتوں میں صرف چند سو خاندانوں ـــ کو بسایا گیا جب کہ آبادی کا باقی رقبہ خالی رکھا گیا۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ ایک ہی غیر قانونی آبادکار نے بیک وقت کئی آبادیاں قائم کیں۔ اس قسم کی ایک مثال اس آبادکار کی ہے جس نے دو کالونیاں بسائیں، ایک شہر سے صرف چند کلومیٹر دور اور دوسری دس کلومیٹر کے فاصلے پر۔ آخر الذکر آبادی میں پہلے پہل بسنے والے لوگ انتہائی محتاج تھے۔ اس آبادکار کی نیک نیتی پر شبہ کیا جاسکتا ہے جس نے ان چند خاندانوں کو دور دراز اور نہایت دشوار مقام پر بسایا اور یوں مہیا فراہم کیے جانے والے پلاٹوں کے ارد گرد کے وسیع قطعۂ زمین پر قبضہ کر لیا۔

دلال آباد

"دلال آباد" نامی غیر قانونی آبادی اورنگی سے بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر اور شہر کے صنعتی علاقے سے تقریباً سات کلومیٹر دور واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ ۱۸۰ ایکڑ ہے جسے ۱۲۰ مربع گز کے پانچ سو پچاس پلاٹوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حال تک یہ علاقہ حکومت سندھ کے محکمۂ محصولات کے تحت تھا۔ علاقے کے کچھ حصے پر مقامی باشندوں کو ملکیت کا دعویٰ تھا۔ بقیہ زمین پر مقامی چرواہوں کو مویشی چرانے کا سرکاری پروانہ دیا گیا تھا۔ ۱۹۷۳ میں وہاب نے ایک دلال (middleman) کو بیچ میں ڈال کر یہ پورا علاقہ غیر قانونی طور پر خرید لیا۔ دلال نے مقامی باشندوں کو کچھ رقم ادا کی اور نئی پلاٹ پولیس کو غیر سرکاری مگر مقررہ رقم دی۔ بعد ازاں اس نے پورے علاقے میں تعمیراتی منصوبہ، مع سڑکوں وغیرہ کے، تیار کیا۔ وہاب کو اس عمل میں سیاسی اور انتظامی عملے کی سرپرستی حاصل تھی۔ انٹرویو کرنے پر اس نے چند نہایت بااثر شخصیتوں کا نام لیا جن میں ایک صوبائی اور ایک وفاقی وزیر بھی شامل تھے۔ دوسرے لوگوں سے بات چیت میں ان ناموں کی تصدیق بھی ہوئی۔ یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ دلال آباد میں ایک اور سیاست داں کے رشتہ دار کے کئی پلاٹ ہیں۔

اس پورے عمل میں دلال کے رول کی تصریح مشکل ہے۔ مقامی سطح کا سیاست داں ہونے کے علاوہ اس کا پیشہ غیر قانونی آبادکاری ہی ہے اور وہاب کی طرح اُسے بھی سیاسی اور انتظامی سرپرستی حاصل ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ علاقے کی پلاٹ بندی اور اور پلاٹوں کی فروخت کا کام اُسی نے کیا۔ جب کہ وہاب کا کہنا ہے یہ تمام کام دلال نے اس کے کہنے پر اور اس کی نگرانی میں کیا تھا۔

وہاں اپنی خودمختاری سے کام کرتے ہیں۔ انہیں [illegible] آبادکار سمجھنا غلط نہ ہوگا۔ مگر اس خاص وقوعے میں وہاب نے سب سے پہلے یہاں کچھ [illegible] آباد کیے۔ اسے اصل آبادکار ہی سمجھا جائے گا۔ [illegible] ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر کام نہیں کر سکتے۔

[illegible] سے آنے والے [illegible] کی آبادکاری کے لیے متعدد کمپنیاں [illegible] [illegible] یہاں پچھلے [illegible] آباد کیا گیا۔ [illegible] [illegible] آبادکاری کا مقصد پناہ گزینوں کی بحالی [illegible] ہے۔

[illegible] ایک شاہی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] میں ایک قبرستان [illegible] [illegible]

[illegible] ایک دوسرے سے مختلف [illegible] کوئی پلاٹ [illegible] روپے [illegible] دو روپے [illegible] دو روپے کی [illegible] روپے تک کی پلاٹ [illegible]

[illegible] روپے کی پلاٹ [illegible] [illegible] کمپنی کے حاقل [illegible] شروع میں [illegible]

[illegible] [illegible] پلاٹ [illegible] [illegible] کی قسمت [illegible] پلاٹ [illegible] [illegible] پلاٹ حاصل [illegible] [illegible]

[illegible] کمپنی [illegible] آباد [illegible]

سربرآوردہ سیاسی اور شہر کے کچھ معتبر لوگ شامل تھے؛ وہاب بھی ان میں سے ایک تھا۔ حد بندی کی کمیٹی کے ممبروں نے خود ہی پلاٹ بیچنے شروع کر دیے اور تجارتی پلاٹ آپس میں تقسیم کر لیے۔ یہ تمام خرید و فروخت عاقل، عدل اور پولیس کی خوشنودی حاصل کرنے کے بعد ہی ممکن ہو سکتی تھی۔ ابتدائی برسوں میں پولیس سرگرمی سے اپنا حصہ وصول کرنے آتی تھی۔ ایک پولیس والے نے بھی کچھ پلاٹ فروخت کیے۔

چونکہ یہ سارا معاملہ غیر قانونی تھا اس لیے پولیس کو تمام دوسرے فریقوں پر بالادستی حاصل تھی۔ لیکن وہاب نے اثر و رسوخ سے کام لے کر پولیس کو ایک حد سے بڑھنے سے باز رکھ سکتا تھا۔ وہاب نے ہمیں بتایا کہ پولیس والوں نے چھوٹی موٹی رقم لے لینے پر تو کبھی اعتراض نہیں کیا کیونکہ اس ملک میں یہی چلتا ہے لیکن اگر پولیس والے زیادہ پیسے اینٹھنے کی کوشش کرتے تو وہاب ان کا راستہ روک دیتا تھا۔

وہاب نے ایل ڈی اے کو قائل کر لیا کہ اس آبادی کو پانی فراہم کیا جائے۔ کمیٹی سیمنٹ کے حوض پہلے ہی بنوا چکی تھی۔ ایل ڈی اے کے ٹینکر ایک دن چھوڑ کر پانی لاتے ہیں۔ پانی کے حوض سیمنٹ کے ڈھکنوں سے ڈھکے ہیں، جہاں سے علاقہ بنانے والے پانی کی تقسیم کو کنٹرول کرتے تھے۔ ان کی اہمیت یوں بھی تھی کہ مکان بنانے کا سامان وہ آبادی میں آنے والوں کو ذاتی طور پر مہیا کرتے تھے۔ ایک معمولی مکان پر آنے والی لاگت کا ۲۰ سے ۵۰ فیصد حصہ اسی سامان پر خرچ ہوتا ہے۔ علاقہ بنانے والے ہی پلاٹ بیچنے کا کام کرتے ہیں۔ دلال آباد کا چوکیدار عاقل ملک ہی بنا تھا۔

سب سے اول ان بے ضابطہ دستاویزوں کے بعد خرید و فروخت کے تحریری ثبوت مہیا نہیں کیے گئے۔ اس سے چوکیدار کی طاقت میں بے حد اضافہ ہوا کیونکہ بہرحال سرکاری زمین پر پلاٹ بیچنا اور ان پر مکان بنانا غیر قانونی عمل ہے۔ اب یہ چوکیدار کی مرضی تھی کہ وہ جسے چاہے پلاٹ لینے کا حقدار بتائے اور جسے چاہے غیر قانونی قابض ثابت کر دے۔ اس کی پولیس سے ملی بھگت تھی۔ پولیس کے دباؤ سے اگر معاملہ چوکیدار کی مرضی کے مطابق طے ہو جائے تو وہ اپنے خاندان کو بحالی کا حقدار قرار دے دیتا تھا۔

بعض صورتوں میں پلاٹ خریدنے کے بعد اس پر فوری قبضہ کر کے مکان بنانا شروع نہیں کیا جاتا۔ اس کی دو شکلیں ہوتی ہیں۔ یا تو خریدار نے پلاٹ بعد میں منافعے پر بیچنے کے لیے خریدا ہے، یا پھر اس کے پاس مکان کی تعمیر شروع کرنے کے پیسے بالکل نہیں ہیں۔ فوری قبضہ نہ لینے کی صورت میں پلاٹ کے دوبارہ کسی اور کے ہاتھ فروخت کر دیے جانے کا خطرہ رہتا ہے کیونکہ تحریری دستاویز کی کوئی رسید نہیں دی جاتی۔ ہمیں اس طرح کے ایک واقعے کا علم ہوا۔ ایک پان بیڑی سگریٹ کی دکان والے نے ایک پلاٹ خریدا، تو خریدتے وقت اپنے پڑوسی، ایک ریٹائرڈ فوجی افسر، کو فوج کا یونیفارم پہنا کر ساتھ لے گیا تاکہ وردی پوش عینی شاہد کے ڈر سے اس کا پلاٹ کسی اور کے ہاتھ دوبارہ نہ بیچا جائے۔

علاقے کا چوکیدار اس عمل میں مرکزی کردار ادا کرتا تھا۔ مکان بنانے والوں سے اس نے بدلے

Scanned with CamScanner

میں وہاب کو انسی ٹیوشنل یا سپیٹ سکیمیں کر آخرکار وہاب کو اسے برطرف کرنا پڑا۔ لیکن اس کی جگہ اس کے بھائی ہی کو رکھا گیا، چنانچہ کاروبار انہیں ہاتھوں میں رہا۔

دلال آباد کا کل ۱۸۰ ایکڑ رقبہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ۳۰ ایکڑ پر مشتمل ایک حصہ وہ ہے جس کی ابتدا ہی میں پلاٹ بندی کر لی گئی تھی اور اس حصے کے سرحدی پلاٹوں پر بیشتر اولین بے کس خاندانوں کو لا بسایا گیا تھا۔ ان پلاٹوں اور اورنگی کی پرانی آبادیوں کے درمیان کا بہت بڑا رقبہ خالی چھوڑا گیا۔ اسے دلال آباد میں زمین کی قیمت بڑھنے کے بعد پلاٹ بندی کر کے بیچ گیا۔ یہ حصہ اب جزوی طور پر آباد ہو چکا ہے۔

دلال آباد کا ۱۵۰ ایکڑ پر مشتمل دوسرا حصہ، جو اول بسنے والے خاندانوں کے پلاٹوں سے آگے واقع ہے، ابتدا میں چھوڑ دیا گیا، سوائے ایک قطعہ زمین کے جسے قبرستان کے لیے مختص کیا گیا تھا جو بعد میں استعمال کیا جانے لگا۔ اس حصے کے پلاٹ بعد میں سرمایہ کاروں کے ہاتھ دس سے لے کر سو یا زائد پلاٹ فی کس اکٹھے فروخت کیے گئے۔

۱۹۷۳ کے بعد سے دلال آباد کے اس حصے میں بڑے بڑے پلاٹوں پر رنگائی خانے کھلنے شروع ہو گئے۔ اورنگی کے آس پاس کے مضافات میں ڈیڑھ ہزار سے دو ہزار تک رنگائی خانے ہیں۔ بڑھتے بڑھتے رنگائی خانے رہائشی علاقے میں گھسنے لگے۔ دلال آباد کے ان رنگائی خانوں کے مالکان میں سرکاری افسر، وکلا، ٹھیکیدار اور بلڈنگ بنانے والے شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک تنظیم بنا لی ہے اور اس علاقے کو صنعتی علاقہ قرار دلوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ رنگائی خانوں اور آباد رہائشی پلاٹوں کے درمیان واقع علاقہ سب سے زیادہ متنازعہ ہے۔ رنگائی خانوں کے مالکان اور رہائشی پلاٹوں کے مکین دونوں اس خالی علاقے پر دعویٰ رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں بڑھ رہے ہیں۔

۱۹۷۷ میں وہاب نے پارٹی سے متاثرہ کچھ خاندانوں کو ۸۰ پلاٹوں کا عطیہ دیا تھا۔ مگر جب یہ خاندان یہاں آ رہے تو تجاوزہ کاروں کو خوش رکھنے کے لیے انہیں فی پلاٹ پانچ سو سے ایک ہزار روپے تک دینے پڑے۔ پلاٹ کی قیمت بھی اس زمانے میں کم و بیش اتنی ہی تھی۔

اورنگی کا پورا علاقہ حکومت سندھ کی ملکیت ہے، یعنی بورڈ آف ریونیو کے تحت آتا ہے۔ کے ڈی اے نے سیکٹر کی پلاٹ اور شاپ سکیموں کے لیے اس کے کچھ رقبے کی منصوبہ سازی اور پلاٹ بندی کی تھی لیکن یہ اسکیمیں کبھی مقامی بلدیہ کے سپرد نہیں کی گئی تھیں۔ آخرکار جنوری ۱۹۸۱ میں اورنگی کو بلدیہ عظمیٰ کراچی کے سپرد کر دیا گیا۔ دلال آباد کا کچھ رقبہ بلدیہ کی حدود میں اور کچھ اس کے باہر واقع ہے۔ رنگائی خانوں والا حصہ بورڈ آف ریونیو کے تحت آتا ہے۔ بلدیہ اور بورڈ کے درمیان علاقے کی سرحد متنازعہ تھی۔

رنگائی خانوں کے مالکان نے زور و رسوخ استعمال کر کے اپنے پلاٹوں کو بلدیہ کی حدود سے باہر بورڈ آف ریونیو کی حدود میں رکھنے کی بھرپور مہم چلائی، کیونکہ پلاٹوں کی سرکاری لیز ملنے کی

صورت میں کے ایم سی کو ادا کی جانے والی لیز کی رقم مقابلتاً خاصی زیادہ ہے۔ جب بلدیہ اور بورڈ آف ریونیو کے درمیان سرحدی تنازعہ کم و بیش طے ہو گیا تو بورڈ کے متعلقہ افسر نے صاف کہہ دیا کہ وہ مرغی خانوں کو ہرگز تسلیم نہیں کرے گا۔ ۱۹۸۳ کے شروع میں اس نے انہدام کے اسکواڈ بھیج کر کئی مرغی خانے تڑوا بھی دیے جو استعمال میں نہیں تھے۔ اس طرح کے ہتھکنڈے عموماً مالکان سے پیسے وصول کرنے کے لیے بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بھاری رشوت دینے کے بعد مرغی خانوں کے مالکان کو تیس تیس برس کی لیز مل گئی۔ لیز کی سرکاری فیس تقریباً چار ہزار روپے فی ایکڑ ہے جب کہ بلدیہ لیز دینے کے لیے اس سے دس گنا سے زائد رقم طلب کرتی ہے۔ حکومت سندھ کی جاری کردہ لیز کی دستاویز میں یہ شق بھی درج ہے کہ لیز پر دی جانے والی زمین کو مرغی خانہ کھولنے کے سوا کسی اور مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکے گا۔ اس شرط کا محرک جو بھی کچھ ہو، اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ تیس برس کی میعاد پوری ہونے سے بہت پہلے یہ تمام پلاٹ شہر کے رہائشی مکانوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ مستقبل قریب میں مرغی خانوں کے مالکان اور سرکاری اہلکاروں کے درمیان لین دین کے متعدد مواقع نکلنے لازمی ہیں۔

۱۹۷۸ میں جاری ہونے والے ایک مارشل لا آرڈر کے تحت یکم جنوری ۱۹۷۸ سے پہلے قائم ہونے والی تمام کچی آبادیوں کا مستقل کیے جانے کا حق تسلیم کر لیا گیا۔ اس حق کی کچھ مستثنیات بھی تھیں لیکن دلال آباد ان کی ذیل میں نہیں آتا تھا۔ اس کے باوجود دلال آباد کے متنازعہ علاقے کے مکینوں کو نوٹس ملے کہ اپنے پلاٹ خالی کر دیں ورنہ ان کے خلاف ۱۹۸۰ کے مارشل لا آرڈر نمبر ۱۳۰ (تجاوزات کے خاتمے کے حکم) کے تحت کارروائی کی جائے گی۔ جب دلال آباد کے باسیوں پر ان نوٹسوں کا کوئی اثر نہ ہوا تو بل ڈوزر بھیج کر کچھ مکان گرا دیے گئے۔ دلال آباد کے مکینوں کو اپنے رہنما اوں پر بھروسا نہ تھا۔ انھیں وہاب سے امید تھی کہ وہ ان کی مدد کرے گا۔ چناں چہ انھوں نے خود کو منظم کر کے سرکاری اہلکاروں اور مارشل لا حکام سے رابطہ قائم کیا۔ انھوں نے ایک وکیل کی خدمات حاصل کر کے مقدمہ بھی دائر کر دیا۔ عدالت نے فیصلہ ہونے تک حالات کو جوں کا توں رکھنے کا حکم جاری کر دیا۔

دلال آباد کے غیر متنازعہ علاقے کے مکینوں کو ۱۹۷۸ کے مارشل لا آرڈر سے بے دخلی کے خلاف خاصا غیر دستاویزی تحفظ حاصل ہو گیا تھا۔ لیکن اس آبادی کو اب تک مستقل نہیں کیا گیا ہے۔ مارشل لا کے اس حکم کے تحت جو لوگ اپنے پلاٹوں پر یکم جنوری ۱۹۷۸ سے پہلے سے رہ رہے تھے انھیں لیز حاصل کرنے کا حق دے دیا گیا تھا۔ لیکن حکم میں یہ بات بھی مضمر تھی کہ اس تاریخ کے بعد کسی کو زمین پر غیر قانونی قبضہ کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ۱۹۸۰ کے تجاوزات کے خاتمے کے حکم کے تحت ایسے لوگوں کے خلاف سخت کارروائی کی جا سکتی ہے۔ گویا وہاں پہلے سے آباد لوگوں کے پاس ملکیت کا غیر دستاویزی تحفظ موجود ہے، لیکن تجاوزات والے حکم کے تحت کسی نئے مکان کی تعمیر کو روکا جا سکتا ہے۔ دلال آباد کے ہر پلاٹ پر ملکیت کے دعوے موجود ہیں لیکن بہت بڑی تعداد میں پلاٹ

اب بھی غیر منقسم شدہ ہیں۔ ۱۹۷۳ سے ان پلاٹوں پر مکانوں کی تعمیر کا عمل سست رفتاری کے ساتھ چل رہا ہے۔

تجاوزات کے خلاف جاری ہونے والے مارشل لا آرڈر سے پولیس والوں اور جدیہ کے بعض عناصر کو ایک نیا موقع ہاتھ آیا اور وہ مہاجرین سے مکان کی تعمیر کے وقت اپنا حصہ طلب کرنے کے لیے وارد ہونے لگے۔ اگر پلاٹ کے مالک انہیں رقم ادا کرنے سے انکار کرتے تو ان کے خلاف مقدمہ درج کیا جا سکتا تھا بلکہ ان کو گرفتار بھی کیا جا سکتا تھا۔ [illegible] مقدمے پر متنازع ہونے [illegible] وقت اور پیسا [illegible] جس کے تحت لوگوں کو [illegible] ادائیگی پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔

۱۹۸۳ کے وسط تک ولی آباد کے ۳۰ ایکڑ والے انہیں حصے میں تیار اور فروخت کیے گئے۔ ایک [illegible] پلاٹوں میں سے تقریباً سو آباد ہو چکے تھے۔ کوئی دو سو [illegible] ان حصے میں [illegible] رہے تھے جو جدیہ اور بورڈ آف ریونیو کے درمیان متنازعہ تھا۔ ۱۹۷۳ سے ۱۹۸۳ تک ولی آباد کے پلاٹوں کی قیمتیں پچاس روپے فی پلاٹ سے بڑھ کر [illegible] سے بارہ ہزار روپے فی پلاٹ تک پہنچ چکی تھیں۔ اس طرح قیمت میں اضافے کی اوسط شرح ۶۰ فیصد سالانہ بنتی ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ولی آباد کے مکینوں میں وہاب کی مقبولیت کم ہوتی گئی۔ اس کا طلسمی شخصیت کا امیج کئی برس تک قائم رہا اور مقامی لوگوں کی تمام شکایات اس کے خلاف نہیں بلکہ اس کے عملے کے خلاف ہوتی تھیں۔ [illegible] عاقل کے معاملے میں ہوا، ولی آباد کے لوگ پہلے پہل یہ شکایات وہاب ہی کے علم میں لاتے تھے۔ لیکن جب عاقل کوشش کر کے اس کی جگہ اس کے ساتھی کو لگا دیا گیا تو لوگوں نے وہاب پر بھروسا کرنا چھوڑ دیا۔ کچھ لوگ البتہ اب تک یہی رائے رکھتے ہیں کہ وہاب تو اچھا آدمی تھا، ساری گڑبڑ اس کے چمچوں نے کی۔

۱۹۷۹ میں بلدیاتی انتخابات کے بعد منتخب کونسلر منظر پر نمودار ہوئے۔ اس وقت سے علاقے میں کچھ سیاسی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ ایک سیاست دان نے مسجد اور اسکول کی تعمیر کے لیے جزوی امداد دی لیکن ان دونوں عمارتوں کی تعمیر کا کام وہاب کے آدمیوں کے ہاتھ میں رہا اور ولی آباد کے بعض لوگوں کو یقین ہے کہ امداد کی رقم کا کچھ حصہ خورد برد کر لیا گیا۔

اسی دوران ولی آباد میں رہنے والوں نے وہاب کے خلاف خود کو منظم کرنا شروع کیا۔ دوسری باتوں کے علاوہ انہوں نے آبادی کا نام [illegible] تبدیل کر دیا اور ایک جگہ [illegible] کی پیمائش کر کے وہاں سے [illegible] کی تجاوزات [illegible] کا دی۔ انہوں نے وہاب کے خلاف ایک مقدمہ بھی دائر کیا جس کے فیصلے کے [illegible] ہیں۔ [illegible] پتا چلتا ہے کہ وہاب نے غنڈوں کو پولیس کی حفاظت میں بھیج [illegible] کی پیمائش [illegible] اس موقعے پر سنگین لڑائی ہوئی۔ پولیس نے بھی وہاب کے [illegible] ہے۔

یہ نظام — کچھ تفصیلات

مندرجہ بالا بیانوں کا فی الحال مقصد یہ ہے کہ ایک عمارت لکھتے ہوئے عمل کا بیان ہے تو شبہ ہو کیوں کر ہو سکتا تھا۔ لیکن اس معاملے میں ایک قسم کا نظام بھی کام کرتا ہے۔

اس عمل میں جو بنیادی بات پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے تمام حامل گروہ سرکاری ملکیت کو ذاتی ملکیت میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کوشش میں انہیں ایک دوسرے کی ضرورت ہوتی ہے، ہر ایک کا عمل دوسرے کے عمل کا محتاج ہے اور ہر ایک دوسرے سے اس تعاون کی قیمت وصول کرتا ہے۔

یہ قیمت نقد ادائیگی کی شکل میں بھی ہو سکتی ہے، اور (جیسا کہ لوگوں سے لے جانے والے [illegible] کا) مشقت کرنے اور دشواریاں اٹھانے کی صورت میں بھی۔ یہ قیمت کسی کردار کو کسی مشکل سے نجات دلانے کی صورت میں بھی ادا کی جا سکتی ہے اور (جیسا کہ انتظامی عہدیداروں اور سیاستدانوں کا معاملہ ہے) بڑھی ہوئی طاقت کی شکل میں بھی جسے بعد میں نقدی میں تبدیل کیا جا سکے۔ عموماً قیمت کی ادائیگی میں یہ تمام شکلیں ملی جلی ہوتی ہیں۔

وہ سیاستدان اور بڑے افسران جو غیر قانونی آباد کاری کرنے والوں کی سرپرستی کرتے ہیں یا جو سطح اقتدار کا اشارہ دیتے ہیں، اس عمل میں ریاست کی شمولیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ سب سے پہلے یہی لوگ ریاست کی طرف سے دیے گئے حقوق کو ذاتی معاملے میں تبدیل کرتے ہیں۔ انہیں کسی گڑھے بندے کی ضرورت ہوتی ہے جو یہ کام شروع کرے۔ گڑھے بندے کو مددگاروں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ سرکاری زمین کو ذاتی معاملے میں بدل سکے۔ اس عمل کے دوران انتظامی عملہ (بشمول پولیس) پہلے سرکاری حقوق کو ذاتی معاملے میں تبدیل کرتے ہیں۔ اور آخرکار ان تمام حامل گروہوں کو یہاں بسنے والوں کی ضرورت ہوتی ہے جو تمام بنیادی دشواریاں اور مشقتیں برداشت کر کے اسے ایک شہری محلے میں بدلتے ہیں۔

یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ دلال آباد میں سرکاری زمین کی غیر قانونی فروخت سے کتنا منافع کمایا گیا۔ ایک نہایت سادہ تخمینہ لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ فرض کیا جائے ۱۹۷۳ سے ۱۹۸۴ تک ہر سال دس فیصد پلاٹ فروخت کیے گئے۔ ایک پلاٹ کی اوسط قیمت ۱۹۷۳ میں ۵۰ روپے اور ۱۹۸۴ میں آٹھ ہزار روپے تھی جبکہ کرائے میں رہنے والے حصے میں اوسط قیمت ۲۵ روپے سے ایک ہزار روپے تک بڑھی۔ اس تخمینے میں بہت سی چیزیں شامل نہیں ہیں جن کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، مثلاً ۱۰۰ سے زائد [illegible] پلاٹوں کی قیمت، پلاٹوں کی دوبارہ یا سہ بارہ فروخت وغیرہ۔ ان وضاحتوں کے ساتھ جو تخمینہ لگایا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ دلال آباد میں سرکاری زمین کی غیر قانونی فروخت سے [illegible] کروڑ روپے کمائے گئے۔

فائدہ کس کو ہوا؟

واں آباد کی نشوونما کے بیان سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ کسی ایک فرد یا گروپ کو منافع کمانے کا تنہا ذمے دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا بلکہ مختلف کردار منافع کمانے کی اس کوشش میں نہایت پیچیدہ طور پر باہم اُلجھے ہوئے ہیں۔ نہ یہاں اتفاقِ رائے سے کی جانے والی کسی سازش کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے، اگرچہ دور سے دیکھنے پر محسوس یہی ہوتا ہے کہ یہ نظام کسی رواں مشین کی طرح کام کرتا ہے۔ بعض والوں کو چھوڑ کر، جن کا مقصد سر چھپانے کی جگہ حاصل کرنا ہے، باقی تمام کرداروں کا مقصد ایک ہی ہے لیکن مشترکہ نہیں ـــــ زیادہ سے زیادہ منافع کمانا۔ لہٰذا ان کرداروں کا باہمی رشتہ ساز باز کا نہیں بلکہ مسابقت کا ہے۔ یہ کردار جب کبھی ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں تو وجہ یہ ہوتی ہے کہ انفرادی کرداروں کو حد سے آگے بڑھنے سے روکا جا سکے۔ ان میں سے تقریباً ہر ایک دوسرے کرداروں پر کسی نہ کسی طرح گرفت رکھتا ہے یا اُن کی گرفت میں ہوتا ہے اور یوں اپنی من مانی نہیں کر سکتا۔

وہاب کا عبدل یا عاقل سے رشتہ اس کی بہترین مثال ہے۔ وہاب اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے سیاسی اور انتظامی اختیارات رکھنے والوں کا تحفظ حاصل کر سکتا تھا اور پولیس بعض والوں کو یہاں لا سکتا تھا۔ لیکن وہ یک ایک پلاٹ فروخت کرنے اور آبادی میں روزانہ کی پیش رفت کی نگرانی کرنے سے قاصر تھا۔ اس کے لیے اُسے مددگاروں (عبدل یا عاقل) کی ضرورت تھی جنھوں نے اپنی حیثیت کا بڑی حد تک فائدہ اٹھایا۔ اس حد کا انحصار اس بات پر تھا کہ مددگار تحفظ حاصل کرنے کے لیے کس حد تک وہاب کے محتاج تھے۔ یہ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کے پیر مضبوطی سے پکڑ رکھے ہوں تاکہ دوسرا شخص زیادہ لمبے قدم نہ اٹھا سکے۔

اسی طرح پولیس والوں کی عاقل پر خاصی مضبوط گرفت تھی، کیوں کہ اصولی طور پر وہی قانون کے محافظ تھے۔ لیکن اگر وہ عاقل کو دبانے میں ایک حد سے آگے جاتے تو وہ وہاب کے ذریعے، جسے شہر کے اعلیٰ پولیس افسروں میں اثر و رسوخ حاصل تھا، ان کا تبادلہ کروا سکتا تھا۔ پولیس کے ہتھکنڈوں سے بچنے کے لیے عاقل وہاب کا محتاج تھا۔

واں آباد میں رہائش اختیار کرنے والوں کو عاقل کی دوستی میں رہنا پڑتا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی مدد حاصل کر سکیں کیوں کہ ان سرکاری محکموں تک ان کی پہنچ صرف عاقل ہی کے ذریعے ممکن تھی جو سہولتیں (مثلاً پانی) فراہم کرتے ہیں۔ عاقل سے بگاڑ کر رکھنے میں ہمیشہ ان کا نقصان ہوتا تھا۔

دوسری طرف اس کی شکایات پر عاقل کو ہٹا کر اس کے بھائی ہی کو چوکیدار رکھ لیا گیا؛ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عاقل کا خاندان وہاب پر مضبوط گرفت رکھتا ہے۔ عاقل اتنا طاقت ور کیوں کر ہو گیا؟ اس بارے میں صرف قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے وہ وہاب کو بلیک میل کر رہا ہو۔ اتنے عرصے میں آبادی میں عاقل کی پوزیشن بھی مضبوط ہو چکی تھی؛ اس نے عبدل سے (جو وہاب کا رشتہ دار تھا) اور پولیس سے تعلقات پیدا کر لیے تھے؛ پھر اس نے بلاک بنانے کا کام شروع کر دیا تھا اور سے کئی پلاٹوں پر پھیلایا

Scanned with CamScanner

تھا۔ ممکن ہے دلال آباد کا قصہ شروع ہونے سے پہلے اس نے وہاب کا کوئی کام نکلوایا ہو اور اب اس احسان کا بدلہ وصول کر رہا ہو۔ پھر یہ بھی اہم بات ہے کہ عاقل کا ایک اور بھائی وہاب کے پرائیویٹ دفتر میں کام کرتا ہے۔

عاقل اور اس کے بھائی کو اتنی نفع بخش ملازمتیں کیسے ملیں؟ اسی طرح پولیس کا کنسٹیبل یا متعلقہ سرکاری محکموں کے اہلکار اپنی پرکشش ملازمتیں یوں ہی حاصل نہیں کر لیتے، انھیں یہ ملازمتیں حاصل کرنے یا قائم رکھنے کے لیے سرمایہ کاری کرنی پڑتی ہے، یا انھوں نے بھی پہلے کسی طاقت ور افسر کا کوئی کام نکلوایا ہوتا ہے۔ گویا اس تمام عمل میں لین دین صرف پیسے ہی کا نہیں ہوتا بلکہ ساتھ احسانات بھی لین دین کا وسیلہ بنتے ہیں۔

وہاب کے باپ اور چچا نے ۱۹۵۰ اور ۱۹۶۰ کی دہائیوں میں سرکاری زمین کی غیر قانونی پلاٹ بندی اور فروخت کے ذریعے کئی آبادیاں بسائی تھیں۔ غالباً وہاب کو اپنے اثر و رسوخ کا کچھ حصہ ورثے میں ملا ہے۔ خود وہاب کا پیشہ صحافت ہے۔ صحافی کے طور پر بھی وہ سیاست دانوں اور اعلیٰ سرکاری اہلکاروں کے کام نکلوانے اور انھیں اپنا احسان مند بنانے کی طاقت رکھتا ہے۔ انٹرویو کے دوران اس کے پاس مختلف قسم کے کاموں کے لیے فون آتے رہے اور وہ ہر ایک سے وعدہ کرتا رہا کہ اس کا کام ہو جائے گا۔ لگتا ہے وہاب سے اونچی اور نیچی حیثیت رکھنے والے بہت سے لوگ اس کے احسان مند ہیں۔

احسان مندی اور دباؤ اس عمل کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ نقد ادائیگی سے سودا ختم ہو جاتا ہے اور طویل مدتی اثر و رسوخ پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن منافع کمانا اس کھیل کا اصل مقصد ہے۔ چناں چہ جب نقد رقم وصول بھی کی جاتی ہے تو اس طرح کہ دباؤ پوری طرح ختم نہیں ہوتا۔ مثلاً پلاٹ خریدنے والوں نے پلاٹ کی قیمت ادا کر دی ہے لیکن انھیں مکان کی تعمیر کے وقت، اور پھر آبادی کے مستقل کیے جانے کے وقت، مزید ادائیگی کرنی ہوگی جس کی رقم نامعلوم ہے۔ ایک اور مثال مرغی خانوں کے مالکان کی ہے جنھیں اپنی زمین کی قانونی ملکیت حاصل ہو گئی ہے لیکن آگے چل کر جب وہ اس زمین کو رہائشی یا صنعتی استعمال میں لائیں گے، جو ان کا اصل مقصد ہے، تو انھیں دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس طرح اس عمل کے تمام کردار پیچیدہ طور پر ایک دوسرے کے محتاج ہیں اور دوسروں کا منافع کم رکھنے اور اپنا منافع بڑھانے کی متواتر کوشش کرتے ہیں۔ دلال آباد میں وہاب کو اپنے وسیع تعلقات اور اثر و رسوخ کی بدولت مرکزی حیثیت حاصل ہے، لیکن اس کی آزادی کو بھی دوسرے کردار ایک حد کے اندر رکھتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ان سب کو کسی نہ کسی طرح فائدہ ہوتا ہے۔ زمین کے مقامی دعوے داروں، دلال، وہاب، اس کے ملازموں، آزاد پلاٹ بیچنے والوں اور سرمایہ کاری کی غرض سے پلاٹ خریدنے والوں کا فائدہ بالکل عیاں ہے۔ سیاسی اور انتظامی اختیارات رکھنے والوں کو پہنچنے والا فائدہ بھی کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔

پلاٹ خرید کر آبادی میں رہائش اختیار کرنے والوں کا مسئلہ سب سے زیادہ گمبھیر ہے کیونکہ ان کی گرفت باقی کرداروں پر سب سے کمزور ہے۔ غیر قانونی بستی کی آبادی کی نشوونما کے ابتدائی مرحلے میں ان کو ایک طرح کی طاقت حاصل تھی، کیونکہ ان کے مستقل بسائے بغیر یہ علاقہ شہری آبادی کا حصہ نہیں بن سکتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی یہ طاقت زائل ہوتی گئی۔ اب پلاٹ بیچنے والے کم قیمت پر یا مفت پلاٹ دے کر لوگوں کو یہاں بسنے پر راغب نہیں کرتے بلکہ ایک ایک پلاٹ کو کئی کئی بار فروخت کرتے تھے۔ مزید وقت گزرنے پر انہوں نے خود کو منظم کرنے کی کوشش کی لیکن پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے۔

تاہم ان لوگوں کے علاوہ جن کے پلاٹ کسی اور کے ہاتھ دوبارہ فروخت کر دیے گئے، باقی بسنے والے بھی گھاٹے میں رہے۔ یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ان کے پاس سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی اور سرکاری طور پر ڈویلپ کی ہوئی زمین کی قیمت ان کی استطاعت سے باہر تھی۔ یہ درست ہے کہ اس عمل میں ان کا استحصال کیا جاتا ہے، انہیں سخت مشکلات جھیلنی پڑتی ہیں اور تھوڑی تھوڑی بچت کر کے اچھی خاصی رقم غیر قانونی ٹیکسوں (بھتوں) کی شکل میں دینی پڑتی ہے جو آبادی کی حالت بہتر بنانے کے کام نہیں آتی۔ اس کے باوجود برسوں پر پھیلا ہوا ادائیگیوں کا یہ سلسلہ ان کے مالی حالات سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ وہ کچے مکان بھی اپنی سہولت سے رفتہ رفتہ تعمیر کر سکتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ ایک سے زیادہ پلاٹ خرید لیتے ہیں اور قیمت بڑھنے پر زائد پلاٹ بیچ کر اپنا مالی بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ زمین کی پلاٹ بندی اور فروخت کا یہ کام قانونی طور پر کیوں نہیں کیا جاتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ باقاعدہ سرمایہ کار اس کاروبار میں اس لیے داخل نہیں ہوتے کہ سرمایہ کاری کے حساب سے اتنے زیادہ منافعے کی امید نہیں ہوتی۔ باقاعدہ اور قانونی طور پر کسی علاقے میں آبادکاری کرنے کے لیے کچھ انفراسٹرکچر بنانا پڑے گا جس پر بہت پیسے خرچ ہوں گے۔ علاوہ ازیں انہیں متعدد قانونی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ان آبادیوں میں اقتصادی قوتوں کے مطابق سرمایہ کشی کرنے کا قدیم طریقہ استعمال ہو رہا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کا اولین مرحلہ ہوتا ہے۔

اس عمل میں اصل نقصان ریاست ہی کا ہوتا ہے جو اپنے ایک قیمتی اثاثے، یعنی سرکاری ملکیت کی زمین، سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔

**

Facts & Figures

A monthly compilation of

Urban Resource Centre
613 City Shopping Mall
111 Depot Lines
Karachi.
Tel: 7788021, 7788173

Scanned with CamScanner

کسی شہر کی صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ شہر کا انتظام کیسے چلایا جاتا ہے۔ کراچی شہر کی بدانتظامی کے ایک اہم نتیجے کی تفصیل آپ پچھلے چار مضامین میں ملاحظہ کر چکے ہیں۔ عارف حسن کا مضمون شہری بدانتظامی اور تشدد کراچی کے ناقص انتظام سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کو غیر ترقی یافتہ دنیا کے دوسرے شہروں سے موازنے میں پیش کرتا ہے۔ عارف حسن اپنی تحقیق کی بنیاد پر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شہری انتظامیہ کی نااہلی اور ناکارکردگی، انتظامی فیصلوں میں مفادپرست گروہوں کے عمل دخل، تعلیم یافتہ اور روشن خیال شہریوں کی شہر کے اصل مسائل سے بے اعتنائی اور بدانتظامی کا شکار ہونے والے غریب شہریوں کی بے بسی کے باعث تشدد شہری زندگی کا ایک ناگزیر جزو بن گیا ہے۔

اس مضمون کا متن عارف حسن کے مندرجہ ذیل انگریزی مضامین کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے:

1 "How Does a City Function?"
(Prepared for UNESCAP, August 1995)
2 "Karachi and the Global Nature of Urban Violence"
(*The Urban Age*, Urban Violence Issue Summer 1993)
3 "Asian Overview of Pattern of Violence - Special Focus on Karachi
(Paper for the seminar on "Megacities Crises & Challenges"
Aga Khan University, 16 November 1995)

علاوہ ازیں، عارف حسن سے گفتگو کی بنیاد پر مضمون میں کہیں کہیں اضافے بھی کیے گئے ہیں۔

Scanned with CamScanner

عارف حسن

انگریزی سے ترجمہ اور تدوین: اجمل کمال

شہری بدانتظامی اور تشدد

بیشتر ایشیائی شہروں میں شہری ترقیات کی پالیسیاں وفاقی اور صوبائی حکومتیں وضع کرتی ہیں اور ان کو نافذ کرنے کا کام صوبائی یا شہری ترقیاتی ایجنسیوں کے ذمے ہوتا ہے۔ یہ پالیسیاں تیار کرنے والے افراد اوپر کے درمیانے طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور عموماً روایتی طور پر تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ ان کی تیار کردہ پالیسیوں میں ان کے طبقے کی مخصوص سوچ اور ترقی یافتہ دنیا (First World) کے تعصبات جھلکتے ہیں۔ تیسری دنیا کی یونیورسٹیوں میں رائج تدریس کے طریقوں کے باعث اس کا مقامی معاشرے کی حالت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، یہ تعصبات اور زیادہ مضبوط ہوتے ہیں اور بیرونی ملکوں سے آنے والے کنسلٹنٹوں کے نظریوں، تربیت اور رویے سے تقویت حاصل کرتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر افراد غریب اور کم آمدنی والے طبقوں کے سماجی اور معاشی حالات اور موقعے (فیلڈ) کی صورت حال سے بے خبر ہوتے ہیں۔

پالیسیاں وضع کرنے والوں کے علاوہ شہروں میں معاشی اور سیاسی طاقت رکھنے والے طاقتور گروپ بھی موجود ہوتے ہیں جو سرکاری پالیسیوں اور منصوبوں پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ جو پالیسیاں ان کے مفادات سے مطابقت نہیں رکھتیں، وہ ان کے عملی نفاذ کو روکنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ ان کے مفادات عموماً شہر کے غریب باشندوں کے مفادات سے متصادم ہوتے ہیں۔ جن ایشیائی شہروں میں اسٹیبلشمنٹ مضبوط ہے اور وہاں دولت اور طاقت ور طبقوں کی طاقت سرپرستی کرتی ہے، وہاں مفادات رکھنے والے یہ گروپ اسٹیبلشمنٹ کا باقاعدہ حصہ ہیں اور پالیسی سازی کے عمل میں شامل ہوتے ہیں۔ یہ صورت ملائشیا، تھائی لینڈ اور کوریا میں موجود ہے۔ اس کے برعکس جنوبی ایشیا میں، جہاں کا سیاسی کلچر مقبولیت پسند ہے اور اسٹیبلشمنٹ کی حالت پر گرفت کمزور ہے، وہاں یہ گروپ طاقت ور دلالوں کے طور پر کام کرتے ہیں اور سرکاری پالیسیوں پر بالواسطہ اثرانداز ہوتے ہیں۔ یہ دلال یہ

طرف اپنی سرگرمیوں پر پابندی لگانے والی پالیسیوں کو بے اثر بنا سکتے ہیں اور دوسری طرف شہر کے ان غریب اور کم آمدنی والے طبقوں کا استحصال کرتے ہیں جن کی ضروریات پوری کرنے کے لیے سرکاری پالیسیوں میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ان مافیا گروپوں کے علاوہ شہروں میں کاروباری اور تجارت پیشہ لوگوں کی طاقت ور انجمنیں ہوتی ہیں جو پالیسی سازی اور ترقیات کے عمل میں ایک مثبت کردار ادا کر سکتی ہیں لیکن اکثر صورتوں میں یہ محدود روایتی کردار پر قانع رہتی ہیں جو تاریخ نے ان کے لیے متعین کر دیا ہے۔

عمومی طور پر یہ چھ فریق ہیں جن کی ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت اس امر کا تعین کرتی ہے کہ کسی شہر کا انتظام کیسے چلایا جاتا ہے: (۱) غیر رسمی سیکٹر، (۲) مافیا، (۳) شہر کے غریب اور کم آمدنی والے باشندے، (۴) غیر سرکاری تنظیمیں (NGOs)، (۵) رسمی پرائیویٹ سیکٹر اور (۶) سرکاری ایجنسیاں۔

***

غیر رسمی سیکٹر

شہری منصوبہ بندی اور انتظام کے کام میں انفراسٹرکچر، شہری سہولتوں، روزگار اور رہائش، ٹرانسپورٹ اور وسیع تر ماحولیاتی مسائل کا بندوبست شامل ہے۔ تقریباً تمام ایشیائی حکومتیں ان سب شعبوں میں شہری آبادیوں کی ضروریات پوری کرنے کی اہلیت سے محروم ہیں۔ تاہم، شہروں کی آبادی مسلسل بڑھتی رہتی ہے اور یہ سارے کام رسمی منصوبہ بندی کے بغیر، بلکہ اس سے ہٹ کر، ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں کہیں منصوبے تیار بھی کر لیے جاتے ہیں، وہاں سرکاری نظام ان کو نافذ کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس کے علاوہ دیکھا گیا ہے کہ سرکاری منصوبوں کا شہر کے غریب باشندوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا، اس وقت بھی نہیں جب یہ منصوبے غریب باشندوں ہی کی رہائشی ضروریات پوری کرنے کے مقصد سے بنائے جاتے ہیں۔ بڑھتے ہوئے غیر ترقیاتی اخراجات اور بدعنوانی کے باعث ان سرکاری منصوبوں پر اتنی لاگت آتی ہے کہ ان کی قیمت غریب اور کم آمدنی والے طبقوں کی استطاعت سے باہر ہوتی ہے۔ حکومت کے غیر ترقیاتی اخراجات اتنے بڑھ چکے ہیں کہ اب سہولیات قلیل تعداد سے زیادہ فراہم کرنا پبلک سیکٹر کے بس سے باہر ہے۔ زمین، سہولتیں، تکنیکی امداد اور قرض حاصل کرنے کا امکان غریب باشندوں کے لیے نہیں ہے۔ سرکاری اور رسمی پرائیویٹ سیکٹر کے جاری کیے ہوئے قرضے صرف مال دار افراد کے کام آتے ہیں۔

ایشیائی شہروں میں آمدنی اور سہولتوں کی تقسیم میں دولت مندوں اور غریبوں کے درمیان نمایاں فرق موجود ہے۔ اس فرق

کے نتیجے میں نئے آنے والے غریب لوگ شہر کے بیرونی کناروں پر کچی آبادیوں میں بسائے جا رہے ہیں اور یہ کام غیر رسمی سیکٹر کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔ (بعض صورتوں میں شہروں کے اندر کی پرانی بستیاں، جو ماحولیاتی طور پر تباہ ہو چکی ہیں، رفتہ رفتہ غریبوں کے رہائشی علاقوں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔) یہ پورا عمل قانونی طور پر جائز تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس کے فاعل کردار دلال، قبضہ گیر اور غنڈے ہیں جنہیں بدعنوان سرکاری افسروں اور پولیس والوں کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔ اس عمل کے مالی اخراجات اکثر غیر رسمی سیکٹر کے سودخوروں، علاقے کے مال دار لوگوں اور جائیداد کے تاجروں کی معاونت سے پورے کیے جاتے ہیں۔ یہی فاعل کردار بالعموم علاقے کے لیڈر بن کر ابھرتے ہیں اور علاقے کے غریب باشندوں اور ریاستی اداروں کے درمیان واسطہ بنتے ہیں۔ بعد میں یہی لوگ منتخب ہو کر بلدیاتی اداروں اور اسمبلیوں میں پہنچتے ہیں۔ یہ صورت حال شہر کے غریب باشندوں کے لیے سخت غیر منصفانہ ہے لیکن کوئی اور چارہ نہ پا کر وہ اس سے سمجھوتا کر لیتے ہیں۔ اس طرح پورا جمہوری عمل بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔

روزگار، جو لوگوں کے دیہات سے شہروں میں آنے کا بنیادی سبب ہے، بیشتر صورتوں میں غیر رسمی سیکٹر ہی فراہم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کراچی میں روزگار کے ۷۵ فیصد مواقع غیر رسمی سیکٹر کے فراہم کردہ ہیں۔ یہ سیکٹر ایک طرف غریب باشندوں کی روزگار کی ضرورت پوری کرتا ہے اور دوسری طرف رسمی سیکٹر کے بڑے صنعتی اور تجارتی اداروں کو ٹھیکے پر مزدور مہیا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹے کارخانے اور کاروبار بھی غیر رسمی سیکٹر کے ہاتھوں میں ہیں۔ ان کاروباروں کے لیے قرض کی سہولتیں دلال اور پیشہ ور سودخور فراہم کرتے ہیں اور ۱۰ سے ۱۵ فیصد ماہانہ کی شرح سے سود وصول کرتے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کو آدمیوں سے بھی کم مزدوری دی جاتی ہے۔

ٹرانسپورٹ کے شعبے میں بھی غیر رسمی سیکٹر اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ بسیں اور ٹیکسیاں خریدنے کے لیے قرضے دیتا ہے، بسیں، رکشے اور جانوروں سے کھینچی جانے والی گاڑیاں ٹھیکے پر مہیا کرتا ہے اور جن علاقوں میں پبلک ٹرانسپورٹ کم ہو وہاں سے مزدوروں کو روزگار کی جگہوں تک لے جانے کے لیے ٹھیکے پر ٹرانسپورٹ فراہم کرتا ہے۔

تیسری دنیا کے شہروں میں ٹھوس کوڑے کرکٹ کو ٹھکانے لگانے کا انتظام نہایت ناقص اور اکثر صورتوں میں ۳۰ فیصد سے زیادہ ضرورت پوری کرنے سے قاصر ہے۔ تاہم یہ شہری کوڑا کرکٹ زمین میں دفن نہیں ہو جاتے کیونکہ غیر رسمی سیکٹر ان میں سے کار آمد چیزیں الگ کر کے صنعت کو دوبارہ استعمال کے قابل بنا دیتا ہے۔ اس طرح لوگوں کو روزگار بھی ملتا ہے اور غریب گھرانوں کو تھوڑی سی آمدنی بھی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اپنی استعمال شدہ چیزیں پھینکنے کے بجائے کباڑیوں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔ شہری انتظامیہ کا جمع کیا ہوا کوڑا کرکٹ بھی غیر رسمی سیکٹر سرکاری افسروں کو رشوت دے کر خرید لیتا ہے۔ اس طرح شیشے، پلاسٹک، کاغذ اور دھات کی چیزیں ری سائیکل کر لی جاتی ہیں۔ یہ عمل

[illegible] طریقوں سے [illegible] ہیں۔ کئی شہروں کی انتظامیہ ان طریقوں کو [illegible] کے لیے تکنیکی مدد [illegible] عمل پر [illegible] کی کوشش کر رہی ہے۔

شہروں کے [illegible] علاقوں میں حکومت تعلیم اور صحت کی بھی بیشتر سہولتیں فراہم کرنے سے قاصر رہی ہے۔ تعلیمی سہولتیں [illegible] پرائیویٹ سیکٹر کی طرف سے [illegible] کاروبار یا سماجی خدمت کے طور پر [illegible] جاتی ہیں [illegible] صحت [illegible] رکھتے ہیں [illegible] تربیت یافتہ [illegible] کام کرتے ہیں۔ ان [illegible] کو بہتر بنانے [illegible] سیکٹر [illegible] کی طرف سے کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔ مثلاً [illegible] کی آبادی [illegible] اسکولوں میں [illegible] مختلف [illegible] ۵۲۹ [illegible] پرائیویٹ [illegible] چلا رہی ہیں [illegible] پرائیویٹ اسکولوں کی فیسیں علاقے [illegible] حالت سے مطابق ہیں۔ علاوہ [illegible] پانچ سرکاری ہسپتال [illegible] ۵۹۲ [illegible] پرائیویٹ [illegible] اور ۳۸ [illegible] پرائیویٹ [illegible] ایشیائی شہروں کی [illegible] آبادیوں میں کم و بیش ایسی ہی صورت حال ہے۔

[illegible] شہروں میں [illegible] سیکٹر [illegible] تسلیم نہیں کیا جاتا [illegible] عمل کا [illegible] ایشیائی شہروں [illegible] سیکٹر [illegible] ہوتی ہیں۔ اکثر اوقات [illegible] سیکٹر [illegible] کاروبار [illegible] ہیں۔ [illegible] کام [illegible] ہوتا ہے۔ جبکہ دوسری [illegible]

[illegible]

مافیا

شہروں کی نااہل اور بدعنوان سرکاری انتظامیہ غریب اور کم آمدنی والے طبقوں کی ضروریات پوری کرنے میں ناکام رہتی ہے اور انھیں کسی طرح کا تحفظ نہیں دے سکتی۔ غیر رسمی سیکٹر کے کاروباری لوگ اور دلال اس صورت حال کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ سرکاری زمین پر غریب باشندوں کو بسا کر زمین کی قیمت وصول کرتے ہیں جب کہ اس زمین پر بسنے والے ملکیت کے قانونی تحفظ سے محروم رہتے ہیں۔ وہ غریب باشندوں کو روزگار پر لگواتے ہیں اور اس کے بدلے میں ان سے غیر قانونی ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ وہ انھیں مکان بنانے یا چھوٹا موٹا کاروبار شروع کرنے کے لیے قرض دیتے ہیں اور ظالمانہ شرح پر سود وصول کرتے ہیں۔ وہ انھیں پولیس کی زیادتیوں سے بچانے کے لیے بھتہ وصول کرتے ہیں جس میں پولیس کا باقاعدہ حصہ ہوتا ہے۔ اپنی ان سرگرمیوں کے لیے وہ غنڈوں کو اجرت پر رکھتے ہیں اور سرکاری اہلکاروں سے اپنے تعلقات کو استعمال کرتے ہیں۔ بڑی سرگرمیوں کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کی غرض سے وہ منشیات فروخت کرتے ہیں، عصمت فروشی اور قماربازی کے اڈے چلاتے ہیں اور ہر قسم کی اسمگلنگ اور بلیک مارکیٹنگ کرتے ہیں۔ ان تمام سرگرمیوں کے لیے کارندے شہر کے انھیں غریب باشندوں میں سے بھرتی کیے جاتے ہیں جن کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے یہ غیر رسمی سیکٹر وجود میں آیا تھا۔

یہ مافیا سرکاری اہلکاروں، خصوصاً پولیس، کی مدد کے بغیر کام نہیں کر سکتے۔ یہ شہر کے خوش حال علاقوں میں بھی کام نہیں کر سکتے کیوں کہ ان علاقوں میں رہنے والے لوگ انتظامیہ کی مختلف سطحوں تک رسائی رکھتے ہیں۔ اس طرح ان مافیاؤں کو غریب اور کم آمدنی والے علاقوں میں حکومت کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے اور شہر ان علاقوں اور خوش حال علاقوں کے درمیان تقسیم ہو جاتا ہے۔ غریب علاقوں میں تمام سیاسی جماعتیں اپنی انتخابی مہم کے لیے انھیں مافیاؤں سے مالی اور تنظیمی امداد حاصل کرتی ہیں جس کے بدلے میں ان کی سرگرمیوں کو سیاسی تحفظ بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسے اکا دکا موقعوں کو چھوڑ کر جب واقعی کوئی عوامی تحریک موجود ہو، انتخابات میں کامیاب ہونے والے امیدوار یا تو مافیا کے لوگ ہوتے ہیں یا انھیں مافیا کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔

اس طرح شہر کے غریب باشندوں کو روزگار، سہولتیں اور اقتدار تک رسائی فراہم کرنے میں ناکام رہ کر ریاست انھیں انصاف اور تحفظ مہیا کرنے سے بھی قاصر رہتی ہے۔ ریاست کی یہ ناکامی شہری علاقوں میں تشدد، ظلم اور جبری بھتوں کی وصولی کے نظام کی بنیاد رکھ دیتی ہے۔

شہر کے غریب باشندے

یہ باشندے زیادہ تر شہر کی مضافاتی کچی آبادیوں میں رہتے ہیں۔ ان کی خریدی ہوئی زمین کی ملکیت کا قانونی تحفظ حاصل کرنے کے لیے [illegible] اداروں پر اجتماعی دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ [illegible] کی انجمنیں [illegible] تنظیم کے معاملات میں [illegible] حاصل [illegible] سے وہاں وہ کسی حد تک کامیاب رہتے ہیں۔ [illegible] کی غیر موجودگی میں اچھے طور پر کام کرتے ہیں [illegible] باشندوں کے عدم تحفظ کی صورت میں [illegible] زیادہ [illegible] سرکاری [illegible] خصوصاً علاقائی کونسلروں کی انجمنیوں سے [illegible] غیر سرکاری تنظیموں سے حاصل ہوتی ہے۔ [illegible] ایک طرف غریب باشندوں [illegible] معلومات [illegible] ہوتی ہیں جو سرکاری محکموں سے [illegible] کے لیے ضروری ہے [illegible] دوسری طرف [illegible] لوگوں تک کسی [illegible] تکنیکی مدد [illegible] تنظیمیں بہت کم تعداد میں ہیں [illegible] مشکل پانچ فیصد شہری آبادی تک پہنچ پاتی ہے۔ ان کی تعداد میں [illegible] شہروں کی [illegible] آبادی [illegible] ہے۔

غیر سرکاری تنظیمیں

روایتی طور پر غیر سرکاری تنظیمیں شہری آبادیوں اور سرکاری ایجنسیوں کے درمیان ایک پل کے طور پر کام کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ [illegible] سرکاری ایجنسیاں غیر سرکاری تنظیموں کی حکمت عملی [illegible] سے عمل کرنے کی [illegible] ہے۔ [illegible] سرکاری کام کا حصہ بن سکتی ہیں۔ لیکن چونکہ سرکاری ایجنسیوں کو وہ عملی [illegible] حاصل نہیں ہوتا، اس لیے اگر وہ غیر سرکاری تنظیموں کی حکمت عملی [illegible] کرتی بھی ہیں تو یہ کسی مخصوص علاقے یا پروجیکٹ تک محدود رہتی ہے۔ بعض صورتوں میں ان تنظیموں نے غیر سرکاری سیکٹر کا [illegible] غریب شہریوں کو مستفید کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اس طرح کی کوئی [illegible] غیر سرکاری سیکٹر کا متبادل نہیں بن سکتی اور ایسی کوششیں یا تو غیر اہم رہتی ہیں یا مکمل طور پر ناکام ہو جاتی ہیں۔

حکومت کی [illegible] پالیسی کی دستاویزات میں غیر سرکاری تنظیموں کی حوصلہ افزائی اور ان کو [illegible] کرنے والے ہیں [illegible] ادارے

بھی اپنی مدد آپ کے تحت چلنے والے پروگراموں میں ان کی شمولیت پر زور دیے گئے ہیں۔ لیکن انہیں شامل کرنے کی صورت میں ان سے سرکاری پروگراموں کو سرکاری شرائط پر چلوانے کا مطلب ہو جاتا ہے۔ غیر سرکاری تنظیموں کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ غیر رسمی سیکٹر کو استحصالی اور غیر مہذب قرار دے کر اس کے ساتھ مل کر کام کرنے کے تصور کو مسترد کر دیتے ہیں۔ اس سیکٹر کی سرگرمیاں ان کے مطالعے اور تحقیق کا موضوع بھی نہیں بنتیں۔ اگر ان سرگرمیوں کے منفی پہلوؤں پر توجہ مرکوز رکھنے کے بجائے مثبت پہلوؤں کو قریبی مطالعے کے ذریعے سمجھنے اور بہتر بنانے کی کوشش کی جائے تو غیر سرکاری تنظیمیں اپنے وسائل کو زیادہ موثر طور پر استعمال کر سکتی ہیں اور رفتہ رفتہ اس سیکٹر کو غریب باشندوں کے لیے زیادہ کارآمد بنا سکتی ہیں۔

رسمی سیکٹر

ایشیائی شہروں میں رہائشی زمین کے معاملے میں سب سے اہم کردار رسمی سیکٹر کے ڈویلپروں کا ہوتا ہے۔ شہروں میں مقیم درمیانہ طبقے کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے جس کی دولت کاروباری اور تجارتی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ چونکہ جائیداد محفوظ ترین سرمایہ کاری ہے، اس لیے درمیانہ طبقے کے لوگ اسے منافع کمانے کی غرض سے خریدتے ہیں۔ ڈویلپر ان کی اسی طلب کو پورا کرتے ہیں اور اس طبقے کی ضرورت سے کہیں زیادہ تعداد میں پلاٹ، مکانات اور فلیٹ تیار کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ زمین کے بڑے بڑے قطعات خریدتے ہیں جنہیں شہر کے غریب باشندوں کو رہائشی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ زمین روزگار کی جگہوں کے نزدیک واقع ہوتی ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ڈویلپر اس میں سے بیشتر زمین غریب آبادیوں کو بے دخل کر کے حاصل کرتے ہیں۔ یہ بے دخلی عموماً ڈرا دھمکا کر غیر قانونی طریقے سے کی جاتی ہے اور اس میں ڈویلپروں کو سرکاری اہلکاروں اور پولیس کی عملی امداد حاصل ہوتی ہے۔

جائیداد کا لین دین بہت بڑی تجارت ہے اور یہ تاجر ایسے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں سیاستدان، اعلیٰ ترین سرکاری افسر اور پالیسی ساز بھی شامل ہیں۔ جو کچھ انہیں اپنے تعلقات کے بل پر حاصل نہ ہو سکے وہ اسے سیاستدانوں، سرکاری اہلکاروں وغیرہ کو رشوت دے کر حاصل کر لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ بلدیاتی اداروں اور اسمبلیوں کے انتخابات میں مختلف سیاسی پارٹیوں کے امیدواروں کی انتخابی مہم کے اخراجات برداشت کرتے ہیں اور یوں انہیں پالیسی سازی میں براہ راست عمل دخل حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی ایسی پالیسی وضع کی جائے جس سے ان کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو وہ اسے عملاً بے اثر بنانے کی بھی طاقت رکھتے ہیں۔ بیشتر شہروں میں ڈویلپروں نے اپنی ایسوسی ایشنیں قائم کر

Scanned with CamScanner

رکھی میں مطالبے کے مد رہیں کام کرتی ہیں۔ حکومت کی طرف سے دی جانے والی مالی رعایتیں اور قرضوں کی سہولتیں زیادہ تر انہیں کے کام آتی ہیں اور شہری پالیسیاں تیار کرنے والی تقریباً تمام کمیٹیوں میں ان کا اثر و رسوخ اور نمائندگی موجود ہوتی ہے۔ رسمی سیکٹر کے ڈولپر غریب باشندوں کو رہائشی سہولتیں فراہم کرنے سے دل چسپی نہیں رکھتے بلکہ ان کا اصرار ہے کہ ان کے منافع کی شرح کم نہ ہو۔ چھوٹے ڈولپروں کے اور غریب باشندوں کے درمیان تصادم کا سبب ہوتا ہے کیوں کہ وہ اپنے کاروبار کے لیے بہتر زمین غریبوں کی آبادیاں مسمار کرکے حاصل کرتے ہیں۔ شہروں کے اندرونی علاقوں میں زمین کی قیمت میں تیزی سے اضافہ ہونے سے وہاں موجود غریب باشندوں کی بستیوں میں آگ لگنے کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ یہ آگ حادثاتی طور پر نہیں بلکہ زمین پر قبضہ کرنے والے بلڈروں، جائیداد کے دلالوں اور بڑے تجارتی مفادات رکھنے والوں کی سازش کے نتیجے میں لگتی ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ جائیداد کے تاجروں کی بڑی تعداد کو شہر کی ترقی کے مسائل سے دل چسپی نہیں ہوتی۔ شہروں کا معیار زندگی بلند کرنے اور باشندوں کو سہولتیں فراہم کرنے کے بجائے ان کی تمام کوششوں کا مقصد صرف منافع کمانا ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ فلاحی کاموں پر رقم بھی خرچ کرتے ہیں اور تعلیم، علاج اور تفریح کے ادارے قائم کرتے ہیں لیکن یہ ادارے غریبوں کے کام نہیں آتے اور نہ غریب علاقوں میں واقع ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں جائیداد کے تاجروں اور شہروں کے منتظمین کے درمیان گہرے سیاسی اور مشترکہ مالی تعلقات کی بھی متواتر نشان دہی کی جاتی ہے۔

نئے صنعت کار اور چھوٹے کاروباروں والے اپنی ضرورتوں کے لیے مزدور اور کاریگر غیر رسمی سیکٹر میں کام کرنے والے ٹھیکے داروں کے ذریعے ہی حاصل کرتے ہیں۔ رسمی سیکٹر کے تاجر ٹھیکے پر مزدور رکھ کر قانون کی پابندیوں سے آزاد ہو جانے کے خطرے سے محفوظ رہتے ہیں اور مزدوروں کو ان کے قانونی حقوق سے محروم رکھ کر ان کی محنت کا استحصال کرتے ہیں۔ ان مزدوروں کو کام میں رکھنے کے لیے ٹھیکے دار رشوت اور غنڈہ گردی سے کام لیتے ہیں اور چھوٹی تنظیموں کی عملی مدد کرتے ہیں۔

بیشتر بڑے شہروں میں تاجروں اور صنعت کاروں کی مضبوط تنظیمیں موجود ہوتی ہیں۔ یہ تنظیمیں حکومت کی شہری پالیسیوں اور منصوبہ بندی کی تجاویز مرتب کرنے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ان میں شامل افراد سیاست دانوں اور بیوروکریسی میں اثر رکھتے ہیں۔ یہ تنظیمیں بھی فکری سطح پر قدامت پرست ہوتی ہیں اور شہر کے سماجی مسائل سے کوئی دل چسپی نہیں رکھتیں۔ ان کا رویہ صرف اپنے اعلیٰ ترین طبقوں کے تجارتی مفادات کے تحفظ تک محدود رہتا ہے اور ان کی فلاحی سرگرمیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

تقریباً ہر شہر میں شہریوں اور باشندوں کی بھی باقاعدہ انجمنیں ہوتی ہیں جو ماحول کو بہتر بنانے کے لیے یا صارفین کے مفادات کے تحفظ کے لیے رضاکارانہ طور پر کام کرتی ہیں۔ ان میں سے بہت سی تنظیمیں چندے وغیرہ کے ذریعے وسائل جمع کرکے مقامی سطح کا ترقیاتی کام بھی کرتی ہیں۔ اونچے درمیانہ

یا صاحب اقتدار طبقوں سے تعلق رکھنے کی بدولت انہیں اقتدار کے مراکز تک رسائی بھی حاصل ہوتی ہے۔ تاہم یہ انجمنیں سماجی حالات کو جوں کا توں رکھنے کے حق میں ہوتی ہیں اور ایسی پالیسیاں یا ترقیاتی ترجیحات متعین کرنے کے عمل میں حصہ نہیں لیتیں جن کا تعلق شہری آبادی کی اکثریت یعنی غریب اور کم آمدنی والے باشندوں کی ضروریات اور مسائل سے ہو۔ ایسی انجمنوں کا شہر کی غریب بستیوں سے رابطہ بھی نہیں ہوتا اور نہ یہ عموماً سیاست سے کوئی نظریاتی دلچسپی رکھتی ہیں۔

ایشیا کے بڑے شہروں میں پیشہ ور ماہروں کی ایسوسی ایشنیں موجود ہیں۔ ان ماہرین میں ڈاکٹر، وکیل، آرکیٹیکٹ، منصوبہ سازی کے ماہر، انجینیر، سماجی سائنس دان وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے متعدد تنظیموں کو حکومتیں پالیسی سازی کے عمل میں شامل کرتی ہیں لیکن ان تنظیموں کے ارکان اونچے طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور انہوں نے روایتی طور پر تعلیم اور تربیت حاصل کی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں، حکومت کی روایتی ترقیاتی پالیسیوں اور روایات کو قائم رکھنے میں ان کا ذاتی مفاد بھی ہوتا ہے کیونکہ یہ افراد حکومت کے ترقیاتی پروگراموں میں مشیر اور کنسلٹنٹ کے طور پر شامل کیے جاتے ہیں۔ ایشیا کی مذکورہ پیشہ ورانہ ایسوسی ایشنیں دراصل ٹریڈ یونینوں کے طور پر کام کرتی اور اپنے ارکان کو حاصل مالی اور سماجی مراعات کے تحفظ کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔ اگر ان کا کوئی رکن انفرادی طور پر یا چند ارکان گروپ کی شکل میں کوئی غیر روایتی کام شروع کریں تو انہیں ان ایسوسی ایشنوں کی جانب سے کوئی عملی امداد نہیں ملتی۔

شہروں میں تدریسی اور تحقیقی ادارے خاصی تعداد میں ہوتے ہیں جن کے کام کا تعلق شہری منصوبہ بندی اور پالیسی سازی کے مختلف پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ لیکن ان اداروں کا مد نظر روایتی ہوتا ہے وہ اپنے ردگرد کی دنیا کو مخصوص اصطلاحات اور تعصبات کی روشنی میں دیکھتے ہیں جو ترقی یافتہ دنیا کے ماہرین اور تجربات کی بنیاد پر وضع کیے گئے ہیں۔ ان اداروں کو مقامی حالات اور طور طریقوں سے واقفیت نہیں ہوتی چنانچہ وہ ایسے تربیت یافتہ افراد تیار نہیں کرسکتے جو آگے چل کر سرکاری منصوبہ بندی اور پالیسی سازی کا رخ تبدیل کرسکیں۔ جہاں کہیں ان تدریسی اور تحقیقی اداروں نے آبادی کی نچلی سطحوں کی تنظیموں کے ساتھ مل کر کام کیا ہے وہاں صورت حال میں خاصی تبدیلی آئی ہے؛ لیکن بدقسمتی سے ایسی مثالیں بہت کم ہیں۔

شہروں کے رہائشی مسائل کے بارے میں پرائیویٹ اور سرکاری دونوں قسم کے تحقیقی ادارے پہلے سے موجود پالیسیوں اور روایتوں سے متعلق صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں اور ایسی معلومات جمع کرتے ہیں جن سے ان پالیسیوں اور روایتوں کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ وہ ان طریقوں کا مطالعہ نہیں کرتے جن کے ذریعے غریب اور کم آمدنی والے شہری باشندے ان سرکاری اعانت کے بغیر اپنے رہائشی مسائل کا حل نکالتے ہیں۔ مثلاً یہ حقیقت نظر انداز کردی جاتی ہے کہ یہ شہری باشندے رفتہ رفتہ اپنی بچت اور کم مسودوں اور چھوٹے قرضوں کے ذریعے اپنے مکانوں کو بہتر بناتے رہتے ہیں۔ سرکاری تحقیقی اداروں کے محققین

Scanned with CamScanner

ہوئے اعداد و شمار بھی مقامی حالات سے ناواقفیت یا بے اعتنائی کے باعث ناقص رہ جاتے ہیں۔

سرکاری ایجنسیاں

شہری منصوبہ بندی اور انتظام سے تعلق رکھنے والی ایجنسیوں کے افسر، جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، اونچے طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں، روایتی تعلیم اور تربیت حاصل کرتے ہیں اور مقامی حالات سے ناواقف ہوتے ہیں۔ شہر کے غریب باشندوں کے بارے میں ان کا رویہ شک اور عداوت پر مبنی ہوتا ہے اور وہ ان باشندوں کے سماجی اور معاشی حالات اور ان میں آنے والی تبدیلیوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ رہائش، ٹرانسپورٹ اور دوسرے شعبوں میں غریب باشندوں کے بارے میں پالیسیاں تیار کرنے کے عمل میں ان باشندوں اور ان کی ضروریات پوری کرنے والے غیر رسمی سیکٹر کی رائے تک طلب نہیں کی جاتی۔ نتیجہ یہ کہ پالیسیاں صورت حال کو سنبھالنے میں ناکام رہتی ہیں۔

پالیسی سازی کے مسائل سے قطع نظر، ان پالیسیوں کے نفاذ اور شہری انتظام کے شعبوں میں سرکاری ایجنسیوں (خصوصاً پولیس) کا مافیاؤں، ڈویلپروں اور ٹرانسپورٹروں وغیرہ سے ان کا گٹھ جوڑ ہوتا ہے جو سرکاری طریق کار سے جواب دہی اور شفافیت کے عنصر کو بالکل ختم کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ غریب طبقوں کے لیے سہولتیں حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور طبقاتی تقسیم میں اور زیادہ شدت پیدا ہوتی ہے۔ حکومت اگر کوئی ترقی پسندانہ قانون وضع بھی کر لے تو غریبوں سے متصادم مفادات رکھنے والے گروہوں اور سرکاری عملے کا یہ گٹھ جوڑ اس کے عملی نفاذ کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر، پاکستان میں لینڈ ایکوزیشن ایکٹ موجود ہے جس کے تحت حکومت غریب شہریوں کو رہائش فراہم کرنے کے لیے کسی بھی زمین کو ایک معینہ قیمت ادا کر کے (جو مارکیٹ کے نرخ سے کافی کم ہوتی ہے) حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن یہ قانون صرف کاغذ پر وجود رکھتا ہے اور کبھی عمل میں نہیں لایا گیا۔

عام طور پر محسوس کیا جاتا ہے کہ موثر بلدیاتی ادارے شہری بد انتظامی کی صورت حال بدلنے کا ذریعہ ہو سکتے ہیں۔ شہری انتظام میں حصہ لینے والے تمام فاعل گروہوں میں بھی یہ احساس رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے کہ مستحکم اور خود کفیل بلدیاتی اداروں کا قیام موزوں شہری پالیسیوں کے نفاذ، ترقیاتی کام، انفراسٹرکچر اور شہری سہولتوں کی فراہمی اور دیکھ بھال کے لیے لازمی ہے کیونکہ وہی شہر کے غریب اور سہولتوں سے محروم طبقوں کے ساتھ عملی رابطہ رکھ سکتے ہیں۔ حکومت کے بیشتر منصوبوں، امداد اور قرض دینے والے بین الاقوامی اداروں کی پالیسیوں اور غیر سرکاری تنظیموں کی مطبوعات میں بھی اس نکتے کا بار بار ذکر آتا ہے۔ لیکن بیشتر شہروں میں بلدیاتی ادارے مالی طور پر دیوالیہ ہیں۔ شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے باعث ان سے مطالبات کئی گنا ہو رہے ہیں اور ترقیاتی اخراجات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس پر

Scanned with CamScanner

حصوں کا بوجھ بہت زیادہ ہے اور وہ بیوروکریسی کی سمت رُخ کیے ہیں۔ منتخب بلدیاتی اداروں کو صوبائی اور قومی قانون ساز اداروں اور سیاست دانوں کا حریف سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ جب منتخب بلدیاتی ادارے موجود ہوں تب بھی وہ اپنے محدود فنڈ یا اختیارات موثر طور پر استعمال نہیں کر پاتے۔

علاوہ ازیں، ایشیائی ملکوں کے جدید اقتصادی رجحانات — پرائیویٹائزیشن، آزاد تجارت کی حوصلہ افزائی وغیرہ — اور شہری نظام میں مافیاؤں کے بڑھتے ہوئے اثر نے موثر بلدیاتی اداروں کے قیام کو مزید مشکل بنا دیا ہے۔ ان عوامل نے شہری آبادی کو دو الگ تھلگ دنیاؤں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک طرف غریب اور نچلے درمیانہ طبقے کے لوگ شہروں کی بیرونی سرحدوں کی طرف دھکیلے جا رہے ہیں جس سے ان کی رہائش اور روزگار کی جگہوں کے درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے، اور دوسری طرف خوش حال لوگوں نے علاقے امیروں کے بند محلوں (ghettos) کی صورت تعمیر کر رکھے ہیں جہاں وہ مسلح پہرے داروں اور سیکیورٹی کے جدید آلات کی حفاظت میں رہتے ہیں۔ نتیجتاً شہروں کے مرکزی علاقوں سے ثقافتی اور تفریحی سرگرمیاں ختم ہو گئی ہیں؛ یہ سرگرمیاں اب صرف چند ایسے مقامات تک محدود ہو چکی ہیں جو غریب اور نچلے طبقے کے شہریوں کی پہنچ سے باہر ہیں۔ امداد اور قرض دینے والے بین الاقوامی ادارے ایشیائی ملکوں کے مالی نظام میں جن تبدیلیوں پر زور دے رہے ہیں ان کے نتیجے میں اس تقسیم میں مزید شدت پیدا ہوگی کیوں کہ ان سے پیدا ہونے والی مہنگائی نچلے طبقوں کی زندگی کو اور دشوار بنا دے گی۔

***

* ناموزوں شہری پالیسیاں
* تعلیم یافتہ اور صاحبِ حیثیت طبقات کی شہری معاملات سے بے خبری اور بے اعتنائی، اور
* سرکاری اہلکاروں (خصوصاً پولیس) کا مفادی گروہوں اور مافیاؤں کے ساتھ گٹھ جوڑ

ان تین عوامل کے تحت بہت سے ایشیائی شہروں کا انتظام ایسی مسخ اور غیر منصفانہ شکل اختیار کر لیتا ہے جس میں تشدد ایک لازمی عنصر کے طور پر شامل ہوتا ہے۔ یہ تشدد مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے:

(۱) غیر رسمی سیکٹر کی بنائی ہوئی کچی بستیوں میں مافیا کی حکمرانی ہوتی ہے اور یہ حکمرانی وہاں کے باشندوں کو خوف کے زیرِ اثر رکھنے، منظم ہونے سے روکنے اور تشدد کے استعمال کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ مافیا کا یہ تشدد کرائے کے غنڈوں اور پولیس کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ یہ تمام سرگرمیاں انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے موجود تمام ملکی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کی جاتی ہیں۔ ان بستیوں میں رہنے والی کراچی کی نصف آبادی تشدد کے اسی ماحول میں زندگی بسر کرتی ہے، اور یہ بستیاں شہر کی آبادی میں ہونے والے اضافے کی شرح کے مقابلے میں دگنی رفتار سے بڑھ رہی ہیں۔

Scanned with CamScanner

(۲) شہر کے نسبتاً خوش حال علاقوں میں زمین کی قیمت میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور جائیداد کے تاجر وہاں موجود غریب اور کم آمدنی والی بستیوں کو بل ڈوزروں کے ذریعے مسمار کروا کے نئے تعمیراتی منصوبوں کے لیے زمین کے قطعات حاصل کرتے ہیں۔ یہ تمام عمل سیاسی مداخلت، خفیہ فنڈوں، انتظامی اہلکاروں اور پولیس کا تعاون حاصل کر کے کیا جاتا ہے۔ خوش حال علاقوں کے درمیان کی کچی بستیوں میں آگ لگنے کے واقعات بعض دوسرے ایشیائی شہروں کی طرح کراچی میں بھی بڑھتی ہوئی تعداد میں پیش آنے لگے ہیں۔

(۳) ایشیائی شہروں کے مافیا اور جائیداد کے تاجر انتخابات میں سیاسی پارٹیوں کے امیدواروں کی سیاسی مہم کے مالی اخراجات برداشت کرتے ہیں اور تنظیمی کارکن بھی فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی سرگرمیوں کو سیاسی تحفظ بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ پچھلے دنوں ایک اخباری رپورٹ میں انکشاف کیا گیا تھا کہ ہندوستانی پارلیمنٹ کے ۳۵۲ ارکان میں سے ۱۸۰ مجرمانہ ریکارڈ رکھتے ہیں۔ پاکستان کی قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کے بارے میں اس قسم کی تحقیق کی جائے تو خاصے دل چسپ نتائج سامنے آئیں گے۔ سرکاری اہلکاروں اور مافیاؤں کے گٹھ جوڑ میں سیاست دانوں کی شمولیت کا نتیجہ یہ ہے کہ شہری منصوبہ بندی اور پالیسیوں کے مقاصد کو یکسر مذاق بنا دیتی ہے۔ طاقت ور اور تجارتی مفادات رکھنے والوں کی بالادستی سے صرف خوش حال علاقوں کو چھوڑ کر باقی شہری ضرورتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اقتدار کی کسی بھی سطح تک رسائی نہ رکھنے والے غیر منظم غریب باشندے مفاد پرست تاجروں اور مافیاؤں، بدعنوان سرکاری اہلکاروں اور موقع پرست سیاست دانوں کے اس گٹھ جوڑ کے رحم و کرم پر رہ جاتے ہیں۔

(۴) شہری معاملات کے غیر سرکاری اداروں کی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ایشیا کے بعض بڑے شہروں میں مافیا کی مجرمانہ اور پرتشدد سرگرمیوں میں منشیات کی تجارت سے حاصل ہونے والا سرمایہ استعمال کیا جاتا ہے۔ کراچی میں ان واقعات کے شواہد موجود ہیں کہ غریب علاقوں میں منشیات کی تجارت کے خلاف شہریوں کی چلائی ہوئی تحریکوں کو پولیس نے تشدد سے کچل ڈالا۔

شہری بدانتظامی اور تشدد کی یہ صورت حال شہر کی غریب بستیوں کے حالات پر منفی اثرات مرتب کر رہی ہے۔ علاوہ ازیں ان آبادیوں کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد شہریوں کی دوسری یا تیسری نسل کے نوجوانوں پر مشتمل ہے جس کا گاؤں کے دیہی علاقوں کی معیشت اور کلچر سے تعلق ختم ہو چکا ہے۔ اس تعلق کی عدم موجودگی شہری فرد اور ریاست کے درمیان کے رشتے کو تبدیل کر رہی ہیں۔ خاندان اور برادری کے قدیم ڈھانچے ٹوٹ کر شہری نوجوان ایسے اداروں سے تعلق قائم کرنے کے ضرورت مند ہیں جو ان کی سماجی اور قدروں کی نمائندگی کر سکیں۔ وہ ریاستی اداروں سے یہ امید کرتے ہیں، مدد کرنے کی توقع رکھتے ہیں۔ جب یہ توقع پوری نہیں ہوتی ہے۔ اس طرح ان میں تعصب اور علیحدگی کا احساس بڑھ رہا ہے۔ یہ عمل شہروں میں کم ہو رہا ہے اور بغاوت کے امکان کو

Scanned with CamScanner

تقویت ملتی ہے۔

ایک اور اہم عنصر بے روزگاری ہے۔ اوپر بیان کیے گئے حالات میں جوان ہونے والا فرد شہر کی سیاسی اور سماجی زندگی سے کوئی تعلق پیدا نہیں کر پاتا۔ بے روزگاری اس بے تعلقی اور اجنبیت کے احساس کو اور شدید کر دیتی ہے جس کے نتیجے میں یا تو متبادل سیاسی نظام کی جستجو پیدا ہوتی ہے یا پھر شہروں میں سرگرم مافیا کی ریزروں میں دیا سے وابستہ ہو کر یا انفرادی طور پر، جرم کا رجحان جنم لیتا ہے۔ دونوں صورتوں میں بے روزگار فرد شہری تشدد میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ کراچی ڈویلپمنٹ پلان ۲۰۰۰ کے مطابق ۱۹۸۹ میں کراچی میں بے روزگاری کی شرح ۱۲.۸ فیصد تھی۔ بے روزگاری کو اسی سطح پر برقرار رکھنے کے لیے ۱۹۸۹ کے بعد آنے والے پانچ برسوں میں روزگار کے ۱۱ لاکھ نئے مواقع پیدا کرنا ضروری تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ اس کے برعکس، شواہد بتاتے ہیں کہ رسمی سیکٹر میں روزگار کے مواقع کم ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، کراچی میں ۷۵ فیصد روزگار غیر رسمی سیکٹر فراہم کرتا ہے۔ ۱۹۷۳ میں غیر رسمی سیکٹر کے مہیا کیے ہوئے روزگار کے مواقع کی تعداد ۵۸ فیصد تھی۔ ان اعداد و شمار سے صورت حال کی بخوبی نشان دہی ہو جاتی ہے۔ جن شہروں میں ریاستی ادارے مکمل طور پر تباہ نہیں ہوئے ہیں اور نسلی، لسانی یا مذہبی تفریق نے سیاسی رنگ اختیار نہیں کیا ہے، وہاں تشدد اور جرائم سرکاری ایجنسیوں اور سیاسی نظام کے ادارے کی حیثیت اختیار نہیں کر سکے؛ ایسے شہروں میں تشدد پر قابو پانا ممکن ہوا ہے۔ کراچی میں ایسا نہیں ہوا۔

کراچی میں موجود لسانی یا نسلی گروہوں کے تنازعات کو شہر میں آنے والی مہاجرت کی دو بڑی لہروں کا جائزہ لیے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ ۱۹۴۷ کے بعد کے چار برسوں میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے چھ لاکھ مہاجر شہر میں آئے جن کے باعث شہر کی آبادیاتی صورت حال مکمل بدل کر رہ گئی۔ ۱۹۴۷ سے ۱۹۸۵ تک کے اڑتیس برسوں میں کراچی اور سندھ کے دوسرے شہروں کی مہاجر آبادی نے ایک کے بعد ایک آنے والی وفاقی حکومتوں اور بڑی سیاسی پارٹیوں کا ساتھ دیا جو مضبوط مرکز کی حامی تھیں۔ ان کا یہ طرز عمل صوبے کی سندھی اکثریت کی امنگوں سے متصادم تھا، جہاں پہ صوبے کے دیہی اور شہری علاقوں کے درمیان سیاسی تقسیم گہری ہوتی گئی جس سے صوبے کی، اور خصوصاً کراچی کی، سیاست پر گہرے اثرات پڑے۔ صوبائی اسمبلی میں دیہی علاقوں کے نمائندے اکثریت میں ہیں، اور کراچی کے باشندے محسوس کرتے ہیں کہ وہ شہر کے بنیادی مسائل سے واقفیت اور ان مسائل کو حل کرنے سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ ۱۹۵۰ اور ۱۹۶۰ کی دہائیوں میں شمال مغربی سرحدی صوبے اور وسطی پنجاب سے خوب بڑی تعداد میں لوگ کراچی منتقل ہوئے۔ بعد کے برسوں میں کراچی آنے والوں میں پنجاب کے سرائیکی علاقے کے لوگ زیادہ ہیں۔ اس طرح شہر میں مہاجروں کی آبادی کی فیصد شرح کم ہوتی گئی ہے اور ہوتی جا رہی ہے۔ سرحد اور پنجاب سے آنے والوں نے شہر کے ٹرانسپورٹ، ہوٹل [illegible]۔

Scanned with CamScanner

تعمیرات اور صنعت کے شعبوں میں مختلف پیشے معیار کے [illegible] مزدوروں کی بڑی تعداد [illegible] روزگار [illegible] ہے۔ کراچی میں [illegible] گروہوں کے درمیان تنازعات کی کوئی حقیقی معاشی بنیاد موجود نہیں ہے۔ تاہم، سیاسی موقع پرستی، مختلف [illegible] کی طرف سے محرومی، [illegible] کی حوصلہ شکنی اور شہر کے نسلی گروہوں کے درمیان مسلسل [illegible] گروہوں کے درمیان گہری تقسیم پیدا کر دی ہے۔ [illegible] شہر کے سیاسی [illegible] میں شامل نہیں [illegible]۔

[illegible] پہلے [illegible] صورت [illegible] قیام پاکستان کے وقت سے [illegible] مٹتے ہیں [illegible] ۱۹۸۰ کی دہائی میں [illegible] کا [illegible] مختلف [illegible] اکثریت [illegible] شہر میں موجود [illegible] شہر کی سیاست اور معیشت میں اہم حیثیت [illegible] حکومت [illegible] سیاسی اور ثقافتی زندگی کی [illegible] کے خلاف [illegible] زندگی کے تمام شعبوں [illegible] حاصل [illegible] شامل [illegible] کے [illegible] کیا گیا تھا۔

[illegible] روزگار [illegible] سیاسی [illegible] روزگار [illegible] کراچی [illegible] صورت حال [illegible] باعث تشدد میں مزید اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

**

ضمیر نیازی

کی معروف اور اہم کتاب

The Press in Chains

کا اردو ترجمہ

صحافتِ پابندِ سلاسل

مجلد ۳۷۵ صفحات   قیمت: ۱۰۰ روپے

آج کی کتابیں

اے-۱۶، ساری ہائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی-۷۵۲۹۰

اگلے دو حصے میں کراچی کی صورت حال کے دو نمایاں پہلوؤں — سندھی مہاجر تنازعہ اور شہر میں مہلک ہتھیاروں کی بہتات — کے تجزیے پر مبنی ہیں۔

ایس اکبر زیدی کراچی یونیورسٹی کے اپلائیڈ اکنامکس ریسرچ سنٹر (AERC) سے ریسرچ سکالر اور استاد کے طور پر وابستہ ہیں۔ آئندہ صفحات میں ان کے جس مضمون کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے وہ پہلی بار بمبئی سے نکلنے والے جریدے Economic and Political Weekly کے ۱۸ مئی ۱۹۹۱ کے شمارے (جلد ۲۶، شمارہ ۲۰) میں شائع ہوا تھا اور بعد میں مصنف کی مرتب کردہ کتاب Regional Imbalances & the National Question in Pakistan میں شامل کیا گیا۔ یہ کتاب لاہور سے وین گارڈ بکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ نے ۱۹۹۲ میں شائع کی۔

یہ مضمون اگرچہ کئی سال پہلے لکھا گیا [illegible] موجودہ صورت حال [illegible] ۱۹۹۰ [illegible] حکومت کی [illegible] صورت حال [illegible] مضمون کا [illegible] شامل [illegible]

اس مضمون کے بعد [illegible] مارک ٹلی (Mark Tully) نے ۲۲ فروری ۱۹۹۵ [illegible] The Arms Trade and Political Instability in South Asia [illegible] جنوبی ایشیا میں [illegible] صورت حال [illegible]

[illegible] ۱۹۷۲ [illegible] بی بی سی [illegible] ۱۹۹۳ [illegible] بی بی سی [illegible] Amritsar: Mrs Gandhi's Last Battle (۱۹۸۵)، No Full Stops in India [illegible] بی بی سی [illegible] The Heart of India ۱۹۹۵ [illegible] صورت اختیار کر لی۔

اکبر زیدی

انگریزی سے ترجمہ: فہمیدہ ریاض

سندھی بمقابلہ مہاجر
تضادات، ٹکراؤ اور سمجھوتا

پاکستان میں قومی اور نسلی (ethnic) تشخص کا مظاہرہ جس طرح اس دور کے سیاسی عمل پر حاوی ہو گیا ہے ماضی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ آزادی کے بعد سے ملک کے سیاسی اور اقتصادی ڈھانچے پر پہلے مہاجروں اور پنجابیوں کے حکمران طبقوں کی گرفت تھی، گو رفتہ رفتہ اب یہ کافی حد تک صرف پنجابیوں کے قبضے میں آ گیا ہے۔ اس بالادستی کے باعث ملک میں گزشتہ چالیس برس کے دوران دوسری قومیتوں کی [illegible] یا علیحدگی کی تحریکیں اٹھیں، جن میں سے ایک کامیاب ہو کر بنگلہ دیش کے قیام پر منتج ہوئی۔ دوسری تحریکیں جو علیحدگی یا وسیع تر صوبائی خودمختاری حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں ان میں ایوب اور بھٹو دور میں چلائی گئی بلوچ تحریک کے علاوہ سندھیوں کی متعدد تحریکیں شامل ہیں۔ سندھیوں کی یہ تحریکیں ۱۹۴۸ میں کراچی کی سندھ سے علیحدگی کے خلاف مہم سے شروع ہو کر جنرل ضیاء الحق کی مارشل لا حکومت کے خلاف چلنے والی تحریکوں تک پہنچیں۔ ماضی میں پختونوں نے بھی کافی عرصے تک اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھائی، مگر (سندھ اور بلوچستان کے برعکس) صوبہ سرحد میں زیادہ ترقیاتی کاموں کے باعث اب وہ وفاق پاکستان میں زیادہ بہتر طور پر ضم ہو چکے ہیں۔ فی الوقت سندھیوں اور بلوچوں کی مرکز میں اور خود اپنے اپنے صوبے میں، پنجابی بالادستی کے خلاف جدوجہد جاری ہے جبکہ پختونوں نے اپنے صوبے پر اقتصادی اور سیاسی کنٹرول حاصل کرنے میں جزوی کامیابی حاصل کر لی ہے، اور یوں پختونوں کے مسئلے نے ایسی شکل اختیار کر لی ہے جو دوسری قومیتوں کے مسئلے کی نسبت بہت مختلف ہے۔

پاکستان میں مختلف قومیتوں کے درمیان موجود اس صف بندی (polarisation) کی ایک بڑی وجہ نمائندہ اداروں کا فقدان اور فوجی حکمرانی کا تسلسل ہے جس نے سیاسی اور اقتصادی ترقی پر اپنی گرفت قائم رکھی ہے۔ فوج چونکہ زیادہ تر پنجابیوں پر مشتمل ہے، اور فوجی حکمرانی پاکستان کی عمر کے نصف سے زیادہ عرصے پر محیط رہی ہے، لہذا علاقائی اور قومیتی عدم توازن کی صورت حال اور بگڑ گئی ہے۔ حکومتی نظام میں مرکز کے بہت زیادہ طاقتور ہونے اور اقتدار سے محروم گروہوں کی شکایات رفع نہ کرنے کا

Scanned with CamScanner

موقع نہ ملنے کے باعث محروم طبقہ، قومیتی یا نسلی گروہوں نے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کی ہے۔ البتہ جمہوریت، خواہ کتنی ہی مختصر اور کیسی ہی مسخ حالت میں ہو، اس ملک کے لوگوں کی صورت حال میں ایک تبدیلی ضرور پیدا کرتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جمہوری عمل کے ذریعے برسر اقتدار آنے والی حکومتیں ریاست کے دوسرے اداروں کی طاقت کو کم یا ختم نہیں کر سکیں، تاہم جمہوریت کے آنے سے نظام کی بساط پر تھوڑے بہت ردوبدل کی گنجائش ضرور پیدا ہوئی۔ یہ بات سندھیوں پر سب سے زیادہ صادق آتی ہے جو واحد قومیت ہیں جن میں سے ۱۹۷۰ کے بعد سے تین افراد وزیراعظم ہوئے۔ ۱۹۸۵ کے انتخابات کے بعد جنرل ضیا نے ایک بالکل غیر معروف سیاست دان کو، جس کی واحد خوبی اس کا سندھی ہونا تھا وزیراعظم نامزد کرنے پر خود کو مجبور پایا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان کی موجودہ سیاست میں سندھ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

سندھ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں کی آبادی ۱۹۴۷ سے ہی نسلی بنیادوں پر سب سے زیادہ منقسم رہی ہے۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد مہاجروں کے سیلاب نے اس صوبے کے سیاسی رنگ کو دائمی طور پر تبدیل کر دیا۔ گزشتہ برسوں میں ان دونوں گروہوں کا تنازعہ کئی گنا بڑھ گیا ہے اور قومی حقوق کے نام پر ہونے والے تشدد نے بربریت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس مضمون میں میرا مقصد اس تصادم کی وجوہ بیان کرنا اور ان کی تشریح کرنا ہے۔ اس کے لیے میں پہلے مہاجر تشخص کی مختصر تاریخ پیش کروں گا، پھر سندھی قوم پرست تحریک کے خدوخال پر روشنی ڈالوں گا، اور بعد ازاں اس تنازعے میں ریاست کے کردار اور سندھی مہاجر تصادم میں تشدد کے درجات زیر بحث آئیں گے۔ آخر میں صوبے کی موجودہ صورت حال کا ذکر ہوگا۔

مہاجر تشخص کا ارتقا

۱۹۴۷ میں اردو بولنے والے بیشتر مہاجر صوبہ سندھ کے مقامات، کراچی، حیدر آباد، میرپور خاص اور سکھر میں رہائش پذیر ہوئے۔ (سندھ میں آ کر بسنے والوں میں ان کے علاوہ میمن، گجراتی، بوہرے، کاٹھیاواڑی وغیرہ بھی شامل تھے۔) ان میں اور مشرقی پنجاب سے آ کر مغربی پنجاب میں بس جانے والوں میں یہ فرق تھا کہ پنجابیوں کے برعکس یہ لوگ ایک بالکل اجنبی صوبے میں وارد ہوئے تھے۔ تہذیبی، لسانی، سماجی اور اقتصادی لحاظ سے یہ لوگ اپنے میزبان علاقے کے باسیوں سے بالکل مختلف تھے۔ اس طرح سندھ آناً فاناً ایک اجنبی تہذیب کی یلغار کا شکار ہو گیا جس نے نہ صرف اس صوبے بلکہ پورے ملک پر غلبہ پانا شروع کر دیا۔ بعض مبصرین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ مہاجر قابض ذہنیت

لے کر آئے تھے اور مقامی باشندوں سے حقارت کا سلوک کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ سندھ پر مہاجروں کا غلبہ ہو گیا تھا، لیکن اس کے پیچھے کوئی سازش یقیناً نہیں تھی جیسا کہ زیادہ تر سندھی مبصرین اصرار کرتے ہیں۔ اس غلبے کے چند ٹھوس مادی اور فطری اسباب تھے۔

سندھ کی معیشت غالب طور پر زرعی اور جاگیردارانہ تھی؛ یہاں چند ہندو تاجر تھے اور صنعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ سندھ کے ممتاز سیاست داں جاگیردار طبقے کے نمائندے تھے، کیوں کہ بورژوا اور نچلا بورژوا طبقہ ہنوز ارتقا کے ابتدائی مرحلے میں تھا۔ (سندھ میں ایک شہری بورژوا طبقہ موجود تھا، مگر یہ بڑی حد تک ہندوؤں پر مشتمل تھا، جو تقسیم کے وقت ہجرت کر کے ہندوستان چلے گئے۔ سندھ کے مسلمانوں میں اس وقت تک یہ طبقہ پیدا نہ ہوا تھا۔) اس کے مقابلے میں باہر سے آنے والے ایک ترقی یافتہ شہری سرمایہ دارانہ کلچر کے نمائندے تھے۔ ان میں نہ صرف زیادہ بڑا سرمایہ کار طبقہ تھا بلکہ زیادہ تعلیم یافتہ متوسط منظم طبقہ اور بہتر تربیت یافتہ ہنرمند مزدور طبقہ بھی موجود تھا۔ اس طرح ان میں اور ان کے سندھی میزبانوں میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ مہاجروں کا یہ بھی خیال تھا کہ پاکستان کی تخلیق ان کی بدولت ممکن ہوئی ہے اور انھوں نے اس کے قیام کے لیے تمام قربانیاں دی ہیں ــــ اور ان میں سیاسی جوڑتوڑ کی صلاحیت اور ریاستی مشینری کو بنانے اور چلانے کی مہارت بھی زیادہ تھی ــــ چناں چہ انھوں نے پاکستان میں اقتصادی اور سیاسی اقتدار سنبھال لیا۔ مہاجروں کے بالادست طبقے نے جناح اور لیاقت کی رہنمائی میں بیوروکریسی کی باگ ڈور سنبھالی جبکہ ان کے سرمایہ کاروں اور مزدوروں نے [illegible] صنعت کاری کی داغ بیل ڈالنی شروع کی۔ کراچی کے پاکستان کا دار الحکومت بننے اور انتظامی طور پر سندھ سے علیحدہ کر دیے جانے نے ان کی (حقیقی و خیالی دونوں قسم کی) طاقت کو مزید بڑھاوا دیا۔ اس طرح مہاجر تشخص بھی ملک میں تیزی سے وجود میں آگیا اور مہاجر پاکستان کا پانچواں نسلی گروہ بن کر ابھرے۔

مہاجروں کے نزدیک سندھ ہمیشہ ملک کا ایک پس ماندہ اور کم ترقی یافتہ صوبہ رہا جس کا اس زیادہ نفیس شہری تمدن سے چنداں واسطہ نہ تھا جس کی وہ خود نمائندگی کرتے تھے۔ مہاجروں کا یہ متکبرانہ اور احساسِ برتری سے مملو رویہ سندھیوں کے لیے ہمیشہ باعث توہین رہا اور اب بھی ہے۔ غیر نمو یافتہ سرمایہ دارانہ رشتوں میں الجھے ہونے اور بورژوا طبقے کی غیر موجودگی کے باعث سندھیوں میں سیاسی، اقتصادی یا ثقافتی اقتدار حاصل کرنے کے لیے مہاجروں کو چیلنج کرنے کی سکت نہ تھی۔ بلاشبہ مہاجر ان سرمایہ دارانہ رشتوں کی نشوونما یافتہ صورت کا مظہر تھے، لیکن یہ صورت اس سرزمین سے ارتقا پذیر نہیں ہوئی تھی بلکہ باہر سے آکر پیوند ہوئی تھی۔

مہاجر صنعت کار اور تاجر، خصوصاً کوریا کی جنگ کے بعد اور ایوب حکومت کے اقتصادی پروگرام کے تحت، ملک کی معیشت پر حاوی ہو گئے۔ جب لیاقت علی خاں کی موت کے بعد مطلق اقتدار بیوروکریسی کے ہاتھ میں آگیا، اس سیاسی ابتری کے دور میں بھی مہاجروں کی حیثیت برقرار رہی اور حکومت کے اداروں میں ان کی نمائندگی، ان کی آبادی کے تناسب (ملک کی کل آبادی کے محض ۸ فیصد) سے کہیں

Scanned with CamScanner

چاہتی تھی۔ وہ ریاستی طاقت اور وسائل میں پنجابیوں سے بڑھ چڑھ کر حصے دار بنتے گئے، جبکہ سب سے بڑے قومیتی گروہ (یعنی بنگالیوں) کو، جنہیں ریاستی امور میں زیادہ حصہ ملنا چاہیے تھا، دانستہ طور پر نظر انداز کیا گیا۔ پیداواری رشتوں کے اس مخصوص ترکّب کے باعث سندھیوں اور بلوچوں کو، اور بڑی حد تک پٹھانوں کو بھی، بہت کم نمائندگی ملی۔ پاکستان جس علاقے میں قائم ہوا، وہ بیشتر [illegible] اور پنجاب کے استثنیٰ کے ساتھ — متحدہ ہندوستان کے پسماندہ ترین خطوں پر مشتمل تھا۔ لہٰذا ان علاقوں میں [illegible] خصوصاً اہمیت رکھنے والی [illegible] میں [illegible] اور [illegible] شعبوں میں مہارت رکھنے والے لوگ بہت قلیل تعداد میں تھے، اور بورژوازی کمزور تھی۔ [illegible] ریاست کے اداروں میں مذکورہ گروہی [illegible] گیا۔ علاوہ ازیں، مہاجروں نے نوآبادیاتی ورثے سے [illegible] پرانے طریق کار کو جاری رکھنے میں مدد دی [illegible] گروہوں پر [illegible] مہاجروں کے لیے [illegible] جو وفاقی دار الحکومت [illegible] میں محصور تھے [illegible] کسی بھی سیاسی یا اقتصادی اقتدار کے لیے مسابقت کرنے والا گروہ نہیں تھے۔ اس کے برعکس، [illegible] پنجابیوں کی جانب سے مسابقت کا سامنا تھا۔ لیاقت علی خان کی موت کے بعد مہاجروں کے پاس ان جیسا یا حسین شہید جیسا کوئی لیڈر نہ رہا۔ اس طرح پاکستان کے نسلی یا قومی گروہوں کے مابین سیاسی اقتدار کے [illegible] میں [illegible] شروع ہوئی جو ۱۹۵۸ میں غیر مہاجروں کے اقتدار پر قابض ہو جانے کے بعد زیادہ شدت کے ساتھ جاری رہی۔

[illegible] ۱۹۶۰ کی دہائی میں [illegible] جب [illegible] آنے لگا [illegible] پنجاب میں سبز انقلاب (Green Revolution) کے اثرات کے باعث پاکستان کے اقتصادی، آبادیاتی (demographic) اور سیاسی منظر نامے میں [illegible] تغیر آنا [illegible]۔ پنجاب میں سرمایہ دارانہ پیداواری رشتوں نے گہری جڑیں پکڑنی شروع کیں اور اس کے ساتھ ساتھ مستقبل کی بالادست قومیت، اقتصادی گروہ [illegible] سیاسی قوت کی حیثیت سے [illegible] لگی۔ پنجابیوں میں [illegible] زیادہ [illegible] پیدا ہوئے جو دیہات سے شہروں کی سمت ہجرت کرنے والوں کے تعلیم پانے کے باعث سرکاری ملازمتیں [illegible] مسابقت [illegible]۔ ہندوستان سے آنے والے مہاجر [illegible] اب [illegible] محسوس کرنے لگے۔ [illegible] سرکاری سیکٹر [illegible] دیہات سے [illegible] چھوڑ کر آنے والے پنجابی [illegible] زیادہ متحرک (mobile) ہو [illegible] شہروں میں بھی داخل ہوئے جو اب تک مہاجروں کے قبضے میں تھے [illegible] کامیابی [illegible] مسابقت کرنے لگے۔ [illegible] سرکاری [illegible] بیشتر پنجابی تھے [illegible] پنجاب سے [illegible] شہری علاقوں سے کراچی کی جانب [illegible] مہاجروں کے درمیان [illegible] کاموں میں مشغول ہونے والے

ہجرت نہیں کرتے تھے۔ اس طرح سندھ اور باقی پاکستان میں سرکاری شعبے اور نجی کاروبار پر مہاجروں کا غلبہ ختم ہو گیا۔ سندھ کے شہر خالص مہاجروں کا علاقہ نہیں رہ گئے؛ سرمایہ دارانہ نظام کے مزید ارتقا کے ساتھ ساتھ پنجاب نے، اپنی مضبوط معیشت کے بل پر، رفتہ رفتہ نہ صرف صنعت، زمینداری اور ملازمتوں میں فوقیت حاصل کی بلکہ اندرون ملک نقل مکانی کرنے والے دوسروں میں بھی پنجابیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔

مہاجر لیڈر اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ مہاجروں نے ہمیشہ حکومت سے باہر رہنے والی جماعتوں کے حق میں ووٹ دیا ہے یعنی حزب اختلاف کی حمایت کی ہے۔ ۱۹۶۴ میں ان کے رہنماؤں نے ایوب خان کے مقابلے میں فاطمہ جناح کا ساتھ دیا؛ ۱۹۷۰ میں، جب پورا ملک [مغربی پاکستان] بھٹو کی اٹھائی ہوئی سوشلزم کی لہر کے زیر اثر تھا، انھوں نے اسلامی پارٹیوں کے حق میں ووٹ ڈالا؛ ۱۹۷۷ میں بھی انھوں نے بھٹو کے خلاف پی این اے کے لیے رجعتی اتحاد کی حمایت کی، اور اب، ۱۹۸۸ میں، انھوں نے اپنی جماعت کو ووٹ دیا، جسے ان کے علیحدہ تشخص کے احساس کا نقطۂ عروج کہا جا سکتا ہے۔ ہر چند کہ مہاجر تشخص نے وسیع طور پر ۱۹۸۶ میں مہاجر قومی موومنٹ کے باقاعدہ قیام، اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے پرتشدد واقعات، کے بعد ہی ٹھوس شکل اختیار کی، مگر اس کی ایک صورت مہاجروں کے ایک اکائی کے طور پر یکساں سیاسی رجحانات رکھنے کے باعث طویل عرصے سے ارتقا پذیر تھی۔

مہاجروں نے ماضی میں ہمیشہ بنیاد پرست اسلامی تنظیموں کی حمایت کی جو صوبائی رنگ رکھنے کے بجائے پاکستانیت کی دعوے دار تھیں، اور خود بھی تنظیم بنا لینے تک خود کو تمام تقسیم پسند گروہوں سے دور رکھا۔ اس کی وجوہ سمجھ میں آنے والی ہیں، کیوں کہ مہاجر پاکستان میں مسلمان اور پاکستانی ہی کی حیثیت سے وارد ہوئے تھے اور یہاں انھیں احساس تحفظ کے لیے انھیں نظریات کی ضرورت تھی۔ ابتدائی برسوں میں انھیں ملازمتوں اور دیگر مواقع کی کمی نہ تھی، اور پاکستان کے ریاستی اور معاشی ڈھانچے میں ان کی حیثیت مسلم تھی، چناں چہ یہ نظریات ان کے لیے نہایت آرام دہ بھی تھے۔ لیکن جب اقتدار اور وسائل پر مقابلہ زیادہ شدید ہو گیا تب انھیں بھی ایک نئے تشخص کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسلامی تنظیمیں ان نئی حقیقتوں کا سامنا کرنے کی اہلیت نہ رکھتی تھیں، اور جوں جوں پنجابیوں کی جارحانہ گرفت پاکستان پر مضبوط ہوتی گئی، ایک جداگانہ مہاجر شعور پروان چڑھتا گیا۔ پہلے سندھی وزیر اعظم کے انتخاب کے ساتھ شہروں اور سرکاری ملازمتوں میں ایسے سندھیوں کی ایک بڑی لہر آئی جو اپنے دیہاتی پس منظر سے پوری طرح جدا ہو چکے تھے۔ ۱۹۷۲ میں سندھی کو صوبے کی سرکاری زبان بنانے کی کوشش اسی نوترقی یافتہ درمیانہ اور نچلے درمیانہ طبقے کی جانب سے اپنے تشخص کو، جسے ٹھوس شکل اختیار کرنے میں بہت سال لگے تھے، تسلیم کروانے کی کوشش تھی۔ سندھی قوم پرستی کے اس ابھار کا مہاجروں کی امنگوں اور تصورِ دنیا سے بہ ظاہر براہ راست ٹکراؤ تھا۔ ۱۹۷۷ کے انتخابات دوسرا موقع تھے جب ان دونوں گروہوں کے سیاسی تصورات ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے؛ مہاجروں نے دائیں بازو کی بنیاد پرست جماعتوں کا

Scanned with CamScanner

اور سندھیوں نے پیپلز پارٹی کا ساتھ دیا۔ ۱۹۸۳ اور ۱۹۸۶ کی بحالی جمہوریت کی تحریک (MRD) کے دوران بھی دونوں گروہوں کی سیاسی اسٹینس واضح طور پر مختلف نظر آئیں۔ تاہم مہاجر تشخص کا واضح ترین اظہار ۱۹۸۶ کے کچھ بعد، اور پھر ۱۹۸۷ میں ہوا جب ایم کیو ایم نے بلدیاتی انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کی۔

ایم کیو ایم کے زیادہ تر اراکین بنیادی طور پر نچلے درمیانہ طبقے پر مشتمل ہیں۔ اس تنظیم میں کارکنوں کے درمیان مربوط اور نظم و ضبط کا کردار بہت بنیادی ہے۔ یہ تنظیم مقبولیت پسند (populist) ہے اور اپنے لوگوں کو دہشت اور دھمکی کے ذریعے قابو میں رکھتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس نے مہاجروں کو احساس تشخص دیا ہے اور ایسی شاونزم پیدا کی ہے جسے کسی دشمن کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تمام خصوصیات وہ ہیں جو کسی بھی فاشسٹ تنظیم کی بنیاد ہوتی ہیں۔

اس میں ذرہ برابر بھی شک نہیں کیا جا سکتا کہ ایم کیو ایم نے اپنے حامیوں (مہاجروں) کے متعدد حقیقی مسائل اٹھائے ہیں۔ بے روزگاری اور شہری سہولتوں کا فقدان ایسے مسئلے ہیں جن سے نہ صرف کراچی اور حیدرآباد کے مہاجر بلکہ پورے پاکستان کے لوگ دوچار ہیں۔ مگر ایم کیو ایم کے پاس ان مسائل کو قومی یا وسیع تر سطح پر حل کرنے کا منصوبہ یا اس سے دلچسپی موجود نہیں۔ ہم ایسی کسی چیز کی حمایت نہیں کرتے جس میں لفظ مہاجر نہ آتا ہو۔ اپنے حامیوں کے مسائل کی سمجھ بوجھ بھی ایم کیو ایم کی محدود عصبیت کی بنا پر ہے۔ اپنے مسئلوں کے اس محدود تصور اور مسائل کو وسیع تر پس منظر میں دیکھنے کی اہلیت کے فقدان ہی کے باعث یہ تنظیم ایک ایسی دلدل میں جا پھنسی ہے جہاں قتل، دہشت اور اضطراب کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ کار دکھائی نہیں دیتا۔ چونکہ ایم کیو ایم مہاجروں کی حالت میں کوئی بہتری نہیں لا سکی ہے، اس لیے اس کے حامیوں میں خصوصی سخت بددلی پیدا ہوئی ہے۔ اس سیاسی ناکامی نے ایم کیو ایم کے پاس یہی ایک راستہ چھوڑا ہے کہ اپنے حامیوں کو شدید دہشت میں مبتلا کر کے اپنا ساتھ دینے پر مجبور کرے۔ ایم کیو ایم کا مسلح بازو، بلیک ٹائیگرز، جو چند سو نوجوانوں پر مشتمل ہے جنھوں نے مہاجر کاز کی خاطر جان دینے کا حلف اٹھا رکھا ہے، اس حکمت عملی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرا، یہ تنظیم فاشسٹ ثابت ہوئی۔

اس موقعے پر موضوع سے ذرا ہٹ کر پاکستان کے مجموعی تناظر میں کراچی شہر کی اہمیت کا ذکر کرنا اور یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ شہر ایم کیو ایم کے منصوبے میں کیا کردار ادا کر سکتا ہے۔ کراچی کی آبادی پورے ملک کی آبادی کا دسواں حصہ ہے، مگر ملک کا ایک تہائی معاشی اور صنعتی سرمایہ یہاں لگا ہوا ہے۔ ایم کیو ایم اس بات کو اچھی طرح سمجھتی ہے اور سودے بازی میں اس کی پوزیشن مضبوط ہے۔ کراچی کو باقی سندھ سے الگ کرنے کا سوال بھی ایم کیو ایم نے اٹھایا ہے، اور اس علیحدگی کا اعلان مہاجروں کے پاکستان کی پانچویں قومیت ہونے کے دعوے کی بنیادی دلیل ہے۔ (چند پنجابی دانشور بھی کراچی کی سندھ سے علیحدگی کی حمایت کرتے رہے ہیں۔)

کراچی نے ہمیشہ سماجی، سیاسی اور تمدنی اعتبار سے باقی پورے ملک، خصوصاً سندھ، سے الگ شناخت قائم رکھی ہے۔ (یہاں اُن سندھی دانشوروں کے موقف سے اتفاق کرنا دشوار ہے جن کا کہنا ہے کہ کراچی ایک سندھی شہر تھا جہاں سندھیوں کو اجنبیوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ تاریخی حقائق اس دعوے کی تصدیق نہیں کرتے۔) اسے انگریزوں نے ۱۸۳۹ میں فتح کیا جس سے پہلے یہ ایک چھوٹا سا غیر اہم قصبہ تھا اور ۱۸۴۳ میں حیدر آباد کو فتح کرنے کے بعد ہی پورا سندھ انگریزوں کے قبضے میں آسکا۔ انگریزوں نے کراچی کو سندھ سے الگ ایک کاسموپولیٹن شہر کے طور پر ترقی دی جہاں پوری برطانوی سلطنت سے لوگ آکر جمع ہوئے۔ تقسیم ہند نے بھی اس رجحان کو برقرار رکھا جب مہاجروں نے اس شہر پر یلغار کی۔ ۱۹۴۸ میں اسے دارالحکومت بنا کر حکومت پاکستان نے اس علیحدگی کو باقاعدہ شکل دے دی۔ کراچی کی نشوونما سندھ سے مختلف طور پر ہوتی رہی، ملک کے تمام صوبوں کے لوگ کھنچ کر اس شہر میں آتے رہے اور صوبہ سندھ میں ضم نہیں ہوئے جس کی سرمایہ دارانہ معیشت پوری طرح ترقی یافتہ نہیں تھی۔

تاہم، گزشتہ برسوں میں حالات میں تبدیلی آتی رہی ہے۔ اب کراچی سندھ سے اس حد تک جڑ چکا ہے جتنا ماضی میں کبھی نہیں تھا۔ ملک کے دیہی علاقوں میں سرمایہ داری کے رفتہ رفتہ مضبوط ہونے کے باعث پورے ملک کی معیشت ایک تیز رفتار تبدیلی سے گزر رہی ہے۔ زرعی جنس اور صنعتی پیداوار کی مارکیٹ کے وسیع ہونے کے نتیجے میں سندھ کے دور افتادہ خطے بھی اب قریب آ رہے ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ بننے کے عمل میں ہیں۔ زراعت میں صنعتی طریقوں کے بڑھتے ہوئے استعمال سے پیشوں، قدروں اور سماجی رشتوں میں تبدیلی آ رہی ہے۔ سندھ میں زرعی مشینوں کے استعمال کے باعث جتنے لوگ اب بے روزگار ہو رہے ہیں اتنے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ روزگار کی تلاش میں اب وہ شہروں کی طرف آ رہے ہیں، مہاجر اکثریت کے شہروں میں ان کی موجودگی کو واضح طور پر محسوس کیا جانے لگا ہے۔ تعلیم یافتہ اور پیشہ ور سندھی سب زیادہ تعداد میں ملازمتوں کے میدان میں داخل ہو رہے ہیں اور سب سے خوشحال شہر کراچی کا رخ کر رہے ہیں۔ اس شہر سے سندھیوں کے معاشی مفادات اس سے پہلے کبھی اس قدر وابستہ نہیں تھے۔ علاوہ ازیں، صوبے میں منتخب حکومت کی موجودگی، اور بدعنوانی کے عام چلن، کے باعث کراچی سے سندھیوں کی مضبوط مالی وابستگی پیدا ہو گئی ہے جہاں انہیں جائیداد، لائسنس، پرمٹ وغیرہ سب رعایتی نرخوں پر مل جاتے ہیں۔ اس طرح کراچی سندھیوں کے لیے رقم فراہم کرنے کا ایک اہم ذریعہ بن گیا ہے اور یہ رقم دیہی معیشت میں واپس جا کر دوسرے سندھیوں کو بھی فائدہ پہنچا رہی ہے۔ مزید براں، سندھ کے تمام ٹیکسوں کا ۶۵ فیصد حصہ کراچی سے حاصل ہوتا ہے جس کے عوض اسے بہت کم رقم حاصل ہوتی ہے۔

سندھ کی کراچی میں شمولیت (یا کراچی کی سندھ میں شمولیت) کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ایم کیو ایم کی جانب سے کراچی کو سندھ سے علیحدہ کرنے اور ایک مہاجر صوبہ قائم کرنے کا مطالبہ اب بے موقع ہو چکا ہے۔ اس حقیقت کا احساس مہاجروں میں سخت بے چینی پیدا کرنے کا کیوں کہ وہ اپنی قوم

[illegible] کی ملکیت کے دعوے سے سندھ میں دست کش نہیں ہے۔ یہ بات مستقبل میں ایم کیو ایم کی حکمت عملی پر کچھ نہ کچھ اثر ڈال سکتی ہے۔

سندھی قوم پرستی

سندھی قوم پرستی کا رجحان اور تشخص کے احساس کی جڑیں زمانی نہیں بلکہ ایک طویل عرصے پر محیط ہے۔ سندھ کی تاریخ پانچ ہزار سال پرانی بیان کی جاتی ہے، اور یہ خطہ ہمیشہ آزاد [illegible] ثقافت کا حامل رہا ہے۔ تشخص کے اس احساس کو اس علاقے میں قائم سماجی اور معاشی نظام سے تقویت ملی ہے۔ قومی تشخص سماجی اور معاشی رجحانات کی بنیاد پر ترقی یافتہ ریاستوں میں ابھار اختیار کرتا ہے جب ایک وسیع درمیانہ اور پڑھا لکھا درمیانہ طبقہ قومی جدوجہد کی تنظیم اور رہنمائی کرنے کے لیے موجود ہو۔ ویسے تو کمزور قسم کی قوم پرستی بھی وجود رکھ سکتی ہے، جیسی کہ ماضی میں سندھ میں موجود رہی ہے، مگر یہ عموماً ترقی یافتہ بورژوا قوم پرستی کے مقابلے میں کم مستحکم اور کم مؤثر ہوتی ہے۔ قوم پرستی بنیادی طور پر درمیانے طبقے ہی کا مسئلہ ہوتی ہے۔ ابتداء میں یہ طبقہ یا تو موجود ہی نہ تھا یا کمزور رہا ہے، اس لیے اسے سندھ کی سیاست پر کبھی غلبہ حاصل نہیں رہا اور اس کا سیاسی [illegible] ابھی شروع ہی ہوا ہے۔

۱۹۴۸ میں کراچی کی سندھ سے علیحدگی کے خلاف تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ منتخب سندھی نمائندے [illegible] شعور سیاسی اور سیاسی طور پر غالب مہاجروں سے مقابلہ کرنے کے قابل نہ تھے۔ ۱۹۵۲ میں بنگالیوں کی جانب سے اپنی زبان کو اردو کے مساوی درجہ دلوانے کی کامیاب مہم کے بعد سندھیوں کی طرف سے سندھی کو صوبائی زبان بنانے کا مطالبہ سندھیوں کی کوششوں کو بہتر طور پر تقویت دے سکتا تھا، لیکن اس کا سبب قلیل پڑھا لکھا درمیانہ طبقہ تھا جو کہیں زیادہ زور آور گروہ یعنی [illegible] زبان [illegible] کرنے کا حق حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ ون یونٹ کے خلاف جدوجہد نے سندھی تشخص کے احساس کو زیادہ وسیع اور واضح شکل دی، اسے بھٹو نے بھی [illegible] اور مستحکم کیا۔ یہ طبقہ بھٹو دور میں اتنا طاقتور ہو سکا کہ اردو بولنے والوں کو چیلنج کرتے سندھی کو صوبے کی سرکاری زبان تسلیم کرانے کی کوشش [illegible] گو ناکام کوشش ہی کر سکے۔

بھٹو نے سندھی شعور کو نئی شکل دینے میں یقیناً اہم ترین کردار ادا کیا، اور بھٹو دور میں سندھیوں کو ملازمتیں ملیں جن کے ذریعے ان کی کراچی اور اسلام آباد تک رسائی ممکن ہوئی۔ صوبے میں دولت آئی جس سے جدید طبقوں کی تشکیل کا عمل تیز ہوا۔ جو لوگ زرعی حسب مراتب کی سب سے نچلی سیڑھی پر تھے، انہیں زمین چھوڑنے کا موقع ملا، اور یوں ایک وسیع درمیانہ اور پڑھا لکھا درمیانہ طبقہ وجود میں آیا۔ نئی سندھی شعور [illegible] مضبوط ہوتے ہیں۔ [illegible] کی موت، اور [illegible] شہر سے جانے

Scanned with CamScanner

والے قوم پرستوں کے ساتھ پنجاب اور ان کی لوٹ کے سلوک نے سندھی قوم پرستی کو مزید مضبوط کیا۔ ۱۹۸۳ء کی تحریک ان واقعات کا اہم ترین رد عمل بھی جس کے دوران سندھی قوم پرستی جیسے عروج پر تھی اگرچہ ابھی تک منظم نہ ہو پائی تھی۔ سندھ نے اس رد عمل کا ایک نتیجہ ۱۹۸۵ میں محمد خان جونیجو جیسے ایک سندھی کی وزارت عظمیٰ کے طور پر نامزدگی کی صورت میں برآمد ہوا۔ جونیجو نے بھی سندھیوں کو خوش رکھنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ظاہری طور پر وہی اعتماد پیدا کیا جو بھٹو نے پیدا کیا تھا۔ آج سندھی قوم پرستی صوبے کا غالب سیاسی فلسفہ بن چکی ہے اور رفتہ رفتہ زیادہ پختہ ہو رہی ہے۔ البتہ تنظیم اس تحریک کا مسئلہ معلوم ہوتی ہے، اور اس شعور کی نمائندگی کرنے والی کوئی واحد جماعت سامنے نہیں آ سکی ہے۔

ریاست کا کردار

پاکستانی تناظر میں ریاست کے کردار کا جائزہ لیے بغیر قومیتوں کے سوال کو پوری طرح نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کی ضرورت سے زیادہ ترقی یافتہ نوعیت اور ہمہ گیری ہی سے مختلف قومیتی گروہوں کے اختیار کردہ معاشی اور سیاسی راستوں کا تعین ہوتا ہے۔

ریاست ملک میں سب سے زیادہ ملازمتیں فراہم کرتی ہے اور اپنے اداروں کے ذریعے نجی سرمایہ کاری کی سمت متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ پاکستانی ریاست نے آزادی کے بعد ابتدا ہی سے نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کرنے کی بہت کوشش کی: نہ صرف کئی طرح کی رعایتیں، ٹیکس اور محصول میں چھوٹ وغیرہ، سرمایہ داروں کو دی گئیں بلکہ ریاست نے خود صنعتی کارخانے قائم کر کے انہیں رعایتی قیمت پر نجی سرمایہ کاروں کے حوالے کیا۔ ایوب خان کے دور میں بھی ریاست کی جانب سے سرمایہ داروں کو تحفظ اور بونس واؤچر سکیم کی شکل میں مراعات اور حوصلہ افزائی کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ زراعت کے میدان میں کاشتکاری کے جدید طریقوں کو فروغ دینے کی غرض سے ریاست نے انفراسٹرکچر اور مشینی آلات فراہم کیے۔ اگرچہ اس دور میں نجی شعبے نے خود کو رفتہ رفتہ مضبوط بنایا، تاہم ریاست اور بیوروکریسی کا عمل دخل بہت بڑھ گیا۔ لائسنس، پرمٹ، زرمبادلہ کے قواعد و ضوابط، کوٹہ وغیرہ ایسے معاملات تھے جن پر ریاست کا کنٹرول تھا اور وہ نجی سرمایہ داری کی سمت اپنی مرضی سے متعین کرنے پر قادر تھی۔

بھٹو دور میں معیشت کے تمام شعبوں پر ریاست کا کنٹرول اور بھی واضح ہو کر ابھرا کیوں کہ اس دور میں نیشنلائزیشن کی پالیسی اختیار کی گئی اور معیشت پر سرکاری گرفت زیادہ سخت ہو گئی۔ جمہوری تجربے نے ان حلقوں کو فائدہ پہنچانے کا ایک کارآمد موقع فراہم کیا جو ان شعبوں سے برسر اقتدار آتے ہیں

Scanned with CamScanner

اس حکومت کی مدد کی تھی، اور اُن کو جو مستقبل میں خطرے کا باعث ہو سکتے تھے، مراعات دے کر اپنے ساتھ ملانے کی گنجائش پیدا کی۔ کارخانوں کے علاوہ بینکوں، انشورنس کمپنیوں، اسکولوں، اسپتالوں وغیرہ کے ریاستی ملکیت بن جانے سے سرکاری شعبہ اتنا وسیع ہو گیا کہ یہ کام آسانی سے کیے جا سکتے تھے۔ سرکاری شعبے کے پہلے کی نسبت بہت وسیع ہو جانے کی بدولت اُس درمیانہ اور نچلے درمیانہ طبقے کو روزگار فراہم کرنا آسان ہو گیا جو نیا نیا وجود میں آیا تھا، اور حکومت کے لیے سرکاری شعبے کے ممکنہ استعمال کی صلاحیت بہت بڑھ گئی۔

ضیاء الحق کے دور میں ڈی نیشنلائزیشن کی کوششوں کے باوجود سرکاری شعبے کی جسامت میں مزید اضافہ ہوا۔ فوج اور بیوروکریسی ہی وہ ادارے تھے جن کی طرف سے ضیا کو خطرہ ہو سکتا تھا، لہٰذا انھیں خوش رکھنا اور اُن کی طاقت اور اختیارات کو بڑھانا ضروری اور کارآمد تھا۔ ریاستی ملکیت کے بیشتر اداروں میں حاضر ڈیوٹی اور ریٹائرڈ فوجی افسروں کو پُرکشش ملازمتیں دی گئیں، یا انھیں ضیا کے مشیروں، وزیروں اور بیرونِ ملک متعین سفیروں میں شامل کیا گیا۔ اسلامی نظام کے پردے میں سرکاری سرمائے سے شروع کی جانے والی متعدد اسکیموں کا مقصد دراصل ایسے لوگوں کو ملازمتیں فراہم کرنا تھا جو اسلام اور فوج کی خدمت کر سکیں۔ ۱۹۸۸ کے انتخابات میں صوبۂ سندھ اور مرکز میں پیپلز پارٹی کی فتح کے نتیجے میں سرکاری شعبوں میں پارٹی کے حامیوں کی ایک اور بڑی لہر داخل ہوئی، جب کہ پنجاب میں اسلامی جمہوری اتحاد کی صوبائی حکومت نے بھی اپنے حامیوں کو نوکریوں وغیرہ سے نوازا۔ پاکستان کے نجی شعبے کی روزگار کے کثیر مواقع پیدا کرنے میں ناکامی کی وجہ سے (جسے بہرحال اُس کی ذمے داری بھی قرار نہیں دیا جا سکتا)، سرکاری شعبہ بڑھتی ہوئی تعداد میں بے روزگاروں کو ملازمتیں فراہم کر رہا ہے اور یوں حکومتوں کے لیے اپنے حامیوں کو نوازنے کا موثر ذریعہ ہے۔ تاہم اب یہ گنجائش ختم ہوتی جا رہی ہے اور بحران ناگزیر ہو گیا ہے۔

سندھ کے اندرونی علاقوں میں ریاستی اداروں کی موجودگی زیادہ نمایاں ہے کیوں کہ وہاں روزگار کے متبادل ذرائع نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سرکاری ملازمت تک رسائی کو پورے ملک کی طرح یہاں بھی ہر فرد کا پیدائشی حق سمجھا جاتا ہے۔ حکومت فی الوقت بے روزگاروں کو ملازمت دینے سے قاصر ہے، مگر اس حقیقت کا احساس ہی سندھی باشندوں کو کوئی دوسرا روزگار تلاش کرنے کے بجائے انتظار کرنے یا سفارش اور رشوت کا سہارا ڈھونڈنے پر اکساتا ہے۔ بڑے شہروں کو چھوڑ کر، جن پر مہاجروں کا غلبہ ہے، سندھ کے اندرونی قصبوں میں بہت کم کارخانے موجود ہیں جو مقامی سندھیوں کو روزگار فراہم کر سکیں۔ علاوہ ازیں، سندھ میں زیادہ تر کارخانوں کے مالک پنجابی ہیں اور انھوں نے اپنے یہاں پنجابی مینیجر، کاریگر اور مزدور رکھے ہوئے ہیں۔ اس سے سندھی بے روزگاروں کا مسئلہ اور سنگین ہو گیا ہے۔ (میں نے کہیں اور اس نکتے کے حق میں بحث کی ہے کہ پنجاب کی موجودہ خوش حالی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسے اپنی فاضل لیبر فورس کو دوسرے صوبوں میں کھپانے اور یوں پنجاب میں بے روزگاری کی شدت کم رکھنے کا موقع حاصل

Scanned with CamScanner

ہے۔ سندھی سرمایہ دار ہنوز زراعت سے منسلک ہیں۔ وہ زرعی پیداوار کے طریقوں میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر رہے ہیں لیکن صنعت کاری کے میدان میں سست رفتار ہیں۔ اس طرح سندھیوں کے لیے روزگار کے نئے مواقع بہت کم پیدا ہو رہے ہیں جبکہ زراعت میں مشینوں کے بڑھتے ہوئے استعمال سے کھیت مزدور زیادہ تعداد میں بے روزگار ہو رہے ہیں۔ اس طرح ریاست پر ان کے انحصار میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

سندھی قوم پرستوں میں طلبا، استاد، ڈاکٹر، پیشہ ور ماہرین وغیرہ شامل ہیں جن کی ایک وسیع تعداد بے روزگار ہے۔ ایک مضبوط بورژوازی کی غیر موجودگی میں نچلے درمیانہ طبقے کی بے روزگاری کا مسئلہ سندھی قوم پرستی کا محور بن گیا ہے۔ ان کی بیشتر قیادت جاگیردار طبقے سے تعلق رکھتی ہے، مگر اب اس میں درمیانہ طبقے کے افراد کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ سندھ کے اندرونی علاقوں میں گزشتہ چند برسوں میں ابھرنے والے نچلے درمیانہ طبقے نے جو دباؤ ڈالا ہے اس کے باعث انہیں بعض ریاستی اداروں (مثلاً پولیس، ضلعی انتظامیہ، گورنمنٹ ڈپارٹمنٹ، پبلک کارپوریشنوں وغیرہ) میں ملازمتیں حاصل ہوئی ہیں۔ ضیاء الحق کے دور میں بھی، جب اندرونِ سندھ پنجابیوں کے مفادات کو فوج کا تحفظ حاصل تھا، جونیجو حکومت ۱۹۸۵ سے ۱۹۸۸ تک کے عرصے میں سندھیوں کو ملازمتیں دینے پر مجبور ہوئی، جس سے سندھ میں قومی حقوق کی تحریک کا جوش کچھ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ کراچی میں ۱۹۸۷ سے، جب ایم کیو ایم نے بلدیاتی انتخابات جیتے تھے، بلدیاتی اداروں میں مہاجروں کو ملازمتیں زیادہ تعداد میں دی گئیں۔ لیکن چونکہ بے روزگاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے، اس لیے ریاستی اداروں کی ملازمتیں بے روزگاری کے مسئلے کو پوری طرح ہرگز حل نہیں کر سکتیں۔

جوں جوں سندھ کا نچلا درمیانہ طبقہ زمین سے آزاد ہو کر ملازمتوں کی تلاش میں شہروں کا رخ کر رہا ہے، اس کی توقعات ریاست سے اور زیادہ وابستہ ہوتی جا رہی ہیں۔ سندھی بورژوا طبقہ اندرونِ سندھ صنعتوں کے قیام میں سرمایہ کاری نہیں کر رہا ہے، چنانچہ نجی شعبے کو نشوونما پانے میں طویل عرصہ لگے گا، اور کم از کم اس وقت تک تمام تر انحصار ریاستی شعبے پر رہے گا۔ چونکہ ریاست بڑی تعداد میں ملازمتیں فراہم کرنے سے قاصر ہے، اس لیے بے روزگاروں کی بے اطمینانی اور اشتعال میں اضافہ ہوگا۔ فی الوقت اس معاملے میں ایک الجھاؤ ہے — حکومت کو سندھیوں کے ہاتھ میں سمجھا جاتا ہے (اور بہت سے سندھیوں کو اس دورِ حکومت میں ملازمتیں ملی بھی ہیں)، چنانچہ کسی غیر سندھی حکومت کی نسبت اس حکومت کے خلاف اس اشتعال کی شدت کم ہے۔ لیکن بے روزگاری بڑھ رہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ قوم پرستوں کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کا ایک فطری نتیجہ، کم از کم فی الحال، یہ ہے کہ سندھی قوم پرست مسئلے کی جڑ تک پہنچنے کے بجائے اس اشتعال کا رخ مہاجروں اور پنجابیوں ہی کی طرف رکھیں گے۔

تشدد

گذشتہ چند برسوں کے واقعات کی ایک نمایاں خصوصیت سیاسی مخالفین پر کیے جانے والے تشدد کی نوعیت و شدت ہے۔ … اور چند پارٹی کے کارکنوں نے ایک دوسرے پر جو ہولناک تشدد کیا، اس کا نسلی گروہوں یا مہاجروں کے قومی حقوق کی جدوجہد سے کوئی تعلق نہیں۔ تشدد کی یہ صورتیں قومی حقوق کی جدوجہد سے الگ وجود رکھتی ہیں اور ایک ابھرتے ہوئے کلچر اور غیر متوازن ترقی کا شاخسانہ ہیں جن سے معاشرے کے تمام طبقے یکساں متاثر ہوتے ہیں۔ درحقیقت اس تشدد کی نوعیت ہی ایک بڑا عنصر ہے جس کے باعث سندھی مہاجر تنازعے کو اس قدر شہرت حاصل ہوئی اور ان دونوں گروہوں کے درمیان حقیقی تنازعے کی شدت میں بہت مبالغہ کیا گیا۔

پاکستانی معاشرے میں ہر قسم کے رجحان و تنازعے میں تشدد کا عنصر کارفرما رہا ہے۔ صرف سندھی مہاجر تنازعے پر ہی نہیں، جمہوری دور میں بھی ملک میں تشدد کی عادت سی عام طور پر شامل ہو چکی ہے۔ خواہ قومی تنازعات ہوں، طلبا یا ٹریڈ یونینوں کے باہمی اختلافات ہوں یا فرقہ وارانہ تنازعات، سب نمٹانے کا واحد طریقہ تشدد ہی کو سمجھا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک جھگڑے، پیٹ سے یا بہت ہوا تو چاقو چھری کے استعمال پر ختم ہو جاتے، لیکن اب جدید کلاشنکوف استعمال کی جاتی ہے۔ ہر قسم کا اسلحہ اور گولہ بارود پاکستان میں ہر جگہ آسانی سے دستیاب ہے اور کوئی بھی اس کا استعمال کرتے ہوئے ذرا بھی رکنے کے قابل ہی نہیں سمجھا جاتا۔ سیاسی جماعتوں کی اسلحے تک رسائی کے باعث ان سے وابستہ طلبا تنظیمیں، ٹریڈ یونینیں اور سماجی ادارے بھی مسلح ہو چکے ہیں۔ آج ملک میں اور خصوصاً کراچی میں اسلحے کی اتنی فراوانی ہے … سیاسی دھڑے سے مسلح … اگر رکھتے ہوں وہ نہیں … دوسروں کے … سے پہلے رکھتے ہیں … اور ان کا … کے گروہوں سے ہی کم ہے۔ مختار اصفہانی نے لکھا ہے:

> پاکستان میں بڑے پیمانے پر ملک میں تشدد میں اضافے کا ایک بالواسطہ سبب یہ ہے کہ پاکستان نے افغان مجاہدین کی کارروائیوں کے لیے راستہ اور ان تک اسلحے کی ترسیل کا راستہ فراہم کیا۔ ایک طرف کابل حکومت سے بچنے والے پختون قبیلوں کے ذریعے پاکستان میں ہتھیار آگئے دوسری طرف افغان مجاہدین کے لیے بھیجے جانے والے اسلحے کا بیشتر حصہ چوری چھپے پاکستان ہی میں رہ گیا۔ پاکستانی فوجی افسروں اور افغان مجاہدین کی بابت کہا جاتا ہے کہ انھوں نے خفیہ پاکستان سے کچھ … میں فروخت … ہتھیاروں کے تاجروں … میں

بازو کی اسلام پسند جماعتوں اور سرحدی اور دیہی ڈاکوؤں نے کلاشنکوف سے لے کر راکٹ لانچر اور ٹینک شکن میزائل تک حاصل کر لیے۔

(Pakistan: Dimensions of Insecurity, p 27)

گزشتہ دہائی میں فوجی تسلط نے بہر کیف پاکستان کو ایک بربریت زدہ معاشرہ بنا دیا ہے۔ نہ صرف سیاسی گھٹن کے باعث دبے ہوئے جذبات نے تشدد کی ہولناک صورت میں اپنا اظہار پایا بلکہ حقیقی، تدریسی اور سماجی شعبوں میں فوجی حصہ لے کر سبب معاشرے میں تشدد کی لہر پھیل گئی ہے۔ اپنے تسلط کا جواز پیش کرنے اور عوام کو قابو میں رکھنے کے لیے فوج نے اسلام کو استعمال کیا اور صحت مند اظہار کی تمام صورتوں پر پابندی لگا دی۔ موسیقی، کھیل، فنون، ثقافت، ہر چیز کے لیے قرونِ وسطیٰ کے سماجی ضابطوں کی مطابقت ضروری ٹھہرائی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ بدعنوانی اور رشوت کی جڑیں معاشرے میں گہری ہوتی گئیں اور ہیروئن اور اسلحے کے تاجروں کو ریاستی سرپرستی اور تسلط حاصل ہوا۔ شکایت یا اس کے ازالے کے لیے کوئی پلیٹ فارم میسر نہ تھا، اور ملکی معاملات میں عوام کی شمولیت یا احتساب کا دور دور تک نشان نہ تھا۔ فوجی وردی نے ہر روپ میں طاقت کی تکمیل کی، اخلاق و انصاف ہر چیز کی مالک بن بیٹھی۔

اسلام کے نام پر اس تسلط کے ساتھ ساتھ زندگی کی ہر سطح پر ایک اور متوازی عمل ہو رہا تھا۔ اسمگلنگ (خصوصاً اسلحے اور ہیروئن کی اسمگلنگ اور دولت) کے علاوہ، مشرقِ وسطیٰ کی آمدنی سے جو دولت پیدا ہو رہی تھی اس سے شہروں میں ایک نئے درمیانے طبقے کو فروغ ملا جس کی اقدار معاشرے کی موجودہ اقدار سے الگ تھیں۔ اس کی اصل نیت (consumerism) تھی، نئے متمول درمیانے طبقے کی بدولت وسیع تر دنیا تک رسائی حاصل تھی، سرکاری سطح پر پیش کیے جانے والے نقطۂ نظر سے ہٹ کر ایک اور منظر نامہ پیش کیا۔ خاص کر بڑے شہروں میں کیبل، تارہ، جدید، ڈش اینٹینا اور سستی ویڈیو کلچر نے ایک ایسا نقطۂ نظر پیدا کیا جو سرکاری پروپیگنڈے میں پیش کیے گئے فرسودہ جذبات کو تحقیر کی نظر سے دیکھتا تھا۔ علاوہ ازیں، شہروں کے پھیلاؤ کا عمل بہت تیزی سے جاری تھا، جس کے باعث پرانی اقدار کو ایک نئی، بالکل مختلف دنیا کا سامنا کرنا پڑا۔ جب مشرقِ وسطیٰ سے پیسے کی آمد میں کمی واقع ہوئی تو ابھرتے ہوئے درمیانے طبقے کو دولت، ملازمتوں، مہنگائی اور عدم تحفظ کے مسائل نے زیادہ شدت سے ستانا شروع کیا۔ بے گانگی کی شکار، بے روزگار نوجوان نسل اپنی گھٹن اور بے بسی کی ماری ہوئی تھی اور اسے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے کوئی راستہ میسر نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تضادات کا رخ بدل گیا اور اس گھٹن کا اظہار تشدد کی صورت میں ہوا۔ سیاسی جماعتوں میں سے ایم کیو ایم جیسے مایوسی اور تشدد کے اس شہری مظہر کی سب سے نمایاں علامت ہے۔ (سماجی علوم کے ایک ماہر، عارف حسن کا خیال ہے کہ شہروں کے پھیلاؤ سے جنم لینے والا تشدد پنجاب کے شہروں میں بھی ظاہر ہو گا۔)

انتخابات اور اس کے بعد

۱۹۸۸ کے انتخابات کے بعد ایک نہایت مسخ شدہ جمہوری عمل کا آغاز ہوا۔ جنرل ضیا کی موت کے بعد سے اب تک فوج کے سیاسی عزائم اور منصوبوں کے بارے میں قیاس آرائی کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ پاکستان میں کسی نہ کسی بہانے سے فوج کے ہاتھوں سویلین سیاسی عمل کے معطل کر دیے جانے کا امکان ہمیشہ نمایاں رہتا ہے، لیکن سویلین حکومتیں فوج سے مفاہمت قائم رکھنے کے لیے جس حد تک جھکنے کو تیار رہتی ہیں اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہ جمہوری عمل ابھی کچھ عرصہ اور چلنے دیا جائے۔

سندھ میں انتخابات کے نتائج نے صوبے کی نسلی اور شہری دیہی تقسیم کے بارے میں کسی مغالطے کی گنجائش نہ چھوڑی۔ ایم کیو ایم نے سندھ کے شہری علاقوں میں رہنے والے مہاجروں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ کیا اور پیپلز پارٹی نے سندھی اکثریت کے دیہی علاقوں میں سندھی قوم پرستوں اور ضیا حکومت کی باقیات کو واضح شکست دی۔

سندھ میں قوم پرستوں کی انتخابی شکست کی تعبیر غلط اور عمومی طور پر قوم پرستی کے مسترداور وفاقی نظام کی تائید کی صورت میں کی گئی ہے، اور اس نقطۂ نظر کو پنجاب اور ریاستی اسٹیبلشمنٹ کی طرف سے بڑھاوا دیا گیا ہے۔ یہ تجزیہ درست نہیں ہے۔ پیپلز پارٹی کے سندھی امیدوار اپنے مخالف امیدواروں سے کم قوم پرست نہیں تھے۔ انتخابی مہم کے دوران دونوں فریقوں نے یکساں جیسے نعرے لگائے اور سندھ کے لیے خود مختاری کا مطالبہ کیا۔ دونوں نے مہاجروں کو ہٹانے اور کالا باغ ڈیم تعمیر کرنے کی مخالفت کی۔ پیپلز پارٹی کے امیدواروں کی فتح کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ بھی قوم پرست تھے بلکہ یہ بھی کہ پارٹی کو وفاقی سطح پر بھی اکثریت حاصل تھی کہ مرکز میں حکومت بنانے کی صورت میں وہ صوبہ سندھ اور سندھیوں کی محرومیوں کا کچھ مداوا کر سکتی تھی۔ قوم پرستوں کے مقابلے میں پیپلز پارٹی کو دو اعتبار سے اور بھی فوقیت حاصل تھی: بھٹو کی موت سے پیدا ہونے والا جذبۂ انتقام، اور قوم پرست جماعتوں کا انتشار۔ جہاں تک انتخابات میں قوم پرستی سندھ میں ایک اہم سیاسی قوت کی حیثیت رکھتی تھی، گو وہ فیصلہ کن انتخابی قوت نہیں تھی۔ مگر، جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہوگا، حالات رفتہ رفتہ تبدیل ہو رہے ہیں۔

ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کے درمیان ہونے والا معاہدہ اس تشدد کے شکار صوبے میں امن کے قیام کا حقیقی امکان رکھتا تھا۔ اس معاہدے کی ناکامی کی بڑی وجہ دوری پیپلز پارٹی، خصوصاً بے نظیر بھٹو، کے تنگ نظر رویے پر عائد ہوتی ہے۔ ایم کیو ایم اور دوسرے پارلیمانی اتحادیوں کے ساتھ کچھ زیادہ مفاہمت و تعاون کا رویہ اختیار کرنے سے سندھ کے تناؤ میں کمی واقع ہوتی اور حکومت پر خود بے نظیر کی گرفت بھی زیادہ مضبوط ہو سکتی تھی۔ اپنے اتحادیوں کے ساتھ پیپلز پارٹی کا سلوک واقعی نامناسب تھا۔ دوسری جانب ایم کیو ایم اس اتحاد سے نکل کر متحدہ اپوزیشن کے ساتھ دوسرے اتحاد میں شامل ہوئی، جو اس کی سب

Scanned with CamScanner

رہی غلطی تھی۔ سندھ میں تشدد کی تاریخ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے بعد ہونے والے واقعات کی پیش گوئی کی جا سکتی تھی۔

پیپلز پارٹی سے معاہدہ ختم کرنے کے بعد ایم کیو ایم ملک کے سیاسی عمل سے کٹ گئی اور اپنے حامیوں سے بھی اس کا رابطہ نہ رہا، اور یہ صورت حال اپوزیشن سے معاہدہ ہو جانے کے بعد بھی قائم رہی۔ نومبر ۱۹۸۹ میں بے نظیر کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کی ناکامی ایم کیو ایم کے لیے سخت مایوسی کا سبب بنی کیوں کہ اسے یقین دلایا گیا تھا کہ یہ تحریک کامیاب ہو جائے گی۔ دوسری جانب اپوزیشن کی اس تحریک سے سندھ میں پیپلز پارٹی کی مقبولیت پر مثبت اثر پڑا۔ پیپلز پارٹی میں سخت گیر قوم پرست عناصر کو پارٹی کے ایم کیو ایم کے ساتھ معاہدے پر شدید اعتراض تھا۔ وہ اسے سندھی کاز سے بے وفائی سمجھتے تھے اور ان کی ناخوشی اتنی زیادہ تھی کہ انھوں نے عدم اعتماد کی تحریک میں بے نظیر کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ عدم اعتماد کی تحریک شاید کامیاب ہو جاتی اگر اپوزیشن اور ایم کیو ایم کے معاہدے کا اعلان غلط وقت پر نہ ہوا ہوتا۔ جب یہ واضح ہو گیا کہ پنجابی اور مہاجر اکٹھے ہو گئے ہیں تو اپنی ناخوشی کی شدت سے قطع نظر، سندھی ان نسلی گروہوں کا ساتھ ہرگز نہیں دے سکتے تھے جو سندھی قوم کو نیست و نابود کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔ چناں چہ نئی سیاسی صف بندی ہوئی اور قوم پرست عناصر نے مخالفت ترک کر کے بے نظیر کے حق میں ووٹ دیا۔ عدم اعتماد کی تحریک کے ناکام ہونے کے بعد سندھ میں پیپلز پارٹی پہلے سے زیادہ مضبوط ہو کر ابھری اور اس نے قوم پرست جماعتوں کو خاصی زک پہنچائی کیوں کہ اب اس کا تاثر ایک اصلی سندھی پارٹی کا تھا جو ایم کیو ایم کی سخت مخالف تھی۔

موجودہ صورتِ حال

اس مضمون میں میں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ سندھی مہاجر تنازعہ صوبہ سندھ میں بنیادی تضاد ہرگز نہیں ہے، اور یہ تنازعہ جو آج تشدد کے محور پر گھوم رہا ہے، بڑی حد تک مصنوعی طور پر پیدا کردہ ہے جس کی بڑی ذمہ داری ایم کیو ایم پر عائد ہوتی ہے۔ ایم کیو ایم ایک فاشسٹ تنظیم ہے اور اس کے نزدیک تشدد سندھ کے مہاجروں کو اپنے قابو میں رکھنے کا ایک اہم ذریعہ بن گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملک کے دوسرے گروہوں کی طرح مہاجر بھی روزافزوں معاشی اور سماجی مسائل کا شکار ہیں۔ ایم کیو ایم کو انتخابات میں واضح مقبولیت بھی حاصل ہوئی، اور یہ مہاجروں کی واحد نمائندہ تنظیم ہے کیوں کہ اس نے اس نسلی گروہ کو درپیش مسائل کے لیے آواز اٹھائی۔ اس کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مہاجر سندھ کے چند علاقوں (شہروں اور قصبوں) تک محدود ہیں چناں چہ دوسرے گروہوں کی نسبت انھیں منظم کرنا آسان ہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ تشخص کے بحران میں بھی مستقل طور پر مبتلا ہیں۔ اپنی گرفت قائم رکھنے

Scanned with CamScanner

نے سیاسی تشدد کے استعمال کا سبب [illegible] ۱۹۸۷ سے بلدیاتی انتخابات میں کامیاب ہونے کے بعد سے اب تک [illegible] کے مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کر سکی ہے۔ قومی انتخابات میں [illegible] کامیابی سے کچھ توقعات پیدا [illegible]، لیکن [illegible] نے کوئی ٹھوس فائدہ حاصل نہ [illegible] میں [illegible]۔ [illegible] قیادت [illegible] ہاتھوں [illegible] کرنے [illegible] نہیں ہے، جہاں [illegible] کی [illegible] ایسے [illegible] کی صورت میں [illegible] کا احساس [illegible] رہتی ہے۔ ایم کیو ایم کی سیاست میں تشدد کا عنصر [illegible] اور [illegible] تشدد کے خوف اور تحفظ کی ضرورت کے احساس سے [illegible] تعلیم یافتہ [illegible] تربیت یافتہ [illegible] تشدد [illegible] گروہوں کا [illegible] مہاجروں پر [illegible] ہیں۔

[illegible] تشدد [illegible] کی [illegible] سیاسی طور پر [illegible] سیاسی عمل میں تبدیلی پیدا [illegible]۔ سندھ میں [illegible] تشدد [illegible] مہاجروں [illegible] ۱۹۸۸ سے [illegible] معاشی طور پر [illegible] کیا ہے اور [illegible] کے مختلف [illegible] میں [illegible] آبادی [illegible] اگرچہ [illegible] ہیں۔ [illegible] کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ [illegible] گزشتہ سال [illegible] ہونے والی [illegible] میں [illegible] مہاجروں کی جماعت سے [illegible] زیادہ [illegible] ہیں۔ [illegible] شامل ہیں۔ [illegible] مسائل [illegible] کا حل نہیں ہے۔

[illegible] سندھ کی معیشت میں [illegible] اقتصادی [illegible] ضرورت ہے۔ [illegible] مہاجروں کے [illegible] اور معاشی اور سیاسی اقتدار کے معاملات میں [illegible] کا [illegible] ہے۔

سندھی قوم پرست بھی اپنی جدوجہد کے رخ کے بارے میں غلطی پر ہیں؛ انھیں مہاجروں سے مل کر پنجابی غلبے کے خلاف جدوجہد کرنی چاہیے، کیوں کہ اس کے بغیر وہ کچھ بھی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ سندھی قوم پرستوں کی سب سے بڑی نظریاتی غلطی ان کا مہاجر مخالف ہونا ہے۔ سندھی قوم پرستی کی سیاسی طور پر درست اور سب سے زیادہ موزوں صورت ریاست اور مرکز کے خلاف ان کا مہاجروں سے اتحاد ہے۔ بلاشبہ، موجودہ صورت حال عقل اور منطق کی بالادستی کے لیے سازگار نہیں ہے، کیوں کہ سیاست پر جذبات کی حکمرانی ہے۔ ایم کیو ایم کے احساس عدم تحفظ سے پیدا ہونے والے تشدد سے سندھی قوم پرستوں کو جو دھچکا لگا ہے، وہ پیپلز پارٹی کے مقابلے میں مقبولیت حاصل کرنے جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ مگر یہیں پیپلز پارٹی کے لیے خطرات ہو سکتے ہیں کیوں کہ پارٹی کے کمزور ہونے سے اقتدار پر اس کی گرفت بھی مزید کمزور ہو جائے گی۔ پیپلز پارٹی کو ایک کیچ ٹوئنٹی ٹو (Catch 22) قسم کی صورت حال کا سامنا ہے؛ اگر وہ ایم کیو ایم سے سمجھوتا کرکے موجودہ پرتشدد سیاست کا کوئی حل نکالنے کی کوشش کرتی ہے تو پارٹی میں موجود اور اس کے باہر کے سندھی قوم پرست اس سے ناخوش ہو جاتے ہیں۔ ایم کیو ایم کو نظر انداز کرتی ہے یا اس سے ٹکراؤ کا طرز عمل اختیار کرتی ہے (جیسا کہ اس نے گزشتہ کچھ عرصے سے اختیار کر رکھا ہے) تو خواہ سندھی قوم پرستوں کی ہمدردیاں حاصل ہو جائیں مگر صوبہ سندھ کو زبردست اقتصادی نقصان پہنچ سکتا ہے جس سے خود اس کے حامی بھی شدید طور پر متاثر ہوں گے۔ فی الوقت پیپلز پارٹی کے کٹر حامی سندھ کے معاملات کو سلجھانے کے بجائے موخر الذکر طرز عمل اختیار کرنے کے حق میں ہیں۔

سندھیوں اور ایم کیو ایم کے مابین ایک بڑا نکتہ اختلاف ایم کیو ایم کا یہ مطالبہ ہے کہ مہاجروں کو پاکستان کی پانچویں قومیت تسلیم کیا جائے۔ چوں کہ تمام سندھی قوم پرست قومی حقوق کا اور قومی بنیادوں پر صوبے قائم کرنے کا مطالبہ کرتے رہے ہیں، اس لیے مہاجروں کو قومیت مان لینے کا مطلب مہاجر صوبہ قائم کرنے کا مطالبہ ہوگا۔ سندھ کی تقسیم سندھیوں کے مفاد میں نہیں ہے، چناں چہ وہ اس کی مخالفت کریں گے۔ (گو سندھی قوم پرست مہاجروں کو پاکستان کی پانچویں قومیت مانتے ہیں اور پنجاب کی زمین کے ایک تہائی پر ان کا حق تسلیم کرتے ہیں، لیکن وہ مہاجر صوبے کے قیام کے لیے سندھ کی زمین کا کوئی حصہ دینے کو تیار نہیں۔) دوسری طرف ایم کیو ایم کے وجود کا محور ہی مہاجر قوم پرستی ہے، اور اگرچہ اس بات کے اشارے موجود ہیں کہ اس کی قیادت رفتہ رفتہ مہاجر قومیت اور مہاجر صوبے کا مطالبہ ترک کر دے گی، تاہم یہ عمل ایم کیو ایم کے اندر سست رفتاری سے رونما ہوگا۔ اس وقت تک سندھ میں موجودہ تنازعہ متواتر چلتا رہے گا۔

چند سوالات ایسے ہیں جنھوں نے صوبے میں نظریہ سازش پر یقین رکھنے والوں کو ہر وقت مصروف رکھا ہے، اور ان سوالات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ گزشتہ صفحات میں پیش کیا گیا بنیادی خیال یہ ہے کہ سندھ میں بنیادی تضاد سندھیوں اور مہاجروں کے درمیان نہیں بلکہ سندھ کے باشندوں

اور ریاست کے درکر (یعنی بہاریوں) کے درمیان ہے، تو مندرجہ ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں: سندھ میں ان مسلمین مہاجر سندھی تنازعہ پیدا کیوں کر ہوا؟ کیا اس کی پشت پر کچھ قوتیں کام کر رہی ہیں، اور کیا یہ تشدد ان کے مفاد میں جاتا ہے؟ صوبے میں مہاجر پنجابی یا سندھی پنجابی تنازعہ کیوں موجود نہیں؟

جیسا کہ بہت سے لوگوں کی خواہش ہوگی، دو ریاستی اداروں — فوج اور بیوروکریسی — کو اس صورت حال کا ذمے دار ٹھہرانا بہت آسان ہے، مگر ان میں سے کسی کے ملوث ہونے کا کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہونے کی صورت میں ان پر براہ راست الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ تاہم بعض شہادتیں موجود ہیں، اور جو مخصوص رجحانات پیدا ہوتے ہیں، ان کی بنا پر قیاس آرائی کرنا، اور مزید سوالات اٹھانا ضرور ممکن ہے، جو کہ فی الوقت تشنہ جواب ہیں۔

سندھ میں گزشتہ ایک سال کے عرصے میں ایک ہزار سے زیادہ لوگ مارے جا چکے ہیں، لیکن کسی ایک فرد کو بھی سزا نہیں دی گئی۔ گرفتار شدگان کو بااثر افراد کی ایما پر فی الفور رہا کر دیا گیا۔ اس سے ان قیاس آرائیوں کو تقویت مل رہی ہے کہ سندھ میں تشدد کے واقعات کسی ایسے طاقتور ادارے کی ایما پر کرائے جا رہے ہیں جسے اس تشدد سے فائدہ پہنچنے کا امکان ہے — یعنی فوج، آئی ایس آئی یا دوسری جمہوریت مخالف قوتیں۔

فوج اب اس پوزیشن میں ہے کہ جمہوریت کے تجربے کو کسی بھی وقت منسوخ کر سکے، اور عوام نے بعض حلقوں کی طرف سے یہ مطالبہ بھی زور پکڑتا جا رہا ہے کہ وہ ملک کا اقتدار سنبھال لے۔ ضیاء الحق کے مارشل لا میں فوج کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا تھا، اس لیے اس کی براہ راست حکومت کرنے کی خواہش کو خارج از امکان قرار دینا دشوار ہے۔ اگر جمہوری قوتوں اور اداروں کے خلاف واقعی کوئی سازش کی جا رہی ہے تو اس میں فوج کے بعض حلقوں کے شامل ہونے کا امکان بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ سندھ کے موجودہ حالات سے فائدہ اٹھانے والا دوسرا ممکنہ عنصر بیوروکریٹ ہو سکتے ہیں جو پیپلز پارٹی کی حکومت سے عناد رکھتے ہیں۔ پنجاب کے بعض حلقوں کو بھی اس صورت حال، خصوصاً کراچی میں ہونے والے تشدد، سے فائدہ پہنچ رہا ہے، کیوں کہ کراچی سے سرمائے کی منتقلی [illegible] اور پنجاب کے دیگر حصوں کی سمت ہو رہی ہے۔ اگرچہ سندھ کی صورت حال سے فائدہ اٹھانے والے کسی بھی فریق کو براہ راست ذمے دار ٹھہرانا ممکن نہیں، پھر بھی بہت سے سوالات موجود ہیں۔

جمہوری دور کے چند مثبت نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ پریس نسبتاً آزاد ہے جس کے باعث ایسے تجزیے شائع ہو سکتے ہیں جن میں نہ صرف حکومت پر، بلکہ کسی کسی فوج پر بھی، تنقید کی جاتی ہے۔ سندھ کے تشدد کے تناظر میں بھی اس موضوع پر فوج کے ملوث ہونے پر بالواسطہ، اشارتاً اور براہ راست طبع آزمائی کی گئی ہے۔ کراچی کے انگریزی ماہناموں، نیوز لائن اور ہیرالڈ نے ایسے کئی اشارتی مضامین شائع کیے ہیں۔ حیدرآباد میں تشدد کے حالیہ واقعات میں ایک حاضر ڈیوٹی کرنل کو نام لے کر ملوث ٹھہرایا گیا۔ اسی طرح لاہور کے انگریزی ہفت روزہ فرائیڈے ٹائمز نے اپنے ۱۴ تا ۲۰ جون

Scanned with CamScanner

۱۹۹۰ کے اداریے میں تحریر کیا: پاکستان پیپلز پارٹی کے اس الزام میں تھوڑی بہت صداقت یقیناً معلوم ہوتی ہے کہ سندھ میں اس کی حریف جماعت ایم کیو ایم کو جنرل ضیا کے دور میں آئی ایس آئی کی حمایت حاصل رہی ہے۔)

نتائج

سندھ میں خصوصاً اور ملک میں عموماً انتہائی غیر یقینی حالات کے باعث مستقبل میں کئی امکانات حقیقت بن کر رونما ہو سکتے ہیں۔ سندھ اور اسلام آباد میں سندھی درمیانہ طبقے کی نشوونما سندھی قوم پرستی کی قوتوں کو مضبوط اور پست کر سکتی ہے۔ سندھ کی اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ، اور قوم پرستی کے باوجود، اس صوبے کا ملک کے باقی حصوں سے رابطہ مضبوط اور پیچیدہ تر ہوتے چلے جانے کا امکان ہے۔ سندھی قوم پرستی کا علیحدگی پسند رجحان، اپنے تمام رومانی اور غیر حقیقی خیالات سمیت، اپنی فطری موت مر جائے گا۔ سندھ کے درمیانہ طبقے کو رفتہ رفتہ اس حقیقت کا احساس ہو گا کہ پنجاب اور کراچی سے ساتھ معاملہ کرنا اس کے مفاد میں ہے اور سندھ کی علیحدگی کی تحریک چلانے کے بجائے استحصالی نسلی گروہوں کے ساتھ کسی سمجھوتے پر پہنچنا زیادہ سودمند ہے۔ مگر پیداواری قوتوں کی نشوونما کی موجودہ سطح کو مد نظر رکھتے ہوئے اس حکمت عملی سے سندھی درمیانہ طبقہ مہاجر اور پنجابی سرمایہ داروں کے زیر دست ہو جائے گا۔ (واضح فرق کے باوجود، پختون مسئلے میں ایک دلچسپ مماثلت موجود ہے جو سندھ کے واقعات کی نوعیت کو سمجھنے میں کچھ مدد کر سکتی ہے۔ پختونوں میں بھی ایک قوم پرست درمیانہ طبقہ موجود تھا جو سخت مرکز مخالف اور پنجابی مخالف تھا جس کے ترجمانوں نے متعدد موقعوں پر پاکستان سے علیحدگی کی بات کی تھی۔ آج یہ طبقہ پختون معاشرے پر بورژوا طبقے کے جیسے، اور پنجابیوں اور مرکز کے ساتھ پختونوں کے اتحاد سے فائدہ اٹھانے والوں میں سر فہرست ہے۔ اب کوئی پختون مشکل ہی سے ملک سے علیحدگی کی بات کرتا ہے۔ قومی حقوق کو پاکستان کے وفاقی ڈھانچے کے تناظر میں دیکھا جانے لگا ہے اور اب پختون موجودہ وفاق میں رہتے ہوئے اپنے لیے زیادہ بڑا حصہ حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔) دوسری طرف اگر سندھیوں نے سندھ کے اندرونی علاقوں میں بالادستی حاصل کرنی چاہی ــــ شہروں میں، جو مہاجروں اور پنجابیوں کے قبضے میں ہیں، وہ بالادستی حاصل نہیں کر سکیں گے ــــ تب انہیں مہاجروں کے ساتھ اتحاد کر کے صوبے اور مرکز میں پنجابیوں کے غلبے کے خلاف جدوجہد کرنی ہو گی۔

اول الذکر امکان ــــ یعنی سندھی قوم پرستی کی مضبوطی کے باوجود باقی ملک کے ساتھ اتحاد کا راستہ اختیار کرنے کا امکان ــــ صرف اس صورت میں حقیقت پذیر ہو سکتا ہے کہ سندھ اور مرکز میں پیپلز پارٹی کا اقتدار قائم رہے۔ اگر فوج یا غیر سندھی اپوزیشن سے پیپلز پارٹی کی حکومت ختم کرنے میں کامیابی حاصل

کری تو دوسرا امکان — جو پہلے امکان کے بالکل برعکس ہے — روبہ عمل آسکتا ہے۔ اس صورت میں سندھی معاشرے پر بورژوا طبقے کے غلبے کی رفتار سست پڑ جانے کی اور ان حقائق کے پیش نظر کہ سندھی اپنے صوبے میں اقلیت میں تبدیل ہوچکے ہیں، معاشی طور پر کمزور ہیں اور ان کو مہاجروں اور پنجابیوں کی طرف سے سخت مسابقت کا سامنا ہے، ایک سست رو عمل کا امکان یہ بھی ہے کہ دوسرے نسلی گروہوں کے برعکس سندھیوں میں طاقت ور درمیانہ طبقہ پیدا نہ ہوسکے اور سندھی، سیاسی اور اقتصادی اکائی کے طور پر، اپنا وجود ہی کھو بیٹھیں۔ یہ سندھی قوم کے نابود ہونے کی ابتدا ہوگی۔ ایسی صورت میں سندھ میں ہونے والی تمام تر معاشی ترقی مہاجروں اور پنجابیوں کے قبضے میں آجانے کی جو صوبے پر اپنی گرفت اور مضبوط کرلیں گے۔ یہ عمل اگر پیش آیا تو بہت طویل عرصے میں وقوع پذیر ہوگا، لیکن اگر اس قسم کا رجحان پیدا ہوتا ہے تو اس کے قلیل میعادی اثرات کی پیش گوئی کی جاسکتی ہے: مایوسی کا شکار ہوکر سندھی قوم پرست تشدد کا سہارا لیں گے اور صوبے میں رہنے والے مہاجروں اور پنجابیوں پر حملے کریں گے۔ دوسرا امکان سندھ کے باشندوں کے لیے شدید المناک ہوگا۔

اگر جمہوری عمل جاری رہا تو چند برس کے عرصے میں قوم پرست تحریک میں اعتدال پیدا ہوسکتا ہے اور جمہوری سیاست کو تقویت حاصل ہوسکتی ہے۔ لیکن اس عرصے میں سندھ کا تقسیم ہوجانا یا مہاجروں کا اپنے موجودہ حقوق سے زیادہ کوئی حقوق حاصل کرنا قرین امکان ہے۔ اس کا نتیجہ نسبتاً غیر اہم مسائل پر وسیع تر جھگڑوں کی صورت میں نکلے گا جس کے بعد دونوں گروہوں کے مفادات مرکز کی بالادستی کے خلاف ایک ہوجاتے ہیں۔ سیاسی شراکت اور منصب کے فقدان سے پاکستان میں صرف ایک قسم کے مسائل کی سبیل جمہوریت سے طاقت ور جمہوریت کا بہ تشدد ... آج ملک کے تمام نسلی گروہ اس کے لیے سرگرم ہوسکتے ہیں ... عمل پیرا ہیں۔ اگر دوسرے قسم کے مسائل، مثلاً جمہوریت، کی ترمیم مصروف ہو پائیں تو شکایات سے نمٹنے کی دوسری راہیں دریافت کی جاسکتی ہیں۔ جوں جوں سندھی درمیانہ طبقے کا بالا دستہ کا ... کے بیچ سے ... میں زیادہ ... ہو جائے گا، اور پنجاب کو بھی گرفت اسی طرح ڈھیلی کرنی ہوگی جس طرح اس نے بلوچوں کے معاملے میں کی ہے۔ طویل عرصے میں، زیادہ خودمختاری، قومی ... میں زیادہ شراکت اور زیادہ جمہوریت اور احتساب کی قابل حکومت کا قیام سندھ کے مسائل کے حل کے لیے بنیادی شرط ہے۔ اس مسئلے کا کوئی قلیل میعادی حل نہیں ہے

**

مارک ٹلی

انگریزی سے ترجمہ اور تلخیص: اجمل کمال

چھوٹے ہتھیار

میں بیک وقت دو ملکوں کا شہری ہوں: میں ایک انگریز کی حیثیت سے ہندوستان میں پیدا ہوا، برطانیہ میں تعلیم پائی اور اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا بڑا حصہ واپس آ کر ہندوستان میں گزارا۔ میں اپنے دونوں ملکوں کے بارے میں بہت حساس ہوں۔ ہندوستان سے میری گہری وابستگی کے باعث بعض برطانوی حلقوں میں میری یہ شہرت قائم ہو گئی ہے کہ میں اس ملک سے ضرورت سے زیادہ ہمدردی رکھتا ہوں؛ کچھ لوگ تو مجھے "خوشامدی" کا بھی طعنہ دیتے ہیں۔ اس طعنے سے یہ نمایاں حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہم انگریزوں میں نوآبادیاتی رویہ اب تک پوری طرح ختم نہیں ہوا ہے۔ مجھے اپنے طرزِ عمل پر کسی معذرت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیوں کہ میں ہمیشہ اس بات کا قائل رہا ہوں کہ کسی نقطۂ نظر سے خبر نگاری کروں، جیسے میں برصغیر کے واقعات کی خبر نگاری کرتا رہا ہوں۔ اس وقت تک کوئی ہرج نہیں ہے جب تک آپ کو اس سے ہمدردی نہ ہو۔ میں اسی کی روشنی میں عام سے موضوع پر کچھ نئے خیالات پیش کرنے کے سلسلے میں بھی کوئی معذرت نہیں کرنا چاہتا جو برصغیر میں پائے جاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ لوگ، جو مغرب میں دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ان خیالات سے واقف ہو کر اس بات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے کہ جنوبی ایشیا کے رہنے والے ہماری (یعنی مغرب کی) پالیسیوں کو کس طرح دیکھتے ہیں۔ اس سے شاید ان دو موضوعات پر ایک نئے زاویے سے سوچنے کا موقع پیدا ہو جو میرے نزدیک ایک دوسرے سے قریبی طور پر منسلک ہیں یعنی ایٹمی ہتھیاروں کی روک تھام اور چھوٹے ہتھیاروں کا پھیلاؤ۔

مغرب کے قابلِ تعریف مقاصد، یعنی وہ مقاصد جن سے مجھے ذرا بھی اختلاف نہیں، عموماً ایسے انداز سے پیش کیے جاتے ہیں کہ ترقی پذیر ملکوں میں ان کی بابت شکوک و شبہات، بلکہ کبھی کبھی ردِ عمل پیدا ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر عالمی تجارت کے نئے عالمی نظام کے سلسلے میں ہونے والے مذاکرات کے دوران سماجی شرائط [مثلاً مزدور بچوں کے بارے میں شرائط] شامل کرنے سے ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملکوں میں ایسے خدشات کا پیدا ہونا اگر حیرت انگیز نہیں تو شاید عالمی اقتصادی میدان میں ان کی سب سے فائدہ مند خصوصیت — سستی لیبر — کو ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اسی طرح انسانی حقوق

Scanned with CamScanner

کے بارے میں اپنی فکرمندی کے اظہار کے ساتھ اقتصادی پابندیاں لگانے کی دھمکیوں سے تیسری دنیا کی حکومتوں کے لیے ایمنسٹی انٹرنیشنل جیسی بلند پایہ تنظیموں کی تحقیقات کے نتائج کو مغرب کے اقتصادی مفادات کا نتیجہ قرار دے کر رد کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔

مغرب کی کوششوں کے اصل محرکات کی بابت یہ شبہات سب سے زیادہ ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے معاملے میں سامنے آتے ہیں۔ انہیں شبہات کے باعث ترقی پذیر ملک بین الاقوامی بحثوں میں چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کا معاملہ شامل کرنے پر اصرار نہیں کرتے۔ ناوابستہ ملکوں کی تحریک (NAM) میں یہ خوف پایا جاتا ہے کہ اگر چھوٹے ہتھیاروں کے معاملے پر زیادہ زور دیا گیا تو ایٹمی طاقتوں کو موقع مل جائے گا کہ دنیا کی توجہ ایٹمی ہتھیاروں سے (جن کے وہ مالک ہیں) دوسری طرف پھیر دیں۔

ایٹمی کلب کے بڑے ممالک دنیا میں ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے بارے میں تشویش محسوس کرنے میں حق بجانب ہیں ـــ خصوصاً جنوبی ایشیا میں، جہاں ہندوستان اور پاکستان دونوں کے پاس ایٹمی دھماکا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ لیکن مجھے گمان ہے کہ وہ ان ملکوں کے احساسات کو سمجھنے کی کچھ زیادہ کوشش نہیں کرتے۔ ابھی پچھلے مہینے میں نے ایک اخباری مضمون پڑھا جس کے مصنف کا موقف یہ تھا کہ بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہمیشہ بے گناہ لوگوں کے خلاف استعمال کیے گئے ہیں، چنانچہ ایٹمی ہتھیاروں سے محروم ملکوں کا یہ خوف بالکل بجا ہے کہ ایٹمی ہتھیار انہیں کے خلاف استعمال کیے جانے کے لیے ذخیرہ کیے جا رہے ہیں، جیسے جرمنوں نے یہودیوں کے خلاف ہائیڈروجن سائنائیڈ کا استعمال کیا تھا۔ ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے چھوٹے ملکوں کو مجبور کرنا بالکل ویسا ہی ہے جیسے جرمنوں نے یہودیوں کو ستارۂ داؤد کی علامت پہننے پر مجبور کیا تھا تاکہ وہ آسانی سے پہچانے جا سکیں۔ یہ سخت الفاظ، جنہیں آپ میں سے بہت سے لوگ بالکل نامناسب قرار دیں گے، "ٹائمز آف انڈیا" کے ادارتی صفحے پر چھپنے والے ایک مضمون میں لکھے گئے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان جیسے ملکوں میں مغربی موقف کے بارے میں کس قسم کے احساسات پائے جاتے ہیں۔

ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے سلسلے میں ہماری مشترک کوششیں ایک اور مسئلے کی جانب سے ہماری توجہ بالکل ہٹا دیتی ہیں، یعنی چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کا مسئلہ۔ مجھے ایسی کوئی شہادت نہیں ملی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ مغرب کو اس مسئلے سے کوئی خاص دلچسپی ہے۔ جنوبی ایشیا کے بہت سے لوگ اس عدم دلچسپی کو اس بات کا ثبوت سمجھتے ہیں کہ مغرب کو بڑے بڑے مسائل پر صرف اُس وقت تشویش محسوس ہوتی ہے جب یا تو اسے خود نقصان پہنچ رہا ہو یا وہ تیسری دنیا پر کسی معاملے میں فوقیت حاصل کر رہا ہوتا ہو۔ میں خود بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہمیں ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے بارے میں اس قدر تشویش ہے اور چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کی کوئی خاص پروا نہیں۔

Scanned with CamScanner

میرے نزدیک اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ سے خود ہمیں خطرہ محسوس ہوتا ہے جبکہ چھوٹے ہتھیاروں کی پھیلائی ہوئی تباہی یوروپ کے سرحدی علاقوں اور ترقی پذیر ملکوں خصوصاً افریقہ اور جنوبی ایشیا کے ملکوں ــــ تک محدود رہتی ہے۔ بلاشبہ ہم انگریزوں کو شمالی آئرلینڈ میں چھوٹے ہتھیاروں کی فراہمی روکنے کی سخت فکر ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے ۷۷ ہلاکت خیز تنازعات میں سے ۶۵ تنازعات ترقی پذیر ملکوں میں پیش آ رہے ہیں۔ جنگ کے ان حالیہ میدانوں میں سپاہیوں اور شہریوں کو ہلاک اور زخمی کرنے والے ہتھیار ایٹمی نہیں بلکہ غیر ایٹمی، چھوٹے ہتھیار ہیں۔ ایٹمی ہتھیاروں کا خطرہ کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو، دوسری جنگ عظیم میں جاپان کے خلاف استعمال کیے جانے کے بعد سے اس کی حیثیت ایک امکانی (potential) خطرے کی رہی ہے۔ اس جنگ کے بعد سے اصل (actual) ہلاکت چھوٹے ہتھیاروں کے استعمال سے ہوئی ہے، جن کی ہلاکت خیزی کی تکنیکی صلاحیت مسلسل بڑھتی جا رہی ہے، اور یہ ہلاکت آج بھی جاری ہے۔ اگر ہم انگریزوں کو اپنے ہم وطنوں کے اسی طرح ہلاک ہونے کا خطرہ ہوتا جیسے کشمیر، سری لنکا، صومالیہ، کمبوڈیا اور تیسری دنیا کے متعدد دوسرے ملکوں کے باشندے ہلاک ہو رہے ہیں، تو کیا تب بھی ہم چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے سلسلے میں اتنے ہی بے پروا اور بے عمل رہتے؟ کیا تب بھی ہم جنوبی ایشیا میں مسائل پیدا کرنے والی امریکی پالیسیوں کی اسی شد و مد سے حمایت کرتے؟

اس مقام پر مجھے ان ہتھیاروں کی تعریف متعین کر دینی چاہیے جن کے پھیلاؤ پر مجھے اس قدر تشویش ہے۔ ناٹو (NATO) کی وضع کردہ تعریف کی رو سے چھوٹے ہتھیار وہ ہیں جن کا بور ۵۰ ملی میٹر سے کم ہو۔ لیکن اس سے زیادہ موزوں تعریف مجھے ایک ہندوستانی دفاعی ماہر نے بتائی تھی: چھوٹے ہتھیار وہ ہیں جنھیں کوئی شخص اکیلا اٹھا کر چل سکے۔

ان ہتھیاروں کی پھیلائی ہوئی تباہی کا اندازہ کیوں کر کیا جا سکتا ہے؟ حال ہی میں سیو دی چلڈرن فنڈ (Save the Children Fund) نے تخمینہ لگایا ہے کہ پچھلے دس برسوں میں ہونے والی جنگوں میں ایک کروڑ بچے جسمانی یا نفسیاتی طور پر متاثر ہوئے ہیں، اور پانچ لاکھ بچے ہلاک ہوئے ہیں۔ اس انجمن کا کہنا ہے کہ دولت مند ملکوں کو ان ہتھیاروں کی فراہمی قطعی طور پر روک دینی چاہیے جن کے ذریعے یہ جنگیں ممکن ہوتی ہیں۔ یہ تمام بچے چھوٹے ہتھیاروں سے نہیں ہلاک ہوئے، لیکن ان کی بہت بڑی تعداد یقیناً انھیں ہتھیاروں کا شکار ہوئی ہے۔

آئیے اب جنوبی ایشیا پر نظر ڈالیں۔ سکھ علیحدگی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں ہندوستان کے صوبہ پنجاب میں ایک سال کے عرصے میں ۲۳۷۳ شہری ہلاک ہوئے، تقریباً تمام چھوٹے ہتھیاروں سے۔ کشمیر میں بغاوت کے پہلے سال میں کم از کم پندرہ سو لوگ مارے گئے۔ اس بغاوت کے آغاز کے دو سال کے عرصے میں سات ہزار کلاشنکوفیں، ڈیڑھ سو مشین گنیں، پانچ سو راکٹ لانچر، ڈیڑھ ہزار راکٹ گرینیڈ اور کئی ٹن گولہ بارود برآمد ہوا۔ سری لنکا کی خانہ جنگی کے ایک سال میں دو ہزار لوگ ہلاک ہوئے۔

Scanned with CamScanner

حال ہی میں پاکستانی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے اپنے ملک کے سب سے بڑے صنعتی شہر اور واحد بندرگاہ کراچی میں تشدد اور افراتفری کی صورت حال کو چھوٹے پیمانے کی بغاوت ("mini insurrection") کی اصطلاح میں بیان کیا ہے۔ ایک پاکستانی جریدے کی رپورٹ کے مطابق کراچی ایسے چھوٹے چھوٹے قبائلی علاقوں میں تقسیم ہو گیا ہے جن پر مختلف سیاسی اور مذہبی جماعتوں سے ٹوٹے ہوئے دہشت گرد ٹولوں کا راج ہے، اور ان کی باہمی رقابتیں بے حد پیچیدہ ہو چکی ہیں اور حکام کے بس میں صرف اتنا رہ گیا ہے کہ شہر میں گھوم پھر کر لاشیں جمع کر لیا کریں۔

اس بات میں کم ہی لوگوں کو شبہ ہو گا کہ ہندوستان اور پاکستان میں تشدد کی جو لہر ہے براہ راست اس عمل کا نتیجہ ہے جس میں امریکا کی طرف سے افغان مجاہدین کو ہتھیار فراہم کر کے بڑے پیمانے پر مسلح کرنے کا عمل شامل ہے؛ اور اس عمل میں امریکا کو سعودی عرب اور برطانیہ کی بھی اعانت حاصل رہی ہے۔ لندن یونیورسٹی کے [illegible] ڈاکٹر کرس سمتھ نے ایک مقالہ لکھا ہے جس کا عنوان ہے "پاکستان اور شمالی ہندوستان میں چھوٹے اور ہلکے ہتھیاروں کا پھیلاؤ"۔ اس مقالے میں وہ لکھتے ہیں:

"گزشتہ برسوں میں ہونے والی [illegible] افغان مجاہدین کو مسلح کرنے کے لیے امریکا کی قائم کی ہوئی سپلائی کی پائپ لائن تھی۔ اس نظام [illegible] میں آنے والے ہتھیاروں کے سیلاب نے پچھلے دس سال میں [illegible] مرکزی ہوئی صورت حال پیدا کر دی ہے [illegible] ہے۔ امریکا نے افغانستان میں سوویت یونین کو شکست دینے کا عزم کیا تھا، لیکن اس نے کبھی یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ دولت [illegible] بھی نہیں [illegible] ہوتے ہوئے گزر کر جائے گا۔ جہاں تک اس نے پاکستان کو [illegible] امریکا ہتھیار [illegible] کرتا اور پاکستان ان ہتھیاروں کی تقسیم کو کنٹرول کرتا تھا۔"

اس سلسلے کی [illegible] اس سلسلے میں [illegible] تخمینے لگائے گئے ہیں، جن میں سے کوئی بھی پوری طرح درست نہیں۔ [illegible] افغان مجاہدین [illegible] ایک خفیہ آپریشن تھا۔ لیکن یہ تمام تخمینے مختلف [illegible] ایک [illegible] سیلاب کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کرس سمتھ کا کہنا ہے کہ ۱۹۸۷ء میں یہ مقدار ۶۵ ہزار ٹن سالانہ تک جا پہنچی تھی۔ ایک ہندوستانی دفاعی ماہر، جس نے پاکستان کے [illegible] افغان مجاہدین [illegible] کا گہرا مطالعہ کیا ہے، ان ہتھیاروں کی قسم کا تخمینہ [illegible] لگاتا ہے۔

[illegible] ہتھیاروں اور دوسرے آلات [illegible] سامان [illegible] پاکستان [illegible] ۱۹۸۹ء تک [illegible] زیادہ ہو چکی تھی۔ [illegible] بھاری اور ہلکی مشین گنیں، ۱۲۲ ملی میٹر کے لانچر اور [illegible] ۱۲۲ ملی میٹر کی [illegible]

نے زمین سے ہوا میں مار کرنے والے میزائل فراہم کیے۔ امریکا نے ان ہتھیاروں کی خریداری کے اخراجات برداشت کرنے اور انہیں پاکستان تک پہنچانے کے آپریشن کی نگرانی کرنے کے علاوہ خود بھی پاکستان کو کچھ مہلک ترین ہتھیار فراہم کیے: کلسٹر بموں والے راکٹ، کیمیائی گرینیڈ اور اسٹنگر میزائل۔ رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ افغان جنگ کے دوران ۳۴۰ اسٹنگر میزائل چلائے گئے جن سے ۲۶۹ طیارے گرائے گئے ـــ یعنی کامیابی کی شرح ۷۰ فیصد رہی جبکہ انہیں چلانے والے نشانہ باز پوری طرح تربیت یافتہ بھی نہیں تھے۔

امریکا کو اب اس بات کی بہت فکر ہے کہ حرارت کا پیچھا کرنے والے یہ مہلک ترین اسٹنگر میزائل، جو افغان مجاہدین کو فراہم کیے گئے تھے، کہیں دہشت گردوں کے قبضے میں نہ پہنچ جائیں جو ان کے ذریعے سویلین طیاروں کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ امریکی ان ہتھیاروں کو واپس خریدنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اس میں انہیں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ ایک معتبر ذریعے کے مطابق سو اسٹنگر کچھ ملکوں کے ہاتھ فروخت کیے جا چکے ہیں جن میں لیبیا، عراق، ایران اور شمالی کوریا شامل ہیں۔ جہاں یہ امریکا کی تشویش سمجھ میں آتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ پاکستانی فوج کے قبضے میں بھی کچھ اسٹنگر میزائل ہیں، جن کی خریداری کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔

اسٹنگر میزائلوں کی گمشدگی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مجاہدین کو مسلح کرنے کا عمل کس قدر غیر ذمہ داری سے انجام دیا گیا۔ امریکا ہتھیاروں کے کنٹرول سے مکمل طور پر دستبردار ہو گیا، اور یہ کنٹرول آئی ایس آئی کے پاس رہا۔ یہ ادارہ حکومت کو بلکہ فوج کو بھی پوری طرح جواب دہ نہیں اور بجائے خود ایک قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ فیصلہ کہ کون سے ہتھیار افغان مجاہدین کے کس گروپ کو دیے جائیں بڑی حد تک آئی ایس آئی کے ہاتھ میں تھا۔ افغانستان کی موجودہ ابتر صورت حال کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ گلبدین حکمت یار کو ان کے تناسب سے کہیں زیادہ اور بہتر ہتھیار دیے گئے۔ اس سے بھی بدتر بات یہ تھی کہ آئی ایس آئی نے امریکی ہتھیاروں کی ایک بڑی مقدار، شاید ۳۰ فیصد مقدار، خود اپنے استعمال کے لیے رکھ لی۔ جب تک فوجی ڈکٹیٹر ضیاء الحق کا دور رہا، تب تک آئی ایس آئی پر حکومت کا کنٹرول کسی حد تک قائم رہا۔ اس کے بعد سے یہ کنٹرول تقریباً بالکل ختم ہو چکا ہے۔ افغان جنگ کے دوران پاکستان میں امریکی سفیر اور ہتھیاروں کی ترسیل میں نمایاں کردار ادا کرنے والے رابرٹ اوکلے نے پچھلے سال ایک انٹرویو میں کہا: ”ضیاء الحق کے بعد پاکستانی فوج پر سول کنٹرول باقی نہیں رہا۔ خصوصاً آئی ایس آئی، جو نہ تو فوج کو جواب دہ ہے اور نہ وزیر اعظم کو اور نہ صدر کو۔ نتیجہ یہ ہے کہ آئی ایس آئی کی نگرانی کرنے والا کوئی نہیں۔ بدعنوانی، منشیات اور بے پناہ دولت نے صورت حال کو بے حد پیچیدہ کر دیا ہے۔“

امریکا نے ان ہلاکت خیز ہتھیاروں کو جنوبی ایشیا میں بے لگام چھوڑ دینے کے بعد وقتاً فوقتاً ان کا کنٹرول حاصل کرنے کی تھوڑی بہت کوششیں ضرور کیں لیکن ان میں سے آئی ایس آئی کی طرف سے

کی قسم کا تعاون نہیں ملا۔ ۱۹۸۸ میں امریکہ نے پاکستان میں اسلحے کے ذخیرے کا سامنا کرنے پر اسرار
یا جہادی اور ... اسلام آباد اور راولپنڈی کی شہری آبادی کے قریب اوجڑی میں واقع ہتھیاروں کے
ذخیرے میں زبردست آگ بھڑک اٹھی۔ اس آگ سے ہونے والے دھماکوں میں سیکڑوں لوگ ہلاک اور
مجروح بھی ہوئے۔ پاکستانی اخباروں نے ایک سرکاری رپورٹ شائع کی ہے: اوجڑی، حکام کے
دعووں کے خلاف، ہتھیاروں کی سپلائی کا کوئی معمولی ٹرانزٹ ڈپو نہیں تھا۔ آتش زدگی اور دھماکوں کے
بعد، ملبے میں ملنے والے ٹینک شکن میزائل، سام میزائل، آر پی جی ۱۵۵ اور ۱۲۲ ملی میٹر
کے راکٹ اور مختلف قسم کے مارٹر ملے ہیں۔ اس کی بڑی تعداد آگ اور دھماکوں میں تباہ ہو چکی تھی۔
جس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ کتنی مقدار میں اکٹھا کیا گیا ہو، لیکن اس سے اوجڑی کے خفیہ ہتھیاروں کے ایک بڑے
ذخیرے کے ہونے کی تصدیق ضرور ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ آگ دانستہ
لگائی گئی تھی تاکہ امریکیوں کو معلوم نہ ہو سکے کہ ان کے دیے ہوئے ہتھیاروں کا کیا ہوا۔

لیکن ہمیں اسی راستے میں تھوڑا رک کر دیکھنا چاہیے۔ جنوبی ایشیا میں عدم استحکام پیدا کرنے کا پورا
الزام امریکہ کی طرف سے افغان مجاہدین کو ہتھیاروں کی فراہمی پر نہیں رکھا جا سکتا۔ ہندوستان اور پاکستان
بھی اس سلسلے میں یکساں قصوروار ہیں۔ اور ان دونوں ملکوں نے ایسے سیاسی مسائل پیدا کیے جن سے
مقامی عدم استحکام پیدا ہوا اور ایسے گروپوں نے جنم لیا جنھوں نے ان ہتھیاروں کو استعمال کیا۔ ہندوستان
میں اب یہ بات مسلمہ طور پر مانی جاتی ہے کہ اندرا گاندھی، ان کے بیٹے سنجے، اور اس وقت کے وزیر اعلیٰ
پنجاب ذیل سنگھ، جنھوں نے سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالے کو ایک گمنام سکھ مبلغ کے مقام سے ایک بڑی
سیاسی شخصیت کے رتبے تک پہنچانے کے ذمے دار تھے۔ اندرا گاندھی کو پنجاب میں اپنی حریف سکھ
مذہبی جماعت اکالی دل سے مقابلہ کرنے کا بہترین طریقہ یہی معلوم ہوا کہ اکالی دل کے اس سے بھی زیادہ
شدت پسند حریف کو مستحکم کیا جائے — اس امر کے باوجود کہ ان کی کانگریس پارٹی سیکولر ہونے کا
دعویٰ کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ بھنڈرانوالے کے گولڈن ٹیمپل پر قبضے اور اس پر فوج کی چڑھائی کی صورت
میں نکلا۔ خود اندرا گاندھی کو بھی ان کے سکھ محافظوں نے دربار صاحب کی بے حرمتی پر طیش میں آکر قتل
کر دیا۔ اس طرح پنجاب کے مسئلے کی جڑ ایک بے اصول سیاسی حکمت عملی تھی جو اندرا گاندھی نے اپنی
سیاسی حریف جماعت اکالی دل کو پچھاڑنے کے لیے اختیار کی۔

کشمیر کا بھی یہی قصہ ہے۔ وہاں بھی اندرا گاندھی کے اپنے سیاسی حریفوں کو برداشت نہ کر پانے
سے مسائل پیدا ہوئے۔ انھوں نے اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا کہ کشمیر میں شیخ عبداللہ کے خاندان کی
جماعت نیشنل کانفرنس کی فطری حمایت موجود ہے اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو معزول کرنے کی مہم
چلائی۔ راجیو گاندھی نے فاروق عبداللہ کی حیثیت تسلیم کرتے ہوئے اصرار کیا کہ وہ کانگریس کے ساتھ سیاسی
اتحاد کے معاہدے پر دستخط کریں۔ اس سے کشمیری قوم پرست کے طور پر عبداللہ کا اعتبار خاک میں مل

گیا۔ ہندوستانی نقطۂ نظر سے یہ اعتبار اس خاندان کا سب سے قیمتی سیاسی اثاثہ تھا۔ اس سے جو سیاسی خلا پیدا ہوا اسے ان اسلامی جماعتوں نے پُر کیا جو کشمیر کے ہندوستان میں شامل رہنے کے خلاف ہیں۔

کراچی میں ہونے والے تشدد کی بیشتر ذمہ داری جنرل ضیاء الحق پر عائد ہوتی ہے۔ جنرل نے پیپلز پارٹی کی سیاسی قوت کو توڑنے کی کوشش کی جس کی حمایت سندھی عوام میں مستحکم ہے۔ انھوں نے سندھ کے صدر مقام کراچی میں مہاجر قومی موومنٹ کے قیام کی حوصلہ افزائی کی جس نے تقسیم ہند کے وقت پاکستان آنے والے مہاجروں کے مسائل کے لیے آواز اٹھائی۔ جنرل ضیا نے یک ایسے موقعے پر سیاسی منافرت پیدا کرنے والی جماعت کی تشکیل میں مدد دی جب صوبہ سرحد سے بڑی تعداد میں آنے والے پٹھانوں کے اس شہر کی خوش حالی میں زیادہ حصہ طلب کرنے کے باعث مہاجروں اور پٹھانوں کے درمیان تناؤ بڑھ رہا تھا۔ جنگجو پٹھانوں کے پاس امریکا کا فراہم کیا ہوا اسلحہ اور منشیات کی تجارت سے حاصل کردہ دولت تھی جس کے بل پر وہ کراچی کی جرائم کی دنیا کا ایک اہم عنصر بن گئے تھے۔ ایم کیو ایم کے انتشار، پٹھانوں اور پنجابیوں کے باقی تمام گروہوں کے خلاف اتحاد، شیعہ اور سنی جماعتوں کے باہمی کشت وخون اور اپنے مفادات کا تحفظ کرنے والے ڈرگ مافیا اور نام نہاد سماج دشمن عناصر کی سرگرمیوں کے باعث اب کراچی کی صورت حال انتہائی پیچیدہ ہو چکی ہے۔ لیکن اس صورت حال کا آغاز جنرل ضیا کے اس اقدام سے ہوا جس کے ذریعے انھوں نے بھٹو خاندان کے خلاف نسلی فرقہ پرستی کا ہتھیار استعمال کیا۔

اگرچہ سری لنکا میں ہونے والے تنازعے کے افغان ہتھیاروں سے تعلق کی کوئی واضح شہادت موجود نہیں، تاہم ان میں سے کچھ ہتھیاروں کے وہاں پہنچ جانے کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مگر اس خطے کے دوسرے تنازعات کی ایک قدرِ مشترک وہاں بھی موجود ہے، یعنی نسلی اور مذہبی نفرتوں کو غیر ذمہ داری سے ہوا دینا تاملوں اور سنہالیوں کی خانہ جنگی کا ایک اہم سبب ہے۔ صدر جے وردھنے پہلے سربراہ نہیں تھے جنھوں نے اکثریتی سنہالی گروہ میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے تامل کارڈ استعمال کیا۔ لیکن ۱۹۷۷ میں ایک مضبوط اکثریت کے ساتھ اقتدار میں آ جانے کے بعد، جب وہ آسانی سے مدبرانہ طرزِ عمل اختیار کر سکتے تھے انھوں نے تامل یونائیٹڈ لبریشن فرنٹ کو، جو تشدد کے خلاف تھا اور انتخابات میں حصہ لے چکا تھا، خلافِ قانون قرار دے دیا۔ اس اقدام سے تامل ٹائیگرز کو براہِ راست فائدہ پہنچا جو یقینی طور پر تشدد پر عمل پیرا ہیں اور اپنے جغرافیائی علاقے کے سری لنکا سے علیحدہ ہونے سے پہلے انتخابات میں شریک ہونے کے قائل نہیں۔

جنوبی ایشیائی ملکوں کے لیڈروں کا سیاسی عزائم میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے شارٹ کٹ استعمال کرنے کا رجحان ہی اس خطے میں عدم استحکام پیدا کرنے کے سلسلے میں ان لیڈروں کا واحد قصور نہیں۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں سرحد پار کے تشدد کو ہوا دینے میں یقینی طور پر ملوث رہے ہیں۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستان نے خالصتان کی تحریک کی امداد کی تھی اور کشمیر میں بھی اس کی امداد

Scanned with CamScanner

موجود ہے، اگرچہ اس امداد کی مقدار کے بارے میں ہندوستان کے دعووں کو جوں کا توں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات بھی شک شبہے سے بالاتر ہے کہ مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسندوں کو تربیت دینے میں ہندوستان نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا، اور یہ تربیت اس وقت سے بہت پہلے سے دی جا رہی تھی جب دونوں ملکوں کے درمیان بھرپور جنگ کا آغاز ہوا اور اس کے نتیجے میں نیا ملک بنگلہ دیش قائم ہوا۔ پاکستان کا دعویٰ ہے کہ ہندوستانی ایجنسیاں بھی [illegible] کراچی اور سندھ کے دوسرے حصوں میں سرگرم رہے، گرچہ پاکستان کے انسانی حقوق کے کمیشن نے پچھلے سال اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اس دعوے کو ابھی ثابت نہیں کیا گیا ہے۔ پاکستانی وزیر داخلہ کا بیان یہ تھا کہ مختلف نسلی اور سیاسی فریقوں کے ہندوستان سے روابط کی کافی شہادتیں ریکارڈ پر موجود ہیں۔ سری لنکا کے سلسلے میں بھی عام طور پر مانا جاتا ہے کہ تامل ٹائیگرز کو ابتدائی تربیت اور اسلحے کی فراہمی میں ہندوستان ملوث تھا، جس کے بعد انھوں نے سری لنکا کے شمالی علاقوں پر سے حکومت کا کنٹرول ختم کر دیا۔

پاکستان کے انسانی حقوق کے کمیشن نے سرحد پار دہشت گردی کی امداد اور عدم استحکام کے فروغ کے سلسلے میں ایک اور بھی اہم نکتہ بیان کیا۔ کمیشن کا کہنا تھا: بیرونی ایجنٹ محض کسی تنازعے کی صورت حال کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر معاشرے میں ہم آہنگی موجود ہو تو کسی قسم کی بیرونی مداخلت ایسے حالات پیدا نہیں کر سکتی جس سے نمٹنا معقول کارکردگی رکھنے والی امن و امان قائم رکھنے کی مشینری کے لیے ممکن نہ ہو۔ یہی بات، میرے نزدیک، ہتھیاروں کے سلسلے میں بھی درست ہے۔ جنوبی ایشیا میں ہتھیاروں کی موجودگی عدم استحکام اور تشدد کا سبب نہیں بلکہ اس صورت حال کا محض ایک عنصر ہے۔

لیکن یہ عنصر نہایت اہم ہے۔ بے گناہ شہریوں کو کس سطح کے تشدد سے گزرنا پڑے گا، اس کا انحصار بڑی حد تک انہیں ہتھیاروں پر ہوتا ہے۔ ہندوستانی پنجاب میں کلاشنکوف کی آمد کے بعد سے ہلاک ہونے والوں کی سالانہ تعداد ۱۰۰ سے ۲۵۰۰ تک جا پہنچی۔ چند روز پہلے کشمیر کے صدر مقام سری نگر میں نیم رات کے وقت ایک گاڑی میں سابق وزیراعلیٰ فاروق عبداللہ کے گھر جا رہا تھا۔ نیم فوجی پولیس کے مورچوں کے سوا سڑکیں بالکل سنسان تھیں۔ ایک جھیل کے کنارے ایک جنگل کے پاس سے گزرتے ہوئے ہمیں ایک نوجوان کا [illegible] دکھائی دیا۔ خوش قسمتی سے ہمیں اس نے نشانہ بنانے سے گریز کیا۔ اس قسم کے ہتھیار ہیں جو شہری کشمکش (civil strife) کو خانہ جنگی (civil war) کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں۔

سندھ کی پرتشدد صورت حال ۱۹۸۰ کی دہائی کے درمیانی برسوں میں جو ایک حد تک اہم ہو گئی جب مذہبی جماعتوں کی [illegible] کے خلاف اس قدر شدید [illegible] ترقی یافتہ شہر بھی کچھ مدت [illegible] ہو گئے۔ اس نے کچھ ہی عرصے بعد ایک دوسرے رنگ [illegible] [illegible]

چنانچہ میرے دوست کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ لوگ پولیس کے ہتھیار بند محافظ تھے یا کسی سیاسی جماعت کے، اس وقت یہ پوری بستی کو بندوق کی نوک پر لیے ہوئے تھے۔ خود وہ اس قدر دہشت کے مارے اس موضوع پر بات کرنے سے قاصر تھا۔

یہاں میں ایک بار پھر مشورہ دوں گا کہ ہمیں رائے قائم کرتے ہیں احتیاط برتنی چاہیے۔ تشدد، بغاوت اور دہشت گردی کے بارے میں جتنی تحریریں ہم دیکھتے، پڑھتے اور سنتے ہیں، ان سے جنوبی ایشیا کے علاقے کے تمام ممالک کے بارے میں ایک غلط تصور پیدا ہوتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ دلچسپ ہے کہ ہندوستان کے بارے میں قنوطیت پسند مبصر رہے ہیں، ایک کی کتاب India: A Million Mutinies Now میں لاکھوں بغاوتوں میں سے ہر ایک کے مختلف دیکھی ہے۔ وقتاً فوقتاً میں سب سے زیادہ ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کی پیشگوئیاں کرتے سنتا ہوں۔ گیارہ سال پہلے طارق علی نے پاکستان کے بارے میں Can Pakistan Survive? کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس کا ذیلی عنوان The Death of a State تھا۔

حقیقت میں ہندوستان جتنا مستحکم معلوم ہوتا ہے۔ دو سال پہلے ہندو مذہبی جنونیوں نے ایودھیا کی بابری مسجد کی تباہی، اور اس کے بعد پھوٹ پڑنے والے ہندو مسلم فسادات کے بعد بہت سے لوگوں کی یہ رائے تھی کہ اب مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کسی طور پر ساتھ رہنا ناممکن ہو جائے گا، کہ مسلمان ہتھیار اٹھا لیں گے، اور یہ کہ ہندوستان میں اس بار اس قدر شدید رد عمل ہو گا کہ شاید یہ ملک باقی نہیں رہ سکے گا۔ پھر بمبئی میں دھماکے ہوئے اور بڑی تعداد میں ہتھیار برآمد بھی ہوئے۔ کہتے ہیں یہ دھماکے مسلمانوں کے کسی خاص گروہ کی پیشہ ورانہ کارروائی تھے، شاید بابری مسجد کی تباہی کا بدلہ لینے کی خاطر، شاید ملک کے اقتصادی مرکز کو نشانہ بنا کر حکومت کی نئی اقتصادی اصلاحات کو زک پہنچانے کے مقصد سے۔ ان اصلاحات سے بیرونی سرمایہ کاری کی آمد۔ خرید و فروخت کا مرکز ہندوستان میں بمبئی کے علاوہ کہ جہاں سے بمبئی کے جرائم پیشہ لوگ چلاتے ہیں۔ جس تناسب میں ترقی یافتہ چھوٹے ہتھیار استعمال ہو رہے ہیں وہ ہندوستان کے دور سرحدی علاقوں — کشمیر اور شمال مشرقی ریاستوں — تک محدود ہیں۔ پنجاب میں اب یہ کم ہو چکا ہے۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہندوستان توقع سے کہیں زیادہ مستحکم ہے۔ اس کو ایسے شدید بحرانوں سے گزرنا پڑا ہے جن کی وسعت اور عمق اور مختلف النوع آبادیوں والے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکتے تھے — مہاتما گاندھی کا قتل، ۱۹۶۲ء کی جنگ میں چین سے شکست، گولڈن ٹیمپل پر فوجی حملہ، اندرا گاندھی کا قتل اور اس کے بعد سکھوں کا قتل عام، راجیو گاندھی کا قتل اور حال ہی میں ایودھیا میں مسجد کی تباہی کا واقعہ اور اس کے نتیجے میں ہونے والے فسادات۔ اس ملک کو صوبہ پنجاب میں دس برس طویل دہشت گردی کا سامنا کرنا پڑا ہے اور کشمیر کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ آسام میں بھی سکتا ہوں ہے، مگر یہ بات شمال مشرقی ہندوستان کی دو چھوٹی ریاستوں، منی پور اور ناگالینڈ، کے

بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن ہندوستان تباہ نہیں ہوا۔ یہ کسی بڑی جہاز کی طرح ہے جس پر طوفانی لہروں کی یلغار کبھی کبھی اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ لگتا ہے بس ڈوبنے ہی کو ہے، لیکن وہ پھر سیدھا ہو کر تیرنے لگتا ہے۔ چوں کہ ہندوستان نے ہر موقعے پر اتنی سخت جانی دکھائی ہے، ہندوستان کے لوگ ان صدمات کے اصل اسباب پر زیادہ غور نہیں کرتے۔ جہاں تک سیاست دانوں اور منتظموں کا تعلق ہے، انھوں نے "چلنے دو" کا فلسفہ وضع کر لیا ہے، جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ آخر میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔

پاکستان کو اس سے بھی زیادہ خطرناک حالات سے، یعنی اپنے مشرقی حصے کی علیحدگی سے، گزرنا پڑا ہے۔ اس کی سیاسی زندگی بھی ہندوستان سے زیادہ متلاطم رہی ہے؛ بے پردہ یا باپردہ فوجی حکمرانی طویل مدتوں تک قائم رہی ہے۔ ایک صوبے، پنجاب، کی بالادستی نے ملک کی ترقی کو سخت غیر متوازن رکھا ہے، جس سے باقی تین صوبوں میں زبردست کشیدگی پیدا ہوئی ہے۔ مگر پاکستان قائم رہا ہے اور "چلنے دو" کے فلسفے کا وہاں بھی خوب دور دورہ ہے۔

کیا میرا یہ تبصرہ میری اپنی ہی بات کی نفی نہیں کر دیتا؟ یعنی کیا میرے اس تبصرے کا یہ مطلب نہیں نکلتا کہ چھوٹے ہتھیاروں کا پھیلاؤ جنوبی ایشیا کے استحکام کے لیے کوئی حقیقی خطرہ نہیں ہیں؟ میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میں نے اپنی طرف سے صورت حال کا ایک متوازن نقشہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ ہندوستان یا پاکستان کی ریاستوں کے ٹوٹنے کا کوئی فوری خطرہ نہیں، تاہم چھوٹے ہتھیاروں کے پیدا کیے ہوئے خطرے آخرکار ایسے کسی سانحے کا سبب یقیناً بن سکتے ہیں۔

سب سے پہلے تو یہی خطرہ ہے کہ اس قدر آسانی سے دستیاب ہتھیار دور دور تک پھیل جائیں گے۔ پاکستان میں تو یہ ہتھیار کراچی اور صوبہ سندھ سے باہر پھیل چکے ہیں۔ اب پاکستانی صوبہ پنجاب میں شیعوں اور سنیوں کے درمیان سخت خوں ریز جھڑپیں اور ایک دوسرے کی عبادت گاہوں پر مسلح حملے ہونے لگے ہیں۔ پچھلے سال صوبہ سرحد کے مالاکنڈ نامی علاقے میں ایک مذہبی لیڈر مولانا صوفی محمد نے بیشتر سرکاری عمارتوں اور ایک ایئرپورٹ پر قبضہ کر لیا تھا اور دو ججوں اور ایک سرکاری اہلکار کو یرغمال بنا لیا تھا۔ پاکستان میں بی بی سی کے رپورٹر ظفر عباس نے عینی شاہدوں کے حوالے سے بتایا کہ بغاوت کی خبر پھیل جانے پر سیکڑوں افراد پہاڑوں پر سے اترنے لگے جن میں اکثر نے کالی پگڑیاں باندھ رکھی تھیں اور پستول اور کاربائن سے لے کر کلاشنکوف (AK 47) رائفلوں تک، ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس تھے۔ نیم فوجی دستوں کی کئی ہزار کی نفری کو علاقے کا کنٹرول واپس لینے میں ایک ہفتے سے زیادہ وقت لگا، اور اس پر بھی انھیں مولانا کا مطالبہ ماننا پڑا کہ علاقے میں پاکستانی قانون کی جگہ اسلامی یا شرعی قانون نافذ کیا جائے۔

پاکستان کے وفاقی وزیر اطلاعات و قانون نے حال ہی میں کہا کہ غیر قانونی ہتھیاروں نے ہمارے معاشرے کے ہر شعبے کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اب حکومت نے وفاقی دارالحکومت اسلام آباد میں ہتھیار لے کر چلنے پر پابندی لگا دی ہے، مگر قومی اسمبلی کے ارکان، جو ہمیشہ ہتھیاروں سے لیس محافظوں

Scanned with CamScanner

کے گھیرے میں نکلتے ہیں، اس پابندی کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔ میرا خیال ہے اس سلسلے میں بھی "چلنے دو" کے فلسفے پر عمل کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں یہ خوف پایا جاتا ہے کہ ہتھیار مسلمانوں ـــــ خصوصاً نیپال کی ڈھیلی ڈھالی سرحد پر واقع ریاستوں، اترپردیش اور بہار کی وسیع مسلمان برادریوں ـــــ کے ہاتھ نہ آجائیں۔ میں اترپردیش میں نیپال کی سرحد کے آس پاس کے علاقے میں بہت گھوما پھرا ہوں؛ مجھے مسلمان انتہاپسندوں کی سرگرمی کی کوئی شہادت نہیں ملی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ خطرہ موجود نہیں ہے۔ بہار اور اترپردیش دونوں اب بھی اپنی لاقانونیت کے لیے بدنام ہیں اور ان ریاستوں میں عادی مجرموں کے سیاسی پارٹیوں سے روابط کے باعث پولیس کا مورال تباہ ہو چکا ہے۔ اگر نوجوان مسلمانوں نے ہتھیار اٹھا لیے تو پولیس ان پر قابو پانے میں ناکام رہے گی۔ اگر ایسا ہو تو یہ دونوں ریاستیں ـ جنہیں کسی بھی طرح کشمیر یا شمال مشرقی ریاستوں کی طرح سرحدی ریاستیں قرار نہیں دیا جاسکتا ـــــ سرکاری سکیورٹی فورسز، بشمول فوج، اور مسلح انتہاپسندوں کا میدانِ جنگ بن جائیں گی۔

ہندوستانی فوج کو ابھی تک عموماً بدعنوانی سے پاک، غیرجانبدار اور موثر سمجھا جاتا ہے۔ فسادزدہ شہروں یا قصبوں میں محض فوج کا سڑکوں پر مارچ بعض اوقات امن قائم کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ لیکن شمال مشرقی ریاستوں اور کشمیر میں فوج کا محض مارچ موثر ثابت نہیں ہوا بلکہ اسے علیحدگی پسندوں سے مقابلے کے لیے براہِ راست ملوث ہونا پڑا۔ اس میں فوج کو سو فیصد کامیابی نہیں ہوئی ہے، اور یہی ناکامیاں فوج کے مورال کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی ہیں۔ شہری انتظامیہ کی مدد کے لیے فوج کے باربار استعمال سے سپاہیوں کے بدعنوانی میں ملوث ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ دس سال پہلے احمد آباد کے فسادات میں گجرات پولیس اور ہندوستانی فوج دونوں ناکام رہے، اور ایک اور ریاست کے ایک ممتاز پولیس افسر کو صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے بھیجنا پڑا۔ فوج کی کمان کرنے والے افسر نے التجا کی کہ فوج کے جوانوں کو سڑکوں پر سے واپس بلانے کی اجازت دی جائے کیونکہ وہ پولیس کی طرح بدعنوان ہوتے جارہے ہیں۔ چھوٹے ہتھیاروں کا پھیلاؤ جس قدر بڑھتا جائے گا، ہندوستانی شہروں کی سڑکوں پر فوج زیادہ دکھائی دینے لگے گی، اور زیادہ تعداد میں فوجیوں کے بدعنوانی میں ملوث ہونے کا خطرہ ہوگا۔

جیسا کہ ہیومن رائٹس واچ نامی تنظیم نے نشان دہی کی ہے، کشمیر اور پنجاب کے انتہاپسندوں کی جانب سے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی سنگینی میں چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوا۔ لیکن ساتھ ہی اس تنظیم نے اپنی رپورٹ میں ہندوستانی حکومت کے انسانی حقوق کے ریکارڈ کو بھی ہولناک قرار دیا ہے۔ اگرچہ ہندوستانی فوج پر لگائے گئے اس قسم کے تمام الزامات ثابت نہیں کیے جاسکے ہیں، پھر بھی اس امر کی کافی شہادتیں موجود ہیں کہ متعدد موقعوں پر ہندوستانی فوج نے سخت بربریت کا مظاہرہ کیا، اور اگر اس بربریت کو جاری رہنے دیا گیا تو یہ فوج کے ڈسپلن کے لیے نہایت خطرناک ہوگا۔

Scanned with CamScanner

[illegible]

[illegible]

[illegible] ایک طرف [illegible] اور دوسری طرف سندھ میں ان قوموں کے [illegible] میں اس کی شہادت موجود ہے۔

[illegible]

منشیات کی پیداوار میں بہت تیزی سے ہندوستان کے مشرق میں واقع گولڈن ٹرائنگل نے بڑی اہمیت حاصل کر لی۔ ایک دفاعی مبصر کے اندازے میں ہندوستان کی آدھی زرعی زمین افیون کی فصل سے اور باقی آدھی بارودی سرنگوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہمارا پاکستانی صحافی [illegible] منشیات کی تجارت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے امریکی ایجنسیوں نے [illegible] میں اقوامی تاجروں سے تعارف کے سلسلے میں مدد دی تھی۔ ہتھیاروں اور منشیات کی تجارت کا باہمی تعلق افغان سرحد پر منشیات کے سمگلروں سے پاکستانی سیکیورٹی فورسز کی شدید جھڑپوں کی خبروں سے واضح ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے ایک واقعے کے بعد ۱۳ مشین گنیں، مختلف قسم کی رائفلیں، ۳۵ راکٹ اور ایک میزائل لانچر اور گولیوں کے چھ ہزار سے زائد راؤنڈ برآمد ہوئے۔ ہندوستان میں امریکا کے فراہم کردہ ان ہتھیاروں کے پھیلاؤ اور منشیات کی تجارت کے درمیان تعلق اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ گولڈن ٹرائنگل پر فوج کے قبضے کے بعد وہاں سے دس کلوگرام ہیروئن بھی برآمد ہوئی۔

ہندوستان میں سرکاری نگرانی میں افیون کی تیاری برطانوی دور سے چلی آ رہی ہے۔ پہلے یہ افیون چین بھیجی جایا کرتی تھی، اب اسے دواؤں میں استعمال کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ [illegible] اور بہار کی سرحد کے قریب واقع غازی پور کے قصبے میں افیون کے کارخانے کے افسر نے [illegible] کارخانے سے افیون پہلے بھی لیک ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے۔ آج بھی آپ عادی [illegible] کارخانے کی دیوار پر بیٹھے ہیروئن کے نشے میں جھومتے دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن جب تک چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ اور منشیات کی تجارت نے زور نہیں پکڑا تھا تب تک برطانوی حکومت اور اس کے بعد ہندوستانی قومیں کی حکومت اس پر کوئی خاص تشویش نہیں تھی۔ آج ہندوستان کو گولڈن کریسنٹ میں تیار ہونے والی منشیات کی سمگلنگ کا ایک بڑا سامنا بھی ہے۔

افغان جنگ سے پہلے پاکستان میں ہیروئن کے عادی شخص کا تصور بھی مشکل تھا۔ اب وہاں دس لاکھ سے زیادہ رجسٹرڈ ہیروئن کے عادی افراد ہیں۔ ہم ہندوستانیوں کو پاکستان میں منشیات کے بڑھتے ہوئے مسئلے پر زیادہ فکرمند ہونا چاہیے۔ پچھلے سال برطانوی کسٹم کی پکڑی ہوئی کل ہیروئن میں سے ۷۰ فیصد پاکستان سے اسمگل ہو کر آئی تھی اور کسٹم والوں کا کہنا ہے کہ برطانیہ میں داخل ہونے والی تمام منشیات کا ۹۰ فیصد حصہ وہیں سے آتا ہے۔ چھوٹے ہتھیار بھی، منشیات کی طرح، سرحدوں سے پار ہوتے ہیں، اس لیے اس بات کا معقول عملی جواز موجود ہے کہ کوئی بھی ملک ان کی حفاظت کے سلسلے میں تشویش ظاہر کرے۔ یہ ہتھیار بڑی آسانی سے بین الاقوامی دہشت گردوں کے ہاتھ لگ سکتے ہیں۔

سول اور بندوق کی لڑائیوں سے ہلاک ہونے والے لوگ، منشیات سے تباہ ہو جانے والی زندگیاں، ملکوں کا عدم استحکام، [illegible] کے سوال کی تباہی، ہمارے اپنے مسائل کو پیچیدہ کرنے والے تشدد ___ مجھے امید ہے ان سب کے پیش نظر آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ امریکا کے افغان مجاہدین کو مسلح کرنے کے

طریق کار میں سب سے غیر ذمہ دارانہ طرز عمل اختیار کیا، اور جنوبی ایشیا کے دو بڑے ملکوں کے استحکام کو ان ہتھیاروں سے سخت خطرہ لاحق ہے۔ اب جو فوری سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان ہتھیاروں کے سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے جو اب پھیل چکے ہیں۔ سب سے پہلے تو اس امر کی تحقیقات ہونی چاہیے کہ افغانستان بھیجے جانے والے ہتھیار غیر قانونی طور پر فروخت کیے گئے، اور اس کے ذمہ دار پائے جانے والے افراد کے خلاف قانونی کارروائی کی جانی چاہیے۔ امریکی تنظیم ہیومن رائٹس واچ نے بھی امریکی اور پاکستانی حکومتوں سے یہ مطالبہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ تنظیم کا کہنا ہے کہ ان ہتھیاروں کو واپس حاصل کر کے تباہ کرنے کی موثر کوشش کی جانی چاہیے۔ یہ بات بہت معنی خیز ہے کہ امریکی حکومت نے صرف سٹنگر میزائلوں کو واپس حاصل کرنے کے لیے عملی قدم اٹھایا ہے کیونکہ ان سے خود امریکا کے شہریوں اور ہوائی مسافروں کو خطرہ ہو سکتا ہے۔

اب اس خطے میں پاکستان کے راستے اسلحے کی ایک نئی لہر بلکہ مجھے کہنا چاہیے کہ دو لہروں، کے داخل ہونے کا خطرہ ہے۔ ۱۹۹۲ میں کابل میں مجاہدین کے پہلے صدر کی آمد پر نوجوانوں نے کلاشنکوفوں سے اس قدر شدید ہوائی فائرنگ کی تھی کہ میرے کانوں کے پردے پھٹتے پھٹتے بچے تھے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ بہت جلد یہ کلاشنکوفیں ہماری سرحدی شاہراہوں کی طرف آنے والی ہیں اور مسرت کا یہ سیلاب آنسوؤں میں تبدیل ہونے والا ہے۔ [illegible]۔ چینی، ایرانی، تاجک، ازبک اور پاکستانی، سب کے سب افغان خانہ جنگی میں اپنے اپنے پسندیدہ گروپ کو اسلحہ فراہم کر رہے ہیں۔ اس اسلحے کا کچھ حصہ ضرور پاکستان واپس آئے گا اور خاص پاکستان سرحد کے دونوں جانب موجود ڈرگ مافیا کے منشیات کی حفاظت اور پیداوار کے لیے استعمال ہوگا۔ جنوبی ایشیا میں چھوٹے ہتھیاروں کی دوسری لہر سابق سوویت وسطی ایشیا کی سمت سے متوقع ہے جہاں اسلحے کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اور یہ مارکیٹ کی تلاش میں ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، ان دونوں متوقع خطرات کے سدباب کے سلسلے میں اب تک کچھ بھی نہیں کیا گیا ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یورپی یونین یا دوسرے ممالک جنوبی ایشیا میں چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے سلسلے میں کوئی موثر کردار ادا نہیں کر سکتے۔ جب ہم یورپ کی جانب سے آئرش لبریشن آرمی کو ہتھیاروں کی ترسیل روکنے میں کامیاب نہیں ہوئے تو علاوہ ازیں جنوبی ایشیا میں ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے کہیں زیادہ گمبھیر مسئلے کو حل کرنے کی کیا امید کر سکتے ہیں۔ خصوصاً جب کہ ان دو ملکوں کی خودمختاری کا معاملہ بھی درپیش ہوگا۔ لیکن میرا کہنا ہے کہ ہم ایسا سمجھتے ہیں کہ اس مسئلے کو بین الاقوامی ایجنڈے میں شامل کرنے پر اصرار کریں۔ چھوٹے ہتھیاروں کے مسئلے کو بھی اسی قدر اہمیت بین الاقوامی ایجنڈے میں حاصل ہونی چاہیے جتنی ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے مسئلے کو حاصل ہے۔ اس کے لیے جو کچھ اقدامات ہو سکتے ہیں ان پر غور کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ چھوٹے ہتھیاروں کو بھی اقوام متحدہ کے روایتی ہتھیاروں کے رجسٹر میں شامل کیا جائے۔ اس رجسٹر سے ہتھیاروں کی منتقلی کا کچھ اندازہ ممکن ہوتا ہے، اور ممکن ہے چھوٹے ہتھیاروں کے

معاملے میں یہ اس سے بھی کم موثر ثابت ہو، لیکن اس کے ذریعے سے کچھ نہ کچھ کنٹرول ضرور حاصل کیا جا سکے گا۔ ابھی تک تو ہم نے اس مسئلے کی سنگینی اور پھیلاؤ کا تخمینہ لگانے تک کی ہمت نہیں کی ہے۔

سرد جنگ کے خاتمے سے امریکا اور یورپی اتحادیوں کی طرف سے جنگ میں ان کی قائم مقامی کرنے والے کسی ملک کو ہتھیاروں کی فراہمی کا امکان کم ہو گیا ہے۔ اس لیے اب عالمانہ انداز کی اسلحے کی پابندی قائم نہیں ہو گی۔ اب، جب کہ یہ خطرہ دور ہو گیا ہے کہ کسی طرح کا کنٹرول عائد ہونے سے دشمن عالمی طاقت کی فتح کے امکانات بڑھ جائیں گے، یہ موقع ہے کہ چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے مسئلے پر بھرپور توجہ دی جائے۔

ایک طریقہ ایسا ہے جس سے یورپی ملک انفرادی طور پر براہ راست دنیا میں ہتھیاروں کی تعداد کم کرنے میں حصہ لے سکتے ہیں: اپنے کارخانوں میں تیار ہونے والے ہتھیاروں کی پیداوار اور فروخت کم کر کے۔ اگر — اور یہ بہت بڑا اگر ہے — ہتھیار تیار کرنے والے بڑے ملک اپنی پیداوار کم کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو دنیا میں ہتھیاروں کی کم تعداد دستیاب ہو گی۔ گولا بارود کی فروخت کم کرنا اس سے بھی زیادہ موثر طریقہ ثابت ہو سکتا ہے، کیوں کہ اس سے دنیا میں پھیلے ہوئے کچھ ہتھیار بے کار ہو جائیں گے — ظاہر ہے، کلاشنکوف کو کارتوسوں کے بغیر نہیں چلایا جا سکتا۔ لیکن موجودہ اقتصادی حالات میں، جن میں منافع باقی تمام مقاصد پر حاوی ہو جاتا ہے، اس بات کا امکان بہت کم ہے۔ برطانیہ میں ہتھیار بنانے والی کمپنیاں خریدنے والوں سے سرٹیفکیٹ کی قانونی پابندی کو بڑی آسانی سے نظر انداز کر دیتی ہیں۔ امریکا کی نیشنل رائفل ایسوسی ایشن کے دباؤ نے اس ملک کو ایک عظیم اسلحہ بازار بنا رکھا ہے۔ حال ہی میں وائٹ ہاؤس کے ترجمان نے بیان دیا کہ روایتی ہتھیاروں کی فروخت امریکی پالیسی کا ایک جزو ہے۔ اس پالیسی بیان کا مطلب دراصل یہ ہے کہ صدر کلنٹن کے خیال میں حکومت کو امریکی ملازمتوں اور تجارت کا تحفظ کرنے کے لیے اسلحہ تیار کرنے والی امریکی کمپنیوں کی پیداوار کو بیرونی ملکوں میں فروخت کرنے میں مدد دینے کے لیے ایک بھرپور مہم شروع کرنی چاہیے۔ میرے نزدیک ان ملکوں کا موقف یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ اگر ہم اسلحہ نہیں بیچیں گے تو کوئی اور بیچ دے گا۔

اس کتاب میں ہم نے جنوبی ایشیا میں پیش آنے والے تنازعات میں کارفرما نسلی اور مذہبی عوامل کا جائزہ لیا ہے جو چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ سے سنگین شکل اختیار کر چکے ہیں۔ لیکن میں ان مسائل کا حل پیش کرنے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ میری اپنی بات پوری نہیں ہوگی اگر ان تنازعات کی تہہ تک پہنچنا کہیں زیادہ ضروری نہیں کہ انہیں موجودہ طریقے سے حل کرنے پر توجہ دی جائے۔ اس کے بعد جنوبی ایشیا کے مرکزیت پسند ریاستوں نے ایک عظیم سیلاب کی صورت میں آج جس طرح کا سامنا کیا ہے، موجودہ تنازعات انھی صورت حال سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس صورت حال کی بات کرتے ہوئے میں یقینی طور پر کچھ حقوں میں ظاہر ہوتی ہے جو شہری آبادی، پانی، خوراک اور بنیادی ضروریات کی قلت، اور سب سے بڑھ کر بے روزگاری جیسے تشدد کو جنم دینے والی چیزوں سے...

[illegible] صنعتی اور دیہات [illegible] ہو چکے ہیں [illegible] نقل مکانی [illegible] بوجھ تلے دم توڑ رہے ہیں [illegible] ملکی معیشت [illegible] (demographic) آبادیاتی [illegible] ماحولیاتی اور معاشرتی [illegible] علامت [illegible] تحقیق [illegible] زیادہ بچوں [illegible] شامل کرنے جا رہیں گے [illegible] ماحولیاتی قلت کا مسئلہ ہے [illegible] بحرانی مسئلے پر [illegible] حلقوں میں [illegible] ماحول کا [illegible] تشکیل کی ایک پتھریلی دیوار کھڑی ہے۔

[illegible] حال سے کچھ [illegible] مسئلے [illegible] [illegible] حشیات کی نقل [illegible] مسئلے میں کوئی [illegible] [illegible] مغربی ممالک، کیا کر رہے ہیں؟ ہم [illegible] تحقیقات [illegible] اپنے اقدامات کرنے کا [illegible] [illegible] حقوق [illegible] اور جس کے باعث [illegible]

**

آج

خصوصی شمارہ

سرائیوو سرائیوو

شمارہ ۱۷ : خزاں ۱۹۹۴

۵۲۶ صفحات   قیمت ۱۰۰ روپے

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

کراچی کی صورت حال اس سنگین بحران کی نشان دہی کرتی ہے جس سے پورا پاکستان دوچار ہے، اور جس کی سنگینی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ شہری بد نظمی، تشدد، لسانی اور نسلی گروہوں کے باہمی تنازعات اور مہلک ہتھیاروں کی فراوانی جیسے عوامل کا الگ الگ جائزہ لینے کے بجائے ضروری ہے کہ اس بحران کا پورے ملک کے سماجی اور سیاسی حالات کے تناظر میں تجزیہ کیا جائے۔

اس شمارے کے مرکزی تجزیاتی مضمون میں، جو آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے، عارف حسن نے اپنے تجربے اور تحقیق کی بنیاد پر چند ایسے اہم نتائج اخذ کیے ہیں جو شہر اور ملک کے مسائل کو درست پس منظر میں سمجھنے اور ان کے حل کی سمت متعین کرنے میں بہت کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔

اس مضمون کا متن عارف حسن کے ۱۹۸۶ سے ۱۹۹۵ تک لکھے ہوئے مضامین اور ان کے ساتھ کیے گئے انٹرویو کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے۔ ان مضامین کی تفصیل یہ ہے:

1. "The Twilight of the Waderas" (*Herald*, August 1986).
2. "Karachi's Godfathers" (*Hearld* September 1986).
3. "The Profits of Doom" (*Herald*, January 1987).
4. "The MQM Factor" (*Herald*, March 1987).
5. "A Generation Comes of Age" (*Herald*, October 1987).
6. "Power and Powerlessness" (*Herald* February 1988).
7. "The MQM An Uncertain Future?" (*Herald*, December 1988).
8. "The Grand Compromise" (*Herald*, May 1989).
9. "The Sindh Cauldron" (*Herald*, June 1989).
10. "The Unresolved Conflict" (*Dawn*, 1992).
11. "Karachi and the Global Nature of Urban Violence" (*The Urban Age*, USA, Summer 1993).
12. "Is There a Way Out?" (*Herald* March 1995).
13. "Agreeing to Disagree", (*Herald*, April 1995).
14. "What is Karachi Really Fighting for?" (*Herald* September 1995).
15. "The State Structure and the Processes of Socio-Economic Change" (Habitat II NGO Country Report 1995)

کئی برس کے عرصے میں لکھے گئے ان مضامین میں جا بجا مختلف اعداد و شمار بھی پیش کیے گئے ہیں۔ ہماری درخواست پر عارف حسن نے جہاں تک ممکن ہوا، ان اعداد و شمار کو زمانہ حال کے مطابق کر دیا ہے۔ لیکن بہت سے معاملات پر ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ ان میں اہم ترین حقائق وہ ہیں جو مردم شماری ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں اور جب تک یہ سرکاری طور پر نہ کی جائے کوئی بھی تحقیق اس کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ اس نظر ثانی کے دوران یہ بھی انکشاف ہوا کہ شہر سے متعلق بہت سے سرکاری اعداد و شمار، جو چند سال پہلے تک بعض سرکاری محکموں کی لائبریریوں میں موجود تھے، اب دستیاب نہیں ہیں۔

Scanned with CamScanner

عارف حسن

انگریزی سے ترجمہ اور تدوین: افضال احمد سید

کراچی کی صورتِ حال — تناظر اور تجزیہ

۱۹۴۷ کے بعد سے، جب پاکستان وجود میں آیا، اس ملک میں بے حد اہم آبادیاتی (demographic)، معاشرتی اور اقتصادی تبدیلیاں وقوع ہوئی ہیں۔ یہ تبدیلیاں اتنے بڑے پیمانے پر ہوئی ہیں کہ انہیں انقلابی تبدیلیاں کہا جا سکتا ہے۔ تاہم، ان تبدیلیوں کو اب تک اداروں کی صورت نہیں دی گئی، بلکہ انہیں سیاسی عمل میں بھی شامل نہیں کیا گیا جو معاشرتی سائنس دانوں کے مطابق کسی معاشرے میں آنے والی تبدیلی کو ادارے کی صورت دینے کی شرطِ اول ہے۔ نتیجتاً، جس طرح ہمارے ملک کی تعمیر ہوئی ہے، جس طرح ہماری حکومتیں چلائی جاتی ہیں، ہمارا مالیاتی نظام کام کرتا ہے اور ترقیاتی منصوبوں کو نافذ کیا جاتا ہے، اس میں تبدیل شدہ آبادیاتی، معاشرتی، ثقافتی اور اقتصادی حقائق کی عکاسی نہیں ہوتی۔ ان تبدیل شدہ مگر غیر تسلیم شدہ حقائق کے دباؤ سے، ریاستی قوانین اور ضوابط کے باوجود، حکمرانی کے متوازی، غیر سرکاری نظام وجود میں آ گئے ہیں، ملکی آبادی کے بہت بڑے بڑے حصے سیاسی اور ثقافتی بے گانگی کا شکار ہو گئے ہیں، معاشرتی انتشار پھیل گیا ہے، مقننہ اور عدلیہ اپنے کام انجام دینے میں خود کو بے بس محسوس کرنے لگی ہیں، اور ہمارے پیوستہ مفادات رکھنے والے طبقوں کو یقین ہو چلا ہے کہ وقت بہت کم رہ گیا ہے جس کی وجہ سے لوٹ کھسوٹ اور ہیبت ناک اقدامات کا کلچر پاکستانی زندگی کے ہر پہلو میں سرایت کر گیا ہے۔

پاکستان میں رونما ہونے والی معاشرتی اور اقتصادی تبدیلیوں کے دو نمایاں ترین مظاہر ہیں: اول، جاگیرداری نظام کا ریاستی اسٹیبلشمنٹ کے موثر کردار کی حیثیت سے برقرار رہنا، اور دوم، شہروں کا تیزی سے پھیلنا۔

***

Scanned with CamScanner

جاگیرداری نظام کا زوال

جن علاقوں پر پاکستان کی موجودہ ریاست مشتمل ہے، وہاں انگریزوں کی آمد سے پہلے جاگیرداری نظام موجود و مضبوط طور پر قائم نہیں تھا۔ نوآبادیاتی حکومت نے زرعی زمین کے بڑے قطعات کی موروثی ملکیت کا وسیع نظام قائم کیا۔ اس سے جاگیرداری نظام اور نئے ابھرتے ہوئے بیوروکریسی کے ڈھانچے کے درمیان باہمی معاونت پر مبنی قریبی تعلق کی بنیاد رکھی جس کے تحت جاگیردار اور سرکاری اہلکار دونوں مل کر کام کرنے لگے۔

جاگیرداری نظام کی طاقت اور گرفت کا ایک اہم سبب دیہی معاشرے کا ذاتوں اور برادریوں میں منقسم ہونا بھی تھا۔ مختلف دیہی ذاتوں کے درمیان تعلق نقد لین دین کا نہیں بلکہ مال، اجناس اور خدمت سے باہمی تبادلے (barter) کا تھا۔ دیہی آبادی عمومی طور پر دو گروہوں میں منقسم تھی: زراعت پیشہ ذاتیں اور کاریگر ذاتیں۔ دیہی کاریگر صرف زراعت پیشہ لوگوں کی خدمت کے لیے تھے۔ دہقان یا زمین کی ملکیت ان کے لیے ممنوع تھی اور وہ اپنے موروثی پیشے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں کر سکتے تھے۔ کاریگروں کی پنچایتیں ہوتی تھیں جن کا انتظام گاؤں کے مقتدر لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ کسی تنازعے کی صورت میں ذاتوں اور برادریوں کے معاملات میں ان کا فیصلہ کراتے تھے اور معاشرے کے رکھوالے بن کر جاگیرداری نظام کے سرگروہ اور معاونت کرتے تھے۔

آزادی کے وقت پاکستان دیہی علاقوں پر مشتمل تھا۔ جاگیرداری نظام ان علاقوں میں مندرجہ ذیل کام سرانجام دیتا تھا:

(۱) طبقات اور برادریوں کے نظام کو بحال رکھنا؛

(۲) زرعی پیداوار کا انتظام کرنے، اور زراعت کے لیے درکار مزدور، سسٹم کو قائم رکھنے اور ترقی دینے میں معاونت کرنا؛

(۳) زرعی پیداوار کی تجارت اور صنعت پر بالواسطہ کنٹرول کرنا؛

(۴) ریاستی اداروں کی مدد سے اپنے علاقے میں نظم و ضبط قائم رکھنا؛

(۵) سرکاری محصولات کی وصولی کے لیے خدمت گزار رکھنا؛ اور

(۶) ریاستی انتظامیہ و سیاسی عمل یا انتخابات میں مطلوبہ نتائج کی ضمانت فراہم کرنا۔

جاگیرداری نظام یہ تمام کام ماضی میں نہایت موثر طور پر سرانجام دیتا رہا ہے، لیکن ملکی معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کے باعث اب یہ اس قابل نہیں رہا۔ اور اس کے غیر موثر ہو جانے سے ریاستی ڈھانچہ، جس کا یہ ایک بنیادی ستون تھا، تیزی سے اپنی طاقت سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ پاکستانی معاشرے میں یہ تبدیلیاں بعض اہم ریاستی اقدامات ہی کے

Scanned with CamScanner

منطقی نتائج کے طور پر رونما ہوئیں۔ آبپاشی کے نہری نظام کی توسیع، سبز انقلاب (Green Revolution) کی ٹیکنالوجی، زراعت میں مشینوں کے استعمال، سڑکوں اور ٹرانسپورٹ کی سہولتوں کی فراہمی — ان عناصر نے پاکستان کے دیہی علاقوں کو بنیادی طور پر تبدیل کر دیا۔ ان اقدامات کے نتیجے میں ہونے والی اضافی پیداوار اور نیز کیمیائی کھاد وغیرہ کی نقد خرید و فروخت کی بدولت گاؤں کی سطح پر بارٹر کے نظام کی جگہ نقدی کی معیشت نے لے لی اور یوں دیہی آبادی کے لوگوں کے لیے معاشرتی اور اقتصادی طور پر اپنے قبیلے، ذات اور برادری سے نکل کر ترقی کرنا ممکن ہو گیا، جس سے قبیلے، برادری اور ذات پات کا پرانا نظام ٹوٹ گیا اور خود کفیل گاؤں کا تصور ختم ہو گیا۔ کاریگر دستوں کے لوگ گاؤں سے نکل کر شہروں کی طرف آنے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کے شہروں میں صنعتیں قائم ہونا شروع ہوئیں جنھوں نے دیہات سے شہروں کو نقل مکانی کرنے والوں کو روزگار فراہم کیا۔ اضافی زرعی پیداوار کی فروخت کی ضروریات کے تحت چھوٹے شہروں اور منڈی قصبوں میں توسیع ہوئی۔ ۱۹۷۰ کے عشرے میں زرعی پیداوار کی نقل و حمل کے لیے سوزوکی پک اپ کا استعمال شروع ہوا جو بجائے خود ایک انقلابی پیش رفت تھی۔ اس نے زرعی اجناس کی فروخت کے قدیم طریقِ کار کو بدل کر رکھ دیا؛ اور منڈیوں کا محلِ وقوع بھی تبدیل کر دیا۔ منڈیوں کے پھیلنے کی وجہ سے بہت دور دور واقع ہونے سے دیہی آبادی کے افراد نے بڑے فاصلوں تک سفر کرنا شروع کیا۔

زرعی پیداوار اور نقل و حمل کے نئے ذرائع کو ایک جدید اور موثر سروس سیکٹر درکار تھا جو جاگیرداری نظام اور ریاست مہیا کرنے کے اہل نہیں تھے۔ چنانچہ یہ ضرورت پوری کرنے کے لیے ایک غیر رسمی (informal) سروس سیکٹر وجود میں آیا جو ٹریکٹر اور سوزوکی ڈرائیوروں، مکینکوں، کیمیائی کھاد، بیج اور کیڑے مار دوائیں فراہم کرنے والوں، زرعی اجناس کے آڑھتیوں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ پرانے دیہی نظام میں خدمت گزار دکاندار اور ہنرمند کاریگر تھے، مگر اب اپنے نئے کاموں کی نوعیت کے باعث شہری معیشت سے زیادہ سے زیادہ وابستہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس نئے طبقے کی قوت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۷۲ فیصد کاشتکار نقد، اشیا اور خدمات کی شکل میں ان سے قرض حاصل کرتے ہیں، اور زرعی پیداوار سے ان کا منافع کاشتکاروں کے منافعے کے مقابلے میں تین سے دس گنا تک زیادہ ہوتا ہے۔ نہری آبپاشی کے تحت آنے والے علاقوں کے سروے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۶۸ فیصد چھوٹے کاشتکار اپنی کھاد، کیڑے مار دواؤں، مشینی آبپاشی اور مشینی کاشت کاری کی ضروریات پوری کرنے کے لیے مقامی غیر رسمی لائٹ انجینئرنگ انڈسٹری اور کیمیائی انڈسٹری کی مصنوعات پر انحصار کرتے ہیں۔ ابھرتے ہوئے دیہی نظام میں یہ لوگ، جو پرانے دیہی نظام میں وجود نہیں رکھتے تھے، ایک طاقتور عنصر کے طور پر ابھر رہے ہیں، گو انھوں نے اپنی طاقت کا مظاہرہ ابھی پوری طرح نہیں کیا ہے۔

ان تبدیلیوں کے نتیجے میں جو نئے طبقے وجود میں آئے ہیں ان کے پاس کوئی قومی نظریہ اور سیاسی فلسفہ نہیں ہے۔ وہ صرف مادی فوائد اور معاشی ترقی کے لیے متحرک ہوتے ہیں۔ وہ قومی اور صوبائی

Scanned with CamScanner

حکومت میں حصہ نہیں لیتے، مگر لوکل کاؤنسلوں کے انتخابات میں سرگرم ہیں اور کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ وہ اس مقصد کے لیے کوشاں ہیں کہ ضلعی انتظامیہ کا اختیار ان کے حوالے کر دیا جائے۔

* * *

عام خیال کے برخلاف، پنجاب کا معاشرہ جاگیردارانہ نہیں ہے۔ اس صدی کے آغاز میں انگریزوں نے وسطی پنجاب میں دنیا کا سب سے بڑا آبپاشی کا نظام قائم کیا جس نے لاکھوں ایکڑ بنجر ریگستانی زمینوں کو سرسبز کھیتوں میں تبدیل کر دیا۔ پنجاب کے زیادہ گنجان آباد مشرقی حصے کے کسان حکومت کی ترغیب پر وسطی پنجاب کو منتقل ہوئے۔ ان کی واحد وفاداری حکومت کے ساتھ تھی۔ اتنی بڑی زرعی پیداوار کے پیدا ہونے سے ٹرانسپورٹ کا نظام، منڈیاں، آڑھتی، دلالی، درمیانے اور ریونیو کی وصولی کرنے اور سرکاری محکمے قائم رکھنے والے ادارے وجود میں آئے۔ تعلیمی اداروں کے فروغ کی ذمہ داری حکومت نے لے لی۔ گو پنجاب کے زمینداروں میں بھی چودھری موجود تھے، مگر لوگوں پر ان کے اختیار کی نوعیت سندھ کے وڈیروں، سرحد کے ملکوں اور بلوچستان کے سرداروں سے مختلف تھی جو پیداوار کے ذرائع پر بھی مکمل کنٹرول رکھتے تھے۔

آبپاشی کے اس عظیم نظام کی تعمیر کے لیے مشرقی پنجاب سے انجینئر اور سرحد کے مزدور بلوائے گئے اور مقامی لوگوں کے لیے تکنیکی تربیت کے ادارے قائم کیے گئے۔ بیس سال کے عرصے میں ایک لاکھ سے زیادہ ہنرمند افراد مہیا ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم پنجاب کے کاریگروں، بالخصوص ویلڈروں اور فیکٹری کنٹرولروں کو ۱۹۳۰ کے عشرے سے ہندوستان بھر میں کام کرتے ہوئے پاتے ہیں۔

ان حالات کے تحت، اور کسی مضبوط سیاسی پروگرام کی غیر موجودگی میں، یہ فطری عمل تھا کہ پنجاب کے متوسط طبقے نے ضلعی انتظامیہ پر، اور یہاں کے سرکاری اہلکاروں، بیوروکریٹوں اور پولیس افسروں نے چھوٹے صوبوں کی انتظامیہ پر بھی، کنٹرول حاصل کر لیا۔ ۱۹۳۰ کے عشرے میں سکھر بیراج کی تعمیر کے وقت پنجابی ٹھیکیدار، کاریگر اور تکنیکی ماہر سندھ میں بھی داخل ہو چکے تھے اور آبپاشی کے نظام کی دیکھ بھال کے لیے وہیں رہ گئے تھے۔ بیراج بننے کے بعد پنجاب کے کاشتکاروں کی ایک بڑی تعداد بیراج کے علاقے میں آباد ہوئی تھی۔

۱۹۶۰ کے عشرے میں ایوب خان کے سبز انقلاب کا پنجاب پر بہت اہم اثر پڑا۔ دھان اور گندم کی نئی قسموں کی کاشت شروع ہوئی، ٹیوب ویلوں کی تنصیب اور زراعت میں مشینوں کے استعمال کی بدولت ترقی کی رفتار بڑھی۔ شرح اضافہ ۱۹۵۰ کے عشرے میں ایک فیصد سے کچھ ہی زیادہ تھا، ۱۹۶۰ کے عشرے میں پانچ فیصد تک جا پہنچی۔

سبز انقلاب کے نتیجے میں زراعت پر بڑے زمینداروں کی اجارہ داری قائم ہوئی، کیونکہ زرعی

پیداوار میں استعمال ہونے والے اخراجات کے لیے قرضے صرف بڑے زمینداروں ہی کو میسر تھے۔ چھوٹے کاشتکاروں کی مالی حالت خراب ہوتی گئی اور انہیں اپنی زمینیں بڑے کاشتکاروں کو فروخت کرنی پڑیں۔ مشینوں کے استعمال کے باعث بے زمین کسانوں اور دیہی بے روزگاروں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ زراعت کی جدید کاری سے بڑے زمینداروں کو بھاری منافع ہوا اور انہوں نے اس کا خاصا بڑا حصہ شہری معیشت میں لگایا۔ صرف ۱۹۶۴-۶۵ کے سال میں ساڑھے تین ارب روپے سے زیادہ سرمایہ دیہی علاقوں سے شہروں کو منتقل ہوا۔ ان اسباب کی بنا پر لوگوں کو پنجاب کے دیہات سے نکل کر شہروں کا رخ کرنا پڑا۔

لیکن سبز انقلاب کے نتیجے میں پنجاب کی سیاست میں جو تبدیلی واقع ہونی چاہیے تھی، وہ نہیں ہوئی۔ اس کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں:

(۱) دیہی علاقوں میں آمدنی میں اضافے کے ساتھ ساتھ پنجاب کے تاجروں اور ہنرمند کاریگروں نے اپنی سرگرمیوں کو وسیع کیا اور مشینی زراعت کی مختلف ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لائٹ انجینئرنگ کی صنعتیں قائم ہوئیں۔ ان صنعتوں کا دائرہ بڑھنے لگا اور رفتہ رفتہ آلات جراحی، کھیلوں کی اشیا اور دوسری صارفانہ مصنوعات کے کارخانے وجود میں آئے۔ یہ تمام چھوٹے پیمانے کی صنعتیں حکومت کی جانب سے کسی قسم کی حوصلہ افزائی یا مدد کے بغیر قائم ہوئیں۔

(۲) پاکستانی فوج کی نفری میں اضافہ ہوا اور پنجاب کے لوگوں کی بڑی تعداد کے لیے فوج میں گنجائش نکلی۔

(۳) پنجاب سے ہنرمند کاریگروں نے بڑی تعداد میں یورپ اور مشرق وسطیٰ کو نقل مکانی کی۔

(۴) پنجاب کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد روزگار کی تلاش میں سندھ منتقل ہوئی۔

***

سندھ کا دیہی معاشرہ ۱۹۶۰ کے عشرے کے وسط سے پہلے تک مکمل طور پر جاگیردارانہ تھا۔ وڈیرے اور جاگیردار تمام زرعی زمینوں کو کنٹرول کرتے تھے۔ پنجاب کے برعکس، سندھ میں خودمختار کسان نہ ہونے کے برابر تھے۔ بڑھئی، حجام، چٹائیاں بنانے والے، چمڑا صاف کرنے والے وغیرہ اپنی خدمات کی اجرت گاؤں کے دوسرے لوگوں سے چاول یا گیہوں کی صورت میں حاصل کرتے تھے۔ کپڑا دیہات میں کھڈیوں پر بنا جاتا، بیل گاڑیوں پر لاد کر قصبوں تک لایا جاتا اور دوسری اشیا کے بدلے فروخت کیا جاتا۔ جوتے کسی کسی کو میسر تھے اور پینے کا پانی کچے کنوؤں اور نہروں سے حاصل کیا جاتا تھا۔

زمیندار ہاریوں کی زندگی اور موت پر اختیار رکھتا تھا۔ وہ ان سے اپنی ضرورت کے لیے بیگار لیتا، ان کے پاس صرف اتنی پیداوار رہنے دیتا جس سے وہ صرف بمشکل زندہ رہ سکیں۔ اس کے علاوہ تمام پیداوار ہاریوں سے لے لی جاتی۔ مزاحمت کرنے والوں کو سخت سزائیں جھیلنی اور جرمانے بھرنے پڑتے۔

زمینداروں کے علاوہ قبائلی سردار اور مذہبی پیر بھی استحصال میں شریک تھے۔ قبائلی سردار اپنی برادری کے لوگوں سے ناجائز ٹیکس وصول کرتے، اور ان کے عوض ان کے باہمی تنازعوں کا فیصلہ کرتے اور قصورواروں کو سزائیں دیتے۔ پیر دیہاتیوں کے توہمات کو ہوا دے کر ان کا استحصال کرتے۔ مرید اپنے پیروں کو باقاعدگی سے نذرانے دیتے اور تمام مذہبی اور نجی معاملات میں ان سے مشورہ لیتے۔ بیشتر پیر مذہبی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ زمیندار بھی تھے، اور اس طرح ان کے تسلط کے خلاف آواز اٹھانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

دیہی علاقوں کی آمدنی کے سرچشمے پر جاگیرداری نظام کے مؤثر کنٹرول کی وجہ سے ریاستی انتظامیہ نے خود کو نظم و ضبط قائم رکھنے کی ذمہ داری سے بری کر رکھا تھا۔ حکومت سے تمام معاملات میں مقامی وڈیروں سے مشورہ اور مدد طلب کی جاتی اور اس کے عوض وڈیروں کی قانون شکنی کو نظرانداز کیا جاتا۔ یہ قانون شکنی، یا دوسرے زمینداروں کو بےدخل کرنے، حق شفع غصب کرنے، انہیں سزائیں دینے اور حق انسانی حقوق کی تلفی کرنے جیسی باتیں، جن میں سے بہت سی وہی تھیں جن کی خلاف ورزی کرنے پر مشتمل ہوتی تھی۔ وڈیرا ریاستی انتظامیہ کو علاقے میں امن و امان اور شورش نہ ہونے کی ضمانت فراہم کرتا اور یوں قانون شکنی اور پولیس ایک پورے سلسلے کو کنٹرول بخشی تھی۔ آبپاشی اور نکاسی کی نہریں وڈیروں کے مہیا کردہ بیگار کے مزدوروں کی مدد سے چلائی جاتیں۔ سرکاری محکموں کے لیے مقامی مزدوروں کو راغب کرنا بہت کام دشوار ممکن نہیں تھا۔ وڈیرا انہیں اجازت نہ دیتا، قرض کے عوض یا دوسروں کے کھیتوں میں کام کرنے سے ان کے مزدوروں کی عادتیں خراب ہوں، اس لیے اکثر اوقات سرکاری محکموں کو ملک کے دوسرے حصوں سے مزدور منگوانے پڑتے۔

وڈیرا ہاریوں کے ووٹوں کو کنٹرول کرتا اور ریاستی انتظامیہ کو انتخابات میں مطلوبہ نتائج فراہم کرتا۔ دیہی آبادی کے اکثریت میں ہونے کے باعث شہری علاقوں میں مخالفانہ نتائج بے اثر ہو جاتے۔ دیہی علاقوں میں وڈیرے کی مرضی کے خلاف ووٹ دینا ممکن نہیں تھا۔ نظام سے بغاوت کرنے والے کو بےدخل کر دیا جاتا اور اس کے پاس ہونے کے کوئی راستہ نہ بچتا، سوائے اس کے کہ جنگل میں جا کر ڈاکو بن جائے۔

سندھ میں ہائی ویز نہ ہونے کے سبب پختہ سڑکیں نہیں تھیں اور حمل و نقل کا انحصار بیل گاڑیوں اور اونٹوں کے کاروانوں پر تھا۔ اس طرح شہری منڈیوں تک رسائی کم تھی اور فاضل زرعی پیداوار کے لیے کوئی مارکیٹ نہیں تھی۔ مثال کے طور پر کراچی کے لیے اجناس دادو یا لاڑکانہ کی بہ نسبت پنجاب سے حاصل کرنا زیادہ آسان تھا۔ کاٹن جننگ اور دھان چھڑنے والے کام بڑے شہری مراکز میں مشینی طور پر کیے جاتے تھے۔ شہری مصنوعات دیہی منڈیوں تک نہیں پہنچ پاتی تھیں۔ دیہات میں اسکول، ہسپتال اور ڈسپنسریاں نہیں تھیں اور ٹیلی کمیونیکیشن کی سہولتیں بہت کم تھیں۔

ان حالات میں درمیانہ طبقے کا دیہی علاقوں سے ابھر کر شہری معیشت سے تعلق قائم کرنا ناممکن

میں تو سخت دشوار تھا۔ اس طرح لوکل اتھارٹی اور پنجابی کاروباری طبقوں نے بڑے زمینداروں، وڈیروں اور ریاستی نظامیہ کے ساتھ مل کر دیہی سندھ کی صورت حال کو برقرار رکھنے میں مدد دی۔

ایوب خان کے دور میں کئی نئے تصورات اور منصوبے سندھ میں متعارف کرائے گئے: خاندانی منصوبہ بندی، دیہی ترقیاتی پروگرام، بنیادی جمہوریتیں، سڑکوں کی تعمیر، چھوٹی صنعتوں کی تنصیب، زرعی ترقیاتی بینک وغیرہ۔ چونکہ دیہی آبادی کے شعور کو بلند کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، ان پروگراموں کا جو حصہ جاگیرداروں کے حق میں جاتا تھا اس پر عمل ہوا اور دوسرے حصے رد کر دیے گئے۔ پھر بھی ان پروگراموں کا دیہی معاشرت پر کچھ اثر ہوا۔ چھوٹے جاگیرداروں اور خاندانوں کے لڑکے بڑی تعداد میں تعلیم حاصل کرنے کراچی، لاہور اور حیدرآباد گئے۔ ان میں سے کئی سرکاری محکموں میں کام کرنے لگے۔ بہت سے لوگ خلیجی ممالک میں کام کرنے گئے اور نئے خیالات اور تحریکوں سے متعارف ہوئے۔ ۱۹۶۵ کی پاک بھارت جنگ نے قوم پرستی کے نظریات کو ابھار دیا اور دیہات کے بہت سے لوگ باہر کی دنیا سے آگاہ ہوئے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام اور اس کی عوامی سیاست نے ۱۹۶۷ سے ۱۹۷۱ تک چلائی ہوئی سیاسی تحریک نے سندھ کے دیہی علاقوں میں بہت سی تبدیلیوں کی بنیاد رکھی۔ اب وڈیرے اور بڑے زمینداروں کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی۔ ان علاقوں کی بڑی تعداد نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ بھٹو کے اقتدار میں آنے کے بعد سندھ میں ترقیاتی منصوبے شروع کیے گئے اور کسان طبقے کو سہولتیں دی گئیں۔ روزگار کے مواقع پیدا ہوئے، سکولوں اور کالجوں کا قیام ہوا۔ دیہی سندھ کے بہت سے طلبا تعلیم کے لیے شہر گئے۔ دیہی سندھ کے لوگوں کو روزگار کے مواقع ملے اور دیہی اور شہری علاقوں کے لوگ ایک دوسرے کے قریب ہوئے۔ ان تبدیلیوں کی وجہ سے سندھ کا درمیانہ طبقہ وسیع ہوا اور اس نے ابھرتی ہوئی طاقت حاصل کی۔ یہ تبدیلیاں جاگیرداری نظام کے لیے مہلک تھیں۔

اب وسیع اور چھوٹی تبدیلیوں کے نتیجے میں تنازعات کا پیدا ہونا فطری تھا۔ بھٹو دور میں یہ اختلافات دو عوامل کی وجہ سے دب گئے تھے۔ پہلا یہ کہ ان تبدیلیوں کے طویل مدتی مضمرات ان سے متاثر ہونے والوں کی پوری طرح سمجھ میں نہیں آئے تھے، اور دوسرا یہ کہ حکومت میں شامل جاگیردار ان تبدیلیوں کو اپنی نگرانی میں پروان چڑھا رہے تھے۔ ۱۹۷۷ میں ضیا الحق کے مارشل لا کے اقتدار میں آنے کے بعد یہ عوامل کارگر نہیں رہ سکے۔ جولائی میں فوج کے اقتدار پر قبضہ کرنے اور اکتوبر میں اعلان کردہ انتخابات منسوخ کرنے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ وڈیرے ریاستی نظامیہ کو انتخابات میں مطلوبہ نتائج دلانے کے اہل نہیں رہے تھے اور، چند ایک کو چھوڑ کر، پیپلز پارٹی سے سیاسی طور پر علیحدہ ہو چکے تھے۔

مارشل لا کے تحت سندھ کے وڈیرے اپنی سیاسی قوت اور پارٹیوں پر کنٹرول کھو بیٹھے تھے اور ریاستی نظامیہ سے ان کے رشتے کی نوعیت بدل گئی تھی۔ مارشل لا سے سندھ کا درمیانہ طبقہ بھی متاثر ہوا تھا کیونکہ اسے ریاست کی سرپرستی حاصل نہیں رہی تھی۔ ۱۹۶۰ کے عشرے کے وسط میں شروع ہونے والی تبدیلیاں اپنے راستے پر آگے بڑھ رہی تھیں، لیکن سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کے

Scanned with CamScanner

باعث مختلف طبقوں [illegible] انتظامیہ کے درمیان عمل [illegible] مقصود [illegible] انتظامیہ کے [illegible] سرگرمیوں کو
ہونے سے لیے [illegible] میں کوئی [illegible] سے فاصلہ بڑھتا گیا اور [illegible] کے ساتھ
[illegible] کا [illegible] کی [illegible] ہوتا گیا۔ ۱۹۸۳ کی بحالی جمہوریت
کی تحریک [illegible] کا نقطہ عروج تھی۔ [illegible] تحریک میں [illegible] درمیانہ طبقوں نے [illegible] حصہ لیا، اور
[illegible] تحریک [illegible] درمیانہ طبقے کو توقع سے زیادہ سیاسی حمایت
[illegible] ہے۔ [illegible] شدت [illegible] زیادہ [illegible] خاص [illegible] کے بھیجے
ہونے [illegible] مقامات پر [illegible] کی [illegible]
[illegible] سے زیادہ [illegible] تحریک سے [illegible] انتظامیہ میں [illegible]
[illegible] کا [illegible] علاقوں میں بھی [illegible] ہونے [illegible]
[illegible] سندھ کے کچھ علاقوں میں فوجی [illegible] کے
[illegible] مجبور کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ [illegible]
[illegible] سیاسی [illegible] کوشش کی [illegible] کوشش [illegible]
یا خود بھی ڈاکو بن گئے۔

[illegible] درمیانہ طبقے کی [illegible] طاقت اور [illegible] کی صورت [illegible] سندھ کے
[illegible] مسئلے [illegible] پہلے سے
[illegible] تھی [illegible] زندگی [illegible]
[illegible] بعض [illegible] پانی [illegible]
[illegible] تھے۔ [illegible]
[illegible] ہوئی [illegible] کے لیے [illegible]
[illegible] تعلق سے وابستہ ہونے والی [illegible] سندھ میں
[illegible] حفاظت کے لیے [illegible] تھے، ڈکیتیوں
[illegible] اسمبلی کے مقامی
[illegible] رہی ہیں۔

[illegible] مشکل ہو [illegible]
[illegible] طاقت [illegible] تعلقات [illegible] چھوٹے
[illegible] تھے، [illegible] جاتے [illegible]
[illegible] نقل مکانی کرتے تھے۔ [illegible] کے لیے
[illegible] درمیان [illegible] حیثیت رکھتا
[illegible] پیدا ہونے [illegible]

کرنے کے لیے متعدد دیہات میں لوگوں نے اپنی تنظیمیں بنائی ہیں اور انہیں فلاح و بہبود کی تنظیموں کے طور پر رجسٹر کرایا ہے۔ ان کے منتخب عہدے دار اسکولوں اور ڈسپنسریوں کے قیام، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر اور پانی اور نکاس کی سہولتوں کی فراہمی کے لیے مقامی سرکاری محکموں پر دباؤ ڈالتے ہیں۔ وہ غیر سرکاری تنظیموں اور پیشہ ور لوگوں سے رابطہ قائم کرکے تکنیکی مشورے اور امداد حاصل کرتے ہیں اور گاؤں میں اور اس کے اردگرد امن قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض تنظیموں نے اپنے طور پر علاج اور تعلیم کے ادارے قائم کیے ہیں۔ چند مقامات پر انھوں نے یونین کاونسلوں کے انتخابات میں علاقے کے وڈیروں کو شکست بھی دی ہے۔

یہ دیہی تنظیمیں ابھی تعداد میں کم ہیں لیکن رفتہ رفتہ ان میں اضافہ ہونا ناگزیر ہے، کیوں کہ اس وقت سندھ کی معاشرتی تبدیلیوں کے اظہار کا کوئی اور طریقہ دستیاب نہیں۔ انہیں اس کا پورا شعور ہے کہ ان کی کامیابی کی کلید یونین کاونسلوں پر اقتدار حاصل کرنا ہے۔

اس اثنا میں سندھ کی صورت حال مسلسل خراب ہوتی چلی جائے گی جب تک جاگیرداری نظام کے خاتمے کو اداروں کی شکل نہیں دی جاتی اور اقتصادی اور معاشی تبدیلیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نئے طبقوں کو ان کی قوت کے مطابق سیاسی عمل میں شامل نہیں کیا جاتا۔

***

شہری مراکز میں تبدیلیاں

ملک کے بڑے اور چھوٹے شہری مراکز میں بھی تبدیلیوں کی رفتار دیہی علاقوں سے مختلف نہیں تھی۔ ۱۹۵۱ میں پاکستان کی کل آبادی کا ۱۸ فیصد (۶۵ لاکھ) لوگ شہروں میں رہتے تھے۔ ۱۹۹۸ میں آبادی کے شہری تناسب کا تخمینہ ۳۰ فیصد (چار کروڑ) تک پہنچ چکا ہے، اور ۲۰۱۱ میں اس کے ۵۰ فیصد (۹ کروڑ ۸۳ لاکھ) تک جا پہنچنے کی توقع ہے۔ تاہم، ایک طرف پینے کے پانی کی فراہمی، گندے پانی کے نکاس، کوڑے کرکٹ (solid waste) کو ٹھکانے لگانے کے بندوبست، ٹرانسپورٹ، تعلیم اور علاج کی سہولتوں، اور دوسری طرف مکان بنانے کے لیے زمین، قرضے اور تکنیکی معاونت کی فراہمی میں شہری آبادی کے بڑھنے کی رفتار سے اضافہ نہیں ہوا۔ شہروں میں کم وسائل رکھنے والے طبقے کی (جو شہری آبادی کا ۸۰ فیصد ہے) بڑی اکثریت کی رہائش، ٹرانسپورٹ، تعلیم اور علاج کی ضروریات دلالوں اور تاجروں پر مشتمل غیر رسمی سیکٹر پوری کرتا ہے۔ یہ غیر رسمی سیکٹر چھوٹے کاروباروں کے لیے اگرچہ شرح سود پر قرضے بھی دیتا ہے اور (سرکاری اور غیر سرکاری) رسمی سیکٹر کے مقابلے میں زیادہ روزگار بھی فراہم کرتا ہے۔

اس طبقے کو پاکستانی جمہوریت کے سانچے میں ڈھالنے کا واحد طریقہ اسے بااختیار بنانا ہے۔ معاشرے میں ہونے والی ہمہ گیر اور وسیع تبدیلیوں کا تقاضا ہے کہ ضلعی انتظامیہ کے فرائض اس طبقے کے منتخب نمائندوں کے سپرد کیے جائیں اور کاؤنسلیں اپنے محصولات وصول کرنے اور استعمال کرنے میں آزاد ہوں۔ اسی طرح ان تبدیلیوں کے پیش نظر یہ ضروری ہو گیا ہے کہ شہری علاقوں میں مقامی انتظامیہ، ترقیاتی اداروں، ریونیو کے محکموں، پولیس وغیرہ کو شہروں کی منتخب میونسپل کمیٹیوں اور کارپوریشنوں کا ماتحت بنایا جائے۔ ملکی سطح پر یہ ضروری ہے کہ اس طبقے کی معاشی اور معاشرتی سرگرمیوں کو سہولت اور ترقی دینے کی پالیسیاں اور قوانین بنائے جائیں۔ مختصر یہ کہ وقت کا تقاضا ہے کہ پاکستانی معاشرے میں آنے والی ان تبدیلیوں کو تسلیم کیا جائے اور قومی سیاسی نظام اور اداروں کا حصہ بنایا جائے۔ البتہ اب تک اس کے آثار نظر نہیں آتے۔ ریاست کے اداروں کا رویہ ہنوز ان تبدیلیوں کی راہ روکنے کا رہا ہے، جس سے تشدد اور غیر جمہوری رجحانات کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ اس رویے کی دو واضح مثالیں قومی مردم شماری اور بلدیاتی انتخابات کے مسلسل التوا سے ملتی ہیں۔ گزشتہ مردم شماریوں کے نتائج اور آبادیاتی رجحانات (demographic trends) پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کل مردم شماری (جسے ۱۹۹۱ میں ہونا تھا اور اب تک نہیں ہوئی ہے) کے نتائج سے پاکستان کے، بالخصوص صوبہ پنجاب کے، شہری اور دیہی علاقوں کے درمیان اسمبلیوں کے حلقوں کی تقسیم وسیع پیمانے پر تبدیل ہو گی جس سے قومی اور صوبائی سطح کی سیاست پر جاگیردار طبقے کی گرفت کمزور ہو جائے گی۔ اس کا ایک اور اہم نتیجہ سالانہ ترقیاتی پلان (Annual Development Plan) میں بنیادی تبدیلی کی صورت میں رونما ہو گا، اور ترقیاتی رقمیں، جو اب تک قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے اراکین کے کنٹرول میں رہتی ہیں، بڑی حد تک بلدیاتی اداروں کی تحویل میں چلی جائیں گی۔

***

پاکستان کے بڑے شہروں میں بھی معاشرے کی ان تبدیلیوں کے مظاہر واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس وقت شہری آبادی کی اکثریت غیر رسمی، کچی آبادیوں میں رہتی ہے۔ یہ آبادیاں کسی سرکاری منصوبہ بندی کے بغیر بنی ہیں اور انھیں شہری سہولتیں — پینے کا پانی، گندے پانی کا نکاس، بجلی، ٹرانسپورٹ، کوڑے کرکٹ کے انتظام، تعلیم، علاج، قرضہ وغیرہ — سرکاری یا پرائیویٹ رسمی سیکٹر کی طرف سے فراہم نہیں کی گئی ہیں۔ مافیا کے انداز میں کام کرنے والا ایک غیر رسمی سیکٹر کم آمدنی والے اس شہری طبقے کو رہائش، زمین، مکان بنانے اور چھوٹا کاروبار کرنے کے لیے سودی قرضے، ٹرانسپورٹ اور روزگار فراہم کرتا ہے، جب کہ صحت اور تعلیم کی خدمات ایک غیر معیاری پرائیویٹ سیکٹر کی طرف سے مہیا ہوتی ہیں۔ اندازوں کے مطابق ۷۰ فیصد شہری آبادی سے ربط

(unregularised) سیکٹروں میں کام کرنے سے متعلق [illegible] اور [illegible] میں [illegible] طلاق نہیں ہوئی۔ پاکستان کی شہری آبادی میں [illegible] کی شرح ۸.۰۳ فیصد سالانہ تصور کی جاتی ہے، مگر غیر رسمی سیکٹر ۵ فیصد سالانہ کی شرح سے ترقی کر رہا ہے اور یہ شرح مسلسل بڑھ رہی ہے۔

شہری علاقوں میں ہونے والا یہ معاشی اور معاشرتی انقلاب ہے جس کے باعث برادری اور قبیلے سے روایتی تعلقات کی جگہ مقامی سطح کے جدید رشتے پیدا ہو رہے ہیں۔ معاشی دباؤ اور شہری کلچر نے عورتوں کو عام طور پر نچلی آمدنی والی آبادیوں میں، گھروں کے باہر کام کرنے پر مائل کر دیا ہے۔ ایک [illegible] پسند [illegible] نے [illegible] کی جگہ لے رہا ہے۔ نچلی آمدنی والی آبادیوں سے [illegible] والے کاؤنسلر میونسپل اداروں میں [illegible] وقت سے [illegible] رہے ہیں۔ دوسری طرف حکومت، سیاسی جماعتیں اور مافیاں ان تبدیلیوں کا ساتھ دینے [illegible] عمل میں ان تبدیلیوں کے خلاف رکاوٹیں [illegible] کا باعث ہوتے ہیں۔ [illegible] نوجوانوں کی دوسری نسل اور بعض صورتوں میں تیسری نسل [illegible] ہو چکی ہے۔ یہ نسل [illegible] سے تعلق [illegible] چکی ہے اور شہری [illegible] پیدا ہو گئی ہے۔ موجودہ نظام [illegible] شہری تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر [illegible] ہے۔ اگر اس صورت حال کی مناسبت سے [illegible] کام نہیں ہوئے تو انتشار کا پھیلنا ناگزیر ہے۔

* * *

ریاست کی ناکامی

پاکستانی معاشرے میں آنے والی یہ تبدیلیاں صرف نچلی سطحوں پر ظاہر ہوئی ہیں۔ [illegible] حکومتی اداروں، دانشوروں، سیاست دانوں، سیاسی پارٹیوں وغیرہ نے ان معاشرتی تبدیلیوں کو سمجھنے اور [illegible] میں [illegible] کی کوشش نہیں کی ہے۔ نتیجتاً معاشرے کی بدلی ہوئی حقیقت اور ریاست [illegible] کے درمیان ایک خلیج پیدا ہو گئی ہے جو روز بروز وسیع ہوتی جا رہی ہے۔

[illegible] کی بدقسمتی [illegible] ملک میں سیاست کے نام پر [illegible] رہی ہے۔ [illegible] کی سطحوں پر [illegible] پسندی اور استحصال کے خلاف جدوجہد کی جگہ [illegible] استحصال کر [illegible] رجعت پسندی اور استحصال [illegible] ملک کے سماجی اور اقتصادی مسائل کی بحث کی حیثیت [illegible] اور سرگرمیوں کے [illegible] اہمیت حاصل کر لی ہے۔ [illegible] کی تسکین اور [illegible]

چکی ہیں اور حکمرانوں کے طور طریقے مارشل لا دور کی یاد دلانے لگے ہیں۔ عوام کی بڑھتی ہوئی بے کلی اور بیزاری کا سبب ملک کے معاشرتی حقائق اور سیاسی سرگرمی کے درمیان بہت بڑی خلیج ہے۔ سیاسی مبصر اس خلیج کے وجود کے مختلف اسباب بیان کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ منتخب حکومت کے پاس ناکافی اختیارات ہیں اور اس کے باوجود اسے یوں ظاہر کرنا پڑ رہا ہے جیسے اسے تمام اختیارات حاصل ہوں۔ مگر وہ یہ نہیں بتاتے کہ منتخب حکومت کو ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے پر کون مجبور کر رہا ہے۔ بعض لوگ اس صورت حال کا سبب حکومت کے کلیدی عہدوں پر فائز شخصیات کی ناتجربہ کاری اور خام کاری کو ٹھہراتے ہیں جس کے باعث انہیں بیوروکریسی پر قابو پانے میں مشکل ہو رہی ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ منتخب حکومت اپنی کمزوری کے باعث جان بوجھ کر ایسے فیصلے کرنے سے گریز کر رہی ہے جو طاقتور مفادات رکھنے والے حلقوں کی برہمی کا سبب بنیں۔

موجودہ سیاسی حالات کا فوری سبب کچھ بھی بیان کیا جائے، ایک بات یقینی ہے: اس صورت حال کی جڑیں مارشل لا کے گیارہ سالہ دور، اس دور میں بحالی جمہوریت کی تحریک کی نوعیت اور نتائج، اور جنرل ضیا کی موت کے بعد انتخابات کرانے اور منتخب حکومت کو حکومتی اختیارات سونپنے کے فیصلے کی وجوہ میں تلاش کرنی ہوں گی۔ روایتی طور پر پاکستان کی فوجی اور سول بیوروکریسی کو جاگیردارانہ نظام کی حمایت اور اعانت حاصل رہی ہے؛ اور ان تینوں کے اتحاد سے وہ شے ظہور میں آئی جسے اسٹیبلشمنٹ کہا جاتا ہے۔ چوں کہ دیہی آبادی غالب اکثریت رکھتی تھی اس لیے شہری علاقوں میں اٹھنے والی اختلافی آوازوں کو آسانی سے دبا لیا جاتا رہا۔ ۱۹۷۰ کے انتخابات کے نتیجے میں ایک نئی صورت حال سامنے آئی جب دو مقبولیت پسند (populist) پارٹیاں — مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی — منتخب ہوئیں۔ عوامی لیگ اور اسٹیبلشمنٹ کے درمیان مفاہمت نہ ہو پانے کے باعث ۱۹۷۱ میں پاکستان کا اکثریتی صوبہ علیحدہ ہو گیا۔ بقیہ پاکستان میں پیپلز پارٹی کی مقبولیت پسند سیاست نے اسٹیبلشمنٹ کو قانونی اور اخلاقی جواز کا وہ پردہ فراہم کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی جس کے پیچھے فوجی اور سول بیوروکریسی اور جاگیردارانہ نظام کا یہ اتحاد اپنے اختیارات کا استعمال پوری طرح جاری رکھ سکے۔ کسی مقبولیت پسند سیاسی قوت اور روایتی طور پر قدامت پسند (اور ملکی وسائل کے بڑے حصے پر قابض) اسٹیبلشمنٹ کے درمیان مفاہمت بہترین حالات میں بھی زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوتی۔ جولائی ۱۹۷۷ میں لگائے جانے والے مارشل لا کو زیادہ سامنے کے عناصر سے قطع نظر اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔

جنرل ضیا کے گیارہ سالہ دورِ حکومت میں پاکستان کی سیاست، اسٹیبلشمنٹ اور مقبولیت پسند سیاسی قوت کے درمیان ایک مسلسل کشمکش کے سوا کچھ نہیں تھی۔ مقبولیت پسند قوت حکومت کا تختہ الٹنے کے درپے تھی، جبکہ اسٹیبلشمنٹ اس قوت کو غیر اہم بنا کر اپنے آپ کو بااختیار حکومت ثابت کرنے کے لیے کوشاں تھی۔ دونوں فریق اپنا اصل مقصد حاصل کرنے میں ناکام رہے، اور اس کشمکش نے ہر قدم

Scanned with CamScanner

پر دونوں کو اپنے اپنے اصل موقف میں تھوڑی بہت ترمیم کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۸ میں جونیجو حکومت کی برطرفی کے ساتھ یہ تعطل اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ ۱۹۷۷ کے بعد کی سیاست میں جنرل ضیا کے ذاتی کردار کے باعث اس تعطل کا کوئی حل نکالنا ناممکن تھا، جہاں پر اگست ۱۹۸۸ کے ہوائی حادثے نے یہ موقع فراہم کیا کہ ۱۹۷۱ کے بعد کے پاکستان کی ان دو بڑی قوتوں کے درمیان کسی طرح کا تصفیہ ہو سکے۔ اسٹیبلشمنٹ اور مقبولیت پسند سیاسی قوت کے درمیان اس مفاہمت کی تفصیلات کے بارے میں صرف قیاس آرائی کی جا سکتی ہے، لیکن اس مفاہمت کے نتیجے میں ان دونوں قوتوں کے درمیان تعطل کو تسلیم کر کے ملک کے سیاسی نظام کا حصہ بنا دیا گیا اور نومبر ۱۹۸۸ کے انتخابات کے ذریعے اسے قانونی حیثیت دے دی گئی۔ اس مفاہمت میں دونوں قوتوں کو ان کی طاقت اور کمزوری کے اسی تناسب سے حصہ دیا گیا ہے جس کے باعث یہ تعطل پیدا ہوا تھا۔ تاہم، ان دونوں قوتوں کے درمیان یہ رشتہ جامد نہیں ہے بلکہ دونوں ایک دوسرے کو کمزور کر کے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے مسلسل کوشاں ہیں۔ آنے والے برسوں میں پاکستان کی ملکی سیاست کے خدوخال متعین کرنے میں یہی کش مکش سب سے زیادہ اہم عنصر رہے گی۔

مارشل لا کے گیارہ سالہ دور میں ان دونوں قوتوں کو اپنا اپنا مقصد حاصل کرنے میں جو ناکامی ہوئی اس کے اسباب پر نظر ڈالنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ گزشتہ چند عشروں کے دوران پاکستانی معاشرے میں آنے والی ان اہم تبدیلیوں کے باعث جن کا خاکہ اوپر پیش کیا گیا ہے، جاگیرداری نظام، اسٹیبلشمنٹ کی مؤثر حمایت کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے۔ ملک کی شہری آبادی میں نمایاں اضافہ ہو گیا ہے اور اسی تناسب سے دیہی علاقوں کی قوت میں کمی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ زراعت کے پیداواری طریقوں میں ہونے والی تبدیلیوں کے باعث دیہی علاقوں میں بھی کاریگروں، چھوٹے تاجروں اور دکانوں پر مشتمل ایک درمیانہ طبقہ وجود میں آ چکا ہے۔ ان معاشرتی تبدیلیوں کے باعث مجلس شوریٰ میں نامزد ہونے اور غیر جماعتی انتخابات میں منتخب ہونے والے جاگیردار اسٹیبلشمنٹ کو وہ مؤثر حمایت فراہم نہیں کر سکے جو روایتی طور پر ان کا مقصد رہا ہے۔ مقبولیت پسند قوت کی ناکامی کی وجوہ اس سے زیادہ پیچیدہ ہیں۔ اس قوت کی قیادت ایسے افراد کے ہاتھوں میں تھی جن کے مادی اور طبقاتی مفادات اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ جلد از جلد کسی قابل عمل مفاہمت پر پہنچنے کا تقاضا کرتے تھے، اور اگر اسٹیبلشمنٹ کی بعض کلیدی شخصیات نے بھٹو کے مقدمے اور ان کی موت کے سلسلے میں ذاتی طور پر نمایاں کردار ادا نہ کیا ہوتا تو یہ مفاہمت، جو ۱۹۸۸ میں ہوئی، بہت پہلے ہو چکی ہوتی۔ دوسری وجہ مقبولیت پسند قوت میں اتحاد کی کمی تھی، اور اس عدم اتحاد کو ہوا دینے کے سلسلے میں اسٹیبلشمنٹ نے بہت کوششیں اور بہت رقم صرف کی۔ یہ کوششیں اس حد تک کامیاب تھیں کہ ہم نے اسلام آباد کی فوجی حکومت کو علاقائی قوم پرستوں تک کی حمایت کرتے ہوئے دیکھا۔ ان دونوں وجوہ سے کسی وسیع تر جمہوری اتحاد کے قیام کی راہ مسدود کر دی اور یہ تحریک اپنے ابتدائی چار نکاتی ایجنڈے سے آگے کبھی نہ جا سکی۔ جہاں چہ ضیا حکومت کے خلاف

تحریک صرف انتخابات کے مطالبے تک محدود رہی اور ملک کے معاشی مسائل کبھی اس ایجنڈے کا حصہ نہ بن سکے۔ اس پس منظر میں یہ تعجب کی بات نہیں کہ پاکستان میں گیارہ سالہ آمریت مخالف تحریک نے جیسے ہیومن رائٹس کمیشن اور ویمن ایکشن فورم جیسی تنظیمیں تو ضرور دیں لیکن وہ مزدوروں، کسانوں اور چھوٹے تاجروں کو سیاسی طور پر منظم اور متحرک کرنے میں ناکام رہی۔ اور یہ بھی فطری بات تھی کہ جب ۱۹۸۸ میں مقبولیت پسند قوت اور اسٹیبلشمنٹ کے درمیان مفاہمت کا موقع آیا تو اس کے نکات انہیں مسائل تک محدود رہے جو بحالیِ جمہوریت کی تحریک کے ایجنڈے میں شامل رہے تھے، اور معاشی مسائل کو ترجیح حاصل نہ ہو سکی۔

اس مفاہمت کی ترجیحات سے قطع نظر، اس وقت پاکستان کو جن مسائل کا سامنا ہے وہ بنیادی طور پر معاشی نوعیت ہی کے مسائل ہیں۔ آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ ضروریات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے جبکہ وسائل تیزی سے کم ہو رہے ہیں۔ ہر سال قومی آمدنی میں سے کیے جانے والے ترقیاتی اخراجات کا تناسب کم ہو رہا ہے اور اسٹیبلشمنٹ پر کیے جانے والے غیر ترقیاتی اخراجات بڑھ رہے ہیں۔ ۱۹۷۷ میں محصولات کا ۲۹ فیصد حصہ ترقیاتی اخراجات کے لیے رکھا گیا تھا، جبکہ ۱۹۸۷ میں یہ شرح گھٹ کر صرف ۱۳ فیصد رہ گئی۔ اسٹیبلشمنٹ کی ان ترجیحات کے پیشِ نظر ملک میں آنے والی ہمہ گیر معاشرتی تبدیلیوں کو سیاسی نظام کا حصہ بنانا ناممکن ہے، اور اس صورتِ حال کا نتیجہ سماجی انارکی میں اضافے اور انتظامیہ کے رفتہ رفتہ غیر موثر ہوتے چلے جانے کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ یہی ترجیحات ہماری خارجہ پالیسی اور قرض دینے والے ممالک سے ہمارے تعلقات کی نوعیت کو بھی متعین کرتی ہیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے اسٹیبلشمنٹ سے مفاہمت کر کے خود کو پاکستانی عوام کی سیاسی رہنمائی کرنے اور ملک میں آنے والی معاشرتی اور اقتصادی تبدیلیوں کو اداروں کی شکل دینے کے عمل سے دست کش کر لیا ہے۔ شاید اس پارٹی کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ پیپلز پارٹی کی قیادت، بشمول اراکینِ پارلیمنٹ، خود کو ان فوائد سے محروم کرنے کو ہرگز تیار نہیں جو اقتدار میں آنے سے حاصل ہوتے ہیں، خواہ یہ اقتدار جزوی ہی کیوں نہ ہو۔

***

سندھ کے شہروں کی صورتِ حال

کراچی اور حیدر آباد کی موجودہ صورتِ حال کا عمرانیات اور معاشیات کے ماہروں، سیاسی لیڈروں اور حکومتی کمیشنوں نے اپنے اپنے طور پر تجزیہ کیا ہے۔ ان تجزیوں کے نتائج مختلف ہیں۔ سب سے زیادہ

Scanned with CamScanner

عام تصور یہ ہے کہ کراچی کے تنازعے کا باعث شہری سہولتوں — مثلاً ٹرانسپورٹ، پانی، رہائشی زمین، مکانوں کے لیے قرضے، نکاسیِ آب، علاج اور تعلیم — کا فقدان ہے۔ اس تجزیے میں یہ محسوس کیا گیا ہے کہ اگر حکومت یہ سہولتیں فراہم کر سکے تو یہ تنازعہ اور لسانی یا نسلی نوعیت کے دیگر مسائل ختم ہو جائیں گے۔

ایک اور خیال یہ ہے کہ کراچی اور حیدرآباد میں بے چینی اور بدامنی کا بڑا سبب بے روزگاری ہے جو شمالی صوبوں کے لوگوں کے نقل مکانی کر کے ان شہروں میں آنے سے پیدا ہوئی ہے۔ اس تنازعے کا باعث پنجابی عدد رکھنے والی انتظامیہ اور پولیس کو بھی ٹھہرایا جاتا ہے۔ سیاسی لیڈروں کا کہنا ہے کہ کراچی اور حیدرآباد کی شورش مارشل لا کے گیارہ برسوں کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ ایک گروہ یہ سمجھتا ہے کہ تصادم کی یہ فضا کچھ شرپسندوں کی پیدا کی ہوئی ہے اور کراچی اور حیدرآباد کی زیادہ تر آبادی امن پسند شہریوں اور نیک مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ یہ گروہ ان شرپسندوں کو بیرونی ایجنٹ سمجھتا ہے۔

اگر حکومت کی جاری کی ہوئی سالانہ رپورٹ (Yearbook)، مردم شماری کی رپورٹوں، اعداد و شمار اور غیر جانبدار ماہرین کی ریسرچ پر اعتبار کیا جائے تو سندھ کے شہروں کی عمومی صورت حال بہتر ہوئی ہے۔ ۱۹۷۲-۷۳ کے مقابلے میں بے روزگاری کم ہے، ٹرانسپورٹ کی سہولتیں موجود ہیں اور لوگوں کو بس یا ٹیکسی، رکشا کے لیے، دس سال پہلے کے برعکس، اب گھنٹوں انتظار نہیں کرنا پڑتا۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ کچی آبادیاں — جہاں کراچی کے ۴۰ فیصد سے زیادہ شہری رہتے ہیں — ریگولرائزیشن کا حق تسلیم کرا چکی ہیں۔ اسکول جانے والے بچوں کی تعداد ۱۹۷۰ کے عشرے کے مقابلے میں بڑھی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹروں، نرسوں اور ہسپتالوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ مکانوں میں پانی، بجلی اور نکاسیِ آب کی سہولتیں بہتر ہوئی ہیں اور پختہ سڑکیں تعمیر ہوئی ہیں۔

اگرچہ کراچی اور حیدرآباد کے بہت سے علاقوں میں صورت حال آج کے مقابلے میں پہلے کہیں زیادہ خراب تھی مگر احتجاج کی کوئی لہر نہیں اٹھتی تھی۔ بجلی کی معطلی، ٹرانسپورٹ کی کمی، کچی آبادیوں کے ڈھائے جانے، پانی کی شدید قلت یا انتظامیہ کے پروردہ غنڈوں کے مظالم کے خلاف کوئی خاص ردعمل نہیں تھا۔ کراچی اور حیدرآباد میں احتجاج ملک گیر سیاسی تحریکوں کے دوران قومی سطح کے مسائل پر ہوا کرتا تھا۔ ان تحریکوں میں قومی سطح کے لیڈر (اکثر معاوضہ یافتہ کارکنوں کے ذریعے جو علاقے کے دادا گیر کہلاتے تھے) عوام کو سڑکوں پر لے آتے تھے؛ اس ہجوم کا اتحاد تحریک کے ختم ہو جانے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا تھا۔ مگر آج ہجوم اپنے لیڈر خود پیدا کرنے لگا ہے اور لیڈرشپ تبدیل ہو جانے کے بعد بھی متحد رہتا ہے۔ عوامی احتجاج سے نمٹنے کے لیے حکومت کے روایتی طریقے، جو ۱۹۸۰ کے عشرے تک بہت کارآمد تھے، موجودہ شورش کو غیر موثر بنانے میں قطعی ناکام ہو چکے ہیں۔ اس تبدیلی کے پس منظر کو بہت احتیاط کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

Scanned with CamScanner

کراچی میں ہونے والے شہری تشدد کی وجوہ دنیا کے بہت سے ترقی پذیر اور ترقی یافتہ شہروں میں پائے جانے والے تشدد کے اسباب سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں: شہروں کی آبادی میں تیز رفتار اضافہ، شہری باشندوں کی ایک نئی، نوجوان نسل، شہری انتظامیہ کی نااہلی اور بدعنوانی، اور اس کے نتیجے میں ایک بہت بڑی آبادی کی بنیادی شہری سہولتوں سے محرومی۔ شورش پیدا کرنے والے ان اسباب کو ایک دوسرے سے الگ رکھ کر نہیں سمجھا جا سکتا کیوں کہ یہ تمام ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں۔ مثلاً کراچی کے موجودہ تنازعات کو سمجھنے کے لیے ۱۹۴۰، ۱۹۵۰ اور ۱۹۶۰ کے عشروں میں نقل مکانی کر کے شہر میں آنے والی آبادیوں کی تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔ ۱۹۴۷ اور ۱۹۴۹ کے درمیانی عرصے میں اردو بولنے والے چھ لاکھ مہاجر تقسیم ہند کے نتیجے میں شہر میں آئے، جس کے باعث نہ صرف شہر کی زبان اور کلچر بدل کر رہ گیا بلکہ پہلے سے مقیم آبادی پیش منظر سے ہٹ گئی۔ ۱۹۵۰ کے عشرے کے آخر اور ۱۹۶۰ کے پورے عشرے میں سبز انقلاب کے نتیجے میں شہر میں آنے والوں کی ایک اور بڑی لہر پیدا ہوئی جو شہر کے مزدور طبقے میں شامل ہوئے۔ یہ لوگ پنجابی اور پشتو بولتے تھے اور ان کی سیاسی وفاداریاں سندھ کی مقامی آبادی کے بجائے اپنے آبائی صوبوں کے ساتھ تھیں۔ شہری زندگی کے دباؤ سے ان تمام آبادیوں کے باہم اختلاط کے مظاہر دنیا کے دوسرے بڑے شہروں کے مظاہر سے مشابہ ہیں۔ اس اختلاط سے مختلف قسم کے تضاد پیدا ہوئے جن کی نوعیت طبقاتی اور معاشی ہونے کے علاوہ لسانی، نسلی اور ثقافتی بھی تھی۔ کراچی کی صورت حال کا ایک خاص عنصر یہ ہے کہ نقل مکانی کر کے شہر میں آنے والوں کی دوسری نسل اب جوان ہو چکی ہے۔ یہ نسل کراچی کو اپنا شہر اور شہر کی سیاست اور انتظام میں شمولیت کو اپنا حق سمجھتی ہے۔ شہر کی انتظامی ایجنسیاں شہر میں آنے والوں کو بنیادی سہولتیں فراہم کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ تخمینے کے مطابق شہر کی آبادی کا تقریباً نصف حصہ کچی آبادیوں میں رہتا ہے جو کسی سرکاری منصوبہ بندی کے بغیر غیر رسمی سیکٹر کے ہاتھوں وجود میں آئی ہیں۔ اس صدی کے آخر تک اس تناسب کے ۷۰ فیصد تک پہنچنے کی توقع ہے۔ ان کچی آبادیوں میں رہنے والے رہائشی زمین، پانی، نکاس کے نظام، تعلیم، روزگار اور علاج کی سہولتوں کے سلسلے میں شہری انتظامیہ کی توجہ اور اعانت سے محروم ہیں اور ان تمام شعبوں میں غیر رسمی سیکٹر پر انحصار کرتے ہیں جس کا دائرہ اثر، اور نتیجتاً اس کی طاقت، شہری انتظامیہ کے مقابلے میں مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ شہری انتظامی ایجنسیاں نااہل ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت بدعنوان بھی ہیں اور غیر رسمی سیکٹر کے کارندوں کے ساتھ سرکاری اہلکاروں کے تعاون سے شہر میں جبری رشوت اور بھتے کی وصولی کا ایک سخت استحصالی نظام قائم کر رکھا ہے جس کی گرفت شہر کی غریب اور نچلی درمیانہ آمدنی کے باشندوں کے لیے روز بروز ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے۔

Scanned with CamScanner

۱۹۹۵ کے غیر سرکاری تخمینے کے مطابق سندھ کی شہری آبادی صوبے کی آبادی کا ۴۸.۰۵ فیصد حصہ ہے۔ سندھ کی آبادی کا تقریباً ۴۰.۲ فیصد حصہ کراچی اور حیدرآباد میں رہتا ہے۔ ملک کی کل دیہی (زرعی) پیداوار کے ۶۸ فیصد حصے کی کھپت شہری علاقوں میں ہوتی ہے، جبکہ صوبہ سندھ کی کل دیہی پیداوار کا ۷۷ فیصد حصہ شہری آبادی استعمال کرتی ہے۔ بینکوں میں جمع کی جانے والی رقم کا ۷۸ فیصد حصہ شہری علاقوں سے، اور شہری علاقوں سے جمع کرائی جانے والی رقم کا ۷۰ فیصد صرف کراچی شہر سے آتا ہے۔

صوبہ سندھ کا ٹرانسپورٹ کا نظام پچھلے بیس سال میں انقلابی طور پر تبدیل ہو چکا ہے۔ باربرداری کے لیے اونٹ گاڑیوں، گدھا گاڑیوں اور بیل گاڑیوں کی جگہ سوزوکی اور ڈاٹسن پک اپ اور لوگوں کے سفر کرنے کے لیے بسوں نے لے لی ہے۔ ان میں سے بیشتر گاڑیاں صوبے کے شہری مرکزوں میں رہنے والوں کی ملکیت ہیں اور وہی ان کو چلانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ اسی طرح صوبے کی زرعی پیداوار کے لیے کیمیائی کھاد ایک لازمی جزو بن گئی ہے؛ اگرچہ یہ کھاد دیہی علاقوں میں تیار کی جاتی ہے، اس صنعت کی تکنیکی مہارت، انتظام اور فروخت وغیرہ کا انحصار شہری علاقوں پر ہے۔ زرعی پیداوار میں مشینوں کے استعمال نے بھی اس پیداواری عمل کا شہری علاقوں پر انحصار بڑھا دیا ہے۔

شہری اور درآمد کردہ مصنوعات — مثلاً کپڑوں، جوتوں، چائے، سگریٹ، الیکٹرونکس کی مصنوعات وغیرہ — کی دیہات میں فروخت کے ذریعے ہر سال ۳ ارب روپے شہروں میں آتے ہیں، اور دیہی زمینیں شہری صنعت کار خرید رہے ہیں۔

***

شہریوں کی نئی نسل

ان تمام حقائق سے، خصوصاً سندھ میں، جو تصویر ابھرتی ہے، اس کی عکاسی حکومت کے ترقیاتی پروگراموں، ریاست کے انتظامی طریقوں، یا بڑی سیاسی جماعتوں کے رویے، پروگرام اور تنظیمی ساخت سے نہیں ہوتی۔ پاکستان کے موجودہ سیاسی بحران کا یہ ایک بڑا سبب ہے۔ کراچی اور حیدرآباد میں پائی جانے والی شورش اور سندھ کے قصبوں میں جاگیرداری کلچر سے تصادم (لسانی مسئلے سے قطع نظر) ان معاشرتی اور اقتصادی تبدیلیوں کی علامت ہیں۔ اس طبقاتی گروپ کے ممبروں میں ۱۴ سے ۳۰ سال تک کی عمر کے لوگ شامل ہیں۔ اس نسل کے لوگ بھی، اس کی نظریات، رویوں اور سوچ سے اپنا تعلق توڑ کر تیزی سے جدید شہری تصورات اپناتے جا رہے ہیں۔

کراچی کی تقریباً ۳۶ فیصد آبادی ۱۴ سے ۳۰ سال تک عمر کی نئی نسل پر مشتمل ہے۔ اس نسل کے ۸۰ فیصد لوگ کراچی ہی میں پیدا ہوئے ہیں، اور ان میں سے بیشتر کے والدین کی نوجوانی کا زمانہ کراچی میں گزرا ہے۔ اس عمر کے ۷۴ فیصد افراد خواندہ ہیں، جبکہ کراچی میں عمومی طور پر خواندگی کی شرح ۵۵ فیصد اور پورے پاکستان میں تقریباً ۲۶ فیصد ہے۔ اس نسل میں لڑکیوں کی خواندگی کی شرح لڑکوں سے صرف ۶ فیصد کم ہے، جبکہ عورتوں اور مردوں میں خواندگی کی شرح کا فرق کراچی میں ۱۲ فیصد (لاہور میں ۱۵ فیصد) اور پورے ملک میں یہ فرق تقریباً ۱۹ فیصد ہے۔ کراچی کی اس خواندہ نئی نسل کے تقریباً ۲۸ فیصد افراد میٹرک پاس اور ۲۲ فیصد سے زیادہ گریجویٹ ہیں۔ اس نسل کا جاگیرداری نظام اور اس کی معیشت اور ثقافت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان لوگوں نے جاگیرداروں اور ان کے نظام کو صرف ٹیلی وژن پر یا فلموں میں دیکھا ہے۔

اس نئی نسل کی لغویات بدل چکی ہیں۔ ۱۴ سے ۳۰ سال تک کے اس گروپ میں کوئی خود کو "تابعدار" یا "نیازمند" نہیں کہتا، ان میں سے کسی کے "مائی باپ" نہیں ہیں (لیاری کے علاقے میں بھی نہیں)، یہ لوگ "مصاحب" یا "مرید" نہیں ہیں۔ "سفارش"، جسے روایتی طور پر ایک معاشرتی قدر سمجھا جاتا ہے، ان کی لغویات میں ایک گندہ لفظ ہے۔ وہ اپنے لیڈروں کو "صاحب"، "حضور" یا "سائیں" نہیں بلکہ "بھائی" اور "چاچا" کہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں محبوب واضح طور پر صنفِ مخالف سے تعلق رکھتا ہے۔

دوسری طرف جن انتظامی ایجنسیوں، خصوصاً نفاذِ قانون کی ایجنسیوں، سے اس نسل کے افراد کا ہر قدم پر سابقہ پڑتا ہے، ان کے اہلکار "تابعدار" اور "نیازمند" ہیں، ان کے "مائی باپ" بھی ہیں اور وہ سفارش کو اعزاز سمجھتے ہیں۔ اس طرح جنگ کی صف بندی قطعی طور پر واضح ہو گئی ہے۔

ماضی میں سرکاری انتظامیہ امن و امان قائم رکھنے کے لیے محلے کے موذنوں اور عزت داروں کو بلا کر ان سے امن کے برقرار رہنے کی ضمانت حاصل کر لیا کرتی تھی۔ لسانی اور نسلی طور پر ہم آہنگ علاقوں میں (مثلاً کراچی کی ابتدائی کچی آبادیوں میں) پنچایت یا برادری کے بزرگ، اور نئی مخلوط آبادیوں میں زمین پر قبضہ کر کے ان آبادیوں کے باشندوں کو پلاٹ فراہم کرنے والے لوگ اس سلسلے میں موثر ثابت ہوتے تھے۔ کراچی کے مشرقی علاقے کی غریب بستیوں میں ۸۷-۱۹۸۶ کی کشیدگی سے یہ بات عیاں ہو گئی کہ روایتی موذنوں اور عزت داروں کا علاقے کے نوجوانوں پر کنٹرول باقی نہیں رہ گیا ہے۔ ان کی بزرگی اور مقام کو اسی طرح حقارت سے دیکھا جاتا ہے جیسے زمینوں کے قبضہ گیر اور ڈومیسائل اور سرکاری انتظامیہ کے دلال سمجھے جاتے ہیں۔ جہاں تک پنچایتوں اور برادریوں کا تعلق ہے، وہ کراچی کے مقامی لوگوں کے لیے بہت عرصہ ہوا ختم ہو چکی ہیں۔ البتہ شمالی علاقوں سے آنے والوں میں قبائلی نظم و ضبط، برادری کے بزرگ اور جرگہ جیسے ادارے اب تک موجود ہیں۔

کراچی میں ۱۴ سے ۳۰ برس تک کے نوجوانوں کی کثیر تعداد صنعتی مزدوروں یا یومیہ اجرت حاصل کرنے والوں پر نہیں بلکہ سفید کار ورکروں اور ہنرمند کاریگروں پر مشتمل ہے جن کا تعلق

Scanned with CamScanner

ٹرانسپورٹ انڈسٹری یا سروس سیکٹر سے ہے۔ اس نسل کے افراد کی ایک بڑی تعداد کا اپنا ذاتی روزگار ہے، جس میں دکان دار، چھوٹی مصنوعات بنانے والے اور کنٹریکٹر شامل ہیں۔ وہ بستیاں جہاں یہ لوگ رہتے ہیں، ۱۹۶۰ کے عشرے کی ابتدائی کچی آبادیوں اور رہائشی سکیموں کی طرح طبقاتی طور پر ہم آہنگ نہیں ہیں۔ ڈاکٹر، بینک ملازم، یومیہ اجرت پر کام کرنے والے، مزدور اور صنعتی کاریگر سب ایک ہی گلی میں رہتے ہیں، کیوں کہ مکان بنانے کے لیے باقاعدہ پلاٹ کی قیمت نچلی درمیانہ آمدنی کے ان خاندانوں کی استطاعت سے باہر ہے۔

مختلف طبقوں اور پیشوں کے ایک دوسرے پر اثرانداز ہونے کی بدولت ان محلوں میں ہر قسم کی بے شمار تنظیمیں قائم ہوئی ہیں۔ ان میں سماجی بہبود کی تنظیمیں، لائبریریاں، اسپورٹس اور ہیلتھ کلب، ڈرامیٹک سوسائٹیاں، نعت خواں گروپ، تعلیمی ادارے، تاجروں اور کاریگروں کی تنظیمیں اور ۱۹۸۰ کے عشرے کے نصف آخر کی منشیات مخالف تنظیمیں شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر تنظیموں کا انتظام نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے۔

شہر کے نچلی درمیانہ آمدنی والے علاقوں میں سیاسی طنزیہ ڈرامے اور ورائٹی پروگرام ہوتے ہیں؛ یہ ڈرامے وغیرہ، پیش کش اور مکالموں میں کراچی کی متمول سوسائٹیوں کے سنجیدہ اور فکرانگیز ڈراموں سے مختلف ہیں۔ پاپ سنگر لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد ان تنظیموں سے نکلی ہے۔ اسی طرح کامیڈین اور فنکار بھی ان تنظیموں سے آئے ہیں۔ کچی آبادیوں میں اسپورٹس کلب ہیں جنھوں نے قلیل وسائل کے باوجود قومی سطح کے کھلاڑیوں کی کوچ کی حیثیت سے خدمات حاصل کیں اور بعض دفعہ قومی کھلاڑیوں پر مشتمل فٹ بال اور ہاکی ٹیموں کو شکست دی۔ اس گروپ میں موسیقار، قوال، شاعر اور پیشہ ور مقرر بھی شامل ہیں۔

ان تنظیموں سے نکلنے والے کھلاڑیوں اور آرٹسٹوں کو حکومت کی سرپرستی حاصل نہیں ہے، چناں چہ ان کی سرکاری میڈیا تک رسائی یا کھیلوں کی قومی ٹیموں میں شمولیت تقریباً ناممکن ہے۔ ان تنظیموں کی تعلیمی سوسائٹیوں کو، خواہ وہ متعدد اسکولوں کو چلا رہی ہوں، حکومت کی طرف سے کوئی اعانت نہیں ملتی۔ اس کا سبب بتاتے ہوئے کراچی میں رہنے والے ایک ٹیچر حامد حسین نے کہا: "ہم نچلی درمیانہ آمدنی والے طبقے کے لوگ ہیں۔ ہمارا جاگیرداروں یا سرمایہ داروں سے یا کلفٹن، سوسائٹی یا ڈیفنس میں رہنے والے ان کے خدمت گاروں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پاکستان پر حکمرانی یہی لوگ کرتے ہیں۔ اگر ہم ان کے منظورِ نظر ہوتے تو ہماری بھی سرپرستی کی جاتی۔ صرف ہمارے درمیان سے اٹھنے والی قیادت ہی ہمیں ہمارے حقوق دلوا سکتی ہے۔"

آرٹسٹوں، کھلاڑیوں اور مدرّسوں کے علاوہ وہ طالب علم بھی دل شکستہ ہیں جو امتحانوں میں عمدہ نمبر حاصل کرنے کے باوجود پیشہ ورانہ کالجوں میں داخلے حاصل نہیں کر سکے، اور اسی طرح وہ گریجویٹ بھی جو کوٹا سسٹم کے باعث بے روزگار ہیں۔ انہیں علم ہے کہ کوٹا سسٹم کچھ عرصے کے لیے ہمارے

سندھی بھائیوں کو درکار ہے،' ایک بے روزگار انجینیر کمال زیدی کہتا ہے۔ 'لیکن اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ داخلہ یا ملازمت جاگیردار کے لڑکے کو دی جائے وڈیرے کے لڑکے کو نہیں، تو ہماری قربانی بے کار گئی۔' وہ یہ بھی کہتا ہے کہ 'ہمارے لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ سرکاری ادارے، خاص طور پر پولیس، باصلاحیت اور ایماندار ہوں۔ ہم امیروں کی طرح انہیں رشوت نہیں دے سکتے ہیں۔ وہ تعلقات کے ذریعے ان پر دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ اگر ہماری نمائندگی ہم جیسے لوگوں نے نہیں کی تو حالات کبھی تبدیل نہیں ہوں گے۔ دیہی علاقوں کے لوگ اپنی دیہی اقدار کے ساتھ شہری معاشرے کا نظم و نسق چلانے کے اہل نہیں ہیں۔ تجربے نے ہمیں یہی سکھایا ہے۔'

کراچی کے فعال لوگوں میں ایسے نوجوانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو مختلف تنظیموں سے منسلک رہے ہیں۔ انہوں نے کسی نہ کسی شکل میں اپنے علاقے اور اپنے معاشرے کی ترقی کے لیے جدوجہد کی ہے۔ انہوں نے پولیس کو منشیات مخالف تنظیموں کو کچل کر ختم کرتے دیکھا ہے۔ انہوں نے سرکاری اداروں کی بدعنوانی، نااہلی اور ظلم کا سامنا کیا ہے اور اس کے پیچھے اصل طاقتوں کو پہچانا ہے۔ یہاں تک کہ کراچی کی روایتی تاجر سوسائٹیوں کے نوجوانوں نے بھی اپنے قدامت پرست والدین کے خلاف بغاوت کی ہے اور ہجوم کا حصہ بن گئے ہیں۔ مقامی انتظامیہ کے ساتھ ان کی جنگ نہ صرف طاقت کے حصول کی بلکہ اقدار کی جنگ بھی ہے۔

لیاقت آباد کے ایک نوجوان کی نظم اس صورت حال کو بہت اچھی طرح پیش کرتی ہے:

وردی والے دیہاتی درندے نے ہم کو روکا
اور پوچھا کہ کون ہے موٹر سائیکل پر
پیچھے بیٹھی ہوئی
میرا خون کھولا
جی چاہا کہ اپنا خنجر اس کے پیٹ میں ڈبو کر
اس کی آنتوں کا ہار اس کی گردن میں ٹانگوں
پر تیرے ہاتھ کے اشارے نے مجھے کو روکا
اور میں نے کہا "میری بہن ہے"
ذلت کے آنسو بہاتا میں گھر کو لوٹا

کرفیو، پولیس کے بہیمانہ رویے، بلاجواز گرفتاریوں اور تشدد نے نوجوانوں اور انتظامیہ کے درمیان تصادم کو بڑھا دیا ہے۔ تاہم ناظم آباد کی ایک نوعمر شادی شدہ لڑکی کرفیو لگنے کا خیر مقدم کرتی ہے۔ اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر وہ کہتی ہے:

میں تمہاری ماں سے باتیں کر رہی تھی
اور تم گلی میں میرا انتظار
کرفیو کا
تمہارے گھر رکنے کا بہانہ مل گیا

کراچی کی پسماندہ بستیوں کی نسل ملک بھر میں آج تک سڑکوں پر آنے والے ہجوموں میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور باشعور ہے۔ یہ ہجوم اپنے لیڈر، نظریہ ساز اور حکمت عملی کے ماہر خود پیدا کر رہا ہے۔ ۱۹۸۰ کے عشرے کے آخری برسوں میں شہر کے مختلف علاقوں میں ابھرنے والی امن کمیٹیوں اور محلہ کمیٹیوں نے رہنماؤں کے بیانات سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ہجوم اپنے مسائل کو قومی اور طبقاتی مسائل کے تناظر میں دیکھنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔

اس ہجوم کا سب سے منظم حصہ ایم کیو ایم کی لیڈر شپ کی حمایت کرتا ہے۔ ایم کیو ایم کے وجود میں آنے سے جہاں ایک طرف کراچی، حیدر آباد اور صوبے کے چھوٹے شہروں کے مہاجر نوجوانوں کو تشخص کا احساس ملا ہے، وہیں دوسری طرف اس سے شہروں کی آبادی لسانی گروہوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ایم کیو ایم کے حامیوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ تقسیم پہلے سے موجود تھی کیوں کہ شمال سے نقل مکانی کر کے آنے والوں کا رہائشی بستیوں سے رشتہ مقامی آبادی کے رشتے سے مختلف ہے۔ شہری آبادی میں یہ تقسیم ایم کیو ایم کی مہاجر کی تعریف سے پیدا ہوئی۔ ایم کیو ایم نے مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آنے والوں کو ـــ جن کی اکثریت اردو بولتی ہے اور معاشرتی اور ثقافتی طور پر دوسرے مہاجروں سے مختلف نہیں ـــ علیحدہ کر دیا۔ ایم کیو ایم کی تعریف کے مطابق مہاجر وہ لوگ ہیں جو ہندوستان کے non agreed علاقوں سے آئے ہیں۔ اس تعریف کے باعث شہری تحریکیں کمزور پڑ گئی ہیں کیوں کہ مشرقی پنجاب سے آنے والوں کی ایک بڑی تعداد سندھ میں موجود ہے۔

دیہی سندھ کی سیاست پر سندھی قوم پرستی کا غلبہ ہے اور اس بات سے قطع نظر کہ سندھی بولنے والا نوجوان کس پارٹی سے تعلق رکھتا ہے، مکمل صوبائی خود مختاری اور دیہی ثقافت، تاریخ اور زبان سے اس کی وابستگی مقدم ہے۔ مرکزی حکومت کی پالیسیوں کے نتیجے میں ایک خاصا بڑا سندھی بولنے والا درمیانہ طبقہ ابھرا جس کا سندھ کے چھوٹے شہروں میں مہاجر اور پنجابی مفادات سے تصادم ہوا۔ ۱۹۸۳ میں بحالی جمہوریت کی تحریک کی ناکامی کے بعد اس درمیانہ طبقے کو احساس ہوا کہ شہر کے مہاجر باشندوں کی شمولیت کے بغیر کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔

دیگر پنجاب سے آنے والے تیس لاکھ کے لگ بھگ آباد کار بھی سندھ میں رہ رہے ہیں۔ وہ صرف آباد کار نہیں بلکہ کنٹریکٹر، تاجر اور سرمایہ کار بھی ہیں اور زرعی پیداوار کی ضروریات پوری کرنے والی صنعتوں میں سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ سندھ کے کئی حصوں میں دیہی معیشت کا ان پر بہت زیادہ انحصار

Scanned with CamScanner

ہے۔ ایم کیو ایم کی "مہاجر" کی تعریف انھیں ایم کیو ایم سے باہر رکھتی ہے، اور یوں آدھا تیتر آدھا بٹیر کا نعرہ لگانا ممکن ہو جاتا ہے۔ اسی باعث مہاجر کی کوئی ایسی تعریف جس میں سندھ کے مشرقی پنجابی بھی شامل ہوں، سندھی قوم پرستوں کو بھی قبول نہیں ہے۔

***

سندھ میں ہونے والا تاریخی عمل انوکھا نہیں ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں دنیا کے بیشتر بڑے شہر آبادی میں کثیر اضافے کے بعد اس دور سے گزرے ہیں۔ پرانا شہری نظام، جو اپنی اصل میں جاگیردارانہ تھا، اپنے فرسودہ اور بوسیدہ اداروں کی وجہ سے نئے شہری مسائل اور رویوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تھا۔ جن ریاستوں میں حکومتوں نے ان تبدیلیوں کو سمجھا اور ان کی طرف مثبت توجہ دی وہاں پرانے ریاستی نظام میں وقت کے تقاضے کے مطابق ترامیم کی گئیں اور وہ جاری رہ سکا۔ جہاں ان تبدیلیوں کو نظر انداز کرنے یا دبانے کی کوشش کی گئی وہاں نہ صرف شہروں سے پرانا نظام اکھاڑ پھینکا گیا بلکہ پورے ملک کی سیاست مکمل طور پر تبدیل ہو گئی۔

سندھ کی شہری تحریک اس وقت لسانی اور نسلی تصادم کا شکار ہے، پھر بھی کراچی کے شورش زدہ علاقوں میں اس کا حل تلاش کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ان میں سے ایک تجویز، جس کی بہت پذیرائی ہوئی ہے، یہ ہے کہ کراچی میں ۱۰۰ کی جگہ ۳۰۰ منتخب کاؤنسلر ہونے چاہییں؛ شہر کی حکومت میونسپل کاؤنسل کے پاس ہونی چاہیے اور شہر کے تمام ترقیاتی اور انتظامی اداروں اور پولیس کو ان کے ماتحت ہونا چاہیے۔

"اگر ہمارے محلے کے منتخب لوگوں کے پاس اقتدار ہو تو ہم انھیں اپنی فلاح و بہبود کے کام کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں،" نذیر احمد کہتا ہے۔ وہ ایک موٹر مکینک ہے اور محمود آباد میں رہتا ہے۔ "ہم تمام بدعنوانیوں اور نااہلیوں کو اکھاڑ کر پھینک سکتے ہیں۔ کسی پنجابی تھانے دار کی جگہ مہاجر تھانے دار کو لا دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ تھانے دار ہمیں، اور اس کا ایس پی ہمارے نمائندوں کو، جواب دہ ہو۔"

جو لوگ یہ حل پیش کر رہے ہیں انھیں یہ اندازہ نہیں ہے کہ اتنی بڑی بنیادی تبدیلی حکومت کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو گی، کیوں کہ اس طرح محلوں کو بے پناہ طاقت حاصل ہو گی اور بیوروکریسی کو ان کے ماتحت آنا پڑے گا۔ مزید یہ کہ یہ عمل صرف کراچی تک محدود نہیں رہے گا۔

کراچی اور حیدرآباد کی شہری تحریک کو اس کے مخالفین نے کامیابی سے لسانی بنیادوں پر تقسیم کر کے فی الوقت غیر موثر کر دیا ہے۔ لیکن جب اسی طرز کی تحریک مستقبل قریب میں پنجاب کے شہری مراکز میں شروع ہو گی (جیسا کہ آبادیاتی اعداد و شمار واضح طور پر پیش گوئی کرتے ہیں) تو اسے

Scanned with CamScanner

غیر موثر کرنا دشوار ہو گا۔

***

شہری انتظام میں مافیاؤں کا دخل

کراچی میں رہائشی علاقے ڈیولپ کرنے کے لیے زمین کی ڈویلپمنٹ، زمین کی نقشہ بندی، اس کی پلاٹوں میں تقسیم، پانی اور نکاسی کی سہولتوں کے لیے بنیادی تعمیرات، پلاٹوں کی فروخت وغیرہ کا کام ادارہ ترقیات کراچی (KDA) کے پاس ہے۔ کے ڈی اے کی ڈیولپ کی ہوئی زمین، اس کے محدود ہونے والے ترقیاتی کام کے باعث، ہمیشہ مقدار میں کم رہی ہے اور کم آمدنی والے طبقے کی ضرورت سے کم اور قیمت میں اس طبقے کی قوت خرید سے زیادہ رہی ہے۔ نتیجتاً کے ڈی اے کے فروخت کیے ہوئے پلاٹ درمیانہ طبقے کے ہاتھ میں چلے جاتے ہیں اور سرمایہ کاری اور سٹے (speculation) کی نذر ہو جاتے ہیں، جس پر پہلے درمیانہ طبقے کے لوگوں کو بھی سالوں تک، ملکیت کے تحفظ کے بغیر رہنا پڑتا ہے۔

موقع شناس سرکاری افسروں نے اس صورت حال کو فوراً محسوس کر لیا اور جانے کے لیے مستقبل میں سرکاری زمینوں پر قبضہ کرانے لگے، چھوٹے چھوٹے پلاٹ کم آمدنی والے طبقے کو فروخت کرنے والے قبضہ گیروں اور دلالوں کی سرپرستی اور پشت پناہی کی۔ یہ سرکاری افسروں کو ہر فروخت میں ان کا حصہ دینے کے علاوہ ان کچی بستیوں میں عمدہ موقعے کے پلاٹ بھی ان کے لیے مخصوص کر دیتے، جو بعد میں آبادی بڑھنے اور قبضہ پکا ہونے کے بعد یہ افسران پلاٹوں کو فروخت کر کے بہت دولت کماتے۔

پلاٹ خریدنے والے کم آمدنی والے لوگوں کے ان پلاٹوں پر منتقل ہونے کے بعد بھی ان کی مدد یا سرپرستی ختم نہیں ہوتی۔ دلال ان آبادیوں کے لیے پانی کے ٹینکر جاری کرتے، سہولت فراہم کرتے اور ان کو بے دخلی سے محفوظ رکھنے کے لیے حکام سے مفاہمت کرتے۔ ان خدمات کے عوض وہ آبادی سے ماہانہ وصولی کرتے جس کا حصہ سرکاری افسروں اور پولیس کو دیا جاتا۔ یہ دلال غیر قانونی طور پر آبادیوں اور حکومت کے درمیان رابطہ بن کر سیاسی طاقت حاصل کرتے۔ ۱۹۶۰ اور ۱۹۷۰ کے عشروں میں بننے والی آبادیاں ان دلالوں کے ہاتھوں میں تھیں اور جیتنے والے ان علاقوں سے کونسلر منتخب ہوتے۔

۱۹۷۰ کے عشرے میں پیپلز پارٹی تھی۔ شہر کی سیاسی کارکنوں کا پارٹی کے مقامی رہنماؤں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ غیر قانونی

کچی آبادیوں کو ڈویلپ کرنے کے لیے سرکاری وسائل — گاڑیاں، بلڈوزرز اور آلات — استعمال کیے گئے۔

زمین حاصل کرنے کے بعد کم آمدنی والے طبقے کا دوسرا اہم مسئلہ مکان بنانے کے لیے رقم کا انتظام کرنے کا ہوتا تھا۔ زمین کا قانونی قبضہ نہ رکھنے کے باعث انہیں کسی سرکاری ادارے سے قرض کی سہولت نہ مل سکتی تھی۔ یہاں بھی غیر رسمی سیکٹر ان کی مدد کرتا۔ ٹھیکے والے — جیسے کہ بلاک وغیرہ بنانے والے — انہیں قرض پر تعمیر کا سامان فراہم کرتے۔ ان قرضوں کی وصولی کی ضمانت کے لیے سماجی دباؤ کو استعمال کیا جاتا۔ مکان بنانے یا کاروبار کرنے کے لیے نقد رقم سود خوروں سے قرض لی جاتی؛ ان قرضوں پر سود کی شرح ۲۰ سے ۳۰ فیصد ماہانہ ہوتی۔ سود خور اپنے مقروضوں کو کرائے کے غنڈوں کے ذریعے قابو میں رکھتے۔

کچی آبادیوں سے متعلق ڈھانچے کے کردار — قبضہ گیر، دلال، پولیس والے، سرکاری افسر، ٹھیکے والے، سود خور اور غنڈے — مختلف لسانی گروہوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس ڈھانچے میں اکثریت مہاجروں اور پنجابیوں کی تھی۔

کراچی میں نجی ملکیت کی پبلک ٹرانسپورٹ میں ایوب حکومت کے دور میں اضافہ ہوا۔ کراچی میں آنے والے پٹھان ایوب خان کے اہم سیاسی حمایتی تھے اس لیے بسوں کے بیشتر روٹ پرمٹ انہیں دیے گئے۔ کم تعداد میں مہاجروں اور پنجابیوں کو بھی روٹ پرمٹ ملے۔ اس زمانے میں ڈرائیوروں اور کلینروں کی بڑی تعداد بھی انہیں دونوں لسانی گروہوں سے آتی تھی، مگر وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد کم ہوتی چلی گئی اور پٹھانوں نے ان کی جگہ لے لی۔ بسوں کے مالکان اس کی جو وجہیں بتاتے ہیں ان میں پٹھانوں کی کم اجرت پر زیادہ دیر تک کام کرنے پر آمادگی، ٹریڈ یونینوں اور سودا کاری کی سیاسی سرگرمیوں سے عدم دلچسپی، مالی معاملات میں دیانت داری اور مالک سے وفاداری شامل ہیں۔ بسوں کے ڈرائیور اور کلینر مالکان کے تنخواہ دار ملازم ہوتے تھے اور بسوں کی مرمت وغیرہ کی ذمہ داری مالکان پر ہوتی تھی۔

منی بسیں کراچی میں ستر کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں متعارف ہوئیں۔ ان کے روٹ پرمٹ سیاسی رشوت کے طور پر بالخصوص غیر پٹھان افراد کو دیے گئے تاہم ان میں سے بیشتر نے یہ پرمٹ پٹھانوں کے ہاتھ بیچ دیے۔ منی بسیں بھی ابتدا میں تنخواہ دار ڈرائیوروں سے چلوائی جاتی تھیں۔ بعد میں رفتہ رفتہ یہ نظام قائم ہوا کہ روٹ پرمٹ رکھنے والا شخص ڈرائیور کو منی بس خریدنے کے لیے قرض دے دیتا اور سود کی بہت اونچی شرح پر ماہانہ قسطوں میں یہ قرض وصول کرتا۔ پرمٹ کے مالک کے لیے اس نظام کا فائدہ یہ تھا کہ اسے مالی معاملات پر ڈرائیور اور کلینر سے بحث نہ کرنی پڑتی اور وہ دھوکا کھانے کے خطرے سے محفوظ رہتا۔ اس کے علاوہ سود کی بدولت اس کی آمدنی بہت بڑھ گئی۔ تنخواہ دار ڈرائیوروں کی جگہ سودی قرضے سے منی بس حاصل کر کے چلانے والے ڈرائیوروں نے لے لی۔ اس طرح کراچی کا منی بس مافیا وجود میں آیا۔ اس مافیا کے سرکردہ لوگ، قرض فراہم کرنے والے، ڈرائیور اور کلینر پٹھان تھے۔

تاہم، ابتدا میں اس مافیا کی طاقت محدود تھی کیوں کہ پبلک ٹرانسپورٹ اور پرائیویٹ بس کمپنیاں شہر کی ضروریات کے خاصے بڑے حصے کو پورا کرتی تھیں۔ اس کے باوجود، اگرچہ مزید بسوں کی گنجائش موجود تھی، لیکن ٹرانسپورٹروں کی جانب سے اتنی بڑی مقدار میں قرض دستیاب نہ تھا۔ کمیٹی کے مطابق ۱۹۷۳ سے ۱۹۷۹ تک کے سات سال میں سود خور ٹرانسپورٹروں نے صرف ۶۰۰ بسوں کے لیے قرضے دیے، اور ان قرضوں کی مجموعی رقم صرف دو کروڑ روپے تھی۔

چوں کہ اس وقت تک منی بس والے شہر کا پہیہ جام کرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے اور مالی دشواری کی وجہ سے بسوں کی تعداد بڑھانے سے قاصر تھے، اس لیے انتظامیہ کے لیے کسی خطرے کا باعث نہ تھے؛ اور پولیس کی ان سے ان کا رشتہ ان کی اسی حیثیت کے مطابق متعین ہوتا تھا۔ جہاں تک اس وقت معاوضہ [illegible] کی [illegible] عام نہ تھی جتنی اب ہے، اخراجات بھی کم ہوتے تھے کیوں کہ [illegible] اس قدر آسانی سے خریدے نہیں جا سکتے تھے جیسے آج خریدے جا سکتے ہیں اور ٹریفک قوانین کی پاسداری آج کل کے مقابلے میں سختی اور مساوات سے [illegible] نہیں کی جاتی تھی۔

۱۹۷۰ کے عشرے کے آخری اور ۱۹۸۰ کے عشرے کے ابتدائی برسوں میں کراچی کی معیشت میں ہیروئن کا پیسہ داخل ہو گیا اور اس نے اس عام صورت کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اس دولت کے طفیل بڑے پیمانے پر زمینوں پر قبضہ کیے گئے، غیر قانونی ڈویلپمنٹ اور فروخت بڑے پیمانے میں شروع ہوئی، غیر سرکاری بینکاری (سود خوروں کے قرضوں) کا نیا نظام وجود میں آیا، اور ٹرانسپورٹ مافیا نے شہر کی سڑکوں پر کنٹرول حاصل کر لیا۔

[illegible] کچی آبادیاں پرانی کچی آبادیوں سے مختلف ہیں۔ زمینوں پر سرکاری افسروں کی ملی بھگت سے قبضہ کیا جاتا ہے اور افسروں کے لیے عمدہ پلاٹ محفوظ رکھنے کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب افسران [illegible] ہیں، [illegible] ڈالنے کے لیے مقررہ رقم بھیجی جاتی ہے [illegible] انتظامیہ کے [illegible] غیر قانونی آبادکاری میں غالب عنصر نہیں [illegible] چکے ہیں [illegible] کی پشت پناہی سے معاشی اور سیاسی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ آج کل قبضہ شدہ زمین پر پلاٹوں کی فروخت شروع ہونے سے پہلے آنے والی آبادی کو [illegible] ایک مسلح گروہ جس نے سرحدی پلاٹوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ چند علاقوں میں قبضہ [illegible] پلاٹوں کی فروخت کرنے کے بجائے [illegible] کرائے پر دیے گئے ہیں۔ ان کی آبادیوں میں مکان بنانے کے لیے [illegible] سمت کو [illegible] سود پر [illegible] جاتا ہے۔ بالعموم مکان کی جائیداد کا مسلح غنڈے چھین لیتے ہیں یا [illegible] صورت میں [illegible] پڑتی ہے۔ پرانی آبادیوں پر بھی کنٹرول کے لیے جنگ ہو رہی ہے۔ ان آبادیوں کی بیرونی سرحدوں پر واقع مکان آبادی سے باہر کے لوگ خرید رہے ہیں۔ مکان کے مالک کو جائیداد کی دگنی تگنی قیمت پیش کی جاتی ہے، اور اگر وہ اس پر بھی مکان بیچنے پر

آبادہ ۔ موثر طاقت کا استعمال ہوتا ہے۔ حال ہی میں صدر چوک اور میٹرو سینما کے درمیانی علاقے اور محمود آباد کالونی کے وسط میں ایک اہم محلے کو باہر کے لوگوں نے خرید لیا۔ ان کچی آبادیوں کے رہنے والے، جو باقاعدہ قرار دی جانے والی نہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ یہ باہر کے لوگ اور دلال انتظامیہ کے ساتھ مل کر ریگولرائزیشن کے عمل کو معطل کرانے کے ذمہ دار ہیں تاکہ ان آبادیوں کے باشندے قانونی تحفظ سے محروم رہیں۔

تخمینہ لگایا گیا ہے کہ کراچی میں سالانہ ۱۶ ہزار ۸ سو پلاٹ غیر قانونی طور پر قبضہ کر کے ڈویلپ کیے جاتے ہیں۔ اگر انتظامیہ کو رشوت دینے، غنڈوں کو سنبھالنے اور مکان کی تعمیر کے لیے قرض دینے کے اخراجات ایک ہزار روپے فی پلاٹ بھی رکھے جائیں تو مجموعی رقم ۱ کروڑ ۶۸ لاکھ روپے بنتی ہے۔

ٹرانسپورٹ مافیا اور حکومت کے درمیان بھی رشتہ تبدیل ہوا ہے۔ کراچی کی سڑکوں پر ۱۹۷۸ سے لے کر ۱۹۸۷ تک نو سال کی مدت میں پانچ ہزار منی بسوں کا اضافہ ہوا۔ صرف ۱۹۷۹ میں کمپنی نے چند ٹرانسپورٹروں سے کہیں زیادہ بسیں چلانے والوں کو ڈیڑھ ارب روپے قرض دیے تھے۔ ان منی بسوں کی قانونی ملکیت قرض واپس ہونے تک ٹرانسپورٹر کے نام رہتی ہے۔ حادثے وغیرہ کی صورت میں گاڑی کی مرمت کے اخراجات ڈرائیور خود برداشت کرتا ہے۔ اگر وہ گرفتار ہو جائے تو ٹرانسپورٹر اپنا ڈرائیور ضمانت پر رہا کرا لیتا ہے اور اس کا معاوضہ نقد یا کسی اور صورت میں وصول کرتا ہے۔ بعض صورتوں میں ان منی بسوں کو چلانے کے لیے پابند مزدور (bonded labcurers) بھی شہر میں لائے گئے ہیں۔

ٹرانسپورٹ مافیا اور اس کے شریکوں کے موجودہ طریق عمل اور ٹرانسپورٹ میں بینک اور دیگر تحقیق مطالعے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ان دونوں سرگرمیوں میں کثیر سرمایہ لگایا گیا ہے۔ یہ سرمایہ منشیات کے کاروبار سے حاصل ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ دونوں سرگرمیاں پٹھانوں کے ہاتھ میں ہیں بلکہ ماضی کے برعکس، ہیروئن کی تجارت کی سرپرستی کے بڑے کردار بھی اب بیشتر صوبہ سرحد سے آتے ہیں۔

منشیات مافیا کا پہلا مقصد سیاسی طور پر طاقت حاصل کرنا ہوتا ہے تاکہ حکومت اس کے خلاف قدم نہ اٹھا سکے۔ سیاسی طاقت حاصل کرنے کا سب سے موثر طریقہ کم آمدنی والے علاقوں پر — جہاں شہری انتظامیہ کی گرفت سب سے کمزور ہوتی ہے — قبضہ کرنا ہے۔ اسلحے کی سمگلنگ اور دولت کے ذریعے ان علاقوں پر قبضہ کرنا منشیات مافیا کی اسٹریٹیجی کا حصہ ہوتا ہے۔ کراچی کی کئی کچی آبادیاں اس مافیا کے قبضے میں ہیں اور بہت سی بستیوں پر قبضے کی جنگ جاری ہے۔ اس کے علاوہ شہر میں ہونے والی ہر بدامنی کے بعد ہتھیاروں کی تعداد مسلسل بڑھتی رہی ہے۔

شہری انتظامیہ ان مافیاؤں کا مقابلہ کرنے کی سکت یا ارادہ نہیں رکھتی۔ یہ بات صرف انتظامیہ

کے عمومی رویے سے، بلکہ بعض مخصوص واقعات سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ دسمبر ۱۹۸۵ میں [illegible] سے حکومت کو یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ حادثے میں کسی شخص کے ہلاک ہونے کی صورت میں ڈرائیور پر محض دفعہ ۳۰۴ (الف) — یعنی اتفاقی موت — کے تحت مقدمہ درج کیا جاتا ہے خواہ حادثے کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ اسی سال کے شروع میں [illegible] میں منشیات کے خلاف مہم چلائی گئی۔ پولیس [illegible] سے دو سو [illegible] ہوئے تھے اور منشیات کے خلاف مہم کا [illegible] تحقیقاتی [illegible] نے ابھی تحقیقات مکمل کر لی تھی لیکن اس کی رپورٹ کو بھی ظاہر نہیں کیا گیا۔ اس دوران منشیات کے خلاف تحریک چلانے والوں کو پولیس کی دھمکیاں [illegible] تحریک کا [illegible] آبادیوں میں کام کرنے والے [illegible] منشیات [illegible] پولیس [illegible] کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ [illegible] دھمکیاں دی جاتی ہیں اور [illegible] کو سبق سکھانے کے لیے حوالات میں بند بھی کیا گیا ہے۔

[illegible]

انہیں پولیس سے بچانے کے لیے باقاعدگی سے بھتہ وصول کرتے ہیں۔ اس بات کا پورا امکان موجود ہے کہ جرائم کی دنیا کے یہ ٹھیکیدار اور دادا (پٹھان اور غیر پٹھان دونوں) مافیا کے ہاتھوں استعمال ہو رہے ہوں۔

پٹھان برادری کے ان بدمعاشوں کی دیکھ بھال [illegible] کی مدد [illegible] اور شہر [illegible] انتظامیہ ہے۔ سرحد کے کسی گاؤں سے آنے والا پٹھان دور شہر سے [illegible]، کام حاصل کرنے اور انصاف پانے کے طریقوں میں اپنے لیے گنجائش نہیں دیکھتا۔ کراچی میں قیام کے ابتدائی دنوں میں اسے زبان کی دقت کا بھی سامنا ہوتا ہے۔ پٹھان قبائلی روابط اور ٹھیکیداری کا نظام اسے اجنبی اور ناآشنا شہر میں محفوظ بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی مثالیں شاذ و نادر ہی سننے میں آتی ہیں کہ کسی پٹھان نے انصاف حاصل کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کیا ہو یا کسی تنازعے کو نمٹانے کے لیے کسی سیاسی جماعت یا پولیس کی مدد حاصل کی ہو۔ یہ تمام معاملات ٹھیکیداروں کی یا جرگے کی وساطت سے طے کیے جاتے ہیں۔

کراچی کے مقامی باشندوں کی صورت حال یکسر مختلف ہے۔ ان کے یہاں کوئی روایتی نسلی یا قبائلی تنظیم نہیں ہے جس سے وہ رجوع کر سکیں۔ [illegible] ہندوستان سے یا پاکستان کے دیہی علاقوں سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ شہری زندگی سے وابستہ ہونے کے باعث [illegible] ہو گیا ہے۔ ان کی بس واحد آمدنی یا تنخواہ [illegible] کے مقابلے میں [illegible]۔ علاوہ ازیں اب ان باشندوں کی دوسری نسل جوان ہو چکی ہے [illegible] کی سی مصالحت پسندی اور قوت برداشت موجود نہیں ہے۔ [illegible] محسوس کرتی ہے کہ ان کے کچھ حقوق ہیں اور وہ ان حقوق کے لیے جدوجہد کرنے پر آمادہ ہیں۔ [illegible] شہری انتظامیہ سے روز کا واسطہ پڑنے کے باعث وہ [illegible] اداروں کی بدعنوانی [illegible] سے واقف ہو چکے ہیں۔ [illegible] کے خلاف بغاوت کرنے پر انہیں [illegible] رہی ہے۔ لیکن مسلح اور غیر منظم ہونے کے باعث وہ بہت جلد [illegible] کے قوں برقرار رہتے ہیں۔

شہری ہنگاموں کے ان عوامل اور مافیا کے معاملے کے علاوہ [illegible] کا بھی سامنا ہے۔ مارشل لا دور میں [illegible] سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کے باعث شہر کی سیاسی قوتیں باقی ملک سے کٹ کر رہ گئیں۔ [illegible] کراچی کی [illegible] انتظامیہ کی [illegible] اور مافیا کے جھگڑوں کے درمیان کچھ [illegible] موجود ہے [illegible]۔ ملک کے ۲۵ فیصد محصولات کراچی سے [illegible] جمع کیے جاتے ہیں [illegible] محصولات کا [illegible] حصہ کراچی پر خرچ کیا جاتا ہے۔

کراچی کی پٹھان اور غیر پٹھان آبادی کی صورت حال، مافیا [illegible] انتظامیہ کی [illegible] کے پیش نظر [illegible] ۱۹۸۰ کے عشرے سے [illegible] کراچی [illegible]

لسانی تصادم میں ملوث ہوئی۔ سیاسی گروہوں کے مختلف بیانات میں ایم کیو ایم کو اس لسانی تصادم کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ تاہم، ایم کیو ایم اور کراچی میں رہنے والوں سے جاری شورش کے درمیان تفریق کرنا ضروری ہے۔ ایم کیو ایم کے مطالبات محدود نوعیت کے ہیں: وہ درمیانہ طبقے کے مہاجروں کے مفادات کا تحفظ چاہتی ہے، مہاجر شناخت کی بات کرتی ہے، ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں داخلے کے لیے کوٹہ سسٹم کی مخالفت کرتی ہے اور سندھ کی آبادی میں غیر فطری تبدیلیوں کو روکنا چاہتی ہے۔ ایم کیو ایم ایک منظم جماعت ہے جس کی مرکزی لیڈرشپ موجود ہے۔ دوسری طرف شہری شورش ناکامی محرومی، غصہ اور استحصال و ریاستی طاقت کے خلاف ہے۔ اس کی کوئی مرکزی لیڈرشپ نہیں ہے اور اس کی منظم شکل جو وہ بھی ابھی بن رہی ہے [illegible] کا تعین نہیں ہوا ہے۔ ایم کیو ایم شہری بے اطمینانی اور شورش کی نمائندگی کرنے کے لیے کوشاں نظر نہیں آتی اور اپنے طبقاتی مزاج کی وجہ سے وہ شاید ہی ایسا کرے۔

***

بلدیاتی ادارے ـــ اختیار اور بے اختیاری

۱۹۸۷ء میں سندھ کے بلدیاتی اداروں کے انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ایم کیو ایم کو کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن [illegible] بلدیاتی کاؤنسلوں کا کنٹرول حاصل ہو گیا۔ اس کے علاوہ اسے [illegible] میونسپل کارپوریشن [illegible] میں بھی مطلق اکثریت حاصل ہوئی۔ مگر یہ کنٹرول ایم کیو ایم [illegible] نہیں [illegible] شہروں کے انتظام میں کوئی تبدیلی [illegible] ان شہروں کی بدحالی [illegible] شہروں کے [illegible] نمایاں طور پر [illegible] کا [illegible] ۱۹۷۹ء کے لوکل گورنمنٹ آرڈیننس نے شہروں کی میونسپل [illegible] صوبائی حکومت [illegible] دیا ہے۔

[illegible] بلدیاتی [illegible] سندھ کے شہری علاقوں کی مہاجر آبادی [illegible] کی مہاجر [illegible] مہاجر تشدد پسندی کے ساتھ مل کر کراچی اور حیدرآباد [illegible] سندھی قوم پرست [illegible] جو شروع میں ایم کیو ایم [illegible] خطرہ محسوس کرنے لگے اور اس طرح سندھ کے [illegible] کوششیں شروع ہو گئیں۔

۱۹۷۹ء لوکل گورنمنٹ آرڈیننس [illegible] میونسپل کاؤنسلوں اور صوبائی حکومت کے درمیان

تعلق کو متعین کرتا ہے۔ اس قانون کی دفعہ ۴۲ کے تحت صوبائی حکومت کو شہری انتظامیہ کے مالی امور میں بالادستی حاصل ہے۔ صوبائی حکومت کارپوریشنوں کو ان تمام ٹیکسوں، محصولوں، چنگیوں اور فیسوں کو، جو کارپوریشنیں عائد کرنے کی مجاز ہیں، گھٹانے، بڑھانے، معطل یا موقوف کرنے کا حکم دے سکتی ہے۔ اس کے علاوہ صوبائی حکومت کارپوریشنوں کے منظور کردہ بجٹ میں ترمیم کرنے کا بھی اختیار حاصل ہے۔

کراچی اور حیدرآباد کے شہری علاقوں کی منصوبہ بندی کی ذمے داری منتخب میونسپل کارپوریشنوں پر نہیں بلکہ کراچی اور حیدرآباد ڈویلپمنٹ اتھارٹیوں پر ہے۔ ان دونوں اداروں کو سرکاری ٹیکنوکریٹ چلاتے ہیں جو کسی بھی طرح ان شہروں کے بلدیاتی اداروں کو نہیں بلکہ صوبائی حکومت کو جواب دہ ہیں۔ اس طرح محصولات جمع کرنے اور خرچ کرنے کا اختیار نہ رکھنے اور شہری علاقوں کی ترقیاتی منصوبہ بندی میں شرکت سے محروم ہونے کے باعث ایم کیو ایم کی حمایت یافتہ منتخب حکومتیں ان دونوں شہروں کے عظیم مسائل سے نمٹنے سے مکمل طور پر قاصر تھیں۔ حکومت کے وسیع اختیارات کے پیش نظر یہ بات قابل فہم ہے کہ کراچی اور حیدرآباد کے منتخب میئروں سے ان شہروں کے کمشنروں نے چارج لے لیا تھا۔

یہ منتخب کاؤنسلیں بہرحال حکومت کے خلاف احتجاج کر سکتی تھیں اور آرڈیننس میں دیے گئے منتخب بلدیاتی اداروں کے اختیارات میں اضافے کا مطالبہ کر سکتی تھیں۔ تاہم ان مطالبات سے نمٹنے کے لیے بھی آرڈیننس میں متعدد دفعات موجود ہیں۔ دفعہ ۵۳ کے تحت صوبائی حکومت کو کارپوریشنوں کی عمومی نگرانی کا اختیار حاصل ہے تاکہ ان کی کارروائیاں آرڈیننس سے مطابقت رکھیں۔ بصورت دیگر حکومت ایسے احکام جاری کر سکتی ہے جن سے کارپوریشنوں کے فیصلے آرڈیننس سے مطابقت رکھنے لگیں۔ اس دفعہ کے تحت صوبائی حکومت کارپوریشن کی کسی بھی ایسی کارروائی کو معطل کر سکتی ہے جو اس کے خیال میں آرڈیننس سے مطابقت نہ رکھتی ہو، اور کارپوریشن کو حکومت کے جاری کردہ احکام پر عمل کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ اگر حکومت یہ سمجھتی ہو کہ کارپوریشن آرڈیننس میں دیے گئے فرائض ادا کرنے میں ناکام رہی یا اپنی مالی ذمے داریاں پوری نہیں کر سکی، تو وہ دفعہ ۵۸ کے تحت کارپوریشن کو چھ ماہ کے لیے معطل کر سکتی ہے۔ تاہم اگر منتخب کاؤنسلوں کے احتجاج کو اسٹریٹ پاور کی حمایت حاصل ہو تو وہ، خاص طور پر کراچی جیسے باشعور اور پُراشتعال شہر میں، بہت بڑی طاقت بن سکتی ہیں۔ ایسی صورت حال میں منتخب اداروں کی سرکشی کے اثرات کو کم رکھنے کی غرض سے حکومت نے کراچی کو چار خودمختار زونل میونسپل کارپوریشنوں میں تقسیم کر دیا جن میں سے ہر ایک کے انتظامیہ، مالیات، انجینئرنگ، صحت اور دوسرے شعبے الگ الگ ہیں۔ اگرچہ ان میں سے تین زونل کاؤنسلوں میں ایم کیو ایم کی اکثریت تھی، حکومت کے اہلکاروں کا خیال تھا کہ ایم کیو ایم کی اکثریت والی شہری کاؤنسل کی نسبت ان زونل کاؤنسلوں سے الگ الگ نمٹنا زیادہ آسان ہوگا۔ شہر کو اس طرح انتظامی حصوں میں تقسیم کر دینے کے قدم سے عظیم تر کراچی کا تصور آنے والے وقتوں کے لیے تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ اس

[illegible]

[illegible]

* * *

[illegible]

[illegible]

مشرقی پنجاب کے تھے۔ کچھ دکن اور گجراتی بولنے والے، تجارت پیشہ، کاریگر اور سفید کالر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا طبقاتی پس منظر ویسا ہی ہے جیسا ایم کیو ایم کی لیڈرشپ کا ہے، اور انہیں بھی روزگار اور تعلیم کے انہیں مسائل کا سامنا ہے جن سے مہاجروں کو دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ اس طرح یہ طبقے ایم کیو ایم کے پروگرام سے متاثر ہوگئے ہیں اور اس سے ہمدردی بھی رکھتے ہیں؛ انہیں صرف مہاجر قومیت کے تصور سے اختلاف ہے۔ ایم کیو ایم کے ابھرنے کے باعث یہ گروہ خود کو شہری سیاست کے بڑے دھارے سے علیحدہ محسوس کرنے لگے اور نئے اتحاد کی تلاش میں سرگرم ہو گئے جو انہیں برابری کی سطح پر اپنے ساتھ شامل کرے اور ان کے مفادات کا تحفظ کرے۔

بلدیاتی انتخابات میں ایم کیو ایم کی کامیابی کا سب سے نمایاں اثر سندھی قوم پرستوں سے اس کے رشتے پر پڑا۔ ایم کیو ایم نے یہ موقف اختیار کیا کہ سندھی اور مہاجر سندھ میں دو مختلف قومیتیں ہیں۔ ایم کیو ایم کے برخلاف، جو مہاجروں کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکتی ہے، کوئی بھی سندھی قوم پرست گروپ سندھیوں کی نمائندگی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ جیے سندھ محاذ کو چھوڑ کر، ترقی پسند قوم پرست بھی غیر صوبائی پارٹیوں کا حصہ ہیں۔ ابتدا میں جیے سندھ کی ایم کیو ایم کے ساتھ دوستی سندھیوں میں نامقبول بھی نہیں رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۸۳ کی تحریک کی ناکامی نے یہ ثابت کر دیا کہ مرکز کے خلاف سندھ میں کوئی بھی تحریک مہاجر اکثریت کے شہری علاقوں کی شرکت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔

سندھ کی آبادی میں اتفاق رائے پیدا کرنے کے لیے ایم کیو ایم اور سندھی قوم پرستوں کے درمیان مذاکرات ضروری ہیں۔ اس سلسلے میں چار مسائل کو حل کرنا ہوگا۔

(۱) مہاجر قومیت کا تصور سندھیوں کے لیے ناقابلِ تسلیم ہے کیونکہ اس سے سندھ کی تقسیم کے عمل کو تقویت ملتی ہے۔ یہ تصور ملکی سطح کی پارٹیوں کو بھی منظور نہیں ہو سکتا کیونکہ اس طرح دوسری ثقافتی اقلیتیں بھی خود کو قومیت تسلیم کرانے کا مطالبہ کر سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایم کیو ایم شہری درمیانہ طبقے کی تنظیم ہے اور ایسے سیاسی ماحول میں کام کر رہی ہے جس پر جاگیردار طبقے اور اس کے حواریوں کا مکمل غلبہ ہے؛ یہ موجودہ سیاسی اسٹیبلشمنٹ ایم کیو ایم کو اپنے لیے ایک خطرے کے طور پر دیکھتی ہے۔

(۲) دوسرا مسئلہ ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں داخلوں کا ہے۔ ایم کیو ایم مہاجر آبادی کے تناسب سے ملازمتوں اور داخلوں کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سندھی آبادی دیہی (کوٹہ سسٹم) کے موجودہ نظام کے فوائد سے محروم ہو جائے گی۔

(۳) اردو اور سندھی زبانوں کا تعلیمی اداروں اور انتظامیہ میں استعمال تیسرا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ شاید سب سے زیادہ آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔

(۴) چوتھا مسئلہ بنگلہ دیش سے محصورین کی واپسی کا ہے جس کی ایم کیو ایم حمایت کرتی ہے اور

Scanned with CamScanner

سندھی مخالفت ہیں۔

سندھی قوم پرست ایم کیو ایم سے معاملے کے سلسلے میں کسی جلدی میں نہیں ہیں۔ ان کا اندازہ ہے کہ حالات انہی کے حق میں ہیں۔ [illegible] ایک سندھی کالم نگار نے، ۱۹۸۷ کے بلدیاتی انتخابات کے بعد اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا: سندھ میں اتفاق رائے ہو جائے گا، مگر اس سے پہلے [illegible] مرکز کی طرف سے بھی [illegible] جیسا کہ ہمارے ساتھ ۱۹۸۳ میں ہوا [illegible] نہیں [illegible] جدوجہد [illegible] ہوگی، اس کے بعد ایم کیو ایم اور سندھی قوم پرستوں میں معاہدہ ہو سکتا ہے۔

***

صوبائی اور قومی سیاست کا تناظر

نومبر ۱۹۸۸ کے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں پاکستان کے عوام نے ان قومی پارٹیوں کے حق میں ووٹ دیا جنھوں نے ۱۹۷۳ کے آئین کی بحالی، پارٹی کی بنیاد پر الیکشن اور بنیادی انسانی حقوق کے لیے جدوجہد کی تھی۔ باقی پاکستان میں ووٹنگ کے رجحان کے برخلاف، سندھ کی اردو بولنے والی آبادی نے مقامی اور لسانی تنظیم ایم کیو ایم کو ووٹ دیا۔ کراچی اور حیدر آباد میں ایم کیو ایم کی مکمل کامیابی اور دیہی سندھ میں پیپلز پارٹی کی اکثریت نے صوبے کو دو مختلف حصوں میں بانٹ دیا۔ ایم کیو ایم نے [illegible] سے [illegible] بنا دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سندھ کی [illegible] آبادی [illegible] پاکستان کے سیاسی دھارے سے کٹ گئی ہے۔ [illegible] پس منظر رکھنے کے باعث ایم کیو ایم [illegible] سیاسی پارٹیوں کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اس پارٹی میں چھوٹے تاجر [illegible] اردو بولنے والی [illegible] شامل ہے۔ مگر ایم کیو ایم انہیں [illegible] کی پارٹیوں کا بھی ساتھ نہیں دینے [illegible] پاکستان کی سیاست میں [illegible] ہے۔ اس کے علاوہ [illegible] جو کراچی اور حیدر آباد کے شہری ماحول میں جوان ہوئی ہے، ان رجعت پسند پارٹیوں کا [illegible] سے [illegible] والدین نے حمایت کی تھی۔

[illegible] سندھ کی اردو بولنے والی آبادی تجارت اور پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں ترقی کر رہی تھی، [illegible] بات [illegible] ملکی سیاست [illegible] بیوروکریسی میں اس آبادی کی شمولیت [illegible] پاکستان [illegible] ایم کیو ایم حق اور علیحدگی [illegible] ساتھیوں [illegible] مضبوط پلیٹ فارم مہیا کر کے [illegible] کی آواز بلند کی ہے [illegible] کا مطالبہ کیا ہے۔ ایم کیو ایم کی سب

سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس نے اپنے مسائل اور ان کے حل کو بڑے صوبائی اور قومی مسائل کے ساتھ منسلک نہیں کیا۔

پاکستان کا آئین سوائے پاکستانی قومیت کے کسی اور قومیت کو تسلیم نہیں کرتا اور ایم کیو ایم کے سوا باقی تمام قومیتوں پر اصرار کرنے والی پارٹیوں کو الیکشن میں شکست ہوئی ہے۔ پاکستان کے آئین میں ترمیم کیے بغیر مہاجر قومیت کا تسلیم کیا جانا یا مہاجر اکثریت کے ایک نئے صوبے کا قیام ناممکن ہے۔ مستقبل قریب میں ایسی کوئی آئینی ترمیم خارج از امکان نظر آتی ہے۔ ایسی کسی ترمیم کی غیر موجودگی میں صوبائی اور ملکی سطح پر ایم کیو ایم کی متناسب نمائندگی کی تجویز بھی ناقابلِ عمل ہے۔

جہاں تک کوٹا سسٹم کے خاتمے کا تعلق ہے، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سندھ کی آبادی کا ۴۸ فیصد حصہ شہروں میں رہتا ہے۔ شہری آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ اردو بولنے والوں (یا مہاجروں) پر مشتمل ہے۔ دیہی سندھ کی آبادی کے ۸۹ فیصد لوگ سندھی، بلوچی اور سرائیکی بولنے والے ہیں۔ مہاجروں کی اکثریت تعلیم یافتہ ہے اور سندھ کی دیہی آبادی کی طرح جاگیرداروں کے تابع نہیں ہے۔ کوٹا سسٹم کا خاتمہ سندھیوں کے لیے خودکشی کے مترادف ہوگا۔ ان کے موقف کو نہ صرف ان کی ووٹنگ پاور کی حمایت حاصل ہے، بلکہ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جانا چاہیے کہ سندھ میں جاگیرداری نظام کے ہوتے ہوئے بھی ایک درمیانہ طبقہ اُبھر رہا ہے۔ یہ طبقہ پیشہ ورانہ ملازمتوں میں مہاجروں کی اجارہ داری کے لیے ایک چیلنج ہے، اگرچہ اس نے اب تک مہاجروں کو تجارت کے شعبے میں کوئی خاص نقصان نہیں پہنچایا ہے۔

قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں ایم کیو ایم کی پے در پے کامیابی نے کئی سوالات پیدا کیے: متشدد مہاجروں کو قومیت اور متناسب نمائندگی دلانے میں ناکامی کی صورت میں ایم کیو ایم کا مستقبل کیا ہوگا؟ کیا ایم کیو ایم کی لیڈرشپ میں شامل عسکریت پسند وزارتیں اور غیر اہم مفادات حاصل کر کے خاموش بیٹھ جائیں گے؟ کیا ایم کیو ایم کے متشدد عناصر اپنی جدوجہد کراچی اور حیدرآباد کی سڑکوں پر جاری رکھیں گے اور اس طرح مہاجروں اور سندھیوں کے درمیان خطرناک تفریق میں اضافہ کریں گے؟ کیا اس طرح کی تفریق کے بڑھنے سے مرکز کو صوبائی امور میں مداخلت کا موقع نہیں ملے گا اور صوبائی خودمختاری کی امنگوں کی حوصلہ شکنی نہیں ہوگی؟ اگر ایم کیو ایم نے اپنے مطالبات ترک کر کے پاکستان، بالخصوص سندھ کے بڑے مسائل کے حل کے لیے متبادل حکمت عملی اختیار کی تو کیا مہاجروں کی آبادی ایم کیو ایم سے بدظن ہو جائے گی؟ اس طرح کے سوالات پیدا نہ ہوتے اگر ایم کیو ایم نے کوٹا سسٹم کے مسئلے کو دیہی سندھ کی پسماندہ صورتِ حال کے ایک جاری نتیجے کے طور پر دیکھا ہوتا، اور یہ کہا ہوتا کہ شہری علاقوں میں سہولتوں اور ملازمتوں کے فقدان کی وجوہ وہی ہیں جو دیہی علاقوں میں ہیں، یعنی سست رو ترقی اور زرعی انفرااسٹرکچر کے انحطاط کی ذمے دار ہیں۔

Scanned with CamScanner

سندھ کے شہری مسئلے کا حل جس کے ذریعے صوبے میں شہری دیہی کی فضا ختم ہو سکے، ایک ایسے سیٹ اپ میں ہے جس میں مقامی حکومت کے پاس ہے۔ بڑی حد تک یہ مسائل پورے پاکستان میں موثر لوکل گورنمنٹ کے ادارے قائم کر کے حل کیے جا سکتے ہیں۔

* * *

حل کی تلاش

ہمارے معاشرے کی صحت مند ... سوشل کانٹریکٹ کے تحت عدالتی ادارے
کی تشکیل نو کی جائے گی ... ڈویژنوں کو ختم
کیا جائے گا اور تمام اختیارات نچلی سطحوں پر منتقل کیا جائے گا۔
(... منشور ۱۹۹۳ : تبدیلی کے لیے ایک معاہدہ۔)

کراچی کی صورت حال سے دوچار ... گروہوں کے درمیان کسی نتیجے کی امیدیں ... کی وقت ... نہیں ... ہے ... دہشت گردوں کے ... وشدید ... دہشت گردوں کے ... ووٹ دیا ہے ... سیاسی عمل ... دہشت گردوں کی ... میں ڈھیل ... ہے۔ کراچی کے ... آمدنی ... علاقوں میں ... گزشتہ دو ... سے ... نہیں دیکھتے ... علاقوں میں ... ہے ... مسائل کی ... حکومت ... ہے، وہ ... مستحصال، ... کی جانب سے انہیں ... حکومت کی ... حاصل ہے ... عشروں کی وصولی کے ... درمیان ... ہوتے ہیں۔

دہشت گردوں ... حکومت کی ... کے ... کراچی کے ... حکومت کی جانب سے ... فیصلوں کے اعتبار کو بری طرح مجروح کیا ... کراچی میں دہشت گردوں سے نمٹنے کے لیے ... اخبارات ... علاقوں میں ... وہاں کے باشندے ... لوٹ مار ... ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس آپریشن کے

شکنجے میں مشتبہ دہشت گردوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک غیر جانبدار کمیشن کی تشکیل کی جائے جو ان حراستی ہلاکتوں کی تحقیق کرنے کے بعد ذمہ داروں کا احتساب کرے اور مجرموں کو سخت سزا دے۔ مگر ہم سب جانتے ہیں کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ حکومت نے ۱۹۹۰ء کے فیصلے کے ذریعے سپیشل پولیس ایکٹ ۱۹۹۲ میں ترمیم کر دی ہے۔ اس ترمیم کی وجہ سے کسی ملزم کے پولیس کی تحویل میں دیے ہوئے اقبالی بیان کو سزا کے لیے کافی شہادت سمجھا جائے گا۔ ہماری قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں جس طریقے سے کام کرتی ہیں، اور جتنے لوگ ہر سال پولیس کے تشدد سے ہلاک ہو جاتے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے یہ ترمیم زیادہ تر بے گناہ لوگوں کو ہراساں کرنے اور سیاسی مقصد کے لیے دہشت گردی کی کھلی چھوٹ دینے کے مترادف ہے۔ کراچی کے بھی آبادی والے علاقوں کے لوگ اس ترمیم سے خوفزدہ اور اس کے اثرات کو بھی خطرناک سمجھتے ہیں۔ ان کا سوال یہ ہے: کیا برسر اقتدار پارٹی ان لوگوں کے حقوق کے بارے میں سوچنا پسند نہیں کرے گی جن کے بارے میں اسے معلوم ہے کہ وہ اسے کبھی ووٹ نہیں دیں گے؟

ان غریب علاقوں میں رہنے والے لوگ بتاتے ہیں کہ برسر اقتدار پارٹی کے افراد کراچی میں دہشت گردوں کے مسلح گروہ کا دیدہ دانستہ ... اور بیرونی ایجنسیوں کو ٹھہراتے ہیں۔ لیکن منشیات کے اڈے اب بھی ان علاقوں میں موجود ہیں اور پولیس بدستور ان کی سرپرستی کر رہی ہے۔ ان اڈوں کے چلانے والوں میں سے کوئی شخص گرفتار نہیں کیا گیا۔ اور گرفتار کیے جانے والے ڈاکوؤں میں سے کسی پر بیرونی ایجنٹ ہونے کا جرم ثابت نہیں کیا گیا ہے۔ یہ بات بھی بار بار سننے میں آتی رہی ہے کہ پولیس اپنی تحقیقات کے مطابق ایم کیو ایم (حقیقی) اور سپاہ صحابہ کو دہشت گردی کا ملزم ٹھہراتی ہے، جبکہ رینجرز کی تحقیقات میں ایم کیو ایم (الطاف گروپ) کو ملزم ٹھہرایا جاتا ہے۔ لوگ ان تحقیقات کو انتظامیہ کے مختلف گروہوں کے درمیان مفادات کے تصادم کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

برسر اقتدار پارٹی کی اعلیٰ قیادت نے کہا تھا کہ کراچی کی صورت حال ڈیڑھ سال میں معمول پر آ جائے گی۔ کراچی کی صورت حال یہ ہے کہ پانی، نکاسی آب، سڑکوں، ٹرانسپورٹ، تعلیم، صحت، روزگار اور رہائش کے مسائل تیزی سے بڑھ رہے ہیں، اور جس رفتار سے ان سہولتوں کا انتظام کرنے کی ضرورت ہے ... بحیثیت ... بدعنوانی بھی بڑھ رہی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ دہشت گردی سے کراچی پر قابو پا لیا جائے گا؛ مگر کوئی پالیسی ... جب تک روزگار، جان اور عزت کے تحفظ اور شہری ... کی قابل عمل ... حکمت عملی ... نہیں ہو سکتی۔

کراچی کی آبادی اور برسر اقتدار پارٹی کے درمیان ایک ... معاملہ ... زور و شور ... ہوتا جا رہا ہے۔ ایسی صورت پیدا کی جا رہی ہے کہ ... کے تحت ... قائم ہو بھی جائے تو ... کے موقع پر ... کراچی کی صورت حال ... دیکھتے ہوئے ... تعداد ... روز کم ہوتی جا ... یہ بات ... برسر اقتدار پارٹی ... اختلاف ... صادق آتی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہر کی دیہی علاقوں سے امر واقع میں (de facto) علیحدگی ہو چکی ہے۔ سیاسی طور پر اس سے بڑا کوئی اور المیہ نہیں ہو سکتا اور اس کے نتیجے میں لسانی فسادات اور خوں ریزی کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

کراچی کے لوگ شہر کے بحران اور اس کو سیاسی عمل سے الگ کر دیے جانے پر بڑے پیمانے پر ردعمل کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس موضوع پر بے شمار ریلیاں، میٹنگیں، سیمینار اور ورکشاپ ہو چکی ہیں۔ ان میں سے کچھ شہر کی بیرونی سرحدوں پر واقع کچی آبادیوں کے شیڈوں میں، کچھ غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) کے دفتروں میں اور کچھ پنج ستارہ ہوٹلوں میں ہوئی ہیں۔ ان کا اہتمام کرنے والوں میں زندگی کے تمام شعبوں کے لوگ (مختلف، اور اکثر اوقات متصادم، سیاسی رجحانات اور لسانی پس منظر رکھنے والے) شامل ہیں۔ ان کے منتظمین نے پیشہ ور ماہرین، تاجروں، محلہ اور کمیونٹی تنظیموں، مذہبی تنظیموں اور خواتین کے گروپوں کو اپنے ساتھ ملایا ہے۔ ان تمام اجلاسوں میں خواہ وہ کچی آبادیوں میں منعقد ہوئے ہوں یا پنج ستارہ ہوٹلوں میں ایک مطالبہ مشترک تھا کہ بلدیاتی انتخابات فوراً کرائے جائیں اور منتخب کاؤنسلروں کو کراچی کی بحالی کے منصوبوں اور ترقیاتی پروگراموں میں مؤثر طور پر شریک کیا جائے۔ اس شہر سے وابستگی کے احساس کا اتنی شدت سے اظہار اس سے پہلے کبھی نہیں کیا گیا تھا، اور پاکستان کے کسی بھی شہر میں صورت حال کو سدھارنے کی خواہش کی اتنی پرزور وکالت بھی اس سے پہلے کبھی نہیں کی گئی۔

تاہم، اس بات کو بھی ذہن میں رکھ لینے کی ضرورت ہے کہ بلدیاتی انتخابات اپنے طور پر کراچی کے بحران کا حل نہیں ہیں، اور انتخابات کے دوران اور اس کے فوراً بعد پیدا ہونے والے احساس مسرت کا خاتمہ مایوسی پر ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ نظام میں بلدیاتی اداروں کو شہری حکومت (city government) کے طور پر کام کرنے کے لیے ضروری اختیارات نہیں دیے گئے ہیں۔ منتخب بلدیاتی ادارے صرف اس صورت میں مؤثر طور پر اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں جب ان کا صوبائی ترقیاتی ایجنسیوں اور صوبائی بیوروکریسی کے ساتھ اشتراک کار ہو، یا وہ اپنے محصولات وصول اور خرچ کرنے کا اختیار رکھتے ہوں اور انہیں صوبے میں برسراقتدار پارٹی کا تعاون حاصل ہو۔ سندھ کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر یہ ایک ناممکن مطالبہ ہے۔ اور اگر کسی طرح کراچی میں اعتماد کی یہ فضا پیدا بھی ہو جائے تو اس امر کی ضمانت نہیں ہے کہ وہ پائیدار بھی ثابت ہوگی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ بلدیاتی اداروں کے پاس تکنیکی اور انتظامی پیشہ ورانہ صلاحیت موجود نہیں ہے۔ اس کے باوجود کراچی کے شہریوں کا مطالبہ بالکل بجا ہے، لیکن یہ مؤثر لوکل گورنمنٹ کی غیر موجودگی میں، اور باشندوں کی عملی شرکت کے بغیر، شہر میں واقع ہونے والی معاشرتی اور اقتصادی تبدیلیوں کو اداروں کی صورت نہیں دی جا سکتی۔

شہر کی موجودہ طبعی، معاشرتی اور اقتصادی صورت حال کے بارے میں کراچی کے باشندوں کی اس تشویش کو ضائع نہیں ہونے دیا جانا چاہیے، ورنہ معاشرے میں مزید تشدد اور انتشار پیدا ہوگا۔ اگر حکومت

Scanned with CamScanner

شہریوں کے اس جذبے کا تعمیری استعمال کرنے سے قاصر ہے تو کراچی کے باشندوں کو خود عملی قدم اٹھانا چاہیے۔ غیر سرکاری تنظیمیں، پیشہ ور انجمنیں، کمیونٹی گروپ اور تاجر برادری کے نمائندے ایک تکنیکی ایجنڈے پر متفق ہو سکتے ہیں۔ وہ شہر کے معاملے سے دلچسپی رکھنے والے تمام گروپوں کی ایک وسیع الاساس (broad-based) تنظیم قائم کر سکتے ہیں، اور موثر شہری حکومت قائم کرنے کے لیے انتظامیہ پر اجتماعی دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ اپنے معاملے کو حقیقت پسندانہ اور قابل عمل بنانے کے لیے انہیں ایک کمیٹی بنانی چاہیے جس کے اراکین کو ان کی خدمات کے لیے معاوضہ ادا کیا جائے۔ اس کمیٹی کو یہ ذمہ داری سونپی جائے کہ تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے عملی تجاویز پیش کرے۔ ان تجاویز میں کراچی میں موثر شہری حکومت قائم ہونے کے نتیجے میں ملک اور صوبے کی سیاست پر پڑنے والے اثرات کو مد نظر رکھنا خاص طور پر ضروری ہوگا۔ ان تجاویز کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی جائے اور کراچی سے منتخب ہونے والے قومی اور صوبائی اسمبلی کے اراکان اور منتخب یا نامزد کاونسلروں کو ان سے وسیع طور پر آگاہ کیا جائے، تاکہ ان کو شہر کے تمام بلدیاتی، صوبائی اور قومی انتخابات میں ایک اہم نکتے کے طور پر پیش کیا جائے۔ شہری حکومت فوری یا آسانی سے حاصل نہیں ہوگی۔ اس عرصے میں شہریوں کو (منتخب یا نامزد) کاونسلروں اور عوام کے درمیان رابطے کو مضبوط کرنا ہوگا اور اپنے محلوں میں خود انحصاری ترقیاتی ماڈل کے اصولوں کو اختیار کرنا ہوگا۔ کراچی میں ایسے ماڈل کے کامیابی سے چلنے کی ایک مثال اورنگی پائلٹ پروجیکٹ ہے۔

مندرجہ بالا ایجنڈے کے دو حصے ہیں۔ تبدیلی ہمیشہ اس وقت آتی ہے جب سیاست داں، انٹرسٹ گروپ اور شہری عوام کسی متفقہ نتیجے پر پہنچتے اور قابل عمل متبادل دریافت کرتے ہیں۔ متبادل ہمیشہ شہر کے انٹرسٹ گروپ اور عوام پہلے دریافت کرتے ہیں، اور وہی ان کے نفاذ پر اصرار کرتے ہیں۔ کسی تبدیل شدہ صورت حال سے نمٹنے کے لیے موثر اور سب سے موزوں انتظامی قدم ہمیشہ معاشرے کے معاشی اور اقتصادی رجحانات کو سمجھنے اور ان کا ساتھ دینے کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ کراچی میں ایک بڑا معاشرتی انقلاب رونما ہو چکا ہے۔ کراچی کے باشندوں اور ان کے نمائندوں کا کام ہے کہ وہ ان تبدیلیوں کی مطابقت سے موزوں ادارے قائم کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔ ان معاشرتی تبدیلیوں کا ساتھ دینے سے پہلوتہی کرنے کا نتیجہ مزید انتشار اور خون خرابے کی صورت میں برآمد ہوگا۔

کراچی کی صورت حال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان میں سے اکثر تحریریں سیاسی بیان بازی اور ماتم پر مشتمل ہیں۔ متعدد تحریروں میں معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی صورت حال کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے۔ چند ایک تحریروں میں شہری انتظامی ایجنسیوں، عدالتی نظام اور بلدیاتی اداروں کی تشکیل نو سے متعلق تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ کراچی کے مسائل کے مختلف عناصر کا لحاظ کرتے ہوئے صورت حال کا واضح تجزیہ کیا جائے۔ اس طرح سے چار اہم امور سامنے آتے ہیں۔

(۱) کراچی کے باشندے ملک کے سیاسی عمل سے مکمل طور پر علیحدہ کر دیے گئے ہیں اور اقتدار

[illegible] سیاسی پارٹی کو [illegible]
[illegible] ووٹ [illegible] علم و تشدد [illegible]

۲۔ [illegible] شہری [illegible]
[illegible] شہر کے [illegible] سیاست [illegible]
[illegible] متعدد قومی [illegible]
[illegible] قومی [illegible] شہر کی حقیقی [illegible]
[illegible] علم و تشدد کے لیے استعمال [illegible]
[illegible]
وہ کسی نظم و ضبط کے پابند نہیں ہیں۔

۳۔ [illegible] شہر [illegible]
[illegible] سیاسی
اور اقتصادی منظر [illegible] مختلف [illegible]
[illegible]
[illegible] علم و [illegible]

* * *

[illegible] کتنا ہی مستحکم کیوں نہ ہو، ایسا نہیں رہ سکتا [illegible]
[illegible]
[illegible]

ایسی صورت میں شدت پسند — جو سیاسی [illegible] سب پارٹیوں کی [illegible] ہونے میں حالات سے [illegible] کو [illegible] کرتے رہتے ہیں۔ تاریخ میں [illegible] متعدد [illegible] جیسی [illegible] پشیمانی اور [illegible] حالات سے [illegible] رہے ہیں۔

کراچی میں انتشار کا عمل قیام پاکستان کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا [illegible] موجودہ صورت حال ۱۹۸۰ کے عشرے سے شروع ہوئی ہے۔ [illegible] کے مافیا کا علاقائی ہیڈکوارٹر بن گیا۔ مافیا کے بعد ہی شہر کی معیشت اور سیاست میں [illegible] اس طرح انتظامی امور میں [illegible] سرپرستی کی۔ [illegible] مارشل لا حکومت نے شہر کے [illegible] کو [illegible] سیاسی حکومت کی مخالف [illegible] استعمال کیا جائے۔ [illegible] کے علاوہ [illegible] اور [illegible] سیاسی [illegible] کے لیے [illegible] ۱۹۸۰ کے عشرے میں [illegible] شہری زندگی کا [illegible] سیاسی [illegible] کراچی کی انتظامی اور شہری [illegible] اس عمل کی [illegible] مارشل لا کے خاتمے کے بعد [illegible] کراچی کی [illegible] سیاسی [illegible] پیپلز پارٹی [illegible] الطاف [illegible] صورت میں [illegible] دوسری [illegible] کراچی کے [illegible] شہری [illegible] دینا بھی اسی کی ایک مثال ہے۔

[illegible] کے بعد [illegible] مہاجر [illegible] جانے سے پیدا ہونے والے مسائل پر کسی جانب سے [illegible] موقف [illegible] نہیں کیا گیا؛ تمام پارٹیوں ([illegible]) نے [illegible] کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے اور [illegible] لوگوں نے اب اس پر [illegible] چھوڑ دیا ہے۔ [illegible] کے سلسلے میں کراچی کے [illegible] دہشت گردوں کے خلاف آرمی ایکشن سے [illegible] تمام علاقوں سے [illegible] اور بہت [illegible] ہیں۔ [illegible] پیپلز پارٹی کے [illegible] کراچی کے بارے میں [illegible] کراچی کے سیاسی میدان میں [illegible] ایک بہت بڑی تعداد کا اضافہ ہو گیا ہے۔ کراچی کی

صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لیے مستحکم اقدامات کی ضرورت ہے جو صرف اسی وقت لیے جا سکتے ہیں جب تمام مختلف پارٹیوں کے قائدین، کراچی اور پاکستان کے عمومی مفاد کی خاطر اپنے ذاتی اور پارٹی مفادات سے بلند ہو سکیں۔

(۱) سب سے پہلے پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے درمیان رابطے کے لیے ایک سازگار فضا قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے اعتماد کی بحالی کے اقدامات حکومت کو کرنے ہوں گے اور ایم کیو ایم کو اس کا جواب اسی کے ساتھ دینا ہوگا۔ [illegible] اس کے لیے ایم کیو ایم کے رہنماؤں کے خلاف مقدمات کا واپس لیا جانا ضروری ہو تو حکومت کو اس پہلو پر بھی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ یہ عمل آسان نہیں ہوگا (اور یقیناً آخری مرحلہ بھی نہیں) اور دہشت گردی [illegible] مجرم [illegible] کیے جانے والوں سے کوئی [illegible] حکومت [illegible] کرے۔ اس مذاکرات میں پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کی لیڈرشپ سندھ میں شہری دیہی تفریق ختم کرنے [illegible] صورتِ حال سے [illegible] کرنے کا باقاعدہ ادارے کی صورت دینے پر اپنی توجہ مرکوز کرے۔ [illegible] سے [illegible] کا مطلب [illegible] سندھ کی تقسیم نہیں ہے، بلکہ بلدیاتی اداروں کو زیادہ اختیارات و خود مختاری دینے کی بنا پر ضروری ہے کہ جو [illegible] جائیں وہ سیاسی طور پر حقیقت پسند، انتظامی اعتبار سے قابلِ عمل اور اقتصادی اور آبادیاتی لحاظ سے پائیدار و خود کفیل ہوں۔

(۲) کراچی کی انتظامیہ جو منتخب اداروں پر مشتمل ہو اس کی تشکیل نو کی جائے کیونکہ اس کے بغیر پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے درمیان کوئی بھی معاہدہ کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ حکومت کو چاہیے کہ چیف سیکرٹری، کمشنر [illegible] سیکریٹری بلدیات [illegible] ڈپٹی کمشنر [illegible] کے ایم سی کے سربراہ [illegible] کا تقرر ایم کیو ایم کی رضامندی سے کیا جانا چاہیے۔ [illegible] ان [illegible] صورت میں کام [illegible] کراچی کی انتظامیہ اور شہری ایجنسیوں کی مکمل تشکیلِ نو کا عمل [illegible] بنایا جائے۔ اس صورت میں [illegible] وسیع اختیارات دیے ہوں گے [illegible] منتخب [illegible] سے [illegible] ہوں [illegible] کرنے کے مجاز ہوں۔ حکومت اور ایم کیو ایم دونوں ان عہدوں پر [illegible] کی [illegible] کریں۔ ان عہدوں کی [illegible] شہری مفادات [illegible] رکھنے والی غیر سرکاری تنظیموں، [illegible] پر مشتمل شہری کمیٹیاں قائم کی جائیں۔ ان تمام اقدامات کی نگرانی ایک غیر جانبدار [illegible] پیپلز پارٹی کے معاہدے کے نفاذ کی بھی نگرانی کرے۔ [illegible] کا [illegible] شہر کے باشندے [illegible] صرف [illegible] کے علاوہ [illegible] بھی کریں گے۔

(۳) بلدیاتی اداروں [illegible] شہری انتظامیہ کی تشکیلِ نو کے بعد [illegible] اور بحالی کا عمل شروع ہونے کے ۱۸ ماہ کے اندر اندر [illegible] منعقد کرا دیے جائیں۔

(۴) بلدیاتی اداروں کے ڈھانچے میں مناسب تبدیلی کی جائے۔ لوکل گورنمنٹ کو ترقیاتی منصوبے تیار اور نافذ کرنے اور محصولات جمع کرنے کا اختیار دیا جائے اور اس کی رقم قائم رکھنے کے عمل میں ایک فریق کے طور پر شریک کیا جائے۔ منتخب کاؤنسلوں کے دائرے کو زیادہ مستحکم بنایا جائے اور بستیوں جیسے علاقوں میں شہری سہولتوں کی منصوبہ بندی کرنے اور عمل میں لانے کا راست یا بالواسطہ ذمہ دار بنایا جائے۔

اگر کراچی کی صورتِ حال کے تمام فریق دیانت داری سے اس بدقسمت شہر کو پُرامن بنانے کی خواہش رکھتے ہیں تو انھیں اس قابلِ عمل پیکج کو مکمل طور پر نافذ کرنا ہوگا۔ پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے درمیان کوئی مفاہمت شہر کی انتظامیہ کو نئی شکل دیے بغیر شہر کے مسائل حل نہیں کر سکتی۔ حکومت کی جانب سے غیر قانونی تارکینِ وطن پر سختی یا محلہ کمیٹیوں کو فروغ دینے کی کوششیں نہ صرف ناکام ہوں گی بلکہ ان اقدامات سے صورتِ حال اور زیادہ بگڑ جائے گی۔ اوّل الذکر اقدام کے نتیجے میں بے بس شہریوں سے بڑے پیمانے پر جبری رشوت کی وصولی کا عمل تیز ہوگا جو ان میں اور زیادہ احساسِ بے گانگی پیدا کرے گا۔ دوسرے اقدام سے بیشتر صورتوں میں محلے کی سطح پر نئے مافیا وجود میں آئیں گے جنھیں قانون نافذ کرنے والے بدعنوان عنصروں کی سرپرستی حاصل ہوگی۔ بلدیاتی انتخابات کا انعقاد ہی وہ واحد طریقہ ہے جس سے کراچی کے لوگ اقتدار میں شرکت حاصل کر سکتے ہیں۔

کراچی جیسی صورتِ حال کسی معیار سے پاکستان میں ہر شہر میں موجود ہے۔ سیاسی عمل سے کاٹ دی گئی آبادیاں اور بدعنوان اور نااہل انتظامیہ ہر شہر میں موجود ہے۔ بحران کے موقعے پر ہر شہر میں کراچی جیسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ کراچی کی صورتِ حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے مندرجہ بالا اقدامات کامیاب ہو کر پورے پاکستان کے لیے مثال بن سکتے ہیں۔ جو کوئی اس ملک کے رہنماؤں میں سے پہلے ان اقدامات پر عمل کر سکے گا اسے تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔

***

بحران کی شدت

کراچی آتش فشانوں میں گھرا ہوا ہے۔

(اختر حمید خان (۱۹۸۳) میں کراچی کی کچی آبادیوں سے متعلق ایک بیان۔)

کراچی کی صورتِ حال کی رپورٹوں کے مطابق گزشتہ ڈیڑھ سال کے عرصے میں بیسیوں افراد پولیس کی حراست میں مارے گئے، بہت سے افراد ماورائے عدالت پولیس مقابلوں میں ہلاک کیے گئے اور ۱۲ سے ۶۰ سال تک کی عمر کے بچوں، مردوں اور عورتوں کو قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں نے زد و کوب کیا اور ان

کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر انہیں نامعلوم مقامات پر لے جایا گیا جہاں نقاب پوش مخبروں نے ان کی شناخت کر لی۔ ان کارروائیوں میں اکثر لوگوں کو ان کی مرضی کے خلاف اپنی قمیصیں اتارنے کا حکم دیا گیا اور ان کی آنکھوں پر انہیں قمیصوں سے پٹی باندھ دی گئی۔ حراست میں لیے جانے والے متعدد افراد کو کئی گھنٹوں تک ان کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی رہیں اور اس دوران ان کو پانی اور کھانا اور رفع حاجت کے لیے جانے نہ دیا گیا۔ کئی لوگوں نے اپنی شلواروں میں پیشاب کر دیا۔ اس کے علاوہ کراچی میں پوچھ گچھ کے دوران کئی نوجوانوں کی ہلاکتیں ہو گئیں۔

ہمیں آپریشن والے تمام علاقوں سے ایک جیسی شکایتیں موصول ہوئی ہیں۔ قانون نافذ کرنے والے اہلکار رات کو گھر کا دروازہ توڑ دیتے ہیں، وہ عورتوں کو گالیاں دیتے اور ذلیل کرتے ہیں، اور بہت سے موقعوں پر گھر سے نقدی اور قیمتی اشیا بھی لے جاتے ہیں۔ کئی لوگوں نے بتایا کہ انہوں نے اپنے گھر کے افراد کو رہا کرانے کے لیے قانون نافذ کرنے والوں کو پچاس ہزار روپے تک رشوت کے طور پر ادا کیے ہیں۔ حراست کے دوران ان لوگوں پر اتنا تشدد کیا گیا کہ ان میں سے کم ہی اپنے پیروں پر چل کر گھر واپس پہنچ سکے۔ کئی افراد جنہوں نے قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں یا ان کے دلالوں کو رشوت دی ہے، بتاتے ہیں کہ یہ رقم انہوں نے اپنی قیمتی اشیا (زیادہ تر زیورات) فروخت کر کے یا مہاجنوں سے ادھار لے کر یا ۱۰ سے ۱۵ فیصد ماہانہ کی شرح پر پیشہ ور سود خوروں سے قرض لے کر ادا کی۔ انہیں نہیں معلوم کہ وہ یہ قرض کس طرح ادا کریں گے۔

اس کے علاوہ گرفتار شدہ افراد کا پتہ لگانا بھی سخت دشوار کام ہے۔ کئی کئی دن دلالوں سے گفت و شنید میں گزر جاتے ہیں (یہ دلال قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں اور لوگوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہوتے ہیں اور اپنی خدمات کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں)۔ گھر والوں کو انتظامیہ اور ان کے دلالوں کی طرف سے بار بار بتایا جاتا ہے کہ ان کے گھر کے زیر حراست فرد کے دہشت گرد ہونے کا ناقابل تردید ثبوت موجود ہے اور اسے موت کی سزا ہو سکتی ہے۔ ان جرموں کی وجہ سے رشوت کی رقم بڑھ جاتی ہے۔ شہریوں کا کہنا ہے کہ رشوت کی رقم کا تعین گرفتار شدہ افراد کی مالی حالت اور انتظامیہ یا حکومت کے حامی سیاست دانوں تک رسائی کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔

محلوں میں متعدد ڈکیتیاں ہوتی ہیں۔ مسلح افراد جو کبھی کبھی چہرہ ڈھانپے ہوتے ہیں گھروں میں داخل ہو جاتے ہیں اور قیمتی اشیا اور نقدی لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ پولیس ملوث ہوتی ہے کیونکہ تمام مشتبہ افراد بچ نکلتے ہیں۔ لوگ خوف کے باعث پولیس کو رپورٹیں درج نہیں کراتے۔ شہر کی انتظامیہ کا مقصد حاصل ہو گیا ہے۔

جن علاقوں میں محاصرے کیے گئے ہیں وہ غریب اور محنت پیشہ طبقوں کے علاقے ہیں۔ ان باشندوں کا قومی اسمبلی میں کوئی نمائندہ نہیں ہے، ان کے صوبائی اسمبلی کے رکن اور کاؤنسلر یا تو قید میں ہیں یا روپوش ہیں؛ پاکستان کے دوسرے علاقوں کے باشندوں کے برخلاف، ان کا کوئی سردار، پیر یا کوئی چودھری نہیں ہے، نہ جرگے یا پنچایت کی طرح کا کوئی ادارہ ہے جو ان کے اور حکومتی ایجنسیوں کے درمیان رابطے کا کام انجام دے سکے۔

پولیس اور رینجروں کی کارروائیوں کی وجہ سے ان علاقوں کے متموّل اور نسبتاً بااثر باشندے، جو ان حالات میں رابطے کا کام کر سکتے تھے، ان علاقوں کو چھوڑ چکے ہیں یا چھوڑنے والے ہیں۔ ان علاقوں میں مکانوں کی قیمتیں تیزی سے گری ہیں (جبکہ پُرامن علاقوں میں مکانوں کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے) اور ان میں سے بعض علاقوں میں ۳۰ فیصد کے قریب مکان خالی پڑے ہیں۔ اثر و رسوخ رکھنے والے باشندوں کے چلے جانے سے ان علاقوں کے رہنے والے پولیس کے خوف زدہ کرنے، جبری رشوت وصول کرنے، مافیا کے استحصال، ایم کیو ایم، ایم کیو ایم (حقیقی) سے اور کے ای ایس سی کی بے حسی اور بدعنوانی، اور دکانوں اور ٹھیکے داروں کی غنڈہ گردیوں کے مقابل خود کو بالکل بے دفاع سمجھنے لگے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: "اب تو کوئی فریاد سننے والا بھی نہیں رہا۔"

کراچی میں حکومت سے وابستہ یا غیر وابستہ کچھ حلقے پولیس اور رینجروں کی کارروائیوں کی مکمل حمایت کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کارروائیوں کی وجہ سے سیاسی دہشت گردی کی کمر ٹوٹ گئی ہے اور انھیں جاری رکھ کر دہشت گردی کا مکمل خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جن علاقوں میں محاصرے کیے جا رہے ہیں وہاں دہشت گردوں کی حمایت کی جاتی ہے، چنانچہ ان علاقوں کو اس بات کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ اس کے علاوہ بعض لوگ ایسے ہیں جو ماورائے عدالت ہلاکتوں (extra judicial killings) کو بھی درگزر کرنے کو تیار ہیں۔ ان کی دلیل ہے کہ اگر قانونی تقاضوں کا خیال رکھا جائے تو استغاثے کی نااہلی اور بدعنوانی، اور زیرِ حراست مجرم گروہوں اور سیاسی اسٹیبلشمنٹ سے قریبی رابطوں، کی وجہ سے بیشتر گرفتار شدہ مجرم عدالتوں سے بری ہو جائیں گے۔ وہ اس بات کی شہادت میں کئی نظیریں بھی پیش کرتے ہیں۔

تاہم، اس طرح کی رائے رکھنے والے دو اور ممکنوں کو نظرانداز کر رہے ہیں: (۱) پاکستان کے سیاسی اور انتظامی کلچر اور کراچی میں بدامنی کی صورت حال کے پیش نظر لوگوں کو قتل کرنے کی آزادی کا لازماً سیاسی انتقام لینے کی غرض سے استعمال ہوگا اور اس کے نتیجے میں موجودہ سیاسی اور انتظامی طریق کار کو پس پشت ڈال کر لوگوں کا بدترین استحصال کیا جائے گا۔ اخباری رپورٹوں اور شہر کے مضافاتی (peri-urban) علاقوں سے ملنے والی خبروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ قتل کرنے کی آزادی کا بے روک ٹوک استعمال بڑھ رہا ہے۔ اگر یہ خبریں درست ہیں اور اگر یہ عمل جاری رہتا ہے تو تاریخ یہی بتاتی ہے کہ اس کے ردعمل میں اہم سیاسی تغیر یا انقلاب رونما ہوتا ہے۔

(۴) ۔ کراچی کی صورت حال کی بنیادی وجوہ [illegible] مہاجر حلقوں میں احساس محرومی، ایک موثر شہری [illegible] کی عدم موجودگی، مہاجر نوجوانوں کا [illegible] اور سادہ لوحی [illegible] مہاجر لیڈر شپ کی [illegible] میں [illegible] ہیں۔ [illegible] کا [illegible] ہے، [illegible] سیاست [illegible] افغان جنگ کی باقیات یا شہر میں موجود مختلف ایجنسیوں کی [illegible] مداخلت [illegible] ہے۔

[illegible] موجودہ کراچی کی صورت حال [illegible] ہوئے ہیں۔ لیکن اس صورت حال کی بنیادی وجہ شہری [illegible] پاکستان [illegible] حکومت [illegible] بیوروکریسی [illegible] تعصب [illegible] ہے۔ یہ تضاد [illegible] احساس علیحدگی کے پیدا ہونے [illegible] شہر کے بیچ [illegible] طبقے [illegible] ہے۔ یہ علیحدگی کا احساس پاکستان کے دوسرے شہروں میں بھی [illegible] ہے۔ [illegible] کی شکل میں اظہار نہیں ہوا ہے۔ [illegible] احساس علیحدگی کی [illegible] مہاجر [illegible] کا ساتھ دیتے [illegible] حکومت [illegible] کے باعث زیادہ تر غیر مہاجروں سے اپنا تعلق قائم نہیں رکھتے اس کے باوجود [illegible] کسی [illegible] غیر مہاجر آبادی [illegible] کے خلاف پولیس [illegible] کی کارروائیوں کی حمایت نہیں کی ہے۔

[illegible] حکومت اور کراچی کے بیچلے درمیانہ طبقے کے درمیان [illegible] ۱۹۹۲ میں [illegible] پاکستان [illegible] جب [illegible] کا اظہار کیا۔

[illegible] درمیانہ طبقے کی آبادی جو ۱۹۷۳ میں [illegible] کل آبادی کا ۱۲.۵ فیصد تھی، ۱۹۸۹ [illegible] کی آبادی کے ۳۱ فیصد تک پہنچ چکی تھی۔ [illegible] ۱۹۸۰ میں یہ تعداد [illegible] ۱۹۸۹ [illegible] طبقوں کی محرومیاں [illegible] کا سیاسی اظہار [illegible] کچی آبادیوں [illegible] (سرکاری شمار کے مطابق) ۴۰ فیصد [illegible] ۵۰ فیصد تک شہری کچی آبادیوں میں رہتے ہیں۔ گزشتہ [illegible] ۹ فیصد [illegible] جب [illegible] کی آبادی میں مجموعی [illegible] کی [illegible] کچی آبادیوں کے بیشتر مکین مہاجر ہیں جبکہ [illegible] آبادیوں [illegible] شمالی علاقوں سے آنے والے لوگ بھی [illegible] تعداد میں شامل ہیں

کچی آبادیاں اس لیے وجود میں آتی ہیں کہ حکومت نچلے درمیانہ اور مزدور طبقے کو معقول قیمت پر اور باقاعدہ طریقے سے رہائشی زمین فراہم نہیں کر سکتی۔ ان کے لیے واحد راستہ دلالوں سے (جن کو بدعنوان سرکاری افسروں کی پشت پناہی حاصل ہے) غیر قانونی طور پر ڈویلپ کی ہوئی زمین خریدنے کا ہے۔ کچی آبادیوں میں ابتدائی پانچ سے دس سال تک ہر قسم کا استحصال ہوتا ہے۔ اس رقم کا بڑا حصہ جو کچی آبادیوں کے باشندے دلالوں کو ادا کرتے ہیں، پولیس اور متعلقہ حکومتی ایجنسیوں کے اہلکاروں کو پہنچتا ہے۔ تاہم، ایک وقت گزرنے پر بھی پولیس کے دلالوں کے ہاتھوں جبری وصولی کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ جب کچی آبادی میں کوئی شخص اپنی زمین کے گرد پکی دیوار اٹھاتا ہے یا مکان میں لینٹر ڈلواتا ہے، تو تھانے کے دلال فوراً وصولی کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ جب کوئی اپنے مکان کو پکا کراتا ہے، خاص طور پر جب کنکریٹ کی چھت ڈالی جا رہی ہوتی ہے، تھانے کے دلال دوبارہ آ کر رقم وصول کرتے ہیں۔ جب کسی علاقے کے تھانے کو رقم کی ضرورت ہوتی ہے، نئی کچی آبادیوں کو ڈھا دینے کی دھمکی دی جاتی ہے، اور اس دھمکی کو مزید موثر بنانے کے لیے چند مکان ڈھا بھی دیے جاتے ہیں۔ آبادی کے باشندے پھر پیسے جمع کرتے ہیں اور دلال کے حوالے کرتے ہیں۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ ابتدائی پانچ برسوں میں کچی آبادیوں کے غریب مکین کم از کم پندرہ سے بیس ہزار روپے تک مختلف ایجنسیوں کے دلالوں کو رشوت کے طور پر ادا کرتے ہیں تاکہ اس زمین پر سکون سے رہ سکیں جس کے لیے دلالوں کو تین ہزار سے پندرہ ہزار روپے تک ادا کیے ہیں۔

یہ کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ بجلی کے کنکشن کا ڈیمانڈ نوٹ حاصل کرنے کے لیے کچی آبادیوں کے باشندوں کو ساڑھے تین ہزار روپے رشوت دینی پڑتی ہے۔ ڈیمانڈ نوٹ مل جانے کے بعد بعض اوقات دس ہزار روپے تک کنکشن دینے کے لیے رشوت کے طور پر طلب کیے جاتے ہیں۔ ایسی بھی مثالیں ہیں کہ رشوت دینے کے بعد بھی چار سال تک کنکشن نہیں دیا گیا۔ یہ بھی عام ہے کہ کنکشن دینے کے بعد اسے منقطع کر دیا گیا اور لوگوں کو کے ای ایس سی اور تھانے کے دلالوں نے مجبور کیا کہ وہ کنڈا سسٹم کے تحت چوری کی ہوئی بجلی حاصل کریں۔ اس کے لیے انہیں مستقل بھتا ادا کرنا پڑتا ہے اور اکثر انہیں کنڈے کٹ جانے کا خوف دلا کر ان سے مزید رقم وصول کی جاتی ہے۔

ایک عام طریقہ یہ بھی ہے کہ علاقے میں پانی کی فراہمی منقطع کر دی جاتی ہے اور پھر باشندوں سے پانی بحال کرنے کے لیے رقم وصول کی جاتی ہے۔ سندھ کچی آبادی اتھارٹی (SKAA) کے لیے اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے کیے ہوئے ایک سروے سے ظاہر ہوتا ہے کہ غریب آبادیوں کے لیے مختص پانی زیادہ آمدنی والے علاقوں کو منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ موسم سرما کے دنوں میں خوشحال علاقوں میں جمع ہونے والے بارش کے پانی کا رخ نشیبی کچی آبادیوں کی طرف موڑ دیا جاتا ہے۔

ان آبادیوں کے رہنے والے اپنے مسائل سے بخوبی واقف ہیں، مگر ان مسائل کے حل کے لیے ان کی منظم کوششیں اس لیے ناکام رہتی ہیں کہ انہیں متعدد اداروں تک کسی بھی سطح پر رسائی حاصل

Scanned with CamScanner

نہیں ہے۔ ان دنوں میں جب لوگوں کی نمائندگی منتخب کاؤنسلروں کے ذریعے ہو رہی تھی، صورت حال میں تھوڑی سی بہتری آئی تھی۔

کچی آبادی والے علاقوں کے لیے ایک اہم پیش رفت حکومت کا کچی آبادی ریگولرائزیشن اینڈ امپروومنٹ پروگرام ہے تاہم یہاں بھی رشوت ستانی کا زور ہے۔ سوائے سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے تحت چلنے والی اسکیموں کے، باقاعدہ طریقوں سے لیز کا حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ یہ دلالوں کے ذریعے تقریباً ساٹھ ہزار روپے دے کر حاصل کی جاتی ہے، جبکہ اس کی سرکاری قیمت دو ہزار سے تین ہزار روپے تک ہے۔ اس کے علاوہ ریگولرائزیشن پروگرام نے دلالوں، سیاست دانوں اور حکومت کے اہلکاروں، پولیس کی حمایت سے لوگوں کو اچھے مقامات پر بسے ہوئے اپنے مکانوں سے دست بردار ہونے پر مجبور کرتے ہیں۔ اسی طرح رفاہی پلاٹوں پر قبضہ کر لیا جاتا ہے اور آخر کار ان قبضوں کو سیاست دانوں، سرکاری عہدیداروں اور مفادات رکھنے والے مقامی گروہوں کے گٹھ جوڑ سے ریگولرائز کر دیا جاتا ہے۔

کچی آبادیوں میں کسی بھی قسم کا کاروبار شروع کرنے اور جاری رکھنے کے لیے پولیس کو بھتہ دینا پڑتا ہے۔ عام طور پر کاروبار کی شرح نمو کے ساتھ ساتھ بھتے کی رقم میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ کچی آبادی میں ایک چھوٹے کھوکھے سے روزانہ تیس سے سو روپے تک بھتہ لیا جاتا ہے۔ ایک حالیہ سروے سے معلوم ہوا ہے کہ صرف صدر کے علاقے میں پولیس اور سرکاری انتظامیہ دکان داروں، ہاکروں اور ٹرانسپورٹروں سے گیارہ کروڑ روپے ماہانہ بھتہ وصول کرتی ہے۔

شہر کی زیادہ غریب کچی آبادیوں میں وڈیو ہال، جوئے کے اڈے اور جسم فروشی کے خفیہ اڈے قائم ہیں۔ ان کے چلانے والوں کا اصرار ہے کہ در حقیقت قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں اس کاروبار میں شریک ہیں۔ ان کے دعوے کی تصدیق ذرائع ابلاغ کو حاصل ہونے والی پولیس کی دستاویزات سے ہوتی ہے جس کے بارے میں اخباروں میں کئی رپورٹیں شائع ہوئی ہیں کہ کس طرح منشیات کے خلاف مہم چلانے والے کارکنوں کو قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں نے ہلاک کر دیا۔

نچلی درمیانی آمدنی والے افراد کو اپنا کاروبار شروع کرنے کے لیے قرضوں اور تکنیکی امداد تک رسائی حاصل نہیں ہے۔ ان کو کھلے بازار میں سرمایہ کاروں اور سود خوروں سے ۱۰ سے ۱۵ فیصد ماہانہ کی شرح پر قرض لینا پڑتا ہے۔ اس طرح ان کی کاروباری سرگرمیاں محدود ہو جاتی ہیں اور ان میں کام کرنے والے مزدوروں کا استحصال ہوتا ہے۔ کراچی ماسٹر پلان کے سروے کے مطابق شہر میں ۷۵ فیصد روزگار غیر رسمی سیکٹر فراہم کرتا ہے۔ اس کی تصدیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ صرف اورنگی میں چالیس ہزار چھوٹے تجارتی اور صنعتی یونٹ قائم ہیں۔

اس استحصالی صورت حال کا کراچی کے بالائی طبقے کو کوئی علم نہیں۔ کراچی میں ایک رجسٹرڈ کار شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بغیر کسی پریشانی کے چلائی جا سکتی ہے، مگر کوئی شخص موٹر سائیکل پر ہو اور اس کے کاغذات درست اور مکمل بھی ہوں، تب بھی پولیس کو رشوت دیے بغیر نہیں گزر

سکتا۔ بہت سے دفتروں میں جہاں شام کو دیر تک کام ہوتا ہے، موٹر سائیکلوں پر آنے جانے والے ملازمین گھر واپس جانے کے بجائے دفتر میں سو رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، کیوں کہ رات کو سفر کرنے کی صورت میں انھیں پولیس کو پچاس روپے سے دو سو روپے تک رشوت دینی پڑتی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی، خاتون دوست یا خاتون رشتہ دار کے ساتھ موٹر سائیکل پر سفر کر رہا ہو تو رشوت کی رقم اور زیادہ ہو جاتی ہے کیوں کہ رشوت ادا نہ کرنے کی صورت میں تھانے لے جانے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور عموماً اپنی آمدنی کا ایک تہائی حصہ پولیس کو بھتے کی صورت میں ادا کرتے ہیں۔ باہر سے کراچی آنے والے غریب لوگ جو مختلف اشیائے صرف فروخت کرنے کے لیے ٹھیلے لگاتے ہیں، انھیں پولیس کو کثیر رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ رکشا ڈرائیوروں، ٹھیکے پر چلنے والی سوزوکیوں اور پرانی کاروں سے بھی بھتا وصول کیا جا رہا ہے۔

کراچی کی کچی آبادیوں میں ایک غیر سرکاری تنظیم کے تحت ہونے والی بیٹھک میں لوگوں کو اپنے بچوں کو کام پر بھیجنے کے بجائے سکولوں میں داخل کرنے کی ترغیب دلائی گئی تھی۔ ایک باشندے نے کہا: اگر ہم انھیں سکول جانے دیں تو پولیس اور سرکاری اداروں کا پیٹ کیسے بھریں گے؟ کچی آبادیوں اور نچلے درمیانہ طبقے کے لوگوں کا ایمان ہے کہ ان سے ہتھیائی ہوئی رقموں کی وجہ سے سیاست دانوں کے خاندانوں اور سرکاری ملازموں کی دولت کی ریل پیل ہو رہی ہے۔

کراچی میں کوئی سیاسی مسئلہ پیدا نہ ہوتا اگر کچی اور درمیانہ آمدنی والے طبقوں اور محدود پیشہ لوگوں نے اپنے استحصال کو خاموشی سے گوارا کر لیا ہوتا۔ تاہم، ایسا نہیں ہوا ہے۔ وہ بہتر معاشی و معاشرتی زندگی کے لیے متواتر جدوجہد کر رہے ہیں۔ شہر میں ایم کیو ایم کے وسیع ووٹ بینک کے موجود ہونے کے دو اسباب ہیں: اول، قومی سیاسی پارٹیوں کی لیڈرشپ، ایم کیو ایم کے برخلاف، درمیانہ یا پست طبقے سے تعلق نہیں رکھتی اور نہ واضح طور پر ان لوگوں کے مسائل حل کرنے سے کوئی دلچسپی رکھتی ہے۔ دوم، مناسب شہری اداروں کی عدم موجودگی۔ اس عدم موجودگی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خلا نے لوگوں کے درمیان لسانی اور نسلی بنیاد پر اتحاد کو مضبوط بنا دیا ہے۔

***

حل کہاں سے آئے گا؟

دہشت گردوں کے خلاف حالیہ مہم یا حکومت اور ایم کیو ایم کے درمیان مذاکرات کا جو بھی نتیجہ نکلے، کراچی میں طویل مدت اس شہر میں رونما ہونے والے معاشرتی انقلاب کو سیاسی طور پر مستحکم کیے

Scanned with CamScanner

سے حاصل نہیں ہوگا۔ یہ معاشرتی تبدیلیاں اس وقت تک مستحکم نہیں ہو سکتیں جب تک اس شہر کے باشندے اور شہر کی ترقیات اور ایک موثر رول کو درست کرنے کے لیے ایک تفصیلی خاکہ تیار نہ کریں۔ اس کام کے [illegible] کی بنیاد کے بعد انہیں ان سیاسی جماعتوں اور تنظیموں کی حمایت حاصل کرنی ہوگی جو اس شہر کی نمائندگی کا دعویٰ کرتی ہیں۔ انہیں ان تنظیموں [illegible] بے شمار کمیونٹی تنظیموں اور غیر سرکاری تنظیموں سے بھی رابطہ قائم کرنا ہوگا۔ انہیں اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سیاسی طریق کار کے تحت جدوجہد کرنی ہوگی اور اس تحریک سے حاصل ہونے والے نتائج کی احتیاط سے نگہداشت کرنی ہوگی تاکہ [illegible] کی دوسری [illegible] کو روکا جا سکے۔ یہ کام شروع کرنے سے پہلے اس بات کو تسلیم کرنا لازمی ہے کہ کراچی میں شہری منصوبہ بندی اور انتظام کا موجودہ طریق کار [illegible] اور اداروں سے عدالت تشکیل کی [illegible] سے کی [illegible] انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے، اور یہ طریق حکومت اور شہر کے نچلے درمیانہ اور [illegible] طبقے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔

کراچی کی موجودہ صورت حال پاکستان میں پیش آنے والے بڑے بحران کا پیش خیمہ ہے۔ سرمایہ دارانہ [illegible] شہری آبادی میں اضافے اور [illegible] کے ساتھ ساتھ پرانے طبقاتی رشتے تبدیل ہو چکے ہیں۔ [illegible] اور [illegible] ایک خاص مقصد پورا کرنے کے لیے چنا تھا، اب اپنے سے زیادہ ترقی یافتہ گروہوں اور [illegible] سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس صورت حال سے [illegible] ہونے کے لیے [illegible] اور قدیم ادارے غیر متعلق، غیر موثر اور مکمل طور پر بدعنوان ہو چکے ہیں۔

* * *

نئی معاشرے کی سماجی اور اقتصادی حقیقتوں کا ریاست کے فرسودہ ڈھانچے اور انتظامی کلچر کے ساتھ تصادم جو پاکستان میں پیش آ رہا ہے کوئی انوکھی بات نہیں۔ تاریخ میں اس قسم کا شدید ترین تصادم [illegible] صدی کے یورپ میں پیش آ چکا ہے۔ [illegible] اس تصادم کا حل ــــ خواہ وہ صورت [illegible] انقلاب کی شکل میں [illegible] بورژوازی، طاقتور طبقوں یا اسٹیبلشمنٹ سے [illegible] پاکستان میں بھی ان سے موجودہ تصادم کا کوئی حل نکالنے کی توقع کرنا نادانی ہوگی۔

تبدیل شدہ معاشرتی و اقتصادی [illegible] اداروں کی شکل دینے کے لیے زمین ہموار کرنے کا کام [illegible] ادیب اور مفکر سماجی [illegible] کا موضوع بناتے ہیں، [illegible] کی مضبوط حل کی سمت [illegible]

کرتے ہیں۔ پیشہ ور ماہرین کی انجمنیں بھی کارکردگی کو عوام کے نقطۂ نظر سے پرکھتی ہیں اور صحت، قانون، انجینیرنگ، منصوبہ سازی اور دوسرے میدانوں میں ایسے متبادل طریقے وضع کرتی ہیں جو معاشرے کے حالات سے ہم آہنگ ہوں۔ اعلیٰ تعلیمی ادارے اپنے تدریسی اور تحقیقی طریق کار میں تبدیلیاں لاتے ہیں تاکہ ایسے تعلیم یافتہ افراد پیدا کر سکیں جو سماجی شعور رکھتے ہوں۔ یہ ادارے معاشرے کے مسائل کو جانچنے، سمجھنے اور ان کے حقائق کو احتیاط سے اعداد و شمار کی صورت میں متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور معاشرتی اور طبعی ماحول میں تبدیلیوں کی ضرورت اور نوعیت کو وضع کرتے ہیں۔ یونینوں، پیشہ ور ماہروں اور تعلیمی اداروں کی اس سرگرمی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بصیرت کو (جسے حقائق، اعداد و شمار اور ممکنہ تبدیلیوں کے حقیقت پسندانہ ڈھانچے کا مضبوط سہارا حاصل ہوتا ہے) معاشرے کے ابھرتے ہوئے طبقوں تک پہنچایا جاتا ہے جو یا نئی قائم شدہ کاروباری یا سیاسی تنظیموں کے ذریعے اصلاحات کے لیے دباؤ ڈالتے ہیں یا دوسری صورت میں انقلاب لانے کے لیے کام کرتے ہیں۔ اصلاحات کے لیے دباؤ ڈالنے کا طریقہ صرف اس وقت کارآمد ثابت ہو سکتا ہے جب وہ نہ صرف مسائل کی درست نشان دہی کر سکے بلکہ ان کا ٹھوس حل بھی تجویز کر سکے جو خواہشات سے نہیں بلکہ حقائق سے مطابقت رکھتا ہو۔ خطابت اور نعرے بازی سے نہ کبھی اصلاحات ہوئی ہیں اور نہ کبھی انقلاب آیا ہے۔ جن معاشروں میں دانش ور طبقے کا لوگوں سے رابطہ برقرار رہا اور وہ ان کی زندگی اور ان کو درپیش سماجی اور سیاسی حالات کا اپنے معاشرے کی تاریخ کی روشنی میں مطالعہ کرتا رہا، وہاں یہ طبقہ معاشرے میں تبدیلی لانے کا مثبت کردار انجام دے سکا۔

تیسری دنیا کے بہت سے دوسرے ملکوں کی طرح پاکستان کے دانش ور بھی یہ مثبت کردار انجام نہیں دے رہے ہیں۔ اس کی متعدد وجوہ ہیں جن کو سمجھنا زیادہ دشوار نہیں۔ لیکن ان کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا زاویۂ نظر ان کے اپنے معاشرے کی معروضی حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتا اور نہ یہ حقیقت ان کی تخلیقی اور علمی دلچسپی کا محور ہے۔ رفتہ رفتہ ان کا رشتہ اپنے معاشرے کی حقیقت سے بالکل کٹ گیا ہے اور وہ ذہنی طور پر دنیا کے ان ترقی یافتہ معاشروں سے وابستہ ہو گئے ہیں جن کے خدوخال مناسب اور حقیقت پسندانہ تبدیلیوں کے بغیر ہمارے معاشرے کی حقیقت سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔

یہی معاملہ پاکستان میں بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں اور دانش وروں کا بھی رہا ہے۔ ان کے تجزیوں کی بنیاد بھی اس معاشرے کے معروضی حالات نہیں بلکہ ریاست اور ترقی کے بارے میں ایسے نظریات پر رہی ہے جنہیں روس اور چین میں وہاں کے معروضی حالات اور حقائق کی بنیاد پر وضع کیا گیا تھا جو ہمارے معاشرے کے حالات اور حقائق سے بہت مختلف تھے۔

نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے بائیں بازو کے سیاست دانوں کے معاشرے کے عمل کی بنیاد وہ نہیں جو ہو، معروضی حقائق کے مطالعے اور تجزیے پر بالکل نہیں ہے۔ ہمارے پیشہ ور ماہرین آبادی کی ایک

Scanned with CamScanner

بہت چھوٹی اقلیت کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں؛ ہمارے تعلیمی و تحقیقی ادارے ایسے موضوعات پر کام کرتے ہیں جن کا پاکستانی معاشرے کو درپیش مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔ موثر کردار ادا کرنے کی بجائے یہ ادارے تحقیق کے میدان میں اداروں کی شرطوں اور شخصیتوں کی پالیسیوں پر بے شمار مقالے تیار کرتے ہیں جن میں غیر رسمی سیکٹر کا ذکر نہیں۔ ہماری آبادی کی اکثریت کے معاش کا انحصار اسی پر ہے مگر اسے نصاب میں شامل نہیں کیا جاتا اور نہ اس سیکٹر کو تحقیق کا موضوع بنایا جاتا ہے۔ اسی طرح تعمیر کے میدان میں ٹیکنالوجی، طریقہ کار، متوسط ذرائع وغیرہ کی تحقیق کے ذریعے سہولیات فراہم کرنے ... کا کام نہیں کیا گیا۔ یہ فہرست بہت طویل ہے اور اس میں تعلیم، قانون، معیشت، صنعتی تعلقات، ... اور باقی تمام شعبے شامل ہیں۔ ... مقامی سطح پر کام کرنے والی کاروباری اور فلاحی تنظیموں، شہریوں کی کمیونٹی ... سے ... معلومات ... تعلیمی اور تحقیقی ... کی تحقیق کی بنیاد پر وضع کی جانے والی سرکاری پالیسیاں ہمارے عوام کی اکثریت سے غیر متعلق ہوتی ہیں۔

پاکستان کے ... اور شعبے ... ناکامی سے تعلق ... پاکستانی معاشرے ... کے عوامی ردعمل ... سے ... سامنے آ رہے ہیں۔ ... ترقی یافتہ ... رکھنے والے مقامی دانش وروں کی تعداد ... مقامی حالات سے ... کی نسبت ... دوسری طرف ... اور غیر سرکاری فلاحی تنظیموں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ کالا کا علمی تعلیم ... کام ... معاشرتی و معاشی مسائل سے ... کرنے کی کوششیں ... انسانی حقوق، ... بستیوں و شہری آبادیوں اور چھوٹا کاروبار کرنے والے افراد ... موضوعات میں ... اور ماقبلہ شکل میں پیش منظر پر ... حکمرانوں ... روایت کا حصہ نہیں ہے۔ ... موجودہ ریاستی ڈھانچہ ... کردار ادا کرنے کا اہل نہیں اور ... تبدیل شدہ حقیقت کے مطابق ... متبادل ڈھانچے کو ... اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے سرکاری دانش ... کو ختم کرنے جیسی ... اقتصادی ... وقوع ... سے پیش ... مثبت تبدیلیوں کے ان اشاروں ... یعنی تشدد، انارکی، مذہبی انتہا پسندی ... ہوتی ہیں۔

پاکستانی حالات کا جائزہ لینے والا کوئی بھی شخص سیاسی منظر کی صاف دیکھ سکتا ہے کہ معاشرے کی حقیقت اور ریاستی ڈھانچے کے درمیان موجود اور مسلسل بڑھتی ہوئی خلیج نے جڑ سے تبدیلی کا [illegible] ناگزیر ہو گیا ہے۔ حالیہ رجحانات کو دیکھتے ہوئے اس تبدیلی کا مطلب [illegible] ہوں، علاقائی [illegible] اور عوامی تنظیموں کو زیادہ بااختیار اور خودمختار بنانا ہے۔ [illegible] کے لیے قانونی و [illegible] نظام میں [illegible] گیر تبدیلیاں کرنی ہوں گی۔ اب سوال یہ نہیں ہے کہ ایسا ہوگا یا نہیں، بلکہ یہ [illegible] کس طریقے سے ہوگا؟ یہ تبدیلی کس راستے سے آئے گی اور پاکستان کے مختلف طبقوں و گروہوں پر اس کے اثرات کس نوعیت کے ہوں گے؟

اگر ہمارے دانش وروں نے تیز رفتاری کے ساتھ عوام کی زندگی، ان کے مسائل [illegible] سے مدار فکر سے مطابقت پیدا نہیں کی اور ایک جدید اور جمہوری ریاست کا روشن خیال تصور [illegible] صورت حال کا عملی جواب دینے سے قاصر رہیں گے [illegible] کی صورت میں تبدیلی تشدد کے ذریعے سے آئے گی اور اس پر فسطائیت و مذہبی یا کسی اور قسم کی شدت پسندی کا غلبہ ہوگا۔ اس کے برعکس اگر ہمارے دانش ور ملک بھر میں مقامی سطح پر تبدیلی اور فلاح کے لیے کام کرنے والے سماجی کارکنوں اور عوامی تنظیموں کے ساتھ اتحاد پیدا کر سکے تو تبدیلی بتدریج اصلاحات کے ذریعے بھی آ سکتی ہے اور تشدد اور [illegible] کی شدت کو کم کیا جا سکتا ہے۔

وقت، دونوں صورتوں میں، اب بہت کم رہ گیا ہے۔

**

ضمیمہ ۱

کراچی ــــ چند اہم حقائق

آئندہ صفحات میں کراچی کے بارے میں کچھ اہم حقائق اعداد و شمار کی مدد سے پیش کیے گئے ہیں اور ان کی مختصر وضاحتیں بھی درج کردی گئی ہیں۔

ان اعداد و شمار کے بارے میں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ آبادی سے متعلق 1981 کے بعد سے اعداد و شمار ... سرکاری مردم شماری سے نتائج ... جن میں ملک بھر کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔ مردم شماری نہ صرف ... کی آبادی سے متعلق معلومات کا درست اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے بلکہ حکومتی سطح پر ... کے لیے بھی ... مردم شماری کرتے چلے جانے کے فیصلے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستانی معاشرے میں حقائق کا سامنا کرنے کی صلاحیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس صلاحیت کا فقدان ... بحران کی شدت میں اضافہ ... مسائل کا درست تناظر میں جائزہ لیے بغیر ان کے حل کی طرف قدم بڑھانا ممکن نہیں ہے۔

Table 1	Percentage of Urban Population in Selected Regions of the World 1950 - 2000				
Region	1950	1986	2000	Annual Growth Rate 1990 - 2000	
				Urban	Rural
Europe	56%	73%	79%	1.2%	0.9%
North America	64%	74%	78%	1.2%	1.0%
(Former) Soviet Union	39%	71%	74%	1.4%	1.1%
Latin America	41%	65%	77%	3.1%	0.8%
China	12%	32%	40%	3.2%	0.8%
Africa	15%	30%	42%	4.6%	1.7%
South Asia	16%	24%	35%	4.3%	1.1%

Source: United Nations Population Division
: Mehtab Karim, "The Challenges of Urban Growth: A Case Study of Karachi"

اوپر دیے ہوئے ۱۹۵۰ سے ۲۰۰۰ تک کے آبادیاتی اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کے تمام خطے دیہی معاشرے سے شہری معاشرے میں منتقل ہونے کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ ترقی یافتہ خطے جیسے کہ تاریخی تجارت اور صنعتی ترقی کے باعث رفتہ رفتہ غالب طور پر شہری معاشرے بن چکے ہیں اور وہاں دیہی آبادی کے تناسب میں مسلسل کمی ہو رہی ہے۔ دوسری جانب ترقی پذیر یا کم ترقی یافتہ خطوں میں یہ تبدیلی دیر سے شروع ہوئی ہے اور نہایت تیز رفتار سے جاری ہے۔ جنوبی ایشیا میں شہری آبادی، جو ۱۹۵۰ میں کل آبادی کا صرف ۱۵ فیصد تھی، ۱۹۸۶ میں ۲۴ فیصد تک جا پہنچی اور اسی طرح کی تیز رفتار کے پیش نظر ۲۰۰۰ تک ۳۵ فیصد ہو جائے گی۔ اس تبدیلی کی رفتار جنوبی ایشیا میں افریقہ کو چھوڑ کر تمام خطوں کے مقابلے میں زیادہ تیز ہے۔

Table 2	Percentage of Urban Population in South Asian Countries 1950 - 2000					
Country	**1950**	**1960**	**1970**	**1980**	**1990**	**2000**
Bangladesh	4.4%	5.2%	7.6%	11.2%	16.1%	22.2%
India	16.8%	17.9%	19.7%	22.3%	26.9%	34.1%
Nepal	2.3%	3.1%	3.9%	4.4%	6.8%	9.8%
Pakistan	**17.5%**	**22.1%**	**25.0%**	**28.2%**	**33.6%**	**41.1%**
Sri Lanka	14.4%	17.9%	21.9%	26.8%	32.9%	4[illegible].1%

Source: United Nations Population Division

Dr. Mahjab Karim, "The Challenges of Urban Growth: A Case Study of Karachi."

۱۹۵۰ سے ۲۰۰۰ تک [illegible] جنوبی ایشیا کے ممالک میں [illegible] [illegible] پاکستان کی [illegible] ۱۹۵۰ میں [illegible] ۱۷.۵ فیصد [illegible] ۱۹۹۰ میں ۳۳.۶ فیصد [illegible] ۲۰۰۰ میں ۴۱.۱ فیصد تک [illegible] جنوبی ایشیا کے دیگر ملکوں سے [illegible] [illegible] پاکستان [illegible]

Table 3	Percentage of Urban Population in Provinces of Pakistan : 1981		
Province	**Population**	**Urban**	**Rural**
Balochistan	4 332 000	15 6%	84 4%
NWFP	11 061 000	15 2%	84 8%
Punjab	47 292 000	27 4%	72 6%
Sindh	19.029,000	43 4%	56 6%

Source Census Of Population, 1981

Dr Mahlah Karim . The Challenges of Urban Growth A Case Study of Karachi

پاکستان کے چاروں صوبوں میں دیہی اور شہری آبادی کا یہ موازنہ، جس کی بنیاد ۱۹۸۱ء کی سرکاری مردم شماری پر ہے، ظاہر کرتا ہے کہ صوبہ سندھ میں شہری آبادی کا تناسب باقی تین صوبوں سے زیادہ ہے۔ یہاں ۱۹۸۱ء میں شہری آبادی صوبے کی کل آبادی کے ۴۳.۴ فیصد سے زیادہ تھی۔ ۱۹۸۱ء کے بعد سے کوئی مردم شماری نہیں ہوئی ہے، تاہم ارتقائے آبادی کے رجحانات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تناسب اب مزید بڑھ چکا ہوگا۔ یہ حقیقت پیش نظر رہے تو اس سے سندھ کی سماجی، معاشی اور سیاسی صورتِ حال کو سمجھنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

Table 4 — Comparative Profiles of Five Big Cities of Pakistan: Karachi, Hyderabad, Faisalabad, Lahore and Peshawar

		Karachi	Hyderabad	Faisalabad	Lahore	Peshawar
Population	[illegible]	1 068 459	241 801	187 185	859 221	151 435
	[illegible]	1 912 598	434 537	435 117	1 317 118	218 697
	[illegible]	3 515 402	628 631	839 621	2 198 890	272 697
	[illegible]	5 208 132	751 529	1 121 629	2 988 486	566 248
	[illegible]	7 180 000	980 000	1 520 000	3 870 000	770 000
Population as a Percentage of Pakistan's Population	[illegible]	5 8%	[illegible] 93%	1 4%	3 7%	0 73%
Population as a Percentage of Pakistan's Urban Population	1984	21 4%	2 0%	4 5%	11 5%	2 3%
Annual Growth	1972 1981	4 50%	2 0%	3 5%	3 7%	6 4%
	[illegible]	[illegible]	2 6%	[illegible]	3 8%	3 1%
Population Density		[illegible]	[illegible]	[illegible]	60	NA
Household Size		5 8	[illegible]	[illegible]	6 9	5 9
	[illegible]	6 6			6 9	[illegible]
Employment						
Labour Force Participation (1981)	[illegible]	24 7%	[illegible]	[illegible]	26 4%	25 3%
	Female	2 9%	1 9%	2 6%	2 5%	2 6%
Civilian Labour Force (CLF)	[illegible]	1 234 354	219 466	324 637	788 746	150 055
Unemployment % of CLF	[illegible]	9 2%	[illegible]	5 6 [illegible]	5 9%	3 4%
Land						
Publicly Owned		80%		17%	14%	[illegible]
Privately Owned		20%	-	83%	86%	
Housing						
Units per 1000 Persons		58	143	153	151	145
Persons per Unit		6 7	7 5	6 8	6 6	7 4
Persons per Room			3 8	3 5	2 9	3
Owner Occupied Houses		57%	77 4%	83 12%	87 8%	64 73%
Population in Slums		50%	60%	60%	50%	60%
Katchi Abadis						
Population % of City Population		37%	25%	60%	21%	2%
Area Hectares		6 [illegible] 05	568	243	570	
Services and Infrastructure						
Piped Water Supply 1980						
Individual Connections (% of Units)		46%	63%	31%	55%	[illegible]
Average Daily Piped Water Supply Litre per Capita		90	246	187	225	[illegible]
Sewrage 1980 % of Units		51%	27%	28%	30%	[illegible]
Electricity 1980 (% of Units)		86%	81%	78%	86%	[illegible]
Health and Education						
Hospital Beds per 1000 Persons		1 4	2 85	0 79	2 03	[illegible]
Infant Mortality below 10 years Number per 1000 Live Births		85 107	128	128	108	[illegible]
School Enrolment Rate	Total	41 1%	21 1%	21 9%	25 9%	[illegible]
	Female	39 9%	18 9%	20 1%	24 6%	[illegible]
Literacy Rate	1972	51 7%	42 2%	38 1%	44 1%	[illegible]
	1981	56 6%	41 2%	46 2%	53 4%	[illegible]
Female Literacy Rate	1972	45 7%	32 2%	24 7%	35 6%	
	1981	50 5%	33 0%	36 4%	45 4%	[illegible]

Arif Hasan — Seven Reports on Housing

پاکستان کے پانچ بڑے شہروں — کراچی، حیدرآباد، فیصل آباد، لاہور اور پشاور — کا یہ تقابل ان شہروں کے متعدد اہم حقائق کو سامنے لاتا ہے۔ کراچی ملک کا سب سے بڑا شہر ہے، یہ حقیقت آبادی سے بھی واضح ہے۔ ۱۹۸۸ء کے تخمینے کے مطابق ملک کی مجموعی آبادی کے ۶.۸ فیصد اور ملک کی شہری آبادی کے ۲۱.۳ فیصد باشندے کراچی میں رہتے ہیں۔ آبادی میں اضافے کی رفتار بھی کراچی میں باقی شہروں کی نسبت زیادہ ہے، جس کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ ملک کے دیگر علاقوں سے لوگ بڑی تعداد میں کراچی آ کر آباد ہوتے ہیں۔ دیہات سے شہروں کی طرف نقل مکانی کرنے کا یہ عمل ملک کے باقی شہروں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ جہاں تک دوسرے شہر بھی تبدیلی کے اسی عمل سے گزر رہے ہیں جو کراچی میں پیش آ [illegible] لسانی معاملات میں [illegible] پردہ ڈال دیا گیا ہے [illegible] عمل کو تسلیم کرنے اور اس کی بنیاد پر حقیقت پسندانہ پالیسیاں وضع کرنے کی کوشش جلد شروع [illegible] دوسرے شہر بھی کراچی کی طرح [illegible] بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

روزگار کے اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ شہری آبادی کی لیبر فورس میں شمولیت کے لحاظ سے پانچوں شہر کم و بیش یکساں ہیں۔ مستقل شہری لیبر فورس میں بے روزگاری کی شرح لاہور اور کراچی میں باقی شہروں کی نسبت زیادہ ہے۔

زمین کی ملکیت سے متعلق اعداد و شمار سے یہ اہم حقیقت سامنے آتی ہے کہ کراچی میں ۸۰ فیصد زمین سرکاری ملکیت میں ہے [illegible] پنجاب کے دونوں شہروں، فیصل آباد اور لاہور [illegible] بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اس کا مطلب [illegible] کراچی کی آبادیوں کے موضوع پر لکھے گئے مضامین سے [illegible] کچی آبادیاں کراچی میں سرکاری ملکیت کی زمین پر قائم ہوئی ہیں اور سرکاری اہلکار اس عمل میں غیر قانونی طور پر شریک رہے ہیں۔ اس کا ایک مثبت مطلب یہ [illegible] کچی آبادی [illegible] حکومت کے پاس عملی وسائل موجود ہیں [illegible] سرکاری ایجنسیوں کے [illegible] ۵۰ فیصد [illegible] کام [illegible] ہے۔ فیصل آباد اور لاہور میں زمین کی ملکیت [illegible] وضع کرتے ہیں [illegible] شہروں میں [illegible] شہر سے مضافات میں [illegible] زمینیں [illegible] پلاٹوں میں تقسیم [illegible] زمینوں کی قیمت زیادہ ہونے کے باعث ان شہروں کی کچی آبادیوں میں پلاٹ چھوٹے اور گلیاں تنگ ہوتی ہیں جس کا [illegible] غیر قانونی [illegible] پلاٹ خریدنے والوں کو [illegible] قانونی تحفظ حاصل ہوتا ہے

کراچی کی ۵۰ فیصد آبادی کچی بستیوں (slums) میں رہتی ہے۔ باقی شہروں میں کچی [illegible] کم ہے، خود حیدرآباد، فیصل آباد [illegible] ۱۰ فیصد [illegible] کراچی [illegible] ۳ فیصد [illegible] آبادیوں [illegible] ۱۹۵۰–۶۱ [illegible] کچی بستیاں [illegible] ہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] سے لحاظ سے کراچی باقی شہروں سے کہیں آگے ہے۔

Table 5

Population Growth in Karachi and Pakistan 1901 - 1988

Year	Karachi			Pakistan	
	Population	Increase in 20 years	Annual Growth Rate	Increase in 20 years	Annual Growth Rate
1901	117 000	-	-		-
1921	217,000	85%	3 1%	27%	1 3%
1941	387,000	75 %	3 0%	34%	1 5%
1961	1 917 000	400%	8 4%	62 %	2 1%
1981	5 208 000	175%	5 0%	96%	3 0%
1988	7,950,000		6 0%		3 0%

Source Census of Population 1901 1981
D Mahbub Karim "The Challenges of Urban Growth a Case Study of Karachi"

[illegible]

Table 6	Age Profile of Population Karachi, Rest of Sindh and Other Provinces			
	Below 15	15 29	30 39	40 & above
Karachi	41%	29%	12%	18[illegible]
Rest of Sindh	4[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
Balochistan	4[illegible]	[illegible]	1[illegible]	18
NWFP	48%	2[illegible]	[illegible]	[illegible]
Punjab	45%	[illegible]	10	[illegible]

Source: Census of Population [illegible]

Dr. Mehtab Karim [illegible] challenges [illegible] case study of Karachi [illegible]

[illegible]

Table 7	Karachi's Population by Place of Birth		
	Census Year		
	1921	1961	1981
...l Population	217 000	1 917,000	5,208 000
... Number of Migrants	101 000	1 154 000	1,700 000
...entage of Migrants	47%	60%	33%
Place of Birth of Migrants			
...in (Excluding Karachi)	14%	2%	5%
Baluchistan	14%	2%	1%
Punjab	8%	12%	25%
NWFP	4%	8%	17%
...mir, Frontier Region & Northern Areas		2%	1%
...ia and Other Countries	60%	74%	51%
... Census of Population 1981			
Mrs Shureen Rehmatullah, "Ethnic Strife in Karachi"			

کراچی اپنے مخصوص محل وقوع اور تجارتی سرگرمیوں کے باعث نقل مکانی کرنے والوں کے لیے شروع ہی سے پرکشش رہا ہے۔ اوپر دیے گئے اعداد و شمار واضح کرتے ہیں [illegible] شہر کی آبادی میں تناسب ۱۹۲۱ میں ۴۷ فیصد تھا جو ۱۹۶۱ میں ۶۰ فیصد تک جا پہنچا۔ [illegible] ۱۹۸۱ کی مردم شماری کی رو سے کراچی کی آبادی میں صرف ۳۳ فیصد [illegible] ایسے تھے جو باہر سے آئے تھے۔ باقی [illegible] کراچی ہی میں پیدا ہوئے تھے۔

نقل مکانی کر کے شہر میں آباد ہونے والوں میں موجودہ [illegible] کا تناسب ۱۹۲۱ میں ۶۰ فیصد تھا جو ۱۹۶۱ تک بڑھ کر ۷۴ فیصد ہو گیا [illegible] ۱۹۴۷ میں تقسیم کے وقت ہونے والی حتمی ہجرت تھی۔ تاہم ۱۹۷۰ کے [illegible] پاکستان کے دوسرے علاقوں سے لوگ بڑی تعداد میں کراچی آ کر آباد ہونے لگے جس کے باعث ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے وقت [illegible] پیدا ہونے والے کراچی کے شہریوں کا تناسب (نقل مکانی کرنے والوں کی کل تعداد کا) ۵۱ فیصد [illegible] دوسری طرف کراچی سے باہر پیدا ہونے والے شہریوں میں پنجاب سے منتقل ہونے والوں کا تناسب جو ۱۹۲۱ میں ۸ فیصد تھا، ۱۹۸۱ میں ۲۵ فیصد ہو گیا۔ [illegible] سرحد سے منتقل ہونے والوں کے تناسب میں بھی اضافہ ہوا۔ نقل مکانی کر کے کراچی میں آباد ہونے والے لوگوں میں ۱۴ فیصد ۱۹۲۱ کی مردم شماری کی رو سے سندھ کے دیگر علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ [illegible] ۱۹۶۱ میں کم ہو کر ۲ فیصد رہ گئی [illegible] ۱۹۸۱ میں بڑھ کر ۵ فیصد ہو گئی۔

ان اعداد و شمار سے ایک اہم نکتہ یہ بھی سامنے آتا ہے کہ ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے وقت شہر کے ۶۷ فیصد باشندے کراچی ہی میں پیدا ہوئے تھے [illegible] کراچی شہر ہی میں [illegible]

Table 8	Population by Language Karachi and Other Areas of Pakistan 1981					
Area	Urdu	Punjabi	Pushto	Sindhi	Balochi	Other
Pakistan	7.60%	48.17%	13.14%	11.77%	3.01%	16.27%
Balochistan	1.37%	[illegible]24%	25.07%	8.29%	36.31%	[illegible]
NWFP	0.83%	1.10%	68.30%	0.05%	0.04%	29.68%
Punjab	4.27%	78.68%	0.76%	0.08%	0.57%	45.32%
Islamabad	1.23%	81.72%	4.16%	0.18%	0.16%	2.54%
Sindh	22.64%	7.69%	1.06%	52.40%	4.51%	9.71%
Karachi	54%	14%	10%	7%	4%	11%

Source: Census of Pakistan, 1981
Ms. Shireen Rahmatullah — Ethnic Strife in Karachi

لسانی بنیاد پر آبادی کی تقسیم کی رو سے ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے وقت کراچی کی ۵۴ فیصد آبادی کی مادری زبان اردو تھی۔ یہ شرح اس سے پہلے بہت زیادہ تھی اور اس کے کم ہونے کا امکان ہے کیونکہ شہر کی آبادی میں ایسے لوگوں کی تعداد کا تناسب مسلسل کم ہو رہا ہے جن کی مادری زبان اردو ہے۔ ملک کے دیگر علاقوں سے منتقل ہونے والوں کی تعداد کی شرح مسلسل بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۸۱ میں اردو بولنے والے مہاجرین پورے پاکستان کی آبادی کا ۷.۶ فیصد اور صوبہ سندھ کی آبادی کا ۲۲.۶۴ فیصد تھے۔ دیگر علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے مسلسل اور خصوصاً کراچی میں داخل ہونے کے رجحان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہر کی آبادی میں اردو بولنے والے مہاجروں کی اکثریت ختم ہو چکی ہے، گو وہ اب بھی شہر کا سب سے بڑا لسانی گروہ ہیں۔

سندھ کے بعد جس شہر میں اردو لسانی گروہ کا تناسب سب سے زیادہ ہے وہ وفاقی دارالحکومت اسلام آباد ہے جہاں وہ ۱۹۸۱ میں کل آبادی کا ۱۱.۲۳۴ فیصد حصہ تھے۔

اردو زبان سے قطع نظر کراچی شہر کی رابطہ زبان اب بھی اردو ہے، کیونکہ تاریخی اور معاشرتی عوامل کے تحت ملک کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ باہمی رابطے کے لیے اردو ہی کو اختیار کرتے ہیں۔ [illegible] جیسے [illegible] سے [illegible] ہے کہ [illegible] کہا جا سکتا ہے کہ کراچی کے باشندے [illegible] ہمدردی رکھتے ہیں۔

Table 9	Population Growth Trends Selected Megacities of the World				
City	Population			Rank	
	1994	2015	Increase	1994	2015
Tokyo	26 500 000	28 500 000	7 5%	1	1
New York	16 300 000	17 600,000	8 0%	2	11
Sao Paulo	16 100,000	20 800 000	29 2%	3	6
Mexico City	15 500 000	18 800 000	21 3%	4	10
Shanghai	14 700 000	23 400 000	59 2%	5	4
Bombay	14 500 000	27,400,000	89 0%	6	[illegible]
Calcutta	11 500 000	17 600 000	53 0%	9	12
Seoul	11 500 000	13,100 000	13 9%	10	18
Jakarta	11 000 000	21 200 000	92 7%	11	5
Karachi	9 500 000	20 600,000	118 6%	18	7
Istanbul	7 500 000	12 300 000	64 0%	23	20
London	7,300,000	7,300,000	0 0%	25	[illegible]

Source United Nations Population Division, 1994

Dr Mehtab Karim, "Violence in Karachi A Global View"

درج ذیل میں دیے گئے اعداد و شمار کراچی کی آبادی میں اضافے سے متعلق جو دنیا کے دوسرے بڑے شہروں کے تقابل میں پیش کرتے ہیں۔ اس ٹیبل کے مطابق کراچی آبادی کے لحاظ سے ۱۹۹۴ میں دنیا کا ۱۸ واں بڑا شہر تھا اور اگر آبادی میں اضافے کا یہی رجحان برقرار رہا تو ۲۰۱۵ میں دنیا کا ساتواں بڑا شہر بن جائے گا۔ ٹیبل کے مطابق بیس برس کے عرصے میں کراچی کی آبادی میں ۱۱۸.۶ فیصد اضافہ ہوگا جو اس مدت کے دوران کسی بھی شہر کے باشندوں کی کل تعداد میں ہونے والا اضافہ ہے۔ آبادی میں اضافے کی یہ شرح دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔

Table 10	Population Distribution by Distance to Central Business District (CBD) Karachi 1971 1987					
Distance to CBD (km)	1971		1981		1987	
	Population	% Distance	Population	% Distance	Population	% Distance
0 - 5	999 801	30.3%	1 316 937	27.9%	1 401 063	[illegible]
5.1 - 10	1 088 588	33.0%	1 124 9[illegible]3	23.8%	2 085 778	28.[illegible]
[illegible] - 15	472 732	14.3%	910 085	19.1%	1 [illegible] 2 009	24.[illegible]
15.1 - 20	411 198	12.4%	882 492	18.7%	1 273 400	[illegible]
20.1 - 25	311 000	9.4%	425 115	9.0%	731 426	[illegible]
25.1 - 30	13 335	0.4%	36 784	0.8%	80 885	[illegible]
Over 30	6 157	0.2%	28 341	0.6%	59 122	[illegible]
Total	3 202 820	100%	4 724 847	100%	44[illegible] 063	[illegible]

Source: [illegible] Karachi Metropolitan [illegible] Study
Arif Hasan: Karachi Overview for the Global Report on Human Settlements

[illegible] ۱۹۷۱ ، ۱۹۸۱ اور ۱۹۸۷ میں [illegible] آبادی [illegible] پھیلاؤ [illegible]
[illegible]
[illegible] ۳۰.۳ [illegible] ۱۹۸۷ [illegible] ۹.۸ فیصد [illegible]
[illegible] ۵۹ فیصد [illegible]
[illegible]
[illegible]

Table 1?

Ownership of Land Karachi 1988

Owner	Area (Acres)	%
Karachi Development Authority (KDA)	124 676	29 3%
Cantonment Board	18 596	4 4%
Karachi Municipal Corporation (KMC)	24 189	5 7%
Defence Housing Authority (DHA)	16 567	3 9%
Pakistan Steel	19 461	4 6%
Port Qasim	12 961	3 0%
Karachi Port Trust (KPT)	15 259	3 6%
Pakistan Railways	3 119	0 7%
Government of Pakistan	4 051	1 0%
Government of Sindh	137 687	32 4%
Sindh Industrial Trading Estate (SITE)	5 380	1 3%
Cooperative Housing Societies	15 721	3 7%
Private	27 862	6 5%
Total	425 529	100 0%

Source: Master Plan & Environment Control Unit, KDA

Arif Hasan, "Karachi Overview for the Global Report on Human Settlements."

[illegible]

Table 12	Urban Land Conversion by Distance to CBD Karachi 1970 - 1985	
Distance to CBD (km)	**Land Developed (Acres)**	**Percentage of Total Increase**
0 - 5	2 078	3 7%
5 1 - 10	5 034	9 0%
10 1 - 15	11 609	20 9%
15 1 - 20	11 589	20 8%
20 1 - 25	5 855	10 5%
25 1 - 30	3 165	5 7%
Over 30	16,309	29 3%
Total	55,639	100 0%

Source Master Plan & Environment Control Unit KDA
Arif Hasan, "Karachi Overview for the Global Report on Human Settlements

یہ جدول میں شہر سے فاصلے کے حساب سے زمین کے شہری استعمال میں آنے کے عمل کا جائزہ
لیا گیا ہے۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۵ء تک کے عرصے میں زمین کے استعمال میں یہ تبدیلی زیادہ تر ان علاقوں میں
ہوئی جو شہر کے مرکز سے بیس کلومیٹر دور واقع ہے۔ اگرچہ ۳۰ کلومیٹر سے زیادہ فاصلے پر واقع زمین ـــ
ـــ صنعتی بستی ہے جہاں پاکستان سٹیل واقع ہے اور اس سے متعلق تعمیرات ہوئی ہیں۔ اگرچہ
ـــ فاصلے ـــ کر ـــ شہری استعمال میں آگئی۔

Table 13	Urbanised Land by Distance to CBD Karachi 1970 - 1985			
Distance to CBD	1970		1985	
(km)	Urbanised Acres	% Urbanised	Urbanised Acres	% Urbanised
0 5	7 612	58 6%	9 690	74 6%
5 1 10	14 562	31 5%	19 596	42 4%
10 1 5	6 610	11 5%	18 219	31 6%
15 1 20	8 981	11 5%	20 570	26 4%
20 1 25	5 482	6 2%	11 337	12 8%
25 1 - 30	1 223	2 4%	4 386	8 5%
Over 30	1 924	1 6%	18 309	5 1%
Total	46 394		102 107	

Source Master Plan & Environment Control Unit, KDA
Arif Hasan "Karachi Overview for the Global Report on Human Settlements"

اوپر دیے گئے اعداد و شمار سے ہمیں لگ بھگ اس رقبے کا اندازہ ہوتا ہے جو ۱۹۷۰ اور ۱۹۸۵ میں شہری استعمال میں آچکی تھی۔ ان سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ۱۹۷۰ میں اندر شہر سے پانچ کلومیٹر تک کے فاصلے پر واقع ۴۱.۴ فیصد زمین استعمال میں نہیں آئی تھی اور ۱۹۸۵ تک کی ۲۵.۴ فیصد زمین استعمال نہیں ہوئی تھی۔ اس زمین کی مالیت بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے اور شہری آبادیوں کے موجودہ محال سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم آمدنی والے باشندوں کی رہائش یا سہولت کے لیے یہ سنٹر میں نہیں کیا جائے گا۔ انہیں دور کے دور آباد ہونا پڑے گا اور اپنے روزگار کی جگہوں تک پہنچنے کے لیے روز زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔ جس سے شہر میں ٹرانسپورٹ کے مسائل میں بھی شدت پیدا ہوتی جائے گی۔

Table 14	Residential Land Conversion by Distance to CBD Katchi Abadis and Planned Areas Karachi 1970 - 1988		
Distance to CBD (km)	Land Converted (Acres)		Katchi Abadis as a Percentage of Total
	Katchi Abadis	Planned Areas	
0 - 5	100	641	13.5%
5.1 - 10	700	2,716	20.5%
10.1 - 15	4,700	2,219	67.9%
Over 15	1,000	7,604	11.6%
Total	6,500	13,180	33.0%

Source: Karachi Land & Housing Market Study, 1989

Arif Hasan, "Karachi Overview for the Global Report on Human Settlements."

ان اعداد و شمار میں [illegible] شہر کے مختلف حصوں [illegible] کا جائزہ لیا گیا ہے جو ۱۹۷۰ سے ۱۹۸۸ تک کراچی کے شہر میں [illegible] رہائشی [illegible] پانچ کلومیٹر تک کے [illegible] میں صرف [illegible] ۱۳.۵ فیصد [illegible] بیشتر [illegible]

Scanned with CamScanner

Table 15	Distribution of Katchi Abadis by Distance to CBD Karachi 1970 -1988					
Distance to CBD	1970		1988		Change	
(km)	Area (Acres)	% Distance	Area (Acres)	% Distance	Area (Acres)	% Distance
0 - 5	2 700	41 5%	2 800	21 5%	100	1 5%
5 1 - 10	3 100	47 7%	3 800	29 2%	700	10 8%
10 1 - 15	400	6 2%	5 100	39 2%	4 700	72 3%
Over 15	300	4 6%	1,300	10 2%	1,000	15 4%
Total	6 500	100%	13 000	100%	6 500	100%

Source: van der Linden – UNCHS Karachi Master Plan 1986-2000, PADCO

Arif Hasan – Karachi Overview for the Global Report on Human Settlements

اوپر دیے گئے اعداد و شمار شہر سے کچی آبادیوں کے فاصلے کو ظاہر کرتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں کچی آبادیوں کے ۸۹.۲ فیصد باشندے ۱۰ کلومیٹر تک کے فاصلے پر رہتے تھے جبکہ ۱۹۸۸ء میں ان کی تعداد کم ہو کر ۵۰.۷ فیصد رہ گئی۔ ۱۹۷۰ء میں کچی آبادیوں کے صرف ۱۰.۲ فیصد باشندے ۱۰ کلومیٹر سے زیادہ دور مقیم تھے جبکہ ۱۹۸۸ء میں یہ تناسب بڑھ کر ۴۹.۴ فیصد ہو گیا۔ شہر سے [illegible] کے فاصلے پر رہتے ہیں، اور یہ رجحان دنیا کے دوسرے شہروں کے رجحان کے برعکس ہے [illegible] لوگوں کی آبادیاں شہر کے مضافات میں [illegible] ہوتی ہیں [illegible]۔

[illegible]

کتابیات

تحریری

Abbot, J., *Sind: A Reinterpretation of the Unhappy Valley*, 1924

Advani, A. B., *Annexation of Sind*, 1933.

Advani, A. B., "The Early British in Sind" in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-1, Part 2, 1934

Ahmad, Kazi S., "A Geographical Study of the Refugee Problem" in *Pakistan Geographical Review*, Vol 10, No 2, 1955

Ahmed, S. Haroon, Ed., *Contemporary Conflicts*
Karachi: Pakistan Psychiatric Society Sindh Chapter, 1991

Ahsanullah, *The Goths of Karachi: A Study of Urban Villages*
Karachi: Karachi Geographers Association, 1967

Ahsanullah & Izzatullah, *The Port of Karachi*
Karachi: Karachi Geographers Association, 1954

Aitken, E. H., *Gazetteer of the Province of Sind*
Karachi, Mercantile Steam Press, 1907

Ajwani, L. H., Ed., *The Golden Jubilee Book of the D. J. Sind College*
Karachi, 1939

Alavi, Humza, "The Politics of Ethnicity in India and Pakistan" in *Sociology of Developing Societies* (Ed. Humza Alavi & John Harriss)

Ali, Dr. Mubarak, *A Social and Cultural History of Sindh: Based on the accounts of the European travellers who visited Sindh*
Lahore: Book Traders, 1987

Ali, Dr. Mubarak, *Sindh Observed: Selections from the Journal of Sind Historical Society*, Lahore: Gautam Publishers, 1993

Ali, Dr. Mubarak, *Sindh Analysed*, Lahore, 1993

Ali, Syed Mansoor, *Informal System of Solid Waste Recycling: Preliminary Findings in Karachi*,
(Prepared for Water Engineering & Development Centre, Department of Civil Engineering, Loughborough University of Technology, England) 1993

All India Industrial Exhibition Guide Book.
Karachi: Karachi Municipal Corporation, 1939

Allen, Rev. I. N., *Diary of a March through Sind and Afghanistan*
1843

Amin, Mohamed, Duncan Willetts & Brian Tetley, *Karachi*,

Scanned with CamScanner

Karachi Pak American Commercial Ltd., 1986 (Coffee table book
Andrews W. P. *The Indus and Its Provinces. Their Political & Commercial Importance Considered in Connection with Improved Means of Communication,*
London: William H. Allen & Co., 1857
Anonymous *Draft History of the Port Trust*, 1905
Anonymous *A Guide to Karachi* (79 pages with b/w plates.)
Baillie A. F. *Kurrachee: Past, Present and Future*
1890 Reprinted Karachi Oxford University Press
Beyse George *The Sind Directory* Bombay Bombay Gazetteer Press, 1862
Bellasis A. F. *An Account of the Kurrachee Municipality*, 1860
Bhojwani, T. J. *Municipal Post War Construction Schemes*, 1944
Bilgrami S. A. R., *The Pakistan Yearbook & Who's Who*, 1949
Karachi Kitabistan, 1949
Bilimoria N. M. *Town Planning Scheme Karachi No. 2* 1936
Bilimoria N. M. "Major General E T Marston", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol III, Part 3, 1936
Bilimoria N. M. "Alexander Hamilton's Description of Sind", in *Journal of Sind Historical Society* Vol-IV, Part 4, 1939
Bilimoria N. M. "Life of Charles Masson & Masson's Notes on Kurrachee", in *Journal of Sind Historical Society* Vol IV, Part 3, 194
Bilimoria N. M., *Annual Report on Public Instruction in Sind* 1943
Bilimoria, N. M. "Census Reports of Sind for 1931 & 1941 A Comparison in *Journal of Sind Historical Society*, Vol VI Part 4, 1943
Brow D. B. *The Port of Karachi Outline History 1843 1945* 1945
Brunton, John, *The Diary of John Brunton*
Complete title "John Brunton's Book Being the Memories of John Brunton Engineer from a manuscript in his own hand written for his grandchildren and now first printed,"
Cambridge Cambridge University Press 1939
Burton, Richard F., *Scinde The Unhappy Valley*, 1851
Burton Richard F. *Scinde and the Races that Inhabit the Valley of the Indus*
London 1851 Reprinted Karachi Indus Publications 1988
Burton Richard F. *Sind Revisited* Reprinted Karachi 1992
Byron Farwell *Burton A Biography of Richard Francis Burton*
London Longman, Green & Co., 1964
Carless *Memoirs on the Bay, Harbour and Port of Kurrachee* 1838
Chablani H. C. *The Separation of Sind from the Bombay Presidency A Rejoinder to Khan Bahadur Mahomed Ayoob S. Khuhro's A Story of the Sufferings of Sind,*
Karachi Koh-i-Noor Printing Works 1931
Chablani, S. P., *Economic Conditions in Sind*,
Bombay Longman, Green & Company, 1951
Chand Saheb Khan *The Movement for Separation of Sind from the Bombay Presidency, 1847-1937,*
(Ph. D. thesis for the University of Sindh 1983

Chaudhry, Amir Nazir, *Social Revitalisation: Case Study Saddar, Karachi*
(B. Arch. thesis for Dawood College of Engineering & Technology,
Karachi.) 1990

Cory, A., *The Sind Gazette*, 1893

Cory, A., *Minutes on the Administration of the Municipality
from 1891 to 1894*, Karachi, 1894

Crow, N., *Account of the Country of Sind*, 1799

D'Souza, *Goan Society in Transition*, Bombay, 1975

Dadachanji, F. K., *Parsis Ancient and Modern*
Karachi: Published by the author, 2nd edition, 1986

Dalal, T. B., *A Quarter Century of Karachi Cotton Trade*, 1940

Del Hoste, L. F., *Memoir on Sind*,
Bombay: Secret & Political Department Report No 571, 1832

De Verteuil, P. J., *Fifty Wasted Years*, 1938

Dhalla, Dastur Dr Maneckji Nusserwanji,
The Saga of a Soul: An Autobiography,
Translated from Gujarati by Gool & Behram Sohrab Rustamji
Karachi: Dastur Dr Dhalla Memorial Institute, 1975

Eastwick, E. B., *A Glance at Sind before Napier
or Dry Leaves from Young Egypt*,
1849, Reprinted Karachi: Indus Publications, 1983

Elliot, H. M., *The History of India as told by its own Historians*, 1867

Ellis, *Memoir on the State and Resources of Scinde*, 1809

Ellis, B. H., *Report on Education in Scinde*,
Bombay: Educational Society Press, 1856

Feldman, Robert, *Karachi through a Hundred Years (1860-1960)*,
Karachi: Oxford University Press, 1960

Furber, Holen, *John Company at Work*,
Cambridge: Cambridge University Press, 1951

Gidumal, Dayaram, *Life and Life-work of B. M. Malabari*

Golden Jubilee Book of Sindh Madressatul Islam
Karachi, 1935

Haider, Dr. Azimusshan, *A History of Karachi*
Sub-titled: "With Special Reference to Educational Development and
Commercial Development, 1839-1900."
(Ph.D. thesis for the University of Karachi.)
Karachi: Published by the author, 1974

Haig, M. R., *The Indus Delta Country*,
London: Kegan Paul & Co., 1894

Harrison, H. E. L. T., & G. W. Jog, *A Handbook of Karachi*
Karachi: Educational Printing Press, 1933

Hart, S. V. G., *Town and Port of Kurrachee*, 1840

Hasan, Arif, *Seven Reports on Housing*
Karachi: Orangi Pilot Project Research & Training Institute, 1992

Hasan, Arif, *Manual for Rehabilitation Programmes for Informal Settlements
Based on the Orangi Pilot Project Model*,

Scanned with CamScanner

Karachi Orangi Pilot Project Research & Training Institute, 1992
Hasan Arif *Scaling up of the OPP's Low-cost Sanitation Programme*
Karachi Orangi Pilot Project Research & Training Institute 1992
Hasan, Arif *Karachi Overview for the Global Report on Human Settlements.*
(Prepared for the International Institute for Environment & Development, U K.) 1992
Hasan Arif, *Karachi Master Plan 1986 2000 Report of the Evaluation Committee,*
(Prepared for United Nations Development Programme) 1994
Hasan, Arif, *Coastal Environmental Management Plan for Pakistan Environmental Profile of Coastal Communities,*
1989
Hasan Arif *Evaluation of the Community Development Work at Rehri Carried out by the Coastal Ecosystem Unit, IUCN*
1993
Hasan Khalid Shamsul, *Sindh's Fight for Pakistan.*
Karachi Shamsul Hasan Foundation, 1992
Homji, H. B. M , *O Whither Parsis?.*
Karachi Published by the author, 1978
Hotchand, Seth Naomal *Memoirs of Seth Naomal Hotchand, CSI of Karachi (1804-1878),*
Complete title "A Forgotten Chapter of Indian History, as told by Seth Naomal Hotchand CSI of Karachi (1804 1878), Written by Himself and Translated by His Grandson Rao Bahadur Alumal Trikamdas Bhojwani BA Edited with an Introduction by Sir H Evan M James KCIE, CSI, Commissioner of Sind, 1891-1899, Printed for Private Circulation only"
Exeter William Pollard & Co. Ltd., 1915
Hughes A W *A Gazetteer of the Province of Scinde* 1874
Humphrey J , *Story of the Sind Club*, Karachi, 1946
Husain Saleha Bilal, *In Karachi*, (A collection of newspaper columns),
Karachi. Institute of Social Sciences, 1990.
Husain Commander (Retd) Syed Mazhar, *Indus Delta in Retrospect*
Karachi Published by the author, 1990
Hussain Akmal "The Karachi Riots of December 1986 Crisis of State and Civil Society in Pakistan " in Das, Veena, Ed *Mirrors of Violence Communities Riots and Survivors in South Asia*, New Delhi Oxford University Press, 1990.
Hussain Mohammad *Economic History of Hyderabad W Pakistan*
Hyderabad Sind University Press, 1956.
In the Land of the Sindhi and the Baluch. A Report on Catholic Activities in Sind and Baluchistan, 1935-1947,
Karachi, 1947
Jafri Dr S M H *The Flora of Karachi (Coastal West Pakistan)*
Karachi: The Book Corporation, 1966.
Jamshed Nusserwanji Mehta A Memorial,

Karachi Jamshed Nusserwanji Memorial Committee, 1954

Jillani, M. S., *Resettlement of Displaced Persons in Pakistan*
(Ph.D. dissertation, Department of Sociology, University of Chicago.) 1962

Katrak, Sohrab H. K. *Karachi that was the Capital of Sind*
Karachi: Published by the author, 1957

Kennedy, R. H. *Narrative of the Campaign of the Army of Indus*
1840

Khamisani, Ameena. *Sind's Contribution to English*
Jamshoro. Institute of Sindhology. 1975

Khan. H. H. Aga. *The Memoirs of Aga Khan*
London. Cassel & Company, 1954.

Khan, Ansar Zahid. *History and Culture of Sindh*
Karachi: Royal Book Company, 1980

Khan, Mohammad Zafar Ahmad. *The Development of a Pre-industrial Ci*
An Economic Geography of Karachi,
(Ph. D. Thesis, London University.) 1970

Khan, Mohammad Zafar Ahmad. *Karachi: An Urban Development Profile*
Karachi: Karachi Geographers Association Publication 8, 197

Khosla, G. D. *Stern Reckonings: A Survey of the Events*
Leading Up To and Following the Partition of India
Delhi: Oxford University Press. 1989. (1st Edition 1949)

Khuhro, Hamida, *The Making of Modern Sind: British Policy and Social*
Change in the Nineteenth Century,
Karachi: Indus Publications, 1978.

Khuhro, Hamida. Ed., *Sind Through the Centuries*
Karachi: Oxford University Press, 1981

Khuhro, Hamida, Ed. *Documents on Separation of Sindh*
from the Bombay Presidency,
Islamabad: National Institute of Historical & Cultural Research. 198

Khuhro, M. A., *A Story of the Sufferings of Sind.*
Karachi: Published by the author. Bharat Printing Press. 1930

Khuhro, M. A. *A Convincing Case for Separation of Sind*
Karachi: Navalrai Tatehchand. Bharat Printing Press. 193

Kincaid, C. A. *Forty four Years of Public Service*. 1934

Kincaid, Dennis, *British Social Life in India (1608-1937)*
1939

Kool, Maarten L., Dik Verboom and Jan J. van der Linden
Squatter Settlements in Pakistan,
Sub-titled: The Impacts of Upgrading
Lahore: Vanguard Books (Pvt) Ltd., 1988

Kulke, Eckehard, *The Parsis in India: A Minority as Agents of*
Social Change. Bombay: Vikas Publishing House. 19

Lalji, Haridas. *Silver Jubilee of Buyers and Shippers Chamber*. 1941

Lambrick, H. T. *Sind: A General Introduction*
Hyderabad: Sindhi Adabi Board. 1964

Scanned with CamScanner

Lambrick, H. T. *Sir Charles Napier and Sind*,
Oxford: Clarendon Press, 1952

Latif, Nargis. *Karachi O Karachi*, (A collection of newspaper columns)
Karachi: Published by the author, 1989

Life History of Sir Jehangir Kothari,
Bombay: Times of India Press.

Linden, Jan van der & Frits Selier. *Karachi: Migrants, Housing and Housing Policy*
Lahore: Vanguard Books (Pvt) Ltd., 1991

Lupton, S. *Karachi Handbook*, 1920 edition
Karachi: The Daily Gazette Press Ltd., Caxton House, 1920

Malkani, Kewalram Rattanmal, *The Sindh Story*,
New Delhi: Allied Publishers Private Limited, 1984

Mariwala, C. L. "The First Railway in Sind", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-I, Part 2, 1934

Mariwala, C. L. "Karachi Town and its Trade and Taxation in the First Half of the 19th Century", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-IV, 1940

Mariwala, C. L. "Two Great Occasions in British History in Sind", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-V, Part 1, 1940

Mariwala, C. L. "Origin of the Karachi Municipality", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-V, Part 2, 1941.

Mariwala, C. L. "Treaty and Travels in Sind 1810-1820", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-VI, Part 2, 1942

Mariwala, C. L. "British Administration in Sind in 1799", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-VI, Part 1, 1943.

Mariwala, C. L. *Essays on British Policy towards Sind upto the First Afghan War 1839*,
Bombay: 1947, Reprinted Karachi: Indus Publications, 1982

Mehta, Jamshed N. R. *Karachi Municipality*, Karachi: 1925.

Mehta, Jamshed N. R., *Separation of Sind*, Karachi: 1928

Mehta, Jamshed N. R. *Karachi Extension*, Karachi, 1929

Melvillia, J. Scinde: *1848 Administrative Report by the Order of House of Commons*, 1854

Merriman, R. D. "The Indian Navy: A Review of Activities in Sind from 16[illegible]5 to 1863", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-VI, Part 3, 1943

Mirams, A. E. *Report on the Development of Karachi*, Bombay, 1923

Mirchandani, B. D. "Crow's Account of Sind", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-I, Part 2, 1934.

Moinuddin, *Sindh: Land of Legends*,
Karachi: National Book Foundation, 1975

Morris, Jan, *Stones of Empire: The Buildings of British India*
London: Penguin Books, 1994 (1st edition OUP, 1983)

Mughal, M. Yakub Ed. *Studies on Sind*, Jamshoro: University of Sindh, 1988

Napier, William. *History of Sir Charles Napier's Administration of Scinde and Campaign in the Cuthee Hills*,
London: Chapman & Hall, 1851.

Napier, William, *The Life and Opinions of Sir Charles Napier* (4 vol.)
London: John Murray, 1857

Neil, J. Martin Bladen, *Recollections of Four Years Service in the East with 40th Regiment*,
London: Richard Bentley, 1845

Nientied, Peter, *Redevelopment in Karachi's Inner City The Lines Area Project.*
(Preliminary report prepared for Department of Development Sociology, Free University, Amsterdam.) 1984

Outram, J., *The Conquest of Sind. A Commentary.* (2 Vol.)
Reprinted Karachi: Indus Publications, 1978

Overview of Children in Armed Conflicts in Sindh
(A report prepared by Raasta Development Consultants, Karachi for UNICEF.) 1995

Panhwar, M. H., (Comp.), *Source Material on Sindh*
Jamshoro: Institute of Sindhology, 1977

Patel, D. N., *Karachi Guide & Directory for 1915*
Karachi, 1915.

Pirzada, D. A., *Hatim A. Alavi: A Pillar in the Pakistan Movement*
Karachi: Mehran Publishers, 1994.

Pithawala, Maneck B., "Historical Geography of Sind", in *Journal of Sind Historical Society*, Vol-I, Part 2&3, 1934.

Pithawala, Maneck B., *Sind's Changing Map: An Album Containing 51 Old and Rare Maps of Sind with Critical and Explanatory Notes on them*
Karachi: Published by the author, 1938

Pithawala, Maneck B., *Greater Karachi*, Karachi, 1938

Pithawala, Maneck B., *Problems of Greater Karachi*, Karachi, 1939

Pithawala, Maneck B., & Martin Kaye, *Geology and Geography of Karachi and its Neighbourhood*, Karachi, 1946

Pithawala, Maneck B., *An Introduction to Karachi: Its Environs and Hinterland*, Karachi: The Times Press, 1946 (or 1950.)

Pithawala, Maneck B., *Historical Geography of Sind*
Jamshoro: Institute of Sindhology, 1978 (1st edition 1936)

Postans, T., *Personal Observations on Scinde*,
London, 1843, Reprinted Karachi: Indus Publications, 1973

Pottinger, H., *Travels in Beloochistan and Sinde*
London, 1816, Reprinted Karachi: Indus Publications, 1986

Preedy, Capt., *Selections from the Pre-Mutiny Records of the Commissioner in Sind*, Karachi: The Commissioner's Press, [illegible]

Quadri, Syed Munir Zia, *Jumbo Sheets: An Urban Profile*
Karachi: Karachi Geographers Association Publication 2, 1966

Rahman, Mushtaqur, *Land and Life in Sindh, Pakistan*
Lahore: Ferozsons Ltd., 1993

Raza, M. Hanif, *Karachi: The Show Window of Sind*
Karachi: Editions Mistiques, 2nd edition, 1984 [illegible] 1970

Rehmatullah, Shireen, *Ethnic Conflict in Karachi*

Islamabad: National Council of Social Welfare, 1988.
Report of the Christian Research Centre,
Karachi, 1973.
Rizvi, Taher, *Parsis: A People of Book*,
Calcutta: Imperial Art Cottage, 1928.
Ross, D., *The Land of Five Rivers in Sind*,
Sub-titled "Sketches Historical and Descriptive,"
London: Chapman & Hall, 1883.
Rubie, C.B. & B.D. Shanker, *A History of the Sindh Cricket Tournament and Karachi Cricket in General*,
Karachi: Edwin Forster & Co., Caxton House, 1928.
Rustamji, Behram Sohrab H.J., *Karachi 1939-1947*,
Karachi: Kitabistan Ltd, 1952.
Sayed, G.M., *Struggle for New Sind: A Brief Description of Provincial Autonomy in Sind During a Decade* (1937-1947),
Karachi: Sind Observers Press, 1949.
Shafi, Mian Ahmad, *Haji Sir Abdoola Haroon: A Biography*,
Karachi: Herald Press.
Shaheed, Farida, "The Pathan Mohajir Conflicts, 1985-6: A National Perspective," in Das, Veena, Ed., *Mirrors of Violence: Communities, Riots and Survivors in South Asia*, New Delhi: Oxford University Press, 1990.
Shaikh, Abdul Hamid, *Informal Sector Housing Study of Goths in Karachi*, (B. Arch. thesis for Dawood College of Engineering & Technology, Karachi.) 1990.
Shaikh, Muhammad Ali, *Sindh Madressah: A Journey through Time*,
Karachi: Sindh Madressatul Islam, 1995.
Sidhwa, R.K., *The Corporation of the City of Karachi*, 1939.
Smith, N.H., *Correspondence between the Envoy of Sind and the Officers of Mir Ghulam Ali Talpur of Karachi*, 1809.
Smyth, *Gazetteer of the Province of Sind*, Vol I-B, 1919.
Soomro, Faiz Mohammad, *Cultural History of Sind*,
Karachi: National Book Foundation, 1977.
Soomro, Muhammad Qasim, *Muslim Politics in Sindh (1938-1947)*,
Jamshoro: Pakistan Study Centre, University of Sindh, 1989.
Sorley, H.T., *Gazetteer of West Pakistan: The Former Province of Sind*,
Karachi: West Pakistan Government Press, 1968.
Souvenir of Golden Jubilee of the Karachi Goan Association, 1886-1936,
Karachi, 1936.
Souvenir of Sind Multan Baluchistan Federation of Theosophical Society,
Karachi: Theosophical Society, 1943.
Souvenir Volume of the Karachi Goan Association, 1886-1956,
Karachi, 1956.
State of Human Rights in 1995,
Lahore: Human Rights Commission of Pakistan, 1996.
Street Children of Karachi, (Report of a Study by the Institute of Social

Research & Development, Karachi, conducted for UNICEF) 1990
Tahilramani Persiani V *Why the Exodus from Sind* '
Taraporewalla, E. H *The Karachi Residential & Mercantile Directory for 1938-39.*
Karachi: The Daily Gazette Press, 1939
Temple, B , *The Karachi Hand book and Directory*
Karachi, 1914.
Temple, R , *Men and Events of My Time in India*, 1882
Thomas R Hughes, *Selections form the Records of the Bombay Government* Bombay Government of Bombay, 1855
Thomas, R. Hughes, Ed., *Memoirs on Sind,*
New Delhi Low Priced Publications 1993 (1st edition 1855)
Walker, J , *Kurrachee Harbour in Scinde* 1856
Webb, Montague de P , *The Karachi Hand-book and Directory 1921*
Karachi, 1922
Webb, Montague de P *The Karachi Who's Who and Why.*
Karachi: The Daily Gazette Press, 1932.
Wilton, J. H., *Scenes in a Soldier's Life*, 1848
Wright, Theodore P , 'Centre Periphery Relations and Ethnic Conflict in Pakistan Sindhis Muhajirs and Punjabis" in *Comparative Politics*, Spring 1991
Young, Keith, *Sind in the Forties*, Reprinted Karachi Indus Publications, 1994
Zaidi, S Akbar, Ed , *Regional Imbalances & the National Question in Pakistan*, Lahore Vanguard Books (Pvt) Ltd , 1992
"Zarrin Qulam", "Post Offices in Sind", in *Journal of Sind Historical Society* Vol-V, Part 4, 1942

اردو

ایسٹ، وی بی، سندھ تاریخ کے آئینے میں (۱۹۱۸ تا ۱۹۸۵)، ترجمہ: ڈاکٹر محمود صادق (ظہیر)،
کراچی: ڈھاکا، مکتبہ دانیال، ۱۹۸۹۔
حسن، سید (مرتب)، کراچی کیوں جلتا ہے؟ (مضامین) کراچی: دور لنگ ووڈ پبلیکیشنز، ۱۹۸۷۔
حمید، پروفیسر عزیز الدین، کیا ہم اکٹھے رہ سکتے ہیں؟ پاکستان میں قومیتی مسئلے کا تجزیہ،
لاہور: مکتبہ فکر و دانش، ۱۹۸۸۔
سعید، پروفیسر محمد، حقائق کراچی، لاہور: ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب، ۱۹۹۱۔
شاہد، جاوید (مرتب)، سفر زندگی: ایم کیو ایم کی کہانی، الطاف حسین کی زبانی،
لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۸۸۔
عشو، محمد موسیٰ، پاکستان میں قومیتوں کے مسائل اور ان کا حل

(سندھ کے موجودہ حالات کے پس منظر میں)، حیدرآباد، سندھ نیشنل اکیڈمی، ۱۹۸۳ء
بیگ، میرزا عبدالقادر، کراچی کا تاریخی مقدمہ، لکھنؤ: اترپردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۵ء۔
پرکاش، سری، پاکستان: قیام اور ابتدائی حالات، ترجمہ: محمد عنایت الحسن، لاہور: تخلیقات، ۱۹۹۳ء۔
چوہدری، زاہد، جناح سیاقت تضاد اور پنجابی مہاجر تضاد (پاکستان کی سیاسی تاریخ، جلد ۳)،
لاہور: ادارہ مطالعہ تاریخ، ۱۹۹۰ء۔
چوہدری، زاہد، سندھ: مسئلہ خودمختاری کا آغاز (پاکستان کی سیاسی تاریخ، جلد ۶)،
لاہور: ادارہ مطالعہ تاریخ، ۱۹۹۳ء۔
حال، فرحت شیر، کتاب سے کلاشنکوف تک، کراچی: پاکستانی ویب پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء۔
دعوی جواب دعوی: ایم کیو ایم، حکومت سپریم کورٹ میں، لاہور، جنگ پبلشرز، ۱۹۹۵ء۔
رائے، حنیف، (مدیر)، ہفت روزہ نصرت، لاہور (مہاجر ین نمبر)، ۵ جولائی ۱۹۵۹ء۔
زرداری، ڈاکٹر محمد اسحاق، عہد سندھ (برطانوی فتح سندھ کے دور)،
لاہور: سندھ ہسٹاریکل اینڈ کلچرل سوسائٹی، ۱۹۹۳ء۔
رشید، حسان، سندھ دوراہے پر، کراچی، پاکستانی ویب پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء۔
رضوی، محمود، ملکہ مشرق، کراچی:
علی، ڈاکٹر مبارک، سندھ: خاموشی کی آواز، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۳ء۔
سلیم، احمد، (مرتب)، سلگتا ہوا سندھ، لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۰ء۔
شیرازی، رحمت، اغوا برائے تاوان، کراچی: مطبوعات محمود، ۱۹۹۱ء۔
صدیقی، احمد حسین، گوہر بحیرہ عرب (کراچی)، کراچی، محمد حسین اکیڈمی، ۱۹۹۵ء۔
مرزا محمود، آج کا سندھ — پاکستان کی یکجہتی کے مسائل، لاہور: پروگریسو پبلشرز، ۱۹۸۶ء
منظر، شہزاد، سندھ کے لسانی مسائل، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۳ء۔
ناصر، حمید، (مدیر و مولف)، وادی ملیر، کراچی: حمید ناصر، ۱۹۸۷ء۔
ناصر، حمید، (مدیر و مولف)، وادی لیاری، کراچی: حمید ناصر، ۱۹۹۲ء۔
یوسف، نجیب، کراچی پیپرز، کراچی: رکتاب، ۱۹۹۵ء۔

سندھی

ابڑو، شیخ، ساهیوال جیل جی ڈائری (ساہیوال جیل کی ڈائری)، حیدرآباد: سوفینڈس پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء۔
ڈوڈیجا، لوک رام، مسمود طن مسمی، سهو (سیر وطن سیر سد لوک)،
حیدرآباد: نیو فیلڈس پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء۔
راشدی، پیر علی محمد، اُھے ڈینھن اُھے شینھن (وہ دن وہ شیر)،
حیدرآباد: سندھی ادبی بورڈ، جلد اول ۱۹۶۶ء، جلد دوم ۱۹۸۰ء۔

Scanned with CamScanner

راشدی، سید حسام الدین، مُنوڈو مُنوڈ سد، حیدرآباد: سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۷۷ء۔
سید، جی ایم، جنب گذاریم جن سین، (دو جلدوں میں)، حیدرآباد: سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۷۹ء۔
علی میر محمد، سِس کراچی، حیدرآباد: پرچو ودیا اشاعت گھر، ۱۹۷۰ء۔
کلہوڑو، موسیٰ، محمد عشق، دب (بھوک، عشق، دب)، حیدرآباد: سپی پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء۔
گیانچندانی، سوبھو، تاریخ جا وسارل ورق (تاریخ کے بھلائے ہوئے ورق)، حیدرآباد: سندھی ساہت گھر، ۱۹۹۳ء۔
نظامانی، رئیس کریم بخش خان، تنہیں کتاب، (جلد اول)، حیدرآباد: سیونفیلڈس پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء۔
ہوت چند، سیٹھ نائوں مل، یادگیریوں (یادداشتیں)، ترجمہ: محمد حنیف صدیقی،
حیدرآباد: سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۶۸ء۔

***

aaj

an urdu journal of literature and ideas

Published quarterly from Karachi, *aaj* presents each time a selection of contemporary writings from many languages of the world, translated in Urdu, as well as some ground-breaking Urdu writings of today. At the end of each regular issue a special section - a small anthology in itself - is devoted to a particular writer or subject. The special issues of *aaj* published so far have presented selections of Arabic, Persian and Hindi short stories, selected fiction of Gabriel Garcia Marquez, writings from different parts of the world covering the tragedy of Bosnia, and, recently, the "Story of Karachi" in two volumes - a third volume is to be published shortly.

Subscription

Pakistan:

Rs 300 (one year), Rs 500 (two years)
Please send the subscription through cheque/pay order/draft drawn in favour of
"Quarterly Aaj, Karachi"
to the following address:
Managing Editor, aaj,
A-16, Safari Heights,
Gulistan-e-Jauhar, Karachi 75290.
Tel: (021) 811-3474
e-mail: aaj@biruni.erum.com.pk

Outside Pakistan:

Individuals: US$ 25 (one year), US$ 45 (two years)
Institutions: US$ 40 (one year), US$ 70 (two years)
Please send the subscription in US dollars to
Dr Muhammad Umar Memon,
5417, Regent Street,
Madison, WI 53705, USA.
Tel: (608) 233-2942
Fax: (608) 265-3538
e-mail: mumemon@factstaff.wisc.edu

Subscription includes registered air mail charges

Scanned with CamScanner

شمارہ ۱ : خزاں ۱۹۸۹

تارا شنکر بنرجی — ستیہ جیت رے — اسد محمد خاں

محمد خالد اختر — ڈونلڈ بارتھیلم — ولیم سیرویان

قصاں محمد سعید — ذی شان ساحل — نسرین انجم بھٹی — سعید الدین

نیر مسعود — فروغ فرخ زاد — بابا مقدم

(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۲ : گرما ۱۹۹۰

نجیب محفوظ — لیو تالستائی — کیم مونزو

مظفر علی سید — فہمیدہ ریاض — عذرا عباس

احمد فواد — محمد خالد اختر — اکرام اللہ

(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۳ : بہار ۱۹۹۰

اٹالو کلوینو — ایلین بالوت — محمد عمر میمن

محمد سلیم الرحمٰن — جیک لنڈن — محمد انور خالد

زیبا الیاس — محمد خالد اختر — تاڈیوش روزے وچ

زبگنیو ہربرٹ — وسلاوا شمبورسکا — انگیر اندرواٹ

(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۴ : گرما ۱۹۹۰

وجے دان دیتھا — انور خان — حسن منظر

محمد سلیم الرحمٰن — شمس الرحمٰن — شمس الحق

فہمیدہ ریاض کی طویل تحریر "زندہ بہار — ایک سفر کی روداد"

(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۵ : خزاں ۱۹۹۰

منوچہر خسرو شاہی　　بابا معظم　　جمال میر صادقی

ثروت حسین　　ذی شان ساحل　　اوکتاویو پاز　　یہودا امیخائی

جولین بارنز　　فاروق خالد　　محمد خالد اختر　　علی امام نقوی

ایک مختصر انتخاب ــــ خورخے لوئس بورخیس

(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۶ : سرما ۱۹۹۱

اے بی یہوشوا　　صلاح الدین محمود　　فہمیدہ ریاض

نیر مسعود　　یانس ریتسوس　　انطون شماس　　اسد

ولاس سارنگ ــــ چار کہانیاں

(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۷ : بہار ۱۹۹۱

خصوصی شمارہ ــــ گابریئل گارسیا مارکیز

(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۸ : گرما خزاں ۱۹۹۱

منوج داس　　ضمیر الدین احمد　　نیر مسعود　　اکرام اللہ

خالدہ حسین　　ثنا نور پارا　　افتخار جالب　　اوسیپ ماندلستام

افضال احمد سید　　عذرا عباس　　ہیری ہین　　ذی شان ساحل

گریگور فان ریزوری ــــ ناول کا ایک باب

(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۹ : سرما ۱۹۹۲

خصوصی شمارہ

مصر، جنوبی افریقہ، موزمبیق، زمبابوے، ہندوستان،
امریکا، میکسیکو، انگلستان، آئرلینڈ اور اٹلی کے ادیبوں کی کہانیاں

(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

Scanned with CamScanner

شمارہ ۱۰ : بہار ۱۹۹۲

معاصر اردو فکشن : تیرہ کہانیاں اور ایک ناول

نیر مسعود　　اسد محمد خاں　　حسن منظر

مسعود اشعر　　انور خاں　　قمر احسن

فہمیدہ ریاض کا مکمل ناول ـــ "گوداوری"

صغیر ملال ـــ منتخب کہانیاں

(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

شمارہ ۱۱ : گرما خزاں ۱۹۹۲

محمد خالد اختر　　اسد محمد خاں　　نیر مسعود

فہمیدہ ریاض　　عثمان احمد سید　　میروسلاو ہولب　　سیموں د بووار

ژاں ژینے کا مکمل کھیل "خادمائیں"

(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

شمارہ ۱۲ : سرما ۱۹۹۳

پریم چند　　گابریل گارسیا مارکیز　　نیئر مسعود　　فہمیدہ ریاض

ضمیر الدین احمد　　ذی شان ساحل　　سعید ندیم　　محسن خاں

آئزک باشیوس سنگر ـــ منتخب کہانیاں

(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

شمارہ ۱۳ : بہار ۱۹۹۳

خصوصی شمارہ ـــ عربی کہانیاں

توفیق الحکیم　　عبدالسلام العجیلی　　زکریا تامر　　محمد برادا

عبدہ رحمت　　حنان شیخ　　ساطع مر　　محمود دیاب　　ابراہیم الکونی

یوسف ادریس　　یوسف شارونی　　ادورد الخراط　　طیب صالح

نبیل جورجی　　محمد خضیر　　غسان کنفانی

(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۱۴ : گرما خزاں ۱۹۹۳

وسیلی شوکشن　محمد خالد اختر　افضال احمد سید　افتخار جالب
محمد نور خالد　نیر مسعود　اسد محمد خاں
مصطفیٰ ارباب　سیمون دُبووار　اعجاز راہی
ریشارد کاپوشنسکی کی مکمل کتاب شہنشاہ
(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

شمارہ ۱۵ : سرما بہار ۱۹۹۴

خصوصی شمارہ ـــــ فارسی کہانیاں

صادق ہدایت　بابا مقدم　بزرگ علوی　جلال آل احمد
غلام حسین ساعدی　جمال میر صادقی　غلام حسین ساعدی
اسماعیل فصیح　فریدون تنکابنی　سیمین دانشور　ابراہیم گلستان
نادر ابراہیمی　محسن دانادی　محمود دولت آبادی
منیرہ خاکسار　امین فقیری　منیرو روانی پور　قدسی داری
(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۱۶ : گرما ۱۹۹۴

گابریل گارسیا مارکیز　فہمیدہ ریاض　رگھوویر سہائے
ثروت حسین　نیر مسعود　حسن منظر　سید محمد اشرف
اکرام اللہ　مظفر علی سید　سیمون دُبووار
وجے تندولکر کا مکمل کھیل خاموش! یہ عدالت ہے
(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

شمارہ ۱۷ : خزاں ۱۹۹۴

خصوصی شمارہ ـــــ سرائیوو سرائیوو

بوسنیا سے متعلق تحریروں کا ایک انتخاب
(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

شمارہ ۱۸ : سرما ۱۹۹۵

خصوصی شمارہ ــــ ہندی کہانیاں

امرکانت　　رام کمار　　اُشا پریم ودا　　راجیندر یادو

کاشی ناتھ سنگھ　　سوہن راکیش　　بھیشم ساہنی

نرمل ورما　　شانی　　اصغر وجاہت　　منو بھنڈاری

راجی سیٹھ　　سوویش دیپک　　گووند مشر　　عبدل بسم اللہ

شری لال شکل　　گیان رنجن　　اُودے پرکاش

(دستیاب نہیں ہے)

شمارہ ۱۹ : بہار گرما ۱۹۹۵

نیر مسعود　　ذی شان ساحل　　حسن منظر　　افضال احمد سید

محمد انور خالد　　افتخار جالب　　سعید الدین　　ثروت زہرا

آصف فرخی　　انور خان　　نکہت حسن　　اوشاو گھوش　　ایوان کلیما

حمید دریاش　　اُودے پرکاش　　گریس ہوگوٹ　　جوناتھن ٹراشل

برنارڈ مالامڈ ــــ منتخب کہانیاں

(چند کاپیاں دستیاب ہیں)

آج کی کتابیں

افضال احمد سید

چھینی ہوئی تاریخ (نظمیں)

(دستیاب نہیں ہے)

خیمۂ سیاہ (غزلیں)

قیمت: چالیس روپے

دو زبانوں میں سزائے موت (نظمیں)

قیمت: ساٹھ روپے

ذی شان ساحل

چڑیوں کا شور (نظمیں)

قیمت: چالیس روپے

ابر آلود آسمان کے ستارے (نظمیں)

قیمت: ساٹھ روپے

کراچی اور دوسری نظمیں

قیمت: سو روپے

ضمیر نیازی

صحافت پابندِ سلاسل

انگریزی کتاب The Press in Chains کا اردو ترجمہ

قیمت: سو روپے

محمد عمر میمن

گم شدہ خطوط

اور دیگر تراجم

قیمت: اسی روپے

Scanned with CamScanner

گابریئل گارسیا مارکیز

منتخب تحریریں

("آج" شمارہ ۷، بہار ۱۹۹۱، کتاب کی صورت میں)

لاطینی امریکا کے ملک کولمبیا سے تعلق رکھنے والے نوبیل انعام یافتہ ادیب
کی تحریروں کا ایک جامع انتخاب

دو مکمل ناول
"کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" اور "ایک پیش گفتہ موت کی روداد"
تیرہ منتخب کہانیاں
دو ناولوں "تنہائی کے سو سال" اور "وبا کے دنوں میں محبت" کے منتخب ابواب
مارکیز کی نوبیل انعام پیش کیے جانے کے موقعے کی تحریر اور ایک اہم مضمون
"کولمبیا کا مستقبل"
مارکیز کے فن پر دو مغربی نقادوں کے مضامین
اپنی زندگی، فن اور خیالات پر مارکیز کی ایک طویل گفتگو
مارکیز کی شخصیت اور حالاتِ زندگی کے بارے میں
ان کے ایک ہم وطن دوست ادیب کی ایک طویل تحریر

قیمت: دو سو روپے

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

فہمیدہ ریاض	اختر حمید خاں	آصف فرخی
محمد حنیف	زینت حسام	بنجمن انستوفی
شہریت سوز	لیاقت منوّر	بیکسٹر بھٹی
نسرین اسٹیفن	آصف شہباز	محبوب جان
تسنیم صدیقی	کینتھ فرنانڈیز	یان فانڈر لینڈن
اکبر زیدی	مارک ٹلی	عارف حسن

قیمت ۱۰۰ روپے

آج کی کتابیں

اے ۱۶، سفاری ہائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

Scanned with CamScanner